

پیری دہ خدائی

ن
بجاری

قوی کتب خانہ لاہور

پریڈی درخت

نسیم حمازی



قومی کتب خانہ

۱۹۔ فیروز پور روڈ۔ لاہور

فہرست

۴	پیش لفظ
۷	انتساب
	* پہلا حصہ
۹	برہنہ چٹانیں اور عظیم دریا
	* دوسرا حصہ
۱۲۵	مہکتی خاک اور ٹھنڈی نہریں
	* تیسرا حصہ
۳۴۷	راستے اور فاصلے

پیش لفظ

”خاک اور خون“ کی اشاعت کے بعد مجھے اُمید تھی کہ آنے والے ادوار میں پاکستان کے کئی اہل قلم اس موضوع پر لکھیں گے اور کاروانِ پاکستان نے ماضی کی تاریکیوں کے پہلو میں جو چراغ جلائے تھے ان کی روشنی قوم کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوگی لیکن ہمارے ترقی پسند دانشوروں کے نزدیک زمانہ قبل از تاریخ کے کھنڈر مسلمانوں کی اُن جلی ہوئی بستیوں سے کہیں زیادہ اہم تھے جن کی راکھ ابھی تک گرم تھی۔

کوئی پچیس برس قبل جبکہ خاک اور خون کے کئی ایڈیشن نکل چکے تھے ایک گفتگو کے دوران میں نے احسن صاحب کو یہ کہا تھا کہ اگر کبھی فرصت ملی تو میں ”پردی درخت“ کے عنوان سے ایک ناول لکھوں گا۔ احسن صاحب ذرا چونکے لیکن اُن کے چھوٹے بھائی محمد محسن صاحب کافی پریشان ہوئے تھے۔

پانچ سال قبل میں افغانستان کے اولوالعزم مجاہدوں کے متعلق لکھنے کے لیے مواد جمع کر رہا تھا کہ اچانک بیمار ہو گیا۔ دو سال بعد مجھے ڈاکٹروں نے مکمل آرام کا مشورہ دیا اور میرا تجزیہ یہ تھا کہ مکمل آرام کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ میں بستر پر لیٹے لیٹے کوئی ناول اِلا کرادوں۔

کوئی تیس برس پہلے میں نے طویل علالت اور سخت تکلیف کی حالت میں ”مُعظم علی“ اور ”اور تلوار ٹوٹ گئی“ اِلا کروائی تھیں لیکن اس وقت سیے

رفیقِ کار شرف الدین اصلاحی (اب ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی) تھے۔ میں نے پروفیسر سعید اختر صاحب کو اِلا دینا شروع کی لیکن سخت گرمی کے ایام میں ان کی صحت پر اثر پڑا اور وہ زیادہ دیر میرا ساتھ نہ دے سکے۔ پھر کافی عرصہ تک کوئی نیا آدمی تبتلی بخش کام نہ کر سکا۔ ۱۹۸۶ء میں ایک ذہین بچی آنسہ عارفہ عباس میرے کام میں شریک ہو گئی اور میرا خیال تھا کہ میں سال کے اختتام تک یہ کام ختم کر لوں گا لیکن عارفہ عباس کے والد محترم ملازمت سے ریٹائر ہو چکے تھے اور وہ کراچی شفٹ ہونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ انھوں نے ایک مہینہ بکے لیے اپنا پروگرام ملتوی کر دیا تاہم میری تمام کوششوں کے باوجود ایک تہائی کتاب باقی رہ گئی۔ ایک سال بعد آنسہ عارفہ کو یہ معلوم ہوا کہ کوئی اچھا اِلا دینے والا نہ ملنے کے باعث میرا کام رکا ہوا ہے تو وہ اپنے والد کے ساتھ راولپنڈی آ گئی اور اپنی ایک عزیز سہیلی سیما رؤف کو اِلا لینے پر رضامند کر گئی۔ سیما بیٹی کے والد رؤف صاحب میرے پُرانے دوست نکلے اور انھوں نے خوشی سے بیٹی کو کام کرنے کی اجازت دے دی۔

آنسہ سیما رؤف کو اِلا دینے سے قبل سابقہ مسودے پر نظر ثانی کرتے ہوئے مجھے یہ افسوس ہوا کہ جو داستان ”پردی درخت“ کے عنوان سے شروع ہوئی تھی وہ اس قدر پھیل گئی ہے کہ اسے ایک ناول میں ختم نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی ایک وجہ تو اس کے موضوع کا پھیلاؤ تھا اور دوسری یہ کہ جب انسان کسی بیماری یا تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ اپنے بچپن اور بھرپور توانائی کے زمانے کی یادوں میں پناہ لیتا ہے۔ لہذا میں نے اس ناول کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ دوسرا حصہ ”گمشدہ قابیل“ کے عنوان سے

اختتام پذیر ہوا۔

چنانچہ یہ کام جو میں نے تین سال قبل موسم گرما میں شروع کیا تھا اس سال گرمیوں کے اختتام پر مکمل ہوا۔ آخری اور سب سے زیادہ تکلیف دہ مرحلہ بے ترتیبی سے پکھرے ہوئے مسودے کو یکجا کر کے اس کے صفحات کی ترتیب درست کرنا تھا۔

”پردی درخت“ اور اس کے بعد ”گشہ قافلے“ احسن صاحب کے سپرد کرتے ہوئے مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ کام آئندہ سیارہ روت سے بہتر کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا جس کے لیے میں اس ذہین اور محنتی بچی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

مجھے اس بات کا انہوں نے سب سے گہرا طویل علالت کے باعث میں یہ کام جلدی ختم نہ کر سکا اور مجاہدین افغانستان کی ایمان افروز اور رُوح پرور داستان میں تین سال تاخیر سے شروع کر رہا ہوں۔ اللہ سے دعا ہے کہ جو اسباب مجھ سے جہادِ افغانستان کے موضوع پر قلم اٹھانے کا تقاضا کرتے رہے ہیں ان کی توقعات پوری کر سکوں۔ آمین!

نسیم حجازی

الغیثہ ۳۳/ بی سیٹلائٹ ٹاؤن۔ راولپنڈی

یکم جنوری ۱۹۸۹ء

شیخ محمد احسن

کے نام
جو

میرے دوست اور پبلشر بھی ہیں۔

آج سے تقریباً پینتالیس برس قبل جب کوئی پبلشر ایک نئے مصنف کے مسودے کو ہاتھ لگانے کے لیے تیار نہ تھا تو ایک دن اچانک میں نے قومی کتب خانہ میں اپنے کالج کے ایک ساتھی کو دیکھ کر پہچان لیا تھا۔ قومی کتب خانہ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے گیٹ کے عین سامنے تھا اور احسن صاحب میرے کلاس فیلو تھے لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ میاں محمد نصیر ہمایوں صاحب کے بڑے بیٹے ہیں جن کے نام میں ایک تعارفی خط لے کر حاضر ہوا تھا۔ احسن صاحب کے ساتھ یہ اچانک ملاقات میری زندگی کا ایک اہم واقعہ ثابت ہوئی اور چند ماہ بعد قومی کتب خانہ سے میرا پہلا ناول شائع ہو گیا اور پھر تین اور تصانیف کے بعد میں فکرِ معاش سے آزاد ہو چکا تھا۔

۴۵ سال بعد جب میں ”پردی درخت“ نصف سے زیادہ لکھ چکا تھا تو ایک دن مجھے احسن صاحب کی صحت کے متعلق تشویش ناک خبر

پہلا حصہ

لی۔ بار بار فون کیا تو معلوم ہوا کہ ریسپوڈ اُتار کر رکھ دیا گیا ہے۔ ساری رات اضطراب میں گزری۔ کئی لوگوں کو فون کیے کہ اُن کے گھر جا کر پتہ کریں۔ صبح آٹھ بجے معلوم ہوا کہ اب وہ ٹھیک ہیں۔ میں نے کہا: ”اگر وہ ٹھیک ہیں تو انھیں یہ خبر پہنچا دو کہ میری نئی کتاب کا انتساب اُن کے نام ہو چکا ہے۔“

احسن صاحب مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا کرتے ہیں لیکن میرا پبلشر میرے ہاتھ میں کسی نئی کتاب کا مسودہ دیکھ کر اور بھی زیادہ خوش ہوتا ہے۔

کئی برس سے میری خواہش تھی کہ میں انھیں کوئی تحفہ پیش کر دوں، اُمید ہے کہ یہ کتاب جو میں بے بیشتر بیماری کی حالت میں لکھی ہے انھیں پسند آئے گی۔

نسیم حجازی

۳۳۔ بی۔ انیاٹ، سٹارٹ ٹاؤن راولپنڈی

۶۱۹۸۹

بہترین چٹانیں اور عظیم دریا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

باب - ۱

سکھرتے آگے جیکب آباد اور رستی کی جھلسا دینے والی گرمی سینے کے بعد یوسف
چھ کے قریب ہوا کے خوشگوار بھونکوں سے اپنی آنکھوں میں ٹھنڈک
محسوس کر رہا تھا۔ چند میل کا سفر اور طے کرنے کے بعد احمد خاں نے کار روکتے
ہوئے کہا۔ ”بھئی میں ذرا ٹانگیں سیدھی کر لوں۔ بہت تھک گیا ہوں۔“
یوسف نے دروازہ کھول کر اترتے ہوئے کہا: خانصاحب میں بھی آپ
سے یہی کہنے والا تھا۔ چند قدم آہستہ آہستہ چلنے کے بعد وہ اچانک ٹیلے کی طرف
بھاگنے لگا اور آن کی آن میں اس کی چوٹی پر جا پہنچا۔

یہ دراز قامت نوجوان جس کے دست و بازو تندرستی اور توانائی کا مظہر
تھے اور جس کی آنکھوں سے جرأت ٹپکتی تھی، اُن خوش وضع لوگوں میں سے تھا،
جن کے لڑکپن اور جوانی کی سرحدیں آپس میں ملتی ہیں تو دیکھنے والے ایک مدت
تک عمر کے ان دو حصوں کے درمیان فرق محسوس نہیں کرتے۔ اُس کے چہرے
پر ایک دائمی مسکراہٹ اور عزم و یقین کی روشنی تھی۔ گفتگو کے دوران جب
وہ اچانک خاموش ہو جاتا تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے اُفتی سے آگے وہ کوئی اور
چیز دیکھ رہا ہے۔

اُس کا ساتھی احمد خاں جس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی بسندھ

کا ایک خوشحال زمیندار تھا لیکن تن آسانی کے باعث موٹاپے کی طرف مائل تھا۔
ڈرائیور اور نوکر جو کچھ سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کار سے اتر کر احمد خاں
کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے اور وہ پہاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔
”دیکھا جسم کو بچپن سے ٹھیک رکھنے میں کتنا فائدہ ہے۔ ہم بھی تھوڑا
بہت دوڑ لیا کرو۔“

ڈرائیور نے کہا ”ساتھ میں اُسے آواز دوں؟ وہ کہیں اگلی پہاڑی کی
طرف نہ بھاگ جائے۔“
”تمہاری آواز دہان نہیں جانتے گی، بہتر یہ ہو گا کہ تم بھاگ کر جاؤ اور اسے
ساتھ لے کر آؤ۔“

”نہ سائیں میری توبہ، میں ایک ہرن کی طرح کیسے بھاگ سکوں گا۔“
یوسف اب پہاڑی سے نیچے اتر رہا تھا، دوسرے نوکر نے کہا ”ساتھ اسے
اب آواز دینے کی ضرورت نہیں، وہ خود ہی آتا ہے۔“
بیس منٹ بعد کار آگے روانہ ہو چکی تھی اور یوسف خوش گوار ہوا میں
لبے لبے سانس لے رہا تھا۔

○
احمد خاں سے یوسف کی پہلی ملاقات صرف چار دن قبل سکھر میں اپنے
ماموں زاد حسین احمد کے ہاں ہوئی تھی حسین احمد وہاں اور رہتا تھا اور یوسف
اچانک ہی اُس کے گھر پہنچا تھا۔ حسین احمد اپنی ملازمت کے دوران کافی عرصہ
پہلے بھی سکھر رہ چکا تھا اور وہاں سے چند میل دور ایک گاؤں کے زمیندار سے
اُس کے پرانے مراسم چلے آ رہے تھے جس سے ملنے وہ گیا ہوا تھا۔
یوسف کو اپنے ماموں زاد کے گھر پہنچے ایک گھنٹہ ہوا تھا کہ کسی کی کار

دروازے پر آکر رُک کر حسین احمد کی بیوی نے مارن سن کر کہا: ”یوسف! یہ تمہاری
بھائی جان کے دوست احمد خاں صاحب ہوں گے۔ انہیں بیٹھک میں بٹھاؤ
اور کہو کہ وہ تھوڑی دیر تک آجائیں گے!!“

اور وہ یہ بھی کہہ گئے تھے: ”آپ اسی وقت ان کے ساتھ کھانا کھائیں گے۔“
یوسف نے باہر نکل کر احمد خاں سے مصافحہ کیا اور کہا: ”جناب! آپ کے
دوست اس وقت گھر پر نہیں ہیں، وہ ابھی آجائیں گے۔ آپ تشریف رکھیے۔“
احمد خاں نے سر سے پاؤں تک غور سے یوسف کی طرف دیکھا اور مسکرا کر
کہا اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو آپ یقیناً یوسف صاحب ہوں گے۔ وہی
قد و قامت وہی لمبے لمبے بازو، بڑے بڑے ہاتھ اور وہی کشادہ سینہ
جن کا احمد صاحب اکثر ذکر کیا کرتے ہیں۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی!“
ایک منٹ بعد احمد خاں اور یوسف بیٹھک میں بے تکلفی سے باتیں کر
رہے تھے۔ یوسف اپنے گاؤں کے دل چسپ واقعات سن رہا تھا اور احمد خاں
بے تپاشہ تھکے لگا رہا تھا۔

کوتل میں منٹ بعد حسین احمد بھی آ پہنچا۔ احمد خاں کی کرسی بیٹھک کے
سامنے تھی وہ اٹھ کر کھرا ہو گیا اور حسین احمد نے دہلیز پر قدم رکھتے ہوئے کہا:۔
”السلام علیکم!“

ساتھیں شکر ہے۔ کہ آپ آ گئے۔ میری بیس دن کی چھٹی منظور ہو گئی ہے
انشاء اللہ میں کل ہی روانہ ہو جاؤں گا۔“

احمد خاں نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا: ”ساتھیں شاید آپ کو اپنا پروگرام
تبدیل کرنا پڑے گا۔ حسین احمد کی نظر یوسف پر پڑی اور وہ ایک دوسرے سے
پرٹ گئے۔ حسین احمد نے شکایت کے لہجے میں کہا ”نالائق مجھے تارہی دے دیا

ہوتا۔ مجھے بلاوجہ اپنے افسروں کی منتیں کرنا پڑیں۔ خانصاحب! مجھے اب اتنی سارا پروگرام بدلنا پڑے گا۔ میرا خیال ہے کہ چھٹی منسوخت کرانے کی بجائے یوسف کو کراچی کی سیر کرائی جائے۔“

”نہیں بھائی جان! کراچی میں ایک بار دیکھ چکا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ جولائی میں پہاڑوں کے سوا ہمارا اپنا علاقہ ہر جگہ سے زیادہ خوب صورت ہوتا ہے۔ میں صرف آپ کا اور بھائی کا گلہ دور کرنے کے لیے آیا ہوں۔ سکھر بیراج کا کچھ حصہ میں دیکھ آیا ہوں، باقی شام کو دیکھ لوں گا۔“

احمد خان نے کہا: ”سائیں! میری تجویز ہے کہ آپ کو چھٹی بڑی مشکل سے ملی ہے اب اسے منسوخ نہ کرائیں! یوسف صاحب چند دنوں کے لیے کوئٹہ میں میرے مہمان ہوں گے۔ میں پرسوں وہاں جا رہا ہوں جب میں یہ دیکھوں گا کہ ان کا دل بھر چکا ہے تو میں انہیں گاڑی پر سوار کرادوں گا، مجھے یقین ہے کہ زیارت کی سیر کرنے کے بعد آپ کا بھائی بہت خوش ہوگا۔“

حسین احمد نے کچھ سوچ کر کہا: ”یوسف! تمہاری بھابی شاید اس بات پر خوش ہوں گی کہ ہمارے ساتھ ہی واپس ہوں گی، لیکن انہیں افسوس بھی ہوگا کہ تم اتنی دُور سے آئے اور سیر بھی نہ کر سکے۔ ایک اچھے آدمی کی دعوت ٹھکرانا اچھی بات نہیں۔ تمہیں شکریہ کے ساتھ خانصاحب کی دعوت قبول لینا چاہیے، تعارف کے لیے یہ کہہ دینا ہی کافی ہے کہ میں انہیں اپنا بھائی سمجھتا ہوں۔“

یوسف نے احمد خاں کی طرف دیکھا اور مسکرا کر ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: ”خانصاحب شکریہ لیکن میں ایک ہفتہ سے زیادہ وہاں نہیں ٹھہروں گا۔“ تیسرے روز وہ حسین احمد اور اس کی بیوی کو گاڑی پر سوار کر کے احمد خاں کی رفاقت میں کوئٹہ کا رخ کر رہا تھا۔

کوئٹہ تک جاتی راستے میں یوسف کے لیے خوشگوار ہوا کے سوا دلچسپی کی اور کوئی بات نہ تھی۔ اُس نے چلتے اور کوہِ مردار کے مناظر دیکھتے ہوئے کہا: ”خانصاحب! یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ پہاڑ اس قدر برہنہ بھی ہو سکتے ہیں۔ میں بنزہ زاروں، جنگلوں، آبشاروں اور برفانی چوٹیوں کے سوا پہاڑوں کے متعلق کچھ اور سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔“

احمد خان نے جواب دیا: ”بھئی ان پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف تو سردیوں میں نظر آتی ہے۔ وہ برہنہ پہاڑ جو کوئٹہ سے بالکل قریب ہے اُسے کوہِ مردار کہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایک یا دو دن کوئٹہ میں آرام کرنے کے بعد ہم زیارت جاتیں گے۔ وہاں پہاڑوں پر ماحول کے درخت دیکھ کر آپ کو بہت خوشی ہوگی۔ اگر بارش ہوگی تو کسی جگہ آبشار بھی نظر آجائے گی۔“

بلوچستان میں یوسف کے قیام کے آٹھ دن ایک دلکش خواب کی طرح گزر گئے۔ اُس نے تین دن زیارت میں قیام کیا تھا۔ ایک دن گرد و نواح کے سرسبز پہاڑوں کی سیر کی تھی۔ اگلے دن ایک مقامی سکول ماسٹر کی رفاقت میں خلیفت کی چوٹی سے ہوا یا تھا اور جو رگ بلوچستان کے بلند ترین پہاڑ کو دیکھ چکے تھے وہ اسے ایک کارنامہ سمجھتے تھے۔

اب آٹھ دن بعد اس نے احمد خاں سے واپس جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ یہ کہہ کر ٹال گیا: ”یار اکل پھر دیکھا جائے گا۔“

عصر کی نماز کے بعد یوسف سیر کے لیے نکلا اور تھوڑی دیر بعد احمد خاں بھی اپنی کار پر کسی دوست سے ملنے کے لیے چلا گیا۔

رات کے وقت احمد خاں واپس آیا اور اُس نے کار سے اترتے ہی نوکر سے پوچھا ”مہمان آگیا ہے؟“ ”جی نہیں!“ نوکر نے جواب دیا: ”کافی دیر ہو گئی ہے۔ اگر حکم ہو تو آپ کا کھانا لگوادیا جائے۔“

”نہیں ہم اس کا انتظار کریں گے تم ڈرائیور کو کھانا کھلا دو۔“
تھوڑی دیر بعد احمد خاں اپنے کمرے میں بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا کہ نوکر نے اندر جھانکتے ہوئے کہا: ”سائیں۔ مہمان آگیا ہے۔“ احمد خاں نے کہا: ”اُسے یہیں بلا لو اور کھانا بھی لے آؤ۔“

نوکر ”اچھا سائیں“ کہہ کر واپس چلا گیا۔ اور ایک منٹ بعد یوسف کمرے میں داخل ہوا۔

احمد خاں نے اٹھ کر اُس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

”سائیں آج آپ نے بہت پریشان کیا۔“

”جناب! بات یہ ہوتی تھی کہ مجھے قندھاری بازار میں اسلام آباد کالج لاہور کے چند طلباء مل گئے تھے۔ اُن میں سے ایک تو کوئٹہ کا ہی باشندہ ہے۔ دو کوئٹہ پہنچا تھا۔ باقی میرے لیے اجنبی تھے اور ملتان سے کوئٹہ کی سیر و سیاحت کے لیے آئے تھے۔ وہ تھوڑی سی مدت میں بلوچستان کے زیادہ سے زیادہ علاقے کی سیر کرنا چاہتے تھے۔ اُن کا کل کا پروگرام یہ تھا کہ کوہ مردار کی چوٹی سر کی جائے! مجھے ان کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ ان میں سے کسی کو بھی پہاڑوں پر چڑھنے کا تجربہ نہیں۔ میں کانگریہ کے پہاڑوں پر چودہ ہزار فٹ کی بلندی تک جا چکا تھا۔ لیکن کوہ مردار میں میرے لیے کوئی کشش نہ تھی۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ اگر تم واقعی اس پہاڑ پر چڑھنا چاہتے ہو تو تمہاری کوششیں یہ ہونا چاہیے کہ تم کچھلے پتھر تک اس پہاڑ کے دامن میں کسی ایسی جگہ پہنچ جاؤ، جہاں سے اُوپر جانے کا راستہ تلاش کرنا آسان ہو اور طلوع آفتاب

کے ساتھ ہی تمہیں پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ جانا چاہیے۔ کیونکہ اس کے بعد گرمی میں پہاڑ پر چڑھنا تمہارے لیے بہت مشکل ہو جائے گا۔ پیاس بہت لگے گی۔ اس لیے ہر ایک کے پاس اپنی چھانگل ہونی چاہیے۔ میرے مشورے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مجھے راہنما بنا کر ساتھ لے جانے پر مُصر ہو گئے اور میں کوشش کے باوجود اُن سے جان نہ چھڑا سکا۔

پروگرام یہ بنا کہ ہم ابھی کسی مقامی راہنما کو ساتھ لے کر شہر سے باہر وہ مقام دیکھ آئیں جہاں پر ہمیں کل علی الصبح جمع ہونا ہے۔ نماز فجر پہلی چڑھائی ختم کرنے کے بعد ادا کریں گے۔ اس لیے سب یہاں سے وضو کر کے روانہ ہوں گے۔ اگر کسی کو دیر ہو جائے تو اُسے ہمارے پیچھے پیچھے آنا پڑے گا۔ میرا یہ مطلب ہے کہ اس کا انتظار نہیں کیا جائے گا۔ انہوں نے میسر ہی یہ باتیں مان لیں، لیکن

پہاڑ کے دامن میں پہنچ کر ہمیں اوپر کا راستہ دیکھنے کے لیے کافی دُور جانا پڑا! اس لیے مجھے یہاں آنے میں دیر ہو گئی، جس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔“
اتنی دیر میں نوکر نے کھانا لا کر تپائی پر رکھ دیا اور احمد خاں دیر تک یوسف سے بلوچستان کے مختلف پہاڑوں کے متعلق گفتگو کرتا رہا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”یار! یہاں سے چلتے ہی بہت خوب صورت نظر آتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ چلتے کے اندر بہت ٹھنڈے، میٹھے چشمے اور بہت بڑے بڑے غار بھی ہیں۔ جن میں اتنے بڑے بڑے اثر دے ہوتے ہیں کہ انسانوں تک کو بنگل جاتے ہیں۔“
یوسف نے اطمینان سے جواب دیا۔

”خانصاحب! یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ چلتے جیسا خشک پہاڑ کسی کو بھوک اور پیاس کے سوا کیا دے سکتا ہے؟ میرا خیال ہے کہ درندہ جود و سڑوں

کے گوشت پر پلتا ہے ہمیشہ ایسا مسکن تلاش کرتا ہے جہاں قدم قدم پر شکار مل سکے اور شکار وہاں ہوتا ہے جہاں پانی اور سبزہ ہو۔

”آپ نے کبھی اڑدیا دیکھا ہے؟“

”جی ہاں! کانگرہ میں! ایک سرسبز پہاڑی چروں کی گذرگاہ تھی، میں بلندی کی طرف جا رہا تھا کہ اچانک میں نے کوئی آہٹ محسوس کی۔ سامنے دیکھا تو ایک موٹا تازہ سانپ پگڈنڈی کے بائیں ہاتھ کی جھاڑیوں سے نکل کر دائیں طرف کی جھاڑیوں میں غائب ہو رہا تھا۔ میں نے اُس کا سر نہیں دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی شکار کے پیچھے جا رہا ہے۔“

جتنا وقت اُس نے میری آنکھوں سے اوجھل ہونے میں لگایا تھا۔ اگر اس کے پیش نظر میں اُس کی جسامت کا اندازہ کروں تو اس کی لمبائی پہاڑی راستے کی چوڑائی سے تین گنا زیادہ ہوگی۔ یعنی کوئی اٹھارہ بیس فٹ! ”اور اُس کی تیز رفتاری کی وجہ بھی تو یہی ہو سکتی ہے کہ وہ کسی شکار کے پیچھے لگا ہوا تھا، جسے میں نے نہیں دیکھا تھا۔ ورنہ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنا بڑا اڑدیا مجھ سے ڈر کر بھاگ جائے گا۔“

احمد خاں نے کہا۔ ”یار! میں چڑھائی سے گھبراتا ہوں لیکن کانگرہ کے متعلق تمہاری باتیں سن کر مجھے یہ خیال آنے لگا ہے کہ اگر کبھی تمہاری رفاقت میں سفر کا موقع ملا تو میں تمہارا ساتھ دوں گا۔“

اب آپ کے صبح کے پروگرام کے متعلق میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ پورے اطمینان سے ناشتہ کر کے جائیں میرا ڈرائیور آپ کو اُس مقام تک لے جائے گا جہاں سے چڑھائی شروع ہوتی ہے۔

ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صبح تک میرا موڈ بھی بن جائے اور میں کچھ دور تک

آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جاؤں۔“

یوسف نے کہا۔ ”خاں صاحب! یہ بڑی خوشی کی بات ہوگی۔ اس صورت میں میری یہ کوشش ہوگی کہ آپ کم از کم پہلی چڑھائی تک میرے ساتھ چلیں اور ہم دوسروں کا انتظار کرنے کی بجائے جلد از جلد روانہ ہو جائیں تاکہ پہلی چوٹی پر نماز فجر ادا کرنے کے بعد آپ صبح کے دلکش مناظر دیکھ سکیں اور پھر اگر آپ یہ محسوس کریں کہ آپ تھک گئے ہیں تو آپ وہیں آرام کریں اور میں بہت جلد بلند چوٹی کے اوپر سے ہو آؤں گا۔ ایسی صورت میں مجھے اس بات کی پروا نہ ہوگی کہ میرے ساتھی آتے ہیں یا نہیں؟“

احمد خاں نے کہا۔ ”میرے دل میں آپ کے ساتھ جانے کا خیال ہی اس لیے پیدا ہوا ہے کہ آپ کے ساتھی شاید نہ آئیں اور ہم تھوڑی سی تھکاوٹ کے بعد واپس آجائیں گے! سچ تو یہ ہے کہ مجھے کوہِ مردار کا نام ہی اچھا نہیں لگتا اور ایک دوست کو تنہا اس طرف بھیجتے ہوئے مجھے ایک اُن جانا سا خوف محسوس ہوتا ہے اور اگر صبح تک تمہارے ساتھ جانے کا ارادہ پختہ کر لوں تو اس کا مقصد اپنی بہادری اور مستعدی کا ثبوت دینا نہ ہوگا۔ بلکہ اس کی وجہ محض یہی ہوگی کہ مجھے تمہاری رفاقت پسند ہے۔“

باورچی برتن اٹھانے آیا تو احمد خاں نے کہا۔

”دیکھو! ناشتہ صبح ۳ بجے سے پہلے تیار کرنا ہے۔ مہمان کے ساتھ میرا بھی! یہ اور بات ہے کہ میں بستر سے اٹھنا یا ناشتہ کرنا پسند نہ کروں لیکن تم مجھے جگنا ضرور دینا۔ گل محمد چکیدار اور ڈرائیور کو بھی تین بجے تک ناشتہ دے دینا۔ اگر میں نہ بھی گیا تو بھی گل محمد جو اس علاقے سے واقف ہے یوسف صاحب کا ساتھ دے گا۔ اسے بھی کہہ دو تیار رہو۔ میری ایک دونالی بندوق ڈور بین اور کارٹوسوں کی پیٹی

بھی اس کے سپرد کر دو۔ اور صبح مجھے اپنا رولورا اٹھانا بھی یاد دلادینا۔

○
احمد خاں ایک تنگ راستے پر گل محمد اور یوسف کے پیچھے سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا ہوا، پہاڑ پر چڑھ رہا تھا۔ اُس کے باتیں ہاتھ پر ایک خوفناک کھڈ تھا جس کی چوڑائی اُوپر کی طرف بتدریج کم ہوتی چلی جا رہی تھی اور گرائی اُسی نسبت سے بھیانک نظر آتی تھی۔ احمد خاں اس بات سے بہت پریشان تھا کہ راستہ بار بار کنارے کو چھوٹتا تھا۔ اُسے قدم قدم پر یہ احساس ہوتا تھا کہ کسی جگہ اُس کا پاؤں پھسل جائے گا اور وہ کئی گز نیچے لڑھکتا چلا جائے گا۔

مشرق کی سمت آسمان پر دشنی بتدریج پھیل رہی تھی۔ ہوا بڑی خوشگوار تھی اس کے باوجود اُسے پسینہ آ رہا تھا۔ گل محمد جس نے بدوقت اٹھا رکھی تھی گھٹے ہوئے جسم کا ایک تندرست آدمی تھا۔ وہ اپنی چال سے پہاڑ پر چڑھنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ احمد خاں نے اپنے گلے سے پستول کی پیٹی اتار دی اور اسے دیتے ہوئے کہا۔
”بھئی! اسے بھی پاس رکھو اور یہ میری ٹوپی بھی لے لو۔ شکریہ کہ میں نے یوسف کو دیکھ کر کوٹ نہیں پہنا تھا۔

جب ان کا راستہ کھڈ سے دُور مہٹ گیا تو یوسف اچانک تیزی سے آگے نکل گیا اور ایک موڑ پر رُک کر ان کا انتظار کرنے لگا۔

احمد خاں نے شکایت کی۔ ”دیکھو یار! میں آپ کے ساتھ اس لیے آیا ہوں کہ ہم سیر بھی کریں گے اور باتیں بھی کریں گے۔

یوسف نے جواب دیا: ”خان صاحب! میں یہ محسوس کرتا تھا کہ باتیں کرنے سے آپ کا سانس جلدی پھول جائے گا۔ اب ہماری پہلی منزل قریب آرہی ہے اُس کی چوٹی پر پہنچ کر ہم پہلے نماز پڑھیں گے اور پھر خوب باتیں کریں گے۔“

احمد خاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کاش! یہ راستہ ایسا ہوتا کہ میں آنکھیں بند کر کے بھاگ سکتا اور ایک ہی دوڑ میں چوٹی پر پہنچ جاتا۔ لیکن یہاں تو اس خوف سے بھی بات نہیں کرتا۔ کہ ایک ذرا سی غفلت یا بے توجہی سے میں موت کے منہ میں جاسکتا ہوں۔ یار! سچ کہو تمہیں خوف نہیں آتا، ان راستوں سے؟“

یوسف نے جواب دیا۔ ”خان صاحب دو چار بار چلنے کے بعد آپ کو بھی خوف نہیں آئے گا۔“

وہ چند منٹ خاموشی سے چلتے رہے، پھر ایک جگہ پہنچ کر یوسف نے احمد خاں کا بازو پکڑ لیا:

”خان صاحب! اب تیزی سے دس قدم اٹھائیں اور پھر تین اطراف نظر دوڑائیں تو آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ آپ کے سفر کی پہلی منزل آپ کے قدموں میں ہے۔“

ایک۔ دو۔ تین۔ ————— بلند آواز میں دس تک گن کر اُس نے اللہ اکبر کہا اور خان صاحب سبحان اللہ۔ سبحان اللہ کہتے ہوئے ان پہاڑوں کی طرف دیکھنے لگے جو تین اطراف سے کوئٹہ کی وادی کو گھیرے ہوئے تھے۔

یار اللہ! وہ بولے: میرا یہاں تک پہنچنا ایک معجزہ ہے۔ اب اگر وقت باقی ہے تو ہمیں نماز پڑھ لینی چاہیے اور تم امامت کے فرائض انجام دو گے۔ یوسف نے ایک طرف مہٹ کر نسبتاً ہموار جگہ پر اذان دی اور دونوں قبلہ رُو کھڑے ہو گئے۔

یوسف نے نماز پڑھانے سے پہلے نوکر کی طرف دیکھا اور ہاتھ سے اشارہ کیا۔ نوکر آگے بڑھنے کی بجائے جلدی سے ایک پتھر کی اوٹ میں چھپ گیا۔ دونوں نے

نماز ادا کی۔ احمد دعا کے بعد وہیں لیٹ گیا: ”یار! بڑا مزہ آیا، مجھے مزید آرہی ہے۔ اگر تمہیں اُپر جانا ہے تو جلدی سے ہو آؤ۔ میں تو ایک قدم بھی آگے نہیں جاؤں گا۔ اور دیکھو! نوکر سے میری بندوق لے لو“

یوسف نے کہا۔ ”خان صاحب! یہ تو آپ کو تجربہ ہو گیا کہ چڑھائی پر ایک پاؤ وزن بھی ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ بندوق اُٹھا کر تو میں بالکل آگے نہیں جاسکوں گا۔“

”اچھا تو یوں کرو کہ نوکر سے میرا پستول ہی لے لو۔ نیٹی گلے میں ڈالنے سے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔“

یوسف نے کہا۔ ”اگر ضرورت ہوتی تو میں یہ دونوں چیزیں ساتھ لے جاتا لیکن وہاں ان کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے؟“

”احمد خان نے کہا۔ ”دیکھو! بھتی میں کچھ دہمی سا آدمی ہوں اور یہی وجہ ہے کہ میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا تھا۔ دراصل یہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں کوئی نہیں آتا۔ اس لیے تمہیں ہتھیار کے بغیر یہاں بالکل نہیں جانا چاہیے۔“

یوسف نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”خان صاحب! جب میں خطرہ دیکھوں گا تو میں سیدھا آپ کے پاس آجاؤں گا۔ اچھا خدا حافظ!“

کتے نہیں اور اطمینان سے اپنے مالک کے پیچھے جا رہے ہیں۔ لیکن چند قدم اُٹھانے کے بعد اُس نے دیکھا کہ وہ دونوں جانور اسی رفتار سے اُپر کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ان کے آس پاس کوئی آدمی نہ پا کر یوسف کو یہ سمجھنے میں ذرا دیر نہ لگی کہ وہ پہاڑی بھیڑیے ہیں وہ تیزی سے کنارے کی طرف بڑھا۔ اُس نے کھڈ کی گہرائی کا جائزہ لیا۔

ایک پتھر اُٹھایا اور نیچے اترنے لگا۔ بھیڑیے اس عرصے میں ایک جگہ کھڑے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اُس نے چلتے چلتے دو مرتبہ مڑ کر دیکھا تو وہ اُسی جگہ کھڑے تھے۔ اُسے اطمینان تھا کہ کھڈ عبور کر کے بھیڑیے اگر

حملہ کر بھی دیں تو وہ پتھر گر کر انہیں ہلاک کر سکتا ہے۔ یہ چٹانیں ایسی تھیں کہ ایک بھلی پتھر نیچے لڑھکا دینے سے راستے کے کئی چھوٹے چھوٹے پتھر اپنے ساتھ لے جاتی تھیں۔

بھیڑیوں کے حملے کی دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ وہ پہلے بھاگتے ہوتے بلندی کی طرف جاتے پھر اُس جگہ پہنچ کر اس طرف اُترتے جہاں کھڈ کے کنارے آپس میں لے ہوئے تھے لیکن ایسی صورت میں وہ ان سے کافی دور جاسکتا تھا۔

یہ سمجھتے ہی وہ اپنی غام رفتار سے نیچے اترنے لگا۔ اس نے دوبارہ مڑ کر دیکھا تو بھیڑیے اُسی جگہ دکھائی دیے۔

اچانک اسے خیال آیا کہ شاید بھیڑیوں کا کوئی اور گروہ کسی دوسری جگہ اُس کی گھاٹ میں بیٹھا ہو اس نے اپنی رفتار تیز کر لی اور جب وہ پہلی منزل کے قریب پہنچا تو احمد خان نے اُسے دیکھتے ہی پوچھا۔

”آپ چوٹی سے ہو آئے ہیں؟“

”جی نہیں! میں دو بھیڑیوں سے جان بچا کر واپس آگیا ہوں اور میں اس

بات پر پچھتا رہا ہوں کہ میں نے آپ کی چھٹی جس کا احترام کیوں نہ کیا؟“

”بھیڑیے تم نے کہاں دیکھے تھے؟“

یوسف چوٹی کا تقریباً دو تہائی فاصلہ طے کر چکا تھا اور وہ کھڈ جو پہاڑ کے قدموں میں نصف میل سے زیادہ چوڑا تھا اب کم ہو کر تقریباً سو گز چوڑا رہ گیا تھا

وہ تازہ دم ہونے کے لیے رکا۔ اچانک اُس کی نظر دوسرے کنارے پر دو بھورے رنگ کے جانوروں پر جا پڑی۔ پہلے اُس نے خیال کیا کہ وہ ایشی

وہ ایک لمحہ رکا اور پھر احمقوں کی طرح آگے چل دیا۔
یوسف نے کھڑکا جاترہ لینے کے بعد گل محمد سے بندوق پکڑتے ہوئے کہا:
”خا صاحب اگر میں اوپر جا کر اسے اپنی طرف متوجہ کر سکوں تو اُس کی جان بچ
سکتی ہے۔“

یوسف یہ کہہ کر اوپر چڑھنے لگا۔
احمد خان نے اس کے پیچھے چلتے ہوئے کہا: ”بھئی میں تمہارے ساتھ ہوں۔“
گل محمد بھی اُس کے ساتھ تھا اور کھڑکی دوسری جانب مڑ کر پوری قوت سے
آوازیں دے رہا تھا: ”رک جاؤ! بھائی رک جاؤ آگے خطرہ ہے۔“
کوئی دس منٹ چلنے کے بعد احمد خان نڈھال سا ہو کر بیٹھ گیا، گل محمد نے مڑ کر
کہا: ”سائیں وہ نظر نہیں آتا۔“

”کون یوسف؟“ احمد خان نے دور میں آنکھوں سے لگاتے ہوئے پوچھا۔
”نہیں سائیں ابوہ بیوقوف نظر نہیں آتا، جس کی وجہ سے ہم سب اس مصیبت
میں پھنس گئے ہیں۔“

احمد خان چند منٹ اوپر کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے بیٹے ہوئے کہا۔
گل محمد اب تم دور میں پکڑ لو اور ان کی طرف دیکھتے رہو۔“
گل محمد نے دور میں پکڑ لی اور احمد خان نے آنکھیں بند کر لیں، چند منٹ بعد
گل محمد چلا آیا۔ ”سائیں یوسف بھی کہیں غائب ہو گیا ہے۔“
احمد خان ہڑبڑا کر اٹھا: ”کیوں گرتو نہیں پڑاؤہ؟“
”سائیں وہ بائیں طرف مڑا تھا شاید اُس طرف کسی کھڑکی میں اُتر گیا ہو جو
یہاں سے نظر نہیں آتی۔“

احمد خان کچھ دیر سکتے کے عالم میں بیٹھا رہا۔ پھر دور سے یکے بعد دیگرے

”خا صاحب، کھڑکے دوسرے کنارے وہ میرے ساتھ ساتھ اوپر جا رہے تھے
اور چوٹی سے نیچے ایک جگہ جہاں کھڑکے دونوں کنارے آپس میں ملتے دکھائی دیتے ہیں،
وہاں ہماری ملاقات ہونے والی تھی۔“

احمد خان نے کہا: ”واللہ! اگر میری ٹانگوں میں جان ہوتی تو میں اسی وقت
آپ کے ساتھ چل پڑتا۔ پھر آپ میرا نشانہ دیکھتے۔ میں نے بندوق اٹھانے کا ارادہ
کرتے وقت سوچا تھا کہ شاید کوئی شکار مل جائے لیکن یہ خیال دل میں نہیں آیا تھا کہ
شکار بھیڑیے بھی ہو سکتے ہیں! بہر حال اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ اب ہمیں آہستہ آہستہ
نیچے اترنے کی فکر کرنی چاہیے۔“

یوسف احمد خان کے ساتھ چل دیا مگر تھوڑی دُور جا کر وہ اچانک چلا آیا:
”خان صاحب! غضب خدا کا! ادھر دیکھتے؟“
”کیا ہوا؟“ احمد خان نے بدحواس ہو کر پوچھا۔

یوسف نے کھڑکے دوسرے کنارے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:—
”خان صاحب۔ اس دنیا میں بے وقوف صرف میں ہی نہیں ہوں۔ میری طرح کے
اور لوگ بھی اس جہان میں بستے ہیں۔“

— وہ دیکھتے! ادھر سے کوئی احمق سیدھا اُسی طرف جا رہا ہے جہاں میں
نے ابھی ابھی بھیڑیے دیکھے تھے۔

وہ فوجی بوٹ پہنے ہوئے ہے۔ چھال گلے میں ڈال رکھی ہے۔ سر پر ہیرٹ
ہے۔ ہاتھ میں چھڑی بھی ہے۔ اگر بھیڑیے کہیں دُور نہیں چلے گئے تو وہ بیوقوف
سیدھا موت کے منہ میں جا رہا ہے۔“

یوسف ہاتھ بلند کرتے ہوئے پوری قوت سے چلا آیا:
”کھڑ جاؤ! رُک جاؤ! آگے مت جاؤ!“

احمد خان نے اطمینان سے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا: "یارا کر جائے
دو جسم کو"

اور چند منٹ بعد وہ خراٹے لے رہا تھا۔

○
"خان صاحب! خالص صاحب!"

احمد خان نے ہڑبٹا کر آنکھیں کھولیں۔ یوسف اس کا بازو ہلا
رہا تھا۔ اور ایک اجنبی اس کے ساتھ کھڑا تھا! گل محمد نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے
اس سے کہا:

"السلام علیکم! جناب! آپ نے ہمیں بہت پریشان کیا"

اجنبی نے جھک کر مصافحہ کرتے ہوئے کہا: "وعلیکم السلام!"

مجھے اپنی حماقت کا احساس ہے کہ آپ لوگوں کو تکلیف ضرور ہوئی لیکن
یہ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر کرم ہے کہ آپ اس طرح آگئے جیسے کسی کی جان بچانے کے لیے
فرشتے پہنچ جاتیں۔ میں آپ کا احسان مند ہوں۔"

احمد خان نے یوسف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا: "ساتھیں ہوشیہ
یہ ہے جسے آپ نے مجھ سے زیادہ خوار کیا ہے، لیکن آپ اس پہاڑ پر کیسے پہنچے؟
اجنبی نے جواب دیا۔

"جناب! میں اس کے لئے حماقت کے سوا کوئی اور لفظ استعمال نہیں کروں گا۔

در اصل مجھے پہاڑوں پر چڑھنے کا ضبط ہے اور میں سمجھتا تھا کہ یہاں مجھے کوئی خطرہ
نہیں ہو سکتا"

احمد خان نے پوچھا: "آپ یہاں پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے آئے ہیں؟"

بندوق کے دو فائر سنا کر دیے تو وہ خوشی سے چلایا: "گل محمد تم نے فائر مئے ہیں"
"جی دو فائر مئے ہیں۔ لیکن نظر کوئی نہیں آتا"

"یہ فائر یوسف کے سوا کون کر سکتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ زندہ ہے
اور شاید وہ بیوقوف بھی زندہ ہو۔ اس وقت ہم دعا کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔"
احمد خان پھر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں اور تھوڑی دیر بعد وہ گہری نیند میں
خراٹے لے رہا تھا۔

○
گل محمد دُور بین اُٹھاتے ہیں منٹ اوپر کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اچانک
چلایا "ساتھیں وہ آرہا ہے۔ وہ دونوں آرہے ہیں۔ ساتھیں مبارک ہو"
احمد خان نے آنکھیں کھولیں اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

گل محمد نے اسے دُور بین پیش کرتے ہوئے کہا۔ "ساتھیں دُور بین سے
دیکھئے وہ صاف نظر آرہا ہے۔ ساتھیں میں درست کہتا تھا۔ وہ کسی دوسرے کھڈ
سے نمودار ہوتے ہیں جو نظر نہیں آتا۔ احمد خان نے دوبارہ لیٹتے ہوئے نکلی ہوئی
آواز میں کہا۔ اللہ کا شکر ہے تم دُور بین اپنے پاس رکھو اور میری باتوں کا جواب
دیتے رہو۔ وہ آرام سے آرہے ہیں یا بھاگتے ہوئے آرہے ہیں؟ ساتھیں! وہ
بہت آرام سے آرہے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ باتیں بھی کر رہے ہیں۔" اس کا
مطلب یہ ہوا کہ بھیڑیے ان کا پیچھا نہیں کر رہے۔ بالکل نہیں ساتھیں۔"

"اچھا گل محمد اب تم شور نہ کرو اور مجھے سونے دو"

"ساتھیں میرا خیال ہے کہ اگر آپ آہستہ آہستہ پہاڑ سے اترنا شروع

کر دیں تو بہتر ہوگا، اتنی تھکاوٹ کے بعد یہاں سونے سے آپ کا جسم اکڑ جائے گا۔"

”نہیں جناب! میں فوج میں ملازم ہوں۔ میری تبدیلی یہاں ہوتی ہے میں صرف پندرہ دن پہلے آیا ہوں اور ایم ای ایس کا ایس ڈی اور میرا رشتہ دار ہے۔ اس لیے عارضی طور پر میں اُن کے پاس ٹھہر گیا ہوں۔“

احمد خان یوسف کی طرف متوجہ ہوا۔

”بھائی مجھے یقین ہے کہ آپ ان سے اچھی طرح متعارف ہو چکے ہیں۔ اور میرے ساتھ ان کا تعارف کروانا اب آپ کا پہلا فرض ہے۔“

یوسف مسکرایا۔ ”خان صاحب! یہ ہیں ایم ای ایس کے اور سیئر ان کا نام محمد صدیق ہے اور یہ پنجاب کے ایک شہر لدھیانہ کے رہنے والے ہیں۔ ایس ڈی اور صاحب جن کے ماں یہ ٹھہرے ہوئے ہیں ان کا نام محمد سعید ہے اور وہ بھی لدھیانہ سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔“

احمد خان نے غور سے محمد صدیق کی طرف دیکھا۔ وہ کوئی تیس پچیس سال کا قوی الجشہ اور خوش وضع آدمی تھا۔ چہرے پر سادگی اور شرافت تھی۔

اُس نے یوسف سے مخاطب ہو کر کہا۔

”دیکھو! یوسف صاحب! اب ہمیں نیچے پہنچنے کے لیے اپنی ٹانگوں پر اپنا بوجھ اٹھانا ایک مجبوری ہے۔ میں آپ سب سے وعدہ لینا چاہتا ہوں کہ اگر میں تیز نہ چلوں تو تم میرا مذاق نہیں اڑاؤ گے۔“

محمد صدیق نے کہا۔ ”خان صاحب! میں تو ساری عمر ویسے بھی آپ کا احترام کرتا رہوں گا اور یوسف کی حالت یہ ہے کہ اُن کے نزدیک آپ کا یہاں تک پہنچنا ایک کارنامہ ہے۔ یہ سارا رشتہ آپ ہی کے متعلق باتیں کرتے آتے ہیں۔“

نیچے اترتے ہوئے احمد خان سب سے آگے تھا۔ گل محمد نے کھڑکے قریب اُس کا سہارا بننے کی کوشش کی لیکن احمد خان نے اسے چھڑک دیا۔

ایک گھنٹہ بعد وہ موٹر پر سوار ہو رہے تھے۔

محمد صدیق نے کہا۔ ”خان صاحب! اگر آپ میرے ساتھ چلیں تو ایس ڈی اور صاحب آپ سے بل کر بہت خوش ہوں گے۔“

احمد خان نے جواب دیا۔ ”بھئی! آج تو میں گھر جا کر نہانے، کھانا کھانے اور اُس کے بعد سونے کے سوا اور کچھ نہیں کروں گا۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں، کھانا کھائیں اور کچھ دیر آرام کریں پھر میرا ڈرائیور آپ کو ایس ڈی اور کے گھر چھوڑ آئے گا۔“

محمد صدیق نے پوچھا، خان صاحب! آج آپ چائے پر آ سکیں گے؟

”نہیں بھائی! ایک دو دن مجھے آرام کرنا چاہیے اُس کے بعد دیکھا جائیگا۔“

”یوسف صاحب آپ تو ضرور آئیں گے نا!“

احمد خان نے فوراً کہا ”ہاں بھئی یہ ضرور آئیں گے۔“

پاپ - ۲

یوسف نے دوپہر کو دو گھنٹے گہری نیند سونے کے بعد اٹھ کر غسل کیا۔ اور عصر کی نماز کے بعد کار پر بیٹھتے ہوئے ڈرائیور کو اُس جگہ کی طرف چلنے کو کہا جہاں وہ دوپہر کے وقت محمد صدیق کو چھوڑ کر آیا تھا۔ کار کا مارن سنتے ہی ایک کم سن بچہ بھاگتی ہوئی باہر نکلی اور بڑی خود غمازی سے کار کے قریب پہنچ کر بولی۔

”آپ یوسف صاحب ہیں نا؟ اندر آجائیں۔ آپ ہی کا انتظار ہوا ہے۔“
سُرخ و سفید، بھورے بالوں اور بڑی بڑی آنکھوں والی یہ بچی دس سال سے کم عمر کی ہوگی لیکن اُس کی گفتگو سے ذہانت اور شعور کی پختگی مترشح تھی۔
”آپ ایس ڈی او صاحب کی بیٹی.....“

”جی وہ میری نانی کے خالہ ادبھائی ہیں“ لڑکی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے جواب دیا اور محمد صدیق صاحب؟ ”جی وہ رشتے میں میرے باموں ہیں۔ یعنی میرے نانا جی کے بھائی کے بیٹے۔“

اتنی دیر میں محمد صدیق باہر نکل آیا اور اُس نے یوسف سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا:

”مجھے معلوم تھا کہ اس باتونی لڑکی نے آپ کا راستہ روک رکھا ہوگا اور بھیڑیوں کا قصہ یہیں شروع کر دے گی۔“

بچہ نے غصے سے منہ پھیر لیا اور جب وہ منہ بسورتی ہوئی واپس جانے لگی تو یوسف نے جلدی سے آگے بڑھ کر اُس کا بازو پکڑ لیا: ”صدیق صاحب! غضب کرتے ہیں آپ بھی! آپ اس شہزادی کو باتونی لڑکی کہہ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ابھی تک آپ نے اسے غور سے نہیں دیکھا“ لڑکی نے رُک کر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ یوسف نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ”آپ کا نام کیا ہے؟“

”جی نسرین“ اُس نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔

”صرف نسرین نہیں جی بلکہ شہزادی نسرین، محمد صدیق صاحب! یوسف نے کہا: ”آپ اس کے متعلق جس قدر سوچیں گے اُسی قدر زیادہ آپ کو اس کے لیے شہزادی نسرین کا نام پسند آئے گا۔“

صدیق نے کہا: ”بھائی میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ جب اس کی نانی کو اس کے اس سے نام کا پتہ چلے گا تو اس کی عید ہو جائے گی۔ وہ ہمیں بھی بہت سی تحائف دیں گی۔ چلیے اب آپ کا اندر انتظار ہو رہا ہے۔“

جنگل کے ایک کمرے میں داخل ہوئے وہاں گھر کے چند افراد موجود تھے۔ ایس ڈی او نے اُٹھ کر یوسف سے مصافحہ کیا۔

ایک خاتون نے جس کے چہرے پر عمر ہونے کے باوجود غیر معمولی دلکشی تھی۔ یوسف سے کہا:

”بیٹا! تمہیں اللہ تعالیٰ عزت دے عمر دراز کرے، ترقی دے اور تمہارے والدین تمہاری خوشیاں دیکھیں۔ تم ہمارے لیے ایک فرشتہ رحمت بن کر کوئٹہ آئے ہو۔“

یوسف نے شرماتے ہوئے کہا: ”ماں جی! یہ شاید میری خوش قسمتی تھی کہ میں

ترغیب دیتی ہیں۔ میں وہاں اس لیے چلا گیا تھا کہ یہ پہاڑ زیادہ قریب تھا۔
 یوسف بولا: "میرا وہاں جانا محض اتفاق تھا۔ اگر کل شام اچانک اسلام آباد
 لاہور کے بعض دوست نہ مل جاتے تو میں آج گاڑی میں سفر کر رہا ہوتا۔ پروگرام ان کا
 تھا۔ میں ان کا ساتھ دینے پر تیار ہو گیا۔ جب میں پہاڑ کے دامن میں پہنچا تو وہاں
 نہیں پہنچے تھے۔ اب خدا جانے میرے میزبان کے دل میں کیا آئی تھی کہ وہ میرے
 ساتھ آگئے تھے اور ایک پستول، ایک بندوق اور ایک دُور بین بھی ساتھ
 لے لی تھی۔ اُس وقت یہ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ ساز و سامان آپ کے ماموں جان کو
 بھیڑیوں سے بچانے کے کام آئے گا؟"

محمد صدیق نے پوچھا: آپ کب جا رہے ہیں؟
 "جی! میں انشا اللہ کل چلا جاؤں گا۔"

ایس ڈی او محمد سعید نے معمر عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "آپا جان! آپ
 کا کام بن گیا۔ اللہ نے آپ کو قابل اعتماد ساتھی دے دیا ہے اور میری پریشانی
 دُور ہو گئی ہے کہ آپ کے ساتھ کس کو بھیجا جائے۔"
 "بھتی میں چھوٹی بچی نہیں۔ میں بہت سفر کر چکی ہوں۔ بہر حال یہ خوشی کی بات
 ہے کہ ایک بٹا میرے ساتھ ہو گا اور راستے میں میری شہزادی نسرین کو بھی خوش
 رکھے گا۔"

محمد سعید نے کچھ سوچ کر کہا:

"یوسف صاحب! کیا یہ بہتر نہ رہے گا کہ آپ کل کی بجائے پرسوں جائیں؟
 میں آپ کے ساتھ احمد خاں صاحب کے پاس جاؤں گا اور اُن سے درخواست کروں گا
 کہ کل دوپہر آپ اور وہ ہمارے ساتھ کھانا کھائیں اور پھر آپ کو ہمارے پاس
 ایک ڈوڈن رہنے کی اجازت دے دیں۔"

اُس وقت وہاں پہنچ گیا اور یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ سندھ کے ایک رئیس کو
 اچانک میری دیکھا دیکھی پہاڑ پر چڑھنے کا خیال آ گیا۔ بچوں کو ہر وقت بزرگوں کی
 دعاؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں یہاں اس لیے نہیں آیا کہ آپ میرا شکریہ ادا
 کریں۔ کیونکہ جب آپ میرے لیے دعا کریں گی تو میں شکریہ ادا نہیں کر سکوں گا۔
 میں یہی سمجھوں گا کہ ایک شفیق ماں کا یہی فرض ہے۔"

دروازے کی طرف سے ہلکے ہلکے قہقہے سنا دیے۔
 محمد صدیق نے کہا: "آپا جان! آپ کو مبارک ہو۔ مجھے خال نسرین کے لفظ سے الجھن
 سی محسوس ہوتی تھی۔ یوسف صاحب نے اسے دیکھتے ہی اس کا نام شہزادی
 نسرین رکھ دیا ہے اور میں حیران ہوں کہ ہم میں سے آج تک کسی کو یہ خیال
 کیوں نہیں آیا کہ نسرین بیٹی کا نام شہزادی نسرین ہونا چاہیے تھا؟"
 معمر عورت مسکراتی: "اچھے لوگوں کے منہ سے ہمیشہ اچھی باتیں ہی نکلتی ہیں۔"
 نسرین مجھے ہمیشہ ایک شہزادی معلوم ہوتی تھی لیکن میں دوسروں کے سامنے
 اسے شہزادی کہتے ہوئے جھجکتی رہی۔ میری تینوں بیٹیاں شہزادیاں ہی ہیں یعنی اس
 کی دوسری بہنیں بھی شہزادیاں ہیں۔ لیکن یہ میری بیٹی کوئی خاص شہزادی ہے۔"

نسرین کے ساتھ ایک معزز مہمان کا سالوک ہو رہا تھا اور وہ یوسف
 کے باتیں ہاتھ اپنی نانی اماں کے ساتھ بیٹھی خاموشی سے ان کی گفتگو سن رہی تھی۔
 ایس ڈی او کی جواں سال بیٹی نے یہ سوال پوچھا کہ یہاں سے کوہ مردار کی چوٹیاں
 دیکھ کر وحشت ہوتی ہے۔ میں حیران ہوں کہ آپ کو اور ماموں جان کو اُن تک
 پہنچنے کا شوق کیسے پیدا ہوا؟

صدیق میاں نے کہا: "بیٹی! اگر ہمت ہو تو بلنیاں، بھیس آگے بڑھنے کی

”یوسف صاحب! ایس ڈی اونے اس معمر خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یہ معمر خاتون بیگم فریدہ احمد ہیں اور نسوین، میرا مطلب ہے شہزادی نسوین، ان کی بہت لاڈلی بلکہ سارے خاندان کی لاڈلی ان کی سب سے چھوٹی نواسی ہے محمد سعید کی چھوٹی بیٹی بولی۔ آبا جی نسوین کہتی ہے کہ سب سے لاڈلی فہمیدہ ہے اور نانی جان جب جالندھر جائیں گی تو اسے شہزادی کہنا شروع کر دیں گی۔ مسز احمد بولی۔ ”نہیں بیٹی شہزادی ہمیشہ چھوٹی بیٹی ہوتی ہے“



چائے پینے کے بعد وہ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔

مغرب کی نماز کے بعد وہ پھر ایک گھنٹے تک بیٹھے رہے اور بعد میں یوسف نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اب مجھے اجازت دیجیے۔ خانصاحب میرا انتظار کر رہے ہونگے میں دوپہر کی دعوت کے متعلق ان سے کہہ دوں گا اور اگر وہ اس عرصے میں کسی اور کی دعوت قبول نہیں کر چکے ہوں گے، تو ضرور آئیں گے“

”میں خود کیوں نہ تمہارے ساتھ چلوں“

”نہیں! آپ کو تکلیف ہوگی، لیکن ٹھہریے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خانصاحب کی کار آرہی ہے“

— کار بنگلے کے قریب آکر رُکی! احمد خان کار کا دروازہ کھول کر

باہر نکلا۔ یوسف نے آگے بڑھ کر کہا:

”خان صاحب! السلام علیکم! مجھے افسوس ہے کہ آپ کو تکلیف اٹھانا پڑی“ ”بھائی! کوئی تکلیف نہیں ہوتی“ احمد خان نے کہا:

”تم کچھ عرصہ میرے پاس رہو تو میری بہت سی عادتیں بدل جائیں گی“

”خان صاحب! یہ ایس ڈی اور محمد سعید ہیں“

احمد خان نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا:

”اب آپ سب حضرات چلیں اور میرے ساتھ کھانا کھائیں“

محمد صدیق نے کہا۔ ”نہیں خان صاحب پھر سہی آپ جب بلائیں گے۔

ہم حاضر ہو جائیں گے۔ ویسے ہم یہ درخواست لے کر آپ کے پاس حاضر ہونے کے

متعلق سوچ رہے تھے کہ کل دوپہر آپ ہمارے ہاں کھانا تناول فرمائیں“

احمد خان بولا۔ ”اگر یوسف صاحب رُک جائیں تو مجھے آپ کے ساتھ کھانا

کھانے میں بہت خوشی ہوگی“

سعید بولا: ”جناب! یوسف کو ہم نے یہیں روک لیا ہے۔ کل شام وہ آپ

سے اجازت لے کر ہمارے پاس آجائیں گے اور پرسوں یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔

— انہیں ہم اس لیے زحمت دے رہے ہیں کہ وہ ہماری ایک قریبی رشتہ دار

کر رہے ہیں ان کے گھر پہنچائیں گے۔

احمد خان نے کہا۔ ”اگر آپ نے یوسف صاحب کو اس بات پر راضی کر لیا

ہے تو مجھے اس بات پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے“

محمد صدیق نے کہا۔ ”خان صاحب! یوسف صاحب کی رضامندی کا انحصار

آپ کی رضامندی پر ہے“

احمد خان نے کہا۔ ”بھئی! آپ یوسف صاحب کو دو چار دن اور نہیں

روک سکتے“

”خان صاحب! اگر یہ رُک جائیں تو ہمیں بڑی خوشی ہوگی اور اس بہانے

سے ہم اپنی آپا جان کو بھی روک سکیں گے“

احمد خان نے مسکراتے ہوئے سوال کیا: ”کیوں یوسف صاحب! آپ بلوچستان

کے دوسرے پہاڑ دیکھنا پسند نہیں کریں گے؟

یوسف: "خان صاحب! میں آپ کے ساتھ زیارت دیکھ چکا ہوں اور وہاں سے بابا خرواری جا کر میں نے جو دلکش مناظر دیکھے ہیں ان کے دیکھنے کے بعد میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ قدرت نے بلوچستان کے کوہساروں کے حقے کا بیشتر حسن خلیفت کے دامن میں بکھیر دیا ہے اور اب اگر موقع ملا تو میں یہاں صرف برف باری دیکھنے آؤں گا۔

لیکن خان صاحب! مجھے یقین ہے کہ اگر آپ نے ایک بار کانگرہ کے پہاڑ دیکھ لیے تو پھر آپ ہر سال وہاں جایا کریں گے۔"

احمد خاں بولا: انشاء اللہ! اگلے سال کانگرہ ضرور جاؤں گا۔ لیکن شرط یہی ہوگی کہ آپ میرے ساتھ چلیں۔

محمد صدیق نے کہا: خان صاحب! یوسف صاحب نے ٹھیک کہا ہے: کانگرہ بہت خوب صورت ہے اور وہاں حسبِ منشا شکار ہوتا ہے۔ جنگلی مرغیوں سے لے کر رچھ، چلتے اور شیر تک۔

احمد خاں نے کہا: "چلتے یوسف صاحب! امید ہے کہ آپ کو زحمت کرنے سے پہلے مجھے کئی سالوں کا پروگرام بنانا پڑے گا۔ ممکن ہے میں ستمبر کے شروع میں کانگرہ جانے کے لیے تیار ہو جاؤں۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ آپ مجھے خط لکھتے رہیں کیونکہ اگر کوئی ساتھی آوازیں دینے والا نہ ہو تو میں حرکت میں نہیں آیا کرتا۔"

یوسف نے کہا: "خان صاحب! میں آپ کو خط لکھتا رہوں گا۔ انشاء اللہ۔ اور آپ پروگرام بنا لیجئے گا۔"

یوسف، محمد صدیق اور محمد سعید سے مصافحہ کر کے احمد خاں کے ساتھ کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔

اور جب گاڑی سٹارٹ ہو رہی تھی تو محمد صدیق نے آگے بڑھ کر پوچھا:

"خان صاحب! آپ کل دوپہر کے کھانے پر خود ہی پہنچ جاتیں گے یا میں آپ کو لینے آؤں؟"

"بھئی! میں خود ہی آ جاؤں گا۔" احمد خاں نے کہا۔ "اور میرا خیال ہے کہ ہم وقت سے پہلے یہاں پہنچ جاتیں گے۔ پھر شام کو آپ میرے ہاں چائے پئیں گے اور اس کے بعد یوسف کو آپ کے ساتھ یہاں واپس پہنچا دیا جائے گا۔"



اُن کے جانے کے تھوڑی دیر بعد محمد سعید کے گھر میں چند خواتین اور لڑکیاں جمع ہو گئیں اور خاتون خانہ سے گلہ کرنے لگیں کہ آپ نے ہمیں کیوں نہیں بتایا کہ وہ بہادر لڑکا جس نے محمد صدیق کی جان بچائی ہے آپ کے پاس چائے کے لیے آیا ہے۔

"بھئی! وہ کل پھر آئے گا۔ چاہو تو اُسے اچھی طرح دیکھ لینا!"

محمد سعید کی بیٹیوں نے اپنی سہیلیوں کو یہ بتا دیا تھا کہ اُس نے نسرين کو دیکھتے ہی اس کا نام شہزادی نسرين رکھ دیا تھا اور وہ سب اس کی طرف غور سے دیکھ رہی تھیں۔ ایک لڑکی نے سعید کی بیوی سے کہا: "چچی جان! آپ اُس سے ضرور پوچھیں کہ شہزادی کیا ہوتی ہے؟"

"واہ بھئی! اُس کیوں پوچھوں۔ مجھے معلوم ہے کہ شہزادی کیا ہوتی ہے؟ دوسری لڑکی نے نسرين سے مخاطب ہو کر کہا۔

اچھا شہزادی نسرين صاحبہ — آپ ہی یہ بتادیں کہ شہزادی کیسے

ہوتی ہے؟

"مجھے کیا معلوم وہ کیا ہوتی ہے۔ کل یوسف بھائی جان سے پوچھ کر بتاؤں گی۔"

باب - ۳

اگلے روز محمد حمید کے ہاں یوسف اور احمد خاں دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ ان کے علاوہ چند اور مہمان بھی تھے۔ ایک عبدالحمید ای، لے، سی انتہائی بااثر پٹھانوں کے سردار گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ دوسرا ایک صحافی تھا اور تیسرا کالج کا پروفیسر تھا۔ کوہ مردار کے بھیڑیوں کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی اور یوسف کو مختلف سوالات کے جواب میں ساری داستان ایک بار پھر سنانی پڑی۔ تیمور علی خان نے کہا: ”میں نے مقامی لوگوں سے سنا ہے کہ کوہ مردار پر انتہائی خوفناک بلائیں رہتی ہیں لیکن میں سوچتا ہوں کہ ایسی ویران جگہوں پر کوئی بلا بھوکے بھیڑیوں سے زیادہ خوفناک نہیں ہو سکتی۔“ پروفیسر نے کہا: ”یہ ایک قابل فخر کارنامہ ہے لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کا پہلے بھی کبھی کسی درندے سے سابقہ پڑا ہے؟“

یوسف نے جواب دیا: ”جناب میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا تو مجھے ایک ناقابل یقین واقعہ پیش آیا۔ ہمارے علاقے میں گنا بہت زیادہ ہوتا ہے اور ہمارے ایک کھیت میں ایک نئی قسم کا گنا جو چوسنے میں بہت نرم ہوتا ہے کاشت کیا گیا تھا۔ اس کھیت سے پہلے دو اور کھیت راستے میں آتے تھے۔ ہمیں ہاں پہنچنے کے لیے ایک کھائی میں سے گزرنا پڑتا تھا اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہوتا تھا جب کھائی خشک ہوتی تھی۔ ایک شام میں گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ ہائی کھیلنے کھیلنے گئوں کے لیے اس کھیت کی طرف چل دیا۔ نصف فاصلہ طے کرنے کے بعد

میں نے اچانک دیکھا کہ میرا چھوٹا بھائی میرے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔ شام ہو رہی تھی اور میرا خیال تھا کہ میں چند گنے توڑ کر واپس بھاگ آؤں گا۔ اب چھوٹے بھائی کے آجانے سے مجھے پریشانی ہو گئی وہ مجھ سے چھ سال چھوٹا تھا اور دوسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں کما د کے کھیتوں کے درمیان تھوڑی جگہ خالی تھی میں نے چھوٹے بھائی کو واپس کھڑا کیا۔ جلدی جلدی چند گنے توڑے اور خالی جگہ آکر ان کے چھکے اتارنے لگا۔ اچانک مجھے آہٹ سنائی دی۔ دو کھیتوں کے درمیان ایک پتلی سی منڈیر حصار کا کام دے رہی تھی اور خالی جگہ سے چند فٹ آگے دونوں طرف سے کما د کے گرے ہوئے خشک پتوں میں چھپ گئی تھی اور ان پتوں پر کسی جانور کے چلنے سے دھیمی دھیمی کھڑکھڑاہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ شاید یہ میری چھٹی جس تھی کہ میں نے اپنے چھوٹے بھائی کو بازو سے پکڑ کر اپنے پیچھے کھڑا کر لیا۔ جوں جوں آہٹ قریب آ رہی تھی میرے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی پھر نیچے لٹکے ہوئے سوکھے پتوں سے اُس کا سر نمودار ہوا۔ ہمارے درمیان زیادہ سے زیادہ پندرہ فٹ کا فاصلہ ہو گا۔ میں اپنی جگہ پر کھڑا مبہوت ہو کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ یوسف یہاں تک کہہ کر رہا: ”پروفیسر اور دوسرے لوگوں نے ایک زبان ہو کر پوچھا: ”بھئی وہ کیا تھا؟“ یوسف نے اطمینان سے جواب دیا: ”میں یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ کیا تھا۔ واپس شام کا دھند لگا چھا ہوا تھا۔ میں آپ کو یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ وہ مجھے کتنی دیر دیکھتا رہا! اُس کی آنکھیں یقیناً ایک درندے کی آنکھیں تھیں۔ اُس کا قد کتے سے یقیناً بڑا تھا۔ اُس نے اچانک منہ موڑ لیا اور جس طرح آیا تھا اُسی طرح قدم اٹھاتا ہوا غائب ہو گیا۔“

دروازے کی اوٹ سے عورتوں کی کھسکھس کی آوازیں آنے لگیں۔ ای اے بی نے سوال کیا: ”عجب وہ مڑا تھا۔ آپ یہ نہیں دیکھ سکے کہ وہ کیا تھا؟“

”اگلے دن اُس جگہ سے کوئی سو قدم دُور ایک کتے کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ جس کا کچھ حصہ اُسے ہلاک کرنے والا درندہ ہڑپ کر چکا تھا۔

ہمارے علاقے کی یہ حالت تھی کہ ایک گاؤں کے کما دے کھیت دوسرے گاؤں سے مل جاتے تھے۔ کہیں راستے میں کوئی نہریا ٹرک آتی تھی تو اس سے آگے پھر گئے کے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ اس لیے کسی درندے کا پہاڑی علاقے سے نکل کر اس طرف آجانا ناممکن نہیں تھا۔“

پروفیسر نے کہا: ”دیکھتے برخوردار! اگر آپ یہ بتا سکیں کہ جب آپ نے قدموں کی آہٹ سنی تھی اور پھر جب آپ نے درندے کے چرے کا کچھ دیکھا تھا تو آپ کی ذہنی کیفیت کیا تھی؟“

یوسف نے جواب دیا: ”مجھے معلوم نہیں کہ میری ذہنی کیفیت کیا تھی؟“
”بہر حال آپ ایسی باتیں کہہ سکتے ہیں کہ خوف سے آپ کے ذہنی قویٰ شل ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود آپ اچانک اس قدر سنبھل گئے تھے کہ آپ کو اپنی جان سے زیادہ اپنے بھائی کی جان کا خوف تھا۔ اور پیچھے رہ کر آپ اس کے لیے ڈھال بننا چاہتے تھے۔“

یوسف نے جواب دیا: ”پروفیسر صاحب میرے قویٰ شل نہیں ہوئے تھے اگر میں ڈرے میں کوئی فائدہ دیکھتا تو یقیناً ڈرتا لیکن میں اس عمر میں بھی حقیقت پسند تھا۔“ پروفیسر نے کہا: ”آپ کا ذل تو دھڑکتا ہو گا؟“

یوسف نے جواب دیا: ”جناب اُس وقت دل کی دھڑکن سننے کی فرصت نہ تھی“ اور وہ سب منہس پڑے۔

احمد خان نے کہا: ”یوسف عام لوگوں سے بہت مختلف ہے اگر کوئی مجھے یہ کہے کہ یہ غار میں سستانے والی شیرنی کا بچہ اٹھا لایا ہے تو میں یقین کر لوں گا۔“

”جناب! میں اُسے اس لیے بھی اچھی طرح نہ دیکھ سکا کہ اُس کا رنگ کما دے خشک پتوں سے ملتا جلتا تھا۔ میں صرف اُس کی چمکدار آنکھیں دیکھ سکا تھا اس کے علاوہ میں صرف یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اُس کی دم کافی لمبی تھی۔ اس کے بعد میں نے اپنی ہاکی اٹھائی۔ اور چھوٹے بھائی سے کہا بھاگو۔“

وہ شاید یہ سمجھ گیا تھا کہ کوئی خاص بات ہو رہی ہے۔ وہ بھاگا اور چند سیکنڈ کے بعد میں بھی اُس سے جا ملا اور جب ہمارے درمیان کچھ فاصلہ ہو گیا۔۔۔۔۔ تو میں بھی بھاگ کر اُس سے جا ملا۔ اب ہم کھیتوں سے باہر آچکے تھے۔“

پروفیسر نے پوچھا: ”آپ رک کیوں جاتے تھے جناب؟“
”پروفیسر صاحب! درندے سے زیادہ مجھ پر اس بات کا خوف سوار تھا۔“

کہ اگر درندے نے حملہ کر دیا تو میرا بھائی دوڑ میں پیچھے رہ جائے گا۔ اسی لیے میں اس کے پیچھے رہنا چاہتا تھا۔“

ای اے سی نے پوچھا: ”بھائی! پھر آپ کو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کون سا جانور تھا۔“

”جناب! اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید گاؤں کے لوگ اس کا مذاق اڑاتے، لیکن یہ باتیں میں نے وہاں کہی تھیں اور کسی نے میرا مذاق نہیں اڑایا میرے والد اتفاق سے گھر آئے ہوئے تھے۔ میں نے انھیں بتایا تو انہیں بھی یہ یقین ہو گیا تھا کہ میں نے کوئی خطرناک درندہ ضرور دیکھا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ شیر کا یہاں تک پہنچنا ناممکن نہیں تھا۔ وہ لگڑ لگڑ بھی ہو سکتا تھا۔“

گاؤں کے پندرہ بیس جوان لاٹھیاں اٹھا کر تیار ہو گئے اور انہوں نے آبا جان سے درخواست کی کہ آپ بندوق لے کر ہمارے ساتھ چلیں لیکن انہوں نے سمجھایا کہ رات کے وقت کسی درندے کے پیچھے جانا خطرناک ہو سکتا ہے۔

محمد صدیق نے کہا: ”خان صاحب! یوسف صاحب کے متعلق ایسی باتوں پر مجھے بھی یقین آجاتے گا۔“

پروفیسر نے کہا: ”یوسف صاحب! مجھے درندوں کا کوئی تجربہ نہیں، لیکن آپ شاید اس کی معقول وجہ بیان کر سکیں کہ ایک زندہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آپ کے قریب آیا اور آپ پر حملہ کیے بغیر واپس چلا گیا۔“

یوسف نے جواب دیا: ”پروفیسر صاحب! شاید وہ اپنا شکار چھوڑ کر آیا تھا اور اسے نئے شکار کی ضرورت نہیں تھی۔ درندہ اپنی بھوک مٹانے کے لیے شکار کرتا ہے جب بھوک ختم ہو جاتی ہے تو وہ امن پسند بن جاتا ہے۔“

صحافی نے کہا: ”اس کا مطلب یہ ہے جب بھوک مٹ جاتی ہے تو درندے بھی عدم تشدد کے اصول پر کاربند ہو جاتے ہیں۔“

یوسف نے کہا: ”نہیں جی درندے پر پیٹ بھرتے ہی غنودگی طاری ہونے لگتی ہے اور وہ کہیں چھپ کر سو جاتا ہے۔ انسان عیاں عدم تشدد کے فلسفے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔“

انہسا ان سیاست دانوں کا کھیل ہے جو طاقت ور کے پاؤں پر گرتے ہیں اور کمزور کا گلہ گھونٹتے ہیں۔

عدم تشدد کا واحد مقصد مسلمانوں کو لوریاں دے کر سلانا ہے اور ہندوؤں کو خون کی ندیاں بہانے کے لیے تیار ہونے کے مواقع فراہم کرنا ہے۔“

پروفیسر مسکرایا: ”یعنی آپ کے خیال میں عدم تشدد ایک ڈھونگ ہے۔“

یوسف نے جواب دیا: ”جناب! میری ترجمانی کے لیے آپ اس سے بھی زیادہ سخت الفاظ استعمال کر سکتے ہیں۔“

سب لوگ یوسف کی طرف دیکھ رہے تھے اور وہ نہایت اطمینان سے

بول رہا تھا:

”آج تک کانگریس کا ایک ہی مطالبہ رہا ہے۔ وہ یہ نہیں ہے کہ انگریز یہاں سے نکل جائیں، بلکہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کی صورت میں وہ کانگریس کو ملک کی واحد نمائندہ جماعت مان لیں اور مسلم لیگ کو جسے مسلمانوں کی عظیم اکثریت اپنی واحد نمائندہ جماعت سمجھتی ہے۔ نظر انداز کر دیں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جب اچھوتوں کے علیحدہ ہو جانے کا خطرہ پیدا ہوا تھا تو گاندھی جی نے مرن برت کی دھمکی سے انہیں بے دست و پا کر دیا تھا۔“

جناب پروفیسر صاحب! ہماری تاریخ کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ ہم سو رہے ہیں اور گاندھی اور نہرو کے اعصاب پر یہ خوف سوار ہے کہ یہ مسلمان جنہوں نے ایک ہزار برس اس برصغیر پر حکومت کی ہے۔ انگریز کے جاتے ہی کہیں ایک بار پھر ملک کا اقتدار نہ سنبھال لیں اور دراصل یہی عدم تشدد کا فلسفہ ایک ایسے عفریت کے چہرے کا نقاب ہے، جو آگے چل کر ظلم و وحشت اور خفاکی کی تاریخ میں یقیناً ایک نئے باب کا اضافہ کرے گا۔“

پھر اس نے اپنا رخ بدلا اور صحافی سے مخاطب ہو کر پوچھا:

”جناب! گستاخی معاف میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟“

صحافی نے جواب دیا: ”بھائی میری ملازمت کراچی میں ہے لیکن میرا گھر احمد آباد میں ہے۔“

”معاف کیجیے! اگر یہ بات ہے تو پھر آپ کو اپنے خیالات پر بہت جلد نظر ثانی کرنا ہوگی۔ مسلمان اس وقت آتش فشاں پہاڑ کے دھانے پر کھڑے ہیں اور اگر آج ان میں سے کوئی قائد اعظم کی زبان نہیں سمجھتا تو اگر وہ بدزیت نہیں تو

بیوقوف ضرور ہے۔ کانگریسی ذہن کا یہ صحافی شکست خوردہ نگاہوں سے یوسف کی طرف دیکھ رہا تھا۔

تیمور خان نے کہا۔ ”آپ نے یہاں رہ کر بلوچستان کے حالات کا تھوڑا بہت تجزیہ کیا ہوگا۔ میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا بلوچستان میں تحریک پاکستان کی رفتار سے آپ مطمئن ہیں؟ یوسف نے جواب دیا۔

”خان صاحب کو کچھ معززین ملنے کے لیے آتے رہتے ہیں اور میں ان کی گفتگو سنتا رہا ہوں۔ اس کے علاوہ میں نے اپنے طور پر عام لوگوں سے بھی گفتگو کی ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بلوچستان میں تحریک پاکستان کا کام صحیح خطوط پر شروع نہیں ہوا۔ یہاں ایک قبائلی نظم ہے اور بلوچستان میں وہی سیاست کا سیلاب ہوگی جسے قبائل کے سربراہوں کی حمایت حاصل ہوگی۔ اگر بیچاس یا پچپن قبائل کے سرداروں کو پاکستان کا حامی بنالیا جائے تو یہاں پر پاکستان کی جنگ جیتی جاسکتی ہے۔ قبائل کے عوام ہر قیمت پر اپنے سرداروں کا ساتھ دیں گے۔ یہاں قبائلی عصبیت کی یہ حالت ہے کہ کوئی لیڈر خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ دوسرے قبیلے کے ایک عام آدمی کو بھی اپنے پیچھے نہیں لگا سکتا۔ یہاں جب شاہی جبر کے ارکان ایک قطار میں کھڑے ہو جائیں گے تو یہ سمجھ لیجئے کہ پورا بلوچستان ان کے پیچھے کھڑا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ کو پورے بلوچستان میں زیادہ سے زیادہ ایسے بیچاس ساٹھ معززین سے رابطہ قائم کرنا پڑے گا جو سردار گھرانے سے تعلق رکھتے ہوں اور اپنے سردار پر اثر انداز ہو سکتے ہوں“

تیمور خان نے کہا: ”بھائی واللہ! آپ میرے دل کی بات کہہ رہے ہیں“ میں چند آدمیوں کا ایک وفد بناؤں گا اور پھر ہم ہر با اثر آدمی کے پاس جائیں گے۔ خواہ مجھے اس مقصد کے لیے ملازمت ہی کیوں نہ چھوڑنی پڑے“

یوسف! کہہ کر وہ پھر اس کی طرف دیکھنے لگا: اگر آپ اپنے مستقبل کے متعلق کوئی اور فیصلہ نہیں کر چکے تو میں آپ کو یہاں آنے کی دعوت دیتا ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ اگر آپ کو اپنے حالات آزادی سے تحریک پاکستان کے لیے کام کرنے کی اجازت دے سکیں اور کسی دشواری کی وجہ سے آپ نے اپنی زندگی کا کوئی خاص پروگرام نہ بنا رکھا ہو تو میں آپ کو یہاں آکر کام کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ یہاں ایسے لوگ ہیں جو آپ کے راستے میں اقتصادی مشکلات حائل نہیں ہونے دیں گے“

یوسف نے چند ثانیے سوچنے کے بعد جواب دیا: ”جناب! میرے سامنے اہم ترین مقصد یہی ہے کہ میں حصول پاکستان کی جدوجہد میں ان لوگوں کا ساتھ دوں جو اسے مسلمانوں کی موت و حیات کا مسئلہ سمجھتے ہیں اور اس معرکے میں میرا سب سے بڑا ہتھیار میرا قلم ہے! اپنے متعلق میں اب تک صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں اپنی قوم کے جوانوں کو ان کے ماضی کی ولولہ انگیز روح پرور اور سبقتی آموز داستانیں سنانے کے لیے پیدا ہوا ہوں۔ میں تاریخ کا طالب علم ہوں اور ماضی کی تاریخ میرے لیے ایک آئینہ ہے جس کی بدولت مستقبل کے خدوخال سنوارے جا سکتے ہیں۔ میں اپنے دل میں وہ تڑپ رکھتا ہوں جو مجھے ہمیشہ بے چین اور بے قرار رکھتی ہے اور اسی بے چینی اور بے قراری کے باعث میرے دماغ میں ان گنت داستانیں جنم لیتی ہیں۔ کبھی کبھی میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی دلچسپ داستانیں پہلے کبھی نہیں لکھی گئیں۔ میری قوم کی موجودہ اور آئندہ نسلیں انہیں بہت پسند کریں گی اور متاثر ہوں گی اور ان میں سے کئی پاکستان کے نقیب اور معمار بن جائیں گے۔ خان صاحب! علامہ اقبال، قائد اعظم اور نواب بہادر یار جنگ کا پاکستان وہ خطہ زمین ہوگا جہاں ہم اپنے ناقابل شکست قومی حصار تعمیر کریں گے اور میں اپنے قلم سے اس ناقابل شکست ذہنی اخلاقی اور روحانی حصار کے نقشے تیار کروں گا۔ آپ

جانتے ہوں تو میں یہ بتا سکتا ہوں کہ گزشتہ دو تین صدیوں سے ادب میں ناول نگاری ہی ایک مقبول ترین صنف ہے اور میں ایسے بیسیوں ناول نگاروں کے نام لے سکتا ہوں جنہوں نے مقبولیت بھی حاصل کی اور جن کی آمدنی بھی بے حد و حساب ہوتی تھی۔ جن کی زندگی میں ہی ان کی تصانیف کے بے شمار ایڈیشن شائع ہو گئے اور دنیا کی متعدد زبانوں میں ان کے تراجم بھی شائع ہو گئے تھے۔ لیکن میرے متعلق کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ میرے دل میں ان کی وجہ سے یا ان کو سامنے رکھ کر اپنا حساب کتاب جوڑنے سے یہ شوق پیدا ہوا ہے۔ میرے لیے ناول نگاری اس قومی ابتلاء کے زمانے میں واحد محاذ ہے جہاں میں اپنی ذمہ داریاں بطریق احسن ادا کر سکتا ہوں۔ میرے نزدیک اہمیت اس مقصد کی ہے جس کے لیے میں لکھنا چاہتا ہوں۔ یہ مسئلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا کبھی روٹی کتنی ملے گی۔

جس بھنور میں میں اپنی قوم کو دیکھ رہا ہوں۔ اس سے نکالنے کے لیے مجھے اگر بھوکا بھی رہنا پڑے اور میرا مقصد پورا ہو جائے تو یہ سودا ہنگامہ نہیں۔ جب قوم کو اپنی بقا کے خطرات درپیش ہوں تو میں اپنے شاندار کیریئر کے متعلق نہیں سوچ سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ ناول کے متعلق سوچتے ہوئے میں اپنے اندر ایک خود اعتمادی پاتا ہوں۔ شاید آپ کے دل میں یہ خیال آتے کہ میں اپنے خدشات دور کرنے کے لیے یہ باتیں کر رہا ہوں۔

نہیں یہ بات نہیں ہے مجھے یقین ہے کہ اللہ نے مجھے اگر کوئی صلاحیت دی ہے تو اس کا صحیح استعمال کرنے کے بعد میری روزی اسی کے ذمہ ہے زیادہ یا کم ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرے لیے حصول وطن راجش جمع کرنے سے بہت اہم ہے۔

کو میری یہ بات سن کر یقیناً حیرت ہوگی لیکن مجھے یقین ہے کہ جب میری داستانوں پر ناول کا لفظ چسپاں ہوگا اور جب ناول پڑھے جائیں گے تو کسی کو میری ماعنی حالت پر شک نہیں ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی نظر میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو آپ کی ماعنی حالت پر شک کرتے ہیں؟ صحافی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”جی ہاں۔ ایسے لوگ ہیں اور میں انہیں بڑی جلدی پہچان لیتا ہوں۔ اس وقت آپ کا چہرہ یہ بتا رہا ہے کہ آپ ایک نیم یافتہ آدمی ہونے کے باوجود ان میں سے ایک ہیں۔“

پروفیسر نے کہا: ”دیکھتے یوسف صاحب! یہاں آپ کا کوئی دشمن نہیں آپ ایک تعلیم یافتہ اور صحت مند انسان ہیں اور کوئی آپ کو مستقبل کے متعلق سہانے خواب دیکھنے سے نہیں روک سکتا۔ تاہم ہمیں اس بات سے دلچسپی ضرور ہے کہ اس دنیا میں رہنے کے لیے اور اس دنیا میں زندگی کی ضروریات پورا کرنے کے لیے آپ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ پیدائشی طور پر ایک خوشحال آدمی ہیں اور آپ کے گھر میں وہ سب کچھ ہے جسے آرام کی زندگی کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے تو آپ کو یا آپ کے کسی خیر خواہ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں لیکن اگر ایسی بات نہیں تو پھر آپ سے یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ اپنی روزی کے لیے کیا کام کریں گے۔“

یوسف نے جواب دیا: ”دیکھتے صاحب! میرے دل میں ایسے ناول لکھنے کا ہرگز ارادہ نہیں جو مجھے عزت کی روٹی بھی نہ دے سکیں۔ میں نے آنکھیں بند کر کے نہیں کھلی آنکھوں سے اپنے لیے یہ راستہ تلاش کیا ہے۔ ویسے آپ میں سے اگر کوئی صاحب دنیا کے بڑے بڑے ناول نگاروں کے متعلق کچھ

وہ سب خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ احمد خان نے اس کے کندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ”دیکھو بھتی یوسف! اگر تم وہی ہو جو تم اپنے آپ کو سمجھتے ہو تو یقین مانو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے وہ تمہیں کبھی بھی یوسف نہیں ہونے دے گا۔“

میمور خان نے کہا: ”یار! میں تو تمہاری گفتگو کے دوران یہ محسوس کر رہا تھا کہ پاکستان کی عمارت تعمیر ہو رہی ہے اور اس کے اہمیت معمار جب تھک جاتے ہیں تو تمہاری کتاب اٹھا کر چند صفحات پڑھنے کے بعد تازہ دم ہو کر پھر کام بہر لگ جاتے ہیں اور یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ اپنی قوم کے لئے ایسا ادب پیدا کرنے والا بھوکا بھی رہ سکتا ہے۔ میرے بھائی! میں ہر نماز کے بعد آپ کے لئے دعا کروں گا۔“

احمد خان صاحب نے کہا: ”یار! ایک بات عجیب ہے۔ صرف چند دن قبل یوسف صاحب سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو مجھے وہ بہت چھوٹے نظر آئے۔ پھر بھیڑیوں کا واقعہ پیش آیا تو مجھے یہ افسوس ہوا کہ یہ اپنے قد و قامت اور عمر میں بڑے ہو گئے ہیں اور آج میں یوسف صاحب کے چہرے پر بزرگی کے آثار دیکھ رہا ہوں۔ میرے بھائی! اللہ تمہیں ہمت دے تم کوئی ایسی چیز ہو جسے میں نہیں سمجھ سکتا۔ آج سے میں یہ دعا کیا کروں گا کہ تمہارا ہر خواب پورا ہو۔“

اور پھر وہ سعید کی طرف مخاطب ہوا: ”سعید صاحب! مجھے اچھا کھانا کھانے کے بعد فوراً نیند آ جاتا ہے۔ اور آپ کا کھانا بہت ہی اچھا تھا! اس لئے میں اجازت چاہتا ہوں۔ آپ چائے پر ضرور آئیں۔ یوسف صاحب اگر رُکنا چاہتے ہوں تو رُک جائیں۔ وہ آپ کے ساتھ آجائیں گے۔“

یوسف بولا: ”نہیں خان صاحب! میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔ مجھے

بھی نیند آرہی ہے۔“

تھوڑی دیر بعد یوسف احمد خاں کے ساتھ کار پر اس کی قیام گاہ کی طرف جا رہا تھا۔

باب - ۴

اگلی شام یوسف محمد سعید کا مہمان تھا۔ مغرب کی نماز کے بعد وہ سیر کے ارادے سے باہر نکلا تو نسرین بھاگتی ہوئی اُس کے قریب آگئی۔

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ اُس نے پوچھا۔

یوسف نے کہا: ”شہزادی صاحبہ! میں تو سیر کے لیے جا رہا ہوں۔“

آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔ شہزادیوں کے لیے سیر بہت ضروری ہوتی ہے۔ اس طرح اُس نے اپنا ہاتھ نسرین کی طرف بڑھا دیا۔

اور وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ساتھ چل پڑی۔ تھوڑی دور جا کر اُس نے پوچھا

بھائی جان شہزادی کیا ہوتی ہے؟

یوسف نے غور سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”شہزادی وہ ہوتی ہے جس کے بال سنہری ہوں۔ بڑی بڑی آنکھیں تاروں کی طرح چمکتی ہوں۔ پیشانی کشادہ ہو۔ کوئی آواز دے تو بے پردائی سے منہ پھیر لے۔ کوئی ہنس پڑے تو وہ تلملا کر جلا دے گے؛

جلاد! اس گستاخ کی گردن مار دو اور جے سب پیار کرتے ہوں لیکن اُسے کسی کی پروا نہ ہو۔“

نسرین نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور پیچھے مہٹ کر بولی۔

”واہ جی! آپ کا مطلب ہے کہ شہزادی بڑی اُلو ہوتی ہے۔“

ایک دم اُلو! اور بدتمیز اور بے وقوف بھی!

یوسف ہنس پڑا۔ ”نہیں نسرین! میں مذاق کر رہا تھا۔ مجھے یہ کہنا چاہیے تھا کہ شہزادی بالکل نسرین جیسی ہوتی ہے۔ اسی لیے تو میں نے تمہیں دیکھتے ہی شہزادی نسرین کہا تھا۔“

”اور آپ نے مجھ میں کون سی بے وقوفی کی بات دیکھی تھی؟“

”یہ کس نے کہا ہے کہ شہزادی نسرین بے وقوف ہے۔“

”آپ کا مطلب تو یہی تھا!“

”بالکل نہیں!“

”میں تو صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ شہزادی کبھی کبھی چھوٹی سی بات پر روٹھ جاتا کرتی ہے۔“

”آپ سے کب روٹھی تھی میں؟“

”اتنی جلدی آپ کیسے روٹھ سکتی ہیں؟“

”میں بہت دیر کے بعد بھی آپ سے نہیں روٹھوں گی۔“

یوسف نے کہا۔ ”نہیں! آپ کو یہ کہنا چاہیے کہ آپ کبھی کبھی روٹھا کریں گی! شہزادیاں اگر روٹھنا بھول جاتیں تو وہ شہزادیاں نہیں رہتیں اور میں ننھی نسرین کو ہمیشہ ایک شہزادی دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”نانی جان کہتی تھیں کہ کسی اور نے مجھے شہزادی نہیں کہا۔“

یوسف بولا: ”شہزادی کو پہچاننے کے لیے عقل کی ضرورت ہے۔ ایک بے وقوف آدمی شیشے کے ٹکڑے اور ہیرے میں امتیاز نہیں کر سکتا۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ آپ کے سوا سب بے وقوف ہیں۔“

گئی اور نئے واقعات پیش آتے اور نئے کردار شامل کرنے سے یہ کہانی پھیل کر ایک ناول بن گئی۔“

”بھائی جان! آپ ٹھیک کہتے ہیں، لیکن میں کچھ نہیں سمجھی!“
وہ دونوں گھر پہنچے تو صحن میں محمد سعید کی بیوی اور بیٹیاں اور نانی کرسیوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر نسرین کی نانی نے آواز دی:
”بیٹا! ادھر ہی آکر بیٹھ جاؤ۔ میں تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں!
پھر وہ ادھر ادھر دیکھ کر بولی:

”بیٹی! اپنے بھائی کے لیے ایک کرسی میرے پاس رکھ دو۔
یوسف آہستہ سے السلام علیکم کہہ کر بیگم احمد کے پاس بیٹھ گیا تو اُس نے کہا:
”بیٹا! ابھی احمد خان صاحب جو تمہارے میزبان تھے، آتے تھے اور ایک لفافہ دے گئے ہیں۔ وہ یہ کہتے تھے کہ وہ تمہیں گاڑی پر رخصت کرنے آئیں گے
لیکن ہم نے انہیں یہ کہہ دیا تھا کہ ہم نے ابھی سفر کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔ اب ہم
کل کی بجائے پرسوں جائیں گے۔“

بات یہ تھی کہ جب تم دوپہر کے کھانے کے بعد اپنے میزبان کے ساتھ
گئے تھے تو اساء اس کی بہن اور پڑوس میں اُس کی چند سہیلیوں نے ایک ہنگامہ کھڑا
کر دیا تھا۔ ہم نے اس شرط پر ایک پڑوسی کی طرف سے دوپہر کا کھانا کھانے کی دعوت
قبول کی تھی۔ کہ آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہو“
یوسف نے کہا: ”ماں جی! اگر آپ نے کسی کی دعوت قبول کی ہے تو مجھے
کیا اعتراض ہو سکتا ہے“

”نہیں! میرا مطلب یہ نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ کسی نے آپ
کو غور سے دیکھا ہی نہیں۔“

”نانی جان بھی سب سے یہی کہتی ہیں کہ میری بیٹی کو غور سے دیکھو!“
”وہ ٹھیک کہتی ہیں۔ اب ہمیں باتیں کرنے کی بجائے ذرا تیز تیز چلنا چاہیے!
خاموشی سے تیز چلنا بھی شہزادیوں کے لیے بہت ضروری ہے۔“
یوسف لمبے لمبے قدم تیزی سے اٹھا رہا تھا اور نسرین اُس کے ساتھ
بھاگ رہی تھی۔ ایک فرلانگ چلنے کے بعد وہ رُک گئی۔ یوسف نے مڑ کر دیکھتے
ہوئے کہا۔

”کیا بات ہے شہزادی؟“

نسرین بولی: ”میں نہیں بنتی شہزادی، اب واپس چلیں۔“
یوسف واپس چل دیا۔ اور نسرین نے پھر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
یوسف بولا: ”اب اگر شہزادی صاحبہ چاہیں تو بہت آہستہ چل سکتی ہیں
اور باتیں بھی کر سکتی ہیں۔“

”بھائی جان! نسرین نے کچھ دیر سوچنے کے بعد پوچھا:
”یہ ناول کیا ہوتا ہے؟“

یوسف نے جواب دیا: ”اس کا اصل مفہوم تو تم اس وقت سمجھ سکو گی جب
بڑی ہو جاؤ گی اور چند اچھے ناول پڑھ لو گی۔ اس وقت میں صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ
ناول ایک طرح کی کہانی ہوتی ہے جس میں کئی پہلوؤں سے زندگی کی تصویریں دکھائی
جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہانی تھی کہ دو آدمی جن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہ تھا
مختلف سمتوں سے کوہِ مردار کی چوٹی پر جا رہے تھے۔ پھر راستے میں بھیڑیے آ گئے
اور وہ ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔ پھر ان کی دوستی چند خاندانوں تک پہنچ

ضرورت نہ ہو تو بھی یہ پیسے اپنے پاس رکھ لینا۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ تمہارے ہاتھ سے یہ چند روپے کسی بہتر جگہ خرچ ہوں گے۔ میں ریلوے سٹیشن پر تم سے ملوں گا، لیکن اس سے پہلے مجھے یہ اطمینان ہونا چاہیے کہ ان پیسوں کے متعلق کوئی بات نہیں ہوگی۔ اور مجھے شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا۔

تمہارا بھائی احمد خان

رات کھانا کھانے کے بعد یوسف نے عشاء کی نماز ادا کی اور اس کے بعد اپنے ہیڈ بیگ سے بڑے سائز کی ایک نوٹ بک نکالی اور میز کے سامنے بیٹھ کر لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ گھر کے باقی افراد سوچکے تھے۔

نسرین اور اسماء دبے پاؤں اس کے کمرے میں داخل ہوئیں اور اسے منہمک دیکھ کر کچھ دیر روانے کے پاس کھڑی رہیں پھر وہ واپس جانے لگیں تو اس نے اچانک دیکھ کر کہا۔

”ارے! شہزادی نسرین تم جاگ رہی ہو؟“

”آپ اسماء کا خیال تھا کہ آپ ہمیں کوئی بہت اچھی کہانی سنائیں گے لیکن آپ مصروف ہیں۔“

یوسف مسکرایا: ”اس وقت کچھ لکھ رہا ہوں اس کے متعلق اس وقت میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ جب بڑی ہو کر تم پڑھو گی تو تمہیں پسند آئے گا۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصہ بعد یہ میرے کسی ناول کا اہم حصہ بن جائے۔ لیکن یہ ہے بہت اہم۔ اب تم کو اس کی رکھوالی کرنی پڑے گی اور اس کے بعد سفر کے دوران اس کی حفاظت کی ذمہ داری میں شہزادی نسرین کو سونپتا ہوں۔ لیکن ابھی کسی کو پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ اب تم دونوں یہ وعدہ کرو کہ کسی سے اس کا پی کا ذکر نہیں کرو گی اور نہ ہی

”بیٹا! شہزادی نسرین کو ہم سب نے منع کیا تھا اور اسے اس بات کا احساس دلایا تھا کہ اگر اس کے منہ سے کوئی بات نکل گئی تو آپ کسی صورت میں یہاں نہیں رکیں گے۔ اور بیٹا خان صاحب نے یہ بھی کہا تھا کہ تمہاری کچھ چیزیں تمہیں ریل گاڑی پر پہنچا دی جائیں اور یہ بھی تاکید کی تھی کہ تم اپنا ٹکٹ نہ لو۔“

یوسف نے کہا ”ماں جی! یہ ان کی بہت زیادتی ہوگی۔ انہیں مہمان نوازی کی حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ میں ان سے کوئی چیز نہیں لوں گا۔“

بیگم احمد نے کہا۔ ”بیٹا! تمہیں یہ خیال ضرور رکھنا چاہیے کہ تمہارے طرز عمل سے کسی کی دل شکنی نہ ہو۔“

”نہیں، ماں جی! ایسا نہیں ہوگا۔“

بیگم احمد نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

”یہاں ہمارے جاننے والوں میں کل سے بھیڑیوں کے واقعہ کے بعد زیادہ شہرت ہماری شہزادی کو ملی ہے۔ اور اسے تحائف بھی موصول ہو چکے ہیں۔ کل ہٹاؤ دی میں ہماری پکنک اور بر تکلف دعوت ہے۔“

نسرین بیٹی! وہ لفافہ اگر تم نے گم نہیں کر دیا تو جب یہ اندر جائیں۔ انہیں دے دو!“

مختوڑی دیر بعد یوسف بیٹھک کے اندر گیا۔ نسرین نے لفافہ لا کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ یوسف نے لفافہ کھولا اندر سو سو کے دو نوٹ تھے اور ایک کاغذ پر یہ تحریر لکھی ہوئی تھی:

بھائی یوسف صاحب! السلام علیکم: یہ بڑے بھائی کی طرف سے اپنے چھوٹے بھائی کے لیے ایک چھوٹا سا تحفہ ہے اگر قبول کر لو تو مجھے خوشی ہوگی۔ اگر قبول نہیں کرو گے تو مجھے صدمہ ہوگا۔ کہیں یہ نہ لکھ دینا کہ مجھے ضرورت نہیں۔ اگر

اسے کھول کر پڑھو گی۔“

اسمار نے بھولے پن سے کہا: ”جی میں وعدہ کرتی ہوں اور نسرین تو شاید سمجھ بھی نہ سکے کہ آپ کیا لکھ رہے ہیں۔“ نسرین نے تلملا کر کہا۔

”واہ جی! میں کوئی نالائق ہوں۔ ہمیشہ اپنی جماعت میں اقل آتی ہوں۔“
یوسف نے کہا: ”اچھا شہزادی صاحبہ! اب جا کر آرام کریں۔ میں سوئے سے پہلے چند صفحات اور لکھ لوں۔“

وہ چلی گئیں اور یوسف لکھنے میں مصروف ہو گیا۔
بیگم فریدہ احمد تہجد کی نماز کے لیے اٹھیں تو یوسف کے کمرے میں روشنی دیکھ کر اُدھر آ گئیں:

”بیٹا! تم رات سوئے نہیں؟“
”ماں جی! یوسف نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا: ”اب تہجد پڑھ کر ہی سوؤں گا۔“

بیگم احمد نے پوچھا: ”بیٹا! کیا تم ساری رات لکھتے رہے ہو؟“
”ماں جی! آج لکھنے کا موڈ تھا۔ اور جب موڈ بن جاتا ہے تو مجھے رات کا احساس نہیں رہتا۔ مجھے نیند یا تھکاوٹ بھی محسوس نہیں ہوتی۔“
”بیٹا! تم کیا لکھ رہے ہو؟“

”ماں جی! میں نے اپنے گاؤں پر ایک مضمون لکھا تھا جو ہمارے انگریزی کے پروفیسر کو بہت پسند آیا اور انہوں نے مجھے کہا کہ یہ مضمون ذرا تفصیل سے لکھ ڈالو! اب میں اسے تفصیل سے لکھ رہا ہوں اور اس میں بہت سی ایسی باتیں آگئی ہیں جو اس کی ابتداء کرتے وقت میرے ذہن میں نہ تھیں۔ مسئلہ۔ میری اپنی زندگی کے کئی واقعات اس میں شامل ہوتے جا رہے

ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جب یہ علیحدہ کتاب کی صورت میں یا کسی کتاب کے حصے کے طور پر شائع ہوں گے تو آپ انہیں پسند فرمائیں گی۔“
بیگم احمد نے کہا: ”بیٹا! مجھے یقین ہے کہ جو کچھ تم لکھو گے۔ مجھے پسند آئے گا۔ اب اٹھ کر تہجد پڑھ لو۔ اس کے بعد نماز فجر کا وقت ہو جائے گا اور ایسے کاموں کے لیے زندگی پڑی ہے۔“

یوسف نے قلم رکھ دیا اور اٹھ کر غسل خانے کی طرف چلا گیا۔
وضو کے بعد واپس آ کر یوسف نے اپنے بیگ سے جاتے نماز نکالی اور صحن میں چلا گیا۔ وہاں نماز تہجد ادا کرنے کے بعد اُس نے بیگلے سے باہر کچھ دُور ٹہلنے کے بعد صبح کی نماز ادا کی۔ تازہ ہوا میں چند لمبے لمبے سانس لئے اور پھر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

برآمدے میں بیگم احمد سعید کی بیوی، اسماء، اور نسرین نماز ادا کرنے کے بعد دعا مانگ رہی تھیں۔

یوسف نے بیگم احمد کے قریب سے گزرتے ہوئے کہا۔

”ماں جی! میرے لیے بھی دعا کریں۔“

کمرے میں پہنچتے ہی وہ چار پانی پر لیٹ گیا اور چند ثانیے کے بعد گہری نیند سو گیا۔

جب اُس کی آنکھ کھلی تو نسرین کرسی پر اُس کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔
”میرا خیال ہے کہ میں بہت سویا ہوں۔“ اُس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔
”جی ہاں“ نسرین کی آواز آئی۔

”نانی جان کے حکم سے پرہ دے رہی ہوں کہ آپ کو کوئی جگہ نہ دے۔ میں اتنی دیر سوتی تو میری پٹائی کر ڈالتیں۔“

باب - ۵

تیسرے دن جب وہ اسٹیشن جانے کی تیاری کر رہے تھے، احمد خاں کا ڈرائیور کار لے کر آگیا۔ اُس نے ایک ٹوکری اور ایک چھوٹا سا پکیٹ یوسف کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

”اے اپنے سامان کے ساتھ رکھوا لیجئے۔ خان صاحب کا حکم ہے کہ میں آپ کو اسٹیشن تک پہنچا دوں۔ وہ گاڑی روانہ ہونے سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے۔“

یوسف نے کہا۔ ”میں یہ پکیٹ اپنے سامان میں رکھ لیتا ہوں اور خشک چل والی اس ٹوکری کو کار میں ہی رہنے دو۔ میں باقی سامان بھی پہنچا دیتا ہوں۔“ یوسف نے اندر جا کر پکیٹ کھولا اور قراقلی کی ایک خوب صُوت ٹوپی نکال کر اپنے سوٹ کیس میں رکھ لی۔

مقوڑی دیر بعد یوسف بیگم احمد اور فرسین کے ساتھ پلیٹ فارم پر کھڑا تھا۔ جب گاڑی لگ گئی تو انہوں نے انٹرکلاس کے ایک ڈبے میں سامان رکھنے اور اوپر کی سیٹوں پر بستر لگانے کے بعد بیگم احمد کو اندر بٹھا دیا۔ محمد صدیق نے تازہ پانی کی صراحی بھر کر رکھ دی اور باہر نکل کر گاڑی دیکھنے لگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بھاتی جان کسی اہم کام میں مصروف ہو گئے ہیں۔ ورنہ اب تک وہ ضرور آجاتے۔“

یوسف نے مسکراتے ہوئے کہا۔
”نسرین شہزادی! جب تم بڑی ہو جاؤ گی تو نانی جان کی پٹائی کو بھی اپنی زندگی کے انعامات میں شہار کیا کر دو گی۔“
”ماں جی! وہ بیگم احمد کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا:
”میں ابھی نہا کر آتا ہوں۔“

”بیٹا! جلدی کرو۔ میں تمہارا ناشترہ پٹائی ہوں۔ وہ سب کب سے سیر کو جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں؟“
”ماں جی! آپ نے مجھے جگا دیا ہوتا۔“
”نہیں بیٹا! تمہاری نیند ان کی سیر سے زیادہ قیمتی تھی۔ میں نے تو یہ کوشش کی تھی کہ چلنے کا پروگرام ہی منسوخ کر دیا جائے لیکن یہاں ایک اچھی خاصی دعوت کا انتظام ہو چکا ہے۔“

یوسف نے کہا۔ ”ماں جی! اگر یہ دعوت منسوخ ہو جاتی تو مجھے بہت خوشی ہوتی۔ میں اتنے دن کبھی اپنی والدہ سے دُور نہیں رہا۔ یہ عجب بات ہے کہ آپ کو میں نے پہلی نظر دیکھ کر محسوس کیا ہے کہ شاید امی جان یہاں آگئی ہیں اور مجھے آپ کو ”ماں جی“ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے۔“

بیگم احمد نے کہا۔ ”بیٹا! تمہارے منہ سے ماں جی کا لفظ سُن کر مجھے بھی بہت خوشی ہوتی ہے۔ اب جا کر ناشترے کی تیاری کر لو۔ ناشترے کے بعد تمہیں چند گھنٹے اور آرام کرنا چاہیے۔ اُس کے بعد ہم بہت سی باتیں کریں گے۔“

ہیں اور انہوں نے مجھے تسلی دی ہے کہ خدا بخیر خیر استہ اگر کوئی خطرناک صورت حال پیش آگئی تو وہ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہونے دیں گے۔ اگر آپ یہ دیکھیں کہ شکار پور سے آگے سڑک بند ہے تو بہتر یہی ہوگا کہ آپ فوراً واپس کوٹہ آجائیں۔ میں ان لوگوں سے رابطہ رکھوں گا۔ اور یہ بھی ہماری خوش قسمتی ہے کہ یوسف جیسا نوجوان آپ کا ساتھی ہوگا۔“

احمد خان نے کہا: ”اگر ایسی بات ہے تو یہ لوگ رک کیوں نہیں جانتے؟“

”نہیں خان صاحب! یوسف بولا: اگر میرے ساتھی رُکنا چاہیں تو یہ اور بات ہے ورنہ میرا واپس جانے کا فیصلہ اٹل ہے۔ اگر سیلاب کی وجہ سے کسی جگہ ریل گاڑیاں اور موٹریں بند بھی ہو جائیں تو وہاں کشتیاں کام آئیں گی۔ اور مجھے کشتی پر سفر کرتے ہوئے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں کشتی کھینا بھی جانتا ہوں اور بوقت ضرورت تیر بھی سکتا ہوں۔“

احمد خان نے کہا: ”میرے بھائی کوئی ایسا بھی کام ہے جو آپ نہیں جانتے؟“

”خان صاحب! بعض کام سب کو آنے چاہئیں اور تیرنا ان میں سے انتہائی اہم ہے۔“

”بھئی! میں تیرنا جانتا ہوں۔ ایک اچھا تیراک بننے میں کتنی دیر لگے گی؟“

یوسف نے کہا: ”خان صاحب! انسان فطری طور پر تیراک ہے مجھے یقین ہے کہ چند ماہ کا بچہ بھی تیراک بن سکتا ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اُس میں خود اعتمادی پیدا کی جائے۔“

محمد صدیق نے پوچھا: ”یوسف! آپ نے کس عمر میں تیرنا سیکھا تھا؟“

”مجھے معلوم نہیں کہ میں کب سے تیرنا جانتا تھا۔ لیکن یہ بات مجھے

یوسف نے اطمینان سے جواب دیا۔

”میرا خیال ہے کہ ابھی گاڑی روانہ ہونے میں بہت وقت ہے۔ دیکھتے!

شاید خاں صاحب آ رہے ہیں۔“

محمد سعید نے پھاٹک کی طرف دیکھا تو احمد خان دکھائی دے رہے تھے وہ دونوں پھاٹک کی طرف بڑھے اور نسرین اُن کے پیچھے بھاگنے لگی۔

یوسف نے اُس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا: ”خان صاحب! مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں ایک مدت آپ کے پاس رہا ہوں اور مدت تک آپ کا مقروض رہوں گا۔“

احمد خان نے کہا: ”یار! کیا بات کرتے ہو۔ اگر بڑا بھائی ایک فرض پورا کرے تو چھوٹے بھائی کو شکریہ ادا کر کے اسے پریشان نہیں کرنا چاہیے۔“

یوسف نے مڑ کر نسرین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:۔

”اری! تمہیں گاڑی کے اندر بیٹھنا چاہیے تھا۔“ خان صاحب! یہ وہ شہزادی ہے جس کا میں نے ذکر کیا تھا۔“

محمد سعید، پھاٹک سے اندر آگیا اور اُس نے یگم احمد سے مخاطب ہو کر کہا:۔

”مجھے شکار پور اور سکھر، ٹیلی فون کرتے ہوئے کچھ دیر ہوگئی۔ ہمیں یہ اطلاع ملی تھی کہ سندھ کے بند میں کسی جگہ ٹنگاٹ پڑ گیا ہے۔ اگرچہ اُسے بند کرنے کی کوشش ہو رہی ہے لیکن اگر ٹنگاٹ بند نہ ہو سکا۔ تو بند ٹوٹ جانے سے ایک وسیع علاقے میں سیلاب آجائے گا اور کئی دیہات ڈوب جائیں گے۔ یہ خدشہ ظاہر کیا گیا ہے کہ سکھر اور شکار پور کے درمیان ریلوے لائنیں اور سڑکوں کو بھی خطہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے میں نے احتیاطاً شکار پور اور سکھر اپنے جاننے والوں کو ٹیلی فون کر دیا ہے۔ شکار پور کا اسٹیشن ماسٹر اور سکھر میں ریلوے پولیس کا انسپکٹر میرے دوست

تجارت پیشہ خاندان سے تعلق رکھتی ہے جس کے بعض افراد سرکاری ملازمتوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں اور نسرین کے والد کا جائزہ میں کاروبار بھی ہے اور شہر سے چند میل دور وہ اپنی اور اپنے بھائیوں کے حصے کی زمین کا انتظام بھی کرتا ہے۔

سچی میں انہوں نے چائے پی اور جب یوسف بیرے کو بل دینے لگا تو بیگم احمد نے کہا: ”یوسف بیٹا! یہ پیسے اپنی جیب میں رکھو۔“ یس یہ سوچنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ تم میرے بیٹے کے سوا کچھ اور ہو۔“

یوسف بولا: ”ماں جی! اگر آپ ناراض ہوتی ہیں تو میں معافی مانگتا ہوں۔“
 مائیں بیٹوں سے کبھی ناراض نہیں ہوتیں۔ لیکن میں یہ چاہتی ہوں کہ سفر کے دوران تم کوئی چیز بھی اپنی جیب سے نہیں خریدو گے۔ اب ایک اچھے بیٹے کی طرح وعدہ کرو کہ مجھ کو یہ بات دوبارہ نہیں کہنی پڑے گی۔“

”ماں جی! اگر آپ اس بات پر خوش ہو سکتی ہیں، تو میں وعدہ کرتا ہوں۔“
 بیگم احمد نے بیرے کو بل ادا کرنے کے بعد قدرے توقف کے بعد کہا۔

”بیٹا! تمہاری امی جان تم سے بہت پیار کرتی ہوں گی؟“
 ”جی ہاں!“

”تمہارا اٹھنا بیٹھا اور بولنا ہمیں بھی بہت اچھا لگتا ہے اور میرا خیال ہے کہ جب تم سو جاتے ہو گے تو وہ ٹکٹکی باندھے تمہارا چہرہ دکھتی رہتی ہوں گی۔“

یوسف مسکرایا۔ ”ماں جی! مجھے یہ یاد ہے کہ جب میں چھوٹا تھا تو بستر پر لیٹ کر اُن کا انتظار کیا کرتا تھا اور جب وہ کمرے کی طرف آتی تھیں تو میں اپنی آنکھیں بند کر کے یہ ظاہر کیا کرتا تھا کہ میں سو رہا ہوں۔ وہ میرا ہاتھ چوما کرتی تھیں اور میرے لیے دعائیں کیا کرتی تھیں۔“

بیگم احمد نے کہا: ”بیٹا تمہاری ماں بہت خوش قسمت ہے بلکہ جب تم

اُس وقت معلوم ہوئی جب میرے چچا جان نے گھر سے پانی میں مجھے دھکا دے دیا اور میں ایک غوطا کھانے کے بعد تیرنے لگ گیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے میں — اور میری عمر کے دوسرے لڑکے کمر برابر پانی سے آگے جانا پسند نہیں کرتے تھے۔“
 محمد صدیق نے کہا: ”اب گاڑی چلنے کا وقت ہو چکا ہے!“ اور وہ گاڑی کی طرف چل دیے۔

نسرین کو محمد سعید اور محمد صدیق نے یکے بعد دیگرے پیار کیا اور وہ گاڑی کے اندر جا بیٹھی۔ یوسف نے سب کے ساتھ مصافحہ کیا اور ٹرین پر سوار ہو گیا۔

ریل گاڑی کے ڈبے میں پانچ بڑی سواریاں تھیں جن میں دو مرد تین عورتیں اور ان کے علاوہ ایک بچہ بھی تھا، یوسف بیگم فریدہ احمد اور نسرین دونوں نے راسٹ کر بیٹھا ہوا تھا گاڑی چلنے سے تھوڑی دیر بعد بیگم فریدہ احمد نے کہا: ”خدا کا شکر ہے کہ یہ ڈوب خالی جا رہا ہے۔“
 جب میں آتی تھی، تو بہت زیادہ ریش تھا۔“

یوسف بولا: ”ماں جی! ان دنوں مسافروں سے بھری ہوئی گاڑیاں یہاں آتی ہیں اور قریباً خالی واپس جاتی ہیں۔ جب گرمی گزر جائے گی تو حساب اُلتا ہو جائے گا۔“
 مسز احمد نے کہا: ”بیٹا! تم ذرا قریب آ جاؤ۔ مجھے گاڑی کے شور میں باتیں کرتے ہوئے الجھن محسوس ہوتی ہے، نسرین بیٹی! اپنے بھائی کو جگہ دے دو۔“

نسرین سلمنے کی سیٹ پر بیٹھ گئی اور یوسف بیگم احمد کے قریب ہو گیا وہ دیر تک باتیں کرتے رہے۔

سب سے پہلے مسز احمد، یوسف کے والدین، اُس کے بہن بھائیوں، چچاؤں اور اُن کے بیٹوں بیٹیوں کے متعلق بہت کچھ جان چکی تھیں۔ اُسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ وہ سچے متوسط زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اور اُس کا والد ایک تحصیلدار ہے۔ اُس نے اپنے متعلق یوسف کو یہ بتایا تھا کہ وہ لڑھیانے کے ایک ایسے

”شہزادیاں اکثر بھول جایا کرتی ہیں“

نسرین بولی۔ ”آپ اگر کئی سال کے بعد بھی وہاں آئیں تو میں آپ کو دُور سے دیکھ کر پہچان لوں گی۔“

یوسف نے کہا: ”آپ کو معلوم نہیں کہ عمر کے ساتھ شکلیں بھی بدل جایا کرتی ہیں۔“
 ”ہرگز نہیں! آپ کی شکل اتنی نہیں بدل سکتی کہ میں پہچان نہ سکوں اور اگر بدل بھی جائے تو آپ کی ایک نشانی میں کبھی نہیں بھولوں گی۔“
 بیگم احمد نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”بیٹی! وہ کیا ہے؟“
 ”نانی جان! ان کے ماتھے پر آنکھ کے اوپر زخم کا داغ ہے۔“



جیکب آباد کے اسٹیشن پر وہ رات کا کھانا کھا رہے تھے کہ اسٹیشن ماسٹر کمرے میں داخل ہوا اور اُس نے پوچھا۔ ”یہاں بیگم فریدہ احمد کون ہیں؟“
 ”میں ہوں۔“ بیگم فریدہ احمد نے جواب دیا۔

”جناب! مجھے روہڑی کے ریلوے پولیس انسپکٹر اور شکار پور کے اسٹیشن ماسٹر کا ابھی بھی ذہن آتا ہے کہ دُریا کے بند کا جو حصہ ٹوٹ چکا ہے اس کا مرمت ہونا ناممکن ہے۔ سکھر اور شکار پور کے درمیان قریباً سولہ میل کے علاقے میں بڑی تیزی سے پانی بہہ رہا ہے ریلوے لائن بھی ٹوٹ گئی ہے اور سڑک کئی کئی فٹ پانی میں ڈوب گئی ہے۔“
 اسٹیشن ماسٹر نے شکار پور میں آپ کے قبیلہ کا انتظام کر دیا ہے اور سرکاری اطلاع یہ ہے کہ ایک دو دن تک کشتیوں کے ذریعے آمد و رفت شروع ہو جائے گی اگر آپ سفر جاری رکھنے کا فیصلہ کریں تو اس بات کی کوشش کی جائے گی کہ پہلے دن ہی آپ کو روانہ کر دیا جائے۔ لیکن اگر آپ کو سڑک واپس جانے کا فیصلہ کر لیں تو بہتر یہ ہوگا کہ آپ جیکب آباد سے ہی پہلی گاڑی پر واپس تشریف لے جائیں۔“

ساری رات جاگنے کے بعد سو رہے تھے تو میں یہ سوچ کر تمہارے پاس بیٹھی رہی کہ کوئی تمہیں جگانہ دے پھر ذرا غور سے تمہارا چہرہ دیکھا تو میری نگاہیں تمہاری پیشانی پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ میں نے تمہارے ماتھے پر ہاتھ پھیرا تھا لیکن تم گہری نیند سو رہے تھے۔ بیٹا! تمہیں وہ بہت یاد آتی ہوں گی۔“

جی ہاں بہت زیادہ! ہو سکتا ہے آپ کو میری اس بات پر یقین نہ آئے۔
 اگر امی جان اچانک اس گاڑی میں آجائیں تو شاید نسرین بھی بدحواس ہو کر کہے کہ یہ دوسری نانی اماں کہاں سے آگئی ہیں؟

”انشاء اللہ میں انہیں ضرور ملوں گی۔ میں انہیں لدھیانے آنے کی دعوت دوں گی اور تم سے یہ وعدہ لوں گی کہ تم انہیں لے کر آؤ گے۔“ بیگم احمد نے کہا۔

نسرین بولی: ”نانی جان! دعوت میری امی جان کی طرف سے ہوگی اور آپ سب جالندھر آئیں گے۔ جالندھر پہلے آنا ہے اور لدھیانہ بعد میں! اس لیے جب ان کی امی آئیں گی تو ہم آپ کو بھی جالندھر بلا لیں گے۔“

”ٹھیک ہے بیٹی! شاید تمہارے بھائی یوسف بھی یہ پسند نہ کریں کہ کوئی شہزادی کو سلام کیے بغیر آگے چلا جائے۔ کیوں یوسف؟“

”آپ درست فرماتی ہیں! ہم گھر سے روانہ ہونے سے پہلے آپ کو لکھ دیں گے کہ ہم فلاں تاریخ کو جالندھر پہنچ جائیں گے اور اس کے بعد باقی پروگرام آپ کے حکم کے مطابق طے ہوگا۔ لیکن میں ایک بات سے ڈرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اگر آپ لدھیانہ میں ہوئیں اور ہم جالندھر پہنچ گئے اور وہاں جا کر ہم نے شہزادی صاحبہ کے گھر دستک دی اور شہزادی صاحبہ نے باہر نکل کر یہ پوچھا کہ تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ اور یہاں تمہارا کیا کام ہے؟ تو ہم انہیں اُس وقت کیا جواب دیں گے؟“

”واہ جی! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ نسرین نے کہا:

بیگم احمد نے پوچھا۔ ”اگر میں کوئٹہ واپس چلی جاؤں تو تمہارے خیال میں کتنی دیر تک ریلوے لائن یا سڑک سفر کے قابل ہو جاتے گی؟“

”بیگم صاحبہ! اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ یہ کام ہفتوں بلکہ مہینوں کا بھی ہو سکتا ہے۔“

بیگم احمد نے کہا۔ ”اگر دو چار ہفتے بعد بھی نہیں کشتی پر ہی سفر کرنا ہے تو ہم کوٹہ واپس کیوں جاتیں؟ میں ایک دو دن کے لیے شکار پور کی گرمی برداشت کر لوں گی۔“

بیٹا یوسف، تمہارا کیا خیال ہے؟“

”ماں جی! آپ کا یہ فیصلہ بالکل درست ہے۔ میں ہر صورت میں گھر جانا چاہتا ہوں! اگر آپ کوٹہ لوٹ جانے کا فیصلہ کر لیتی ہیں تو بھی میں آپ کو وہاں پہنچا کر لگا لگاڑی پر شکار پور کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔ جس علاقے میں سیلاب آیا ہے میں نے کارپ کوٹہ جاتے ہوئے یہ علاقہ دیکھا ہے آپ کو گرمی سے تکلیف ہوگی اور آپ یہ محسوس کریں گی کہ جنگلوں میں سے گزر رہی ہیں۔“

بیگم فریدہ احمد نے کہا۔ ”بابو صاحب! آپ شکار پور ٹیلی فون کر دیں کہ ہمسہ کشتیاں روانہ ہونے تک ان کے پاس ٹھہریں گے اور یہ بھی کہہ دیں کہ اس وقت ہم کھانا کھا چکے ہیں۔ شاید ہمارے متعلق سکھر اور کوٹہ سے بھی آپ کو فون آئیں۔ مہربانی فرما کر آپ سب کو ہمارے فیصلے کی اطلاع دے دیجیے۔“

رات کے وقت وہ شکار پور کے ٹیشن ماسٹر کے مکان کی چھت پر آرام کر رہے تھے۔ ہوا خلاف معمول خوشگوار تھی اور وہ جلد ہی گہری نیند سو گئے۔

صبح نسرین کو اس کی نانی جان نے جھنجھوڑ کر جگایا: ”بیٹی! اٹھو! نماز کا وقت

جار رہا ہے۔“ نسرین نے آنکھیں کھول کر یوسف کی کھانٹ خالی دیکھی تو نانی سے پوچھا۔

”وہ کہاں ہیں نانی جان؟“

”بیٹی! وہ بہت سویرے نماز کے لیے نکل گیا تھا اور اپنا تھیلہ اٹھا کر اس نے تمہارے سر پر رکھ دیا تھا اور یہ کہہ گیا تھا کہ اس تھیلے کے اندر کوئی بہت اہم چیز ہے۔ اس لیے جب نسرین بیدار ہو، اسے تاکید کر دیں کہ وہ اس کا خیال رکھے۔ نماز کے بعد وہ میر کے لیے جاتے گا اور وہ مقام دیکھ کر آئے گا جہاں تک سیلاب کا پانی پہنچ چکا ہے اور یہ بھی پوچھ کر آئے گا کہ ہمیں کشتی کس جگہ سے ملے گی؟“

نسرین وضو کرنے کے بعد نماز کے لیے کھڑی ہونے لگی تو بیگم احمد نے کہا: ”بیٹی! نماز پڑھ کر نیچے آ جانا۔“

نسرین نے نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو روزمرہ کی دعا کے ساتھ اس کی زبان پر چند نئی باتیں آ گئیں۔ وہ کہہ رہی تھی:

”یا اللہ! اس خوفناک سیلاب میں سے گزرتے ہوئے ہمیں ہر مصیبت سے بچائو۔ یا اللہ! گرمی لگنے سے نانی جان کی صحت خراب نہ ہو۔ جس کشتی پر ہم سوار ہوں۔ اس کی حفاظت کیجیو اور مجھوں اور پانی کی دوسری بلاؤں کو ہم سے دور رکھیو۔ یا اللہ بھائی! است بھی خیریت سے اپنے گھر پہنچ جائیں۔“

میزبان کی بیوی اور سہیلی اور اس نے کہا: ”بیٹی نیچے آؤ ہم سب ناشتے کے لیے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“

نیچے کشادہ کمرے میں میزبان کی بیٹیاں اور دو بیٹے باپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ نسرین نے اپنی نانی سے سوال کیا۔ ”نانی جان! بھائی یوسف ابھی تک نہیں آئے؟“

”بیٹی! تم اطمینان سے ناشتہ کرو۔ جب وہ آئے گا تو اس گھر میں اس کی تواضع تمہاری خواہش کے عین مطابق کی جائے گی۔“

آپ کو اس تکلیف سے بچانے کے لیے میں یہ کوشش کروں گا کہ آپ کے لیے کوئی اچھا نام تلاش کر لیا جائے۔

”ہاں بیٹا! اس مصیبت سے بچنے کے لیے میں تانگے والے کو پانچ روپے انعام بھی دے دوں گی۔“

یوسف نے کہا۔ ”ماں جی! میں پہلے یہ دیکھوں گا کہ گھوڑا پانی سے نہ ڈرتا ہو۔ پھر پانچ روپے انعام کے لالچ میں تانگے والا آپ کو بالکل کشتی کے قریب پہنچا دے گا۔“

”ہاں بیٹا! گھوڑا ضرور دیکھ لینا، انعام ہم زیادہ بھی دے سکتے ہیں۔ نسرین اس بات سے بہت ڈرتی ہے کہ پانی میں مگر کچھ اسے پکڑ لیں گے!“

نسرین نے پریشان ہو کر کہا۔ ”نانی جان! مجھے یہ بتائیں کہ مگر کچھوں سے کون نہیں ڈرتا اور دریائے سندھ کے مگر کچھ تو اور بھی زیادہ خوفناک ہوتے ہوں گے۔ کیوں بھائی جان! آپ نے جس جگہ سیلاب کا پانی دیکھا تھا وہاں مگر کچھ تو نہیں تھے؟“

یوسف بولا: ”دیکھو نسرین! دریا میں مگر کچھ تو ہوتے ہیں لیکن وہ اتنے بے وقوف نہیں ہوتے کہ جس طرف سیلاب رخ کرے اُدھر ہی چل پڑیں۔ انہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس جگہ سیلاب کا پانی اُتر جائے گا وہاں وہ مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ اس لیے جس طرح ہم اپنا شر کاؤں چھوڑنا پسند نہیں کرتے اس طرح مگر کچھ بھی اپنی مستقل حالت گاہوں سے دُور نکل جانا پسند نہیں کرتے، لیکن یہ سیلاب چونکہ ایسا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دریا نے اپنا رخ ہی بدل دیا ہے تو بعض مگر کچھ ایسے بے وقوف ہو سکتے ہیں کہ وہ اس طرف آنکلیں، لیکن آپ کو ان سے نہیں ڈرنا چاہیے۔“

نانی جان نے کہا: ”اچھا بیٹی جاؤ۔ ان کے ناشتے کی فکر کرو۔ پھر مگر کچھوں کی باتیں کرنا۔“

میزبان کی بیوی نے کمرے میں جھانکتے ہوئے کہا: ”بی بی جی ناشتہ تیار ہے۔ میں

نسرین نے اچانک اُٹھ کر کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ ”نانی جان! میں ابھی آتی ہوں۔“ وہ بھاگتی ہوئی زینے کی طرف بڑھی اور پھر چند ثانیے بعد وہ اُسی طرح بھاگتی ہوئی واپس آئی تو اُس کے ہاتھ میں وہ بیگ تھا جو یوسف اس کے سر ہانے چھوڑ گیا تھا۔

”نانی جان! میں یہ بھول گئی تھی اور بھول جانے کی وجہ یہ تھی کہ میں نماز پڑھتے ہی نیچے آگئی تھی۔“

میزبان کی بیوی نے پوچھا۔ ”کیا اس تھیلے میں کوئی خاص چیز ہے بیٹی!“

”جی اس میں یوسف بھائی کی چیزیں ہیں جن کے تعلق وہ کہتے تھے کہ میں ان کی حفاظت کروں۔“

دُھوپ کافی تیز ہو چکی تھی! یوسف واپس آیا تو نسرین پریشانی کی حالت میں دروازے کے ساتھ سامنے کھڑی تھی۔

وہ صحن میں داخل ہوا تو نسرین ایک کمرے کی طرف بھاگی۔

”نانی جان! وہ آگئے ہیں“ پھر وہ مڑ کر یوسف کی طرف متوجہ ہوئی جو تذبذب کی حالت میں کھڑا تھا۔

”آئیے نا، یہاں کیوں کھڑے ہو گئے۔ نانی جان آپ کا انتظار کر رہی ہیں، گھر کے سب لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ بہت پریشان تھے وہ!“

یوسف مسکراتا ہوا داخل ہوا اور اُس نے کہا۔ ”ماں جی! وہ جگہ جہاں کشتیاں پہنچنا شروع ہو گئی ہیں۔ یہاں سے کافی دور ہے۔ میں ہر بات کا پتہ کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ تاکہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ انشاء اللہ! کل ہمیں کشتی مل جائے گی۔“

گرمی بہت ہو گئی۔ لیکن ہماری کوشش یہی ہونا چاہیے کہ ہم روانگی میں دیر نہ لگائیں۔ یہاں سے کشتی تک پہنچنے کے لیے ہمیں کوئی چار میل تانگے پر سفر کرنا پڑے گا۔ اس میں سے آخری چار فرلانگ کہیں گھٹنے گھٹنے اور کہیں اس سے بھی زیادہ پانی میں سے گزرنا پڑے گا۔

یہیں لے آتی ہوں۔“ بھوڑی دیر بعد یوسف اطمینان سے ناشتہ کر رہا تھا اور نسرین بڑی سنجیدگی کے ساتھ یہ پوچھ رہی تھی کہ ”بھائی جان! اُن بے وقوف مگر مچھوں میں سے کوئی مجھے تو نہیں پکڑے گا۔“

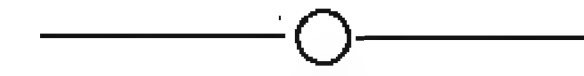
یوسف نے بڑی مشکل سے سنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔

”بے وقوف! خواہ انسان ہو یا مگر مچھ اُس پر کبھی اعتماد تو نہیں کیا جاسکتا، لیکن مجھے یہ اطمینان ہے کہ کئی میلوں میں پھیل جانے کی وجہ سے ریا کے پانی کی گہرائی اتنی کم ہوگئی ہے کہ انتہائی بے وقوف بلکہ پاگل مگر مچھ بھی اس طرف نہیں آئے گا۔“

بھائی جان! جو مگر مچھ بے وقوف ہو سکتے ہیں اور پاگل بھی تو پھر وہ زیادہ خطرناک ہوتے ہوں گے؟“

یوسف نے جواب دیا۔ ”مگر مچھ صرف مگر مچھ ہوتا ہے اور یہ اس کی عادت ہے کہ وہ دیا کے اصل راستے سے دُور جانا پسند نہیں کرتا۔ راوی اور بیاس دونوں ہم سے قریب ہیں اور جب ان میں سے کسی دریا میں بھی سیلاب آتا ہے تو میلوں تک پانی پھیل جاتا ہے لیکن آج تک کسی نے یہ نہیں سنا کہ دوسری مچھلیوں کی طرح مگر مچھ بھی دریا سے نکل کر کھیتوں میں آگے ہوں اور جس جگہ سے ہم نے کشتی پر سوار ہونا ہے وہاں ڈر کی تو کوئی بات ہے ہی نہیں۔“

نانی اماں نے کہا۔ ”ارے بیٹا! جب ہم سیلاب عبور کر لیں گے اور بے وقوف مگر مچھوں کا خطرہ دُور ہو جائے گا تو پھر اس کے قہقہے سننا۔“



وہ کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ پھر نسرین نے اچانک سوال کیا

”آپ نے پہلے کبھی کشتی پر دریا عبور کیا ہے؟“

یوسف نے جواب دیا: ”کئی بار!“

”میرا مطلب ہے، سیلاب کی حالت میں؟“

”میں نے سیلاب کے دنوں میں تین بار راوی عبور کیا ہے اور ایک بار دریائے بیاس کو عبور کیا ہے۔ میں کئی بار دونوں دریاؤں کے آ رہا جا چکا ہوں اور میں تیر کر بھی دریا عبور کر لیتا ہوں۔“

نانی جان نے پوچھا۔ ”بیٹا! دریاؤں پر کس لیے جایا کرتے تھے تم؟“

”ماں جی! شکار کے لیے! پہلے مرغابیوں کا شکار دیکھنے کا شوق تھا۔ اب موقع ملتا ہے تو خود شکار کو چلا جاتا ہوں۔“

”آپ کو دریا سے خوف نہیں آتا؟“ نسرین نے پوچھا۔

”بالکل نہیں! میں تیرنا جانتا ہوں اور مجھے کشتی کھینا بھی آتا ہے۔ بانس کے ساتھ بھی! اور چوڑوں کے ساتھ بھی!“

نسرین کی نانی نے کہا۔ ”بیٹا! انکا کچھ تم نے کیسے سیکھ لیا تھا؟“

یوسف نے جواب دیا۔ ”اگر پانی کا خوف اُتر جائے تو آدمی سب کچھ سیکھ لیتا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے اگر کوئی تیرنا سیکھ لے تو پھر اُسے سب کچھ آ جاتا ہے؟“

”ماں جی! جب آدمی کے دل سے خوف جاتا رہتا ہے تو اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ وہ تیرنا جانتا ہے۔“

”بیٹا! تم نے یہ بات بتائی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے تیرنا کسی سے نہیں سیکھا!“

”ماں جی! مجھے اتنا یاد ہے کہ میں نہر کے کنارے چار پانچ فٹ گہرے پانی میں ہاتھ

پاؤں مارا کرتا تھا۔ اس کے آگے جاتے ہوئے مجھے خوف محسوس ہوتا تھا۔ ایک دن میں

بے خیالی میں کھڑا تھا۔ پیچھے سے میرے چچا جان آئے اور انہوں نے مجھے زور سے دھکا دیا۔

تو مجھے ایک دو غوطے آگئے۔ پھر میں نے شاید یہی سوچا کہ ڈرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

اس لیے میں تیرنے لگ گیا اور اس کے بعد سکول میں میرے متعلق مشہور ہوا کہ میں نہر کو سیدھا

تیر کو عبور کر لیتا ہوں۔

بیگم احمد نے غور سے یوسف کی طرف دیکھا اور پھر نسرین کی طرف دیکھ کر مکراتے ہوئے کہا: "بیٹا! اب مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی خطرہ پیش آیا تو بھی تم نسرین کو ضرور بچا سکو گے۔" نسرین کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن وہ یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ اسے غصہ ظاہر کرنا چاہیے یا نہیں؟

پاپ - ۶

اگلے دن دس بجے کے قریب وہ کشتی پر سوار ہو رہے تھے۔ یوسف نے جو تانگہ پسند کیا تھا، اُس کا گھوڑا انہیں کشتی سے کوئی بیس قدم کے فاصلے تک لے آیا تھا۔ باقی راستہ انہیں گھٹنے گھٹنے پانی اور کچھڑ میں پیدل چلنا پڑا۔ سامان اٹھا کر رکھنے کے لیے ایک نقلی اور ایک گھریلو نوکر پہلے سے وہاں پہنچ چکے تھے۔ پانی کی صراحی کے علاوہ ایک تھرماس بھی شکا پور کا میزبان اسٹیشن ماسٹر اپنے گھر سے لے آیا تھا۔ ان کا سامان رکھوانے کے بعد میزبان اسی تانگے پر واپس چلا گیا تھا۔

ایک سفید ریش سیکھ جسے ایک نوجوان کشتی تک پہنچانے آیا تھا۔ اُن کا ہم سفر تھا اور وہ بار بار کہہ رہا تھا: "بیٹا تم اطمینان سے جاؤ۔ تم میری فکر نہ کرو۔ دھوپ تیز ہو رہی ہے تم جا کر آرام کرو۔"

نوجوان نے بوڑھے ملاح سے مخاطب ہو کر کہا: "بھئی! یہ میرے باپ جی ہیں۔ ان کا خیال رکھنا۔"

بوڑھے ملاح نے کہا: "جناب آپ فکر نہ کریں۔"

کشتی بھر چکی تھی اور تنگ چھپر کے اندر سکڑی سمٹی سوار یوں کا دم گھٹا ہوا تھا لیکن لاچی ملاح لوگوں کی چیخ پکار کے باوجود مزید سواریاں لاؤنے پر مُصر تھا۔

یوسف نے جلدی سے اپنا بیگ کھولا اور اُس میں سے دو کھجور کے پکھے نکال کر نسرین کو دیتے ہوئے کہا: "نسرین! یہ لو! مال جی کا گرمی سے بُرا حال ہو رہا ہے پھر اُس

اتنے زور سے تھپڑ مارا کہ وہ پانی میں جاگرا۔ لوگ شور مچانے لگے: ”دیکھو! بھتی کشتی پر فساد نہ کرو، یہ ڈوب جائے گی!“ یوسف نے بلند آواز میں کہا: ”آپ پریشان نہ ہوں۔ میں کشتی چلانا جانتا ہوں اور انشاء اللہ اسے اکیلا کنارے لے جاؤں گا۔ ان ملاحوں کی بدتمیزی برداشت نہیں کی جاسکتی!“ پھر وہ بوڑھے ملاح کی طرف متوجہ ہوا جو کشتی والوں کا لیڈر معلوم ہوتا تھا۔ ”تم میری طرف کیا دیکھ رہے ہو؟ اٹھو! بانس پکڑ لو، ورنہ میں تمہیں اٹا لٹکا دوں گا اور سنو بھائیو! کسی کے لیے اس ذلیل چھپر کے اندر بیٹھنا ضروری نہیں ہے۔ تم اسے توڑ کر نیچے پھینک دو!“

قوی ہیکل ملاح جو تھپڑ کھا کر پانی میں گرا تھا، کشتی پر دوبارہ سوار ہو کر چھلکائے کھڑا تھا۔

بوڑھے ملاح نے کہا: ”بے وقوف کے بچے! تم سب کا بیڑا غرق کر دو گے اور پھر وہ لوگوں کی طرف متوجہ ہوا۔“

دیکھو بھائیو! آپ اطمینان سے باہر نکل کر ہوا کھا سکتے ہیں۔ لیکن یہ صرف ایک کشتی ہی نہیں ہمارا گھر بھی ہے۔ خدا کے لیے اس کی چھت کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔“

ایک ٹائپ کے اندر ساری فضا بدل گئی۔ بوڑھے سکھ نے کہا: ”اد کا کا! بھگوان تیرا بھلا کرے، درامہ لہا تھ پکڑا کر سہارا دینا!“ یوسف نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُس نے کشتی سے نیچے لٹک کر پانی میں غوطہ لگا دیا۔ پھر کئی لوگ باری باری کشتی سے اتر کر پانی میں نہا رہے تھے۔

ایک جگہ کشتی گھنے درختوں میں سے گزر رہی تھی۔ کہ اچانک یوسف نے دیکھا کہ ایک درخت پر سانپ لٹک رہا ہے۔ اُس نے پھر بوڑھے ملاح کی طرف

نے اپنی قمیص اتار کر ٹی شرٹ پہن لی۔ اور قمیص بیگ کے اندر بٹھونے کے بعد نسرین کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”نسرین! اب اس بیگ میں بہت سی اہم چیزیں جمع ہو گئی ہیں۔ ان سب کی حفاظت آپ کے ذمے ہے۔“

اچانک اُس کی نگاہ بیگم فریدہ احمد پر پڑی۔ اُن کا گرمی سے بُرا حال تھا۔ یوسف نے پانی کی صراحی سے ایک گلاس بھرا۔ تھرماس سے کچھ برت نکال کر اُس کے اندر ڈالی اور ماں جی کو پیش کرتے ہوئے کہا: ”سیجیے، پانی پی لیجئے!“ اُس نے پانی قبول کرتے ہوئے کہا۔

”بیٹا! میرا دم گھٹ رہا ہے۔ خدا کے لیے مجھے اس قید خانے سے نکالو!“

”ماں جی! آپ باہر آجائیں“ یوسف نے کہا۔

وہ لڑکھڑاتی ہوئی اٹھی اور چھپر سے باہر ایک جگہ بیٹھ گئی وہاں اگرچہ دھوپ تھی لیکن کھلی ہوا میں اُس کے چہرے پر تازگی آگئی تھی۔ ایک اور خاتون اور اُس کا خاوند بھی جو پیچھے بیٹھے ہوتے تھے یہ دیکھ کر آگے بڑھے اور نسرین کی نانی کے قریب آ بیٹھے۔ بوڑھا سکھ بھی کھسکتا ہوا سامنے دوسرے کونے پر پہنچ گیا۔



”میں ملاحوں میں سے ایک جو بانس پکڑے ہوئے تھا چلا آیا“ سب اندر چلے جاؤ۔ باہر کوئی نہیں بیٹھے گا۔ جو باہر بیٹھے گا اسے ہم کشتی سے اتار دیں گے۔“ مسافر پیچھے کھسکنے لگے لیکن نسرین اور اس کی نانی جان پریشان سی ہو کر یوسف کی طرف دیکھنے لگیں۔

ملاح پھر چلا آیا۔ ”اومائی سنتی نہیں۔ میں کیا کہہ رہا ہوں؟“ اُس نے ابھی اپنا فقرہ پورا ہی کیا تھا کہ یوسف نے آگے بڑھ کر بانس پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے اُس کے منہ پر

متوجہ ہو کر کہا: ”دیکھو! یا تو تم راستہ بھول گئے ہو یا جان بوجھ کر کشتی کو غلط راستے پر لے جا رہے ہو۔ اس کشتی کو اس جگہ پر رہنا چاہیے جہاں سے سڑک گذرتی ہے۔“

”جناب! اس طرح راستہ لمبا ہو جائے گا“

”تمہیں معلوم ہے کہ کشتی کو درختوں سے دو رکھنا کیوں ضروری ہے۔ سنو! اگر اب کشتی سڑک سے ادھر ادھر ہوتی تو میں چھپر کو آگ لگا دوں گا۔ آگے پانی اتنا کم ہے کہ ہم پیدل چل کر جا سکیں گے۔“

بوڑھے ملاج نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ”او! بے وقوف! اپنا بیڑا کیوں غرق کرواتے ہو۔ جس طرح یہ کہتے ہیں اُسی طرح کرو“

غروب آفتاب کے قریب کشتی دوسرے کنارے پر پہنچ چکی تھی اور مرد علی اپنے نوکروں سمیت اُن کے استقبال کو پہنچ چکا تھا۔

نسرین کی نانی نے کہا: ”یوسف بیٹا! مجھے کشتی سے اتارنے سے پہلے اس صراحی میں جتنا پانی ہے وہ میرے سر پر ڈال دو“

”کچھ نہ کہا۔“ بی بی جی! آپ کا بیٹا بڑا ہونہار ہے۔ میں ہمیشہ اسے دعائیں دیا کروں گا۔ پھر وہ یوسف سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا: ”لیکن بیٹا جی! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ کشتی کو سڑک کے اوپر سے لے جانے میں بھلا کیا حکمت تھی؟“

یوسف نے جواب دیا: ”بابا جی! جو سانپ سیلاب میں بہتے ہوئے آئے تھے۔ وہ درختوں پر پناہ لے چکے تھے۔“ ایک عورت نے بلند آواز سے کہا: ”ماتے میں مر گئی۔ میں بھی سوچ رہی تھی کہ کوئی بہت بڑی بات ہوگی جس کے لیے بھائی صاحب کو اتنا غصہ آ رہا ہے۔“ اور نسرین منہ سے لوسٹ پوٹ ہو گئی۔

نسرین کی نانی نے بوجھا: ”بیٹا! تم نے اپنی آنکھوں سے کوئی سانپ دیکھا تھا؟“

77

بی بی جی! ”یوسف نے جواب دیا۔

”بہت بڑا ہو گا وہ!“ بیگم فریدہ احمد نے فکر مند ہو کر کہا۔

”بڑا نہیں تھا، لیکن اس علاقے کا سانپ بہت زہریلا ہوتا ہے۔“

”بیٹا! خدا کا شکر ہے کہ تمہیں خطرے کا احساس ہو گیا ورنہ ان درختوں سے کوئی خطرناک سانپ ہماری کشتی پر ٹوٹ پڑتے۔“

”ماں جی! یہ ہو سکتا تھا کہ کسی جگہ گھنے درختوں میں کشتی ٹک جاتی اور کوئی سانپ کسی شاخ سے اتر کر کشتی پر آ جاتا۔ ورنہ سیلاب کے باعث جانور بھی بہت سہمے ہوئے تھے۔ جو گاؤں سیلاب میں ڈوب گئے ہیں۔ اُن کے آس پاس جنگلوں سے ہر قسم کے جانور پہلے ہی بھاگ گئے تھے۔ سانپوں کے لیے درختوں کے سوا کوئی جگہ نہ تھی۔“

نسرین بولی ”وہ جانور جو درختوں پر چڑھنا نہیں جانتے۔ سب ڈوب گئے ہوں گے۔“

یوسف مسکرایا اور نسرین نے فوراً اپنے الفاظ پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کہا: ”معاف کیجئے۔ میں بھول گئی تھی کہ سب جانوروں کو تیرنا آتا ہے۔“

تھوڑی دیر بعد وہ تانگے پر سوار ہو رہے تھے۔

بیگم فریدہ احمد نے محمود علی سے یوسف کا تعارف کراتے ہوئے کہا: ”محمود! یہ میرا بہادر بیٹا یوسف ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ ہمارے ساتھ تھا۔ ورنہ خدا معلوم ہم پر کیا گذرتی؟“

نسرین نے کہا: ”بھوپا جان! میں بتاؤں بھائی یوسف نے کیا کیا تھا: کشتی کے ملاج بڑے ظالم تھے۔ ایک تو کوئی دیو معلوم ہوتا تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں تھیں اُس کی! نانی جان گرمی سے بے ہوش ہو رہی تھیں۔ یوسف بھائی نے کہا: ”ماں جی! آپ چھپر سے باہر ہوا میں آجائیں۔ نانی جان باہر نکلیں۔۔۔۔۔ میں بھی ان کے ساتھ تھی۔ پھر بہت سے لوگ چھت سے باہر نکل آئے۔ اُس بد صورت ملاج نے سب کو ڈانٹا اور وہ خوف زدہ ہو کر چھت کے نیچے

”کہیں تو کبھی یہ نہیں کہوں گی کہ آپ واپس جاسکتے ہیں! لیکن اگر آپ آج سیدھے ہمارے گھر چلیں تو میں پہنچتے ہی آپ سے کہہ دوں گی کہ آپ جس وقت چاہیں واپس جاسکتے ہیں۔“

یوسف بولا: ”میں نے چچا جان کو خط لکھ دیا تھا، گاؤں سے کئی لوگ مجھے ریلوے اسٹیشن پر لینے آئیں گے۔ اگر میں نہ پہنچا تو امی جان سخت پریشان ہوں گی اور گاؤں کے لوگوں کو بھی بڑی اذیت ہوگی اور وادی جان کی تو یہ حالت ہوگی کہ وہ ہر گاڑی پر مجھے تلاش کرنے کے لیے دن رات کوئی نہ کوئی آدمی بھیجا کریں گی۔“

بیگم فریدہ نے کہا: ”بیٹا! اگر امی جان اور وادی جان کے انتظار کا مسئلہ ہے تو تمہیں ایک منٹ کے لیے بھی راستے میں نہیں رکتا چاہیے۔“

”کیوں نسرین؟“

نسرین نے پھر نانی سے لپٹ کر کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کچھ کہا۔

بیگم فریدہ نے کہا: ”بیٹا! نسرین کہتی ہے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ میں روٹ نہ جاؤں تو تمہیں اپنی امی جان سے اجازت لے کر بہت جلد ہمارے گھر آنا چاہیے۔ ماں نسرین یہ بھی کہتی ہے کہ وہ آپ کو اپنا ایڈریس لکھ دے گی۔“

یوسف نے کہا: ”یہ بہت ضروری ہے! اپنے بھوپچا کے گھر پہنچتے ہی میرے تھیلے سے میری نوٹ بک نکال لیجئے۔ میری کتابوں میں کسی کتاب کے شروع میں اپنے ابا جی کا نام اور گھر کا پورا پتہ لکھ دیجئے۔“

”واہ جی! اپنے گھر کا ایڈریس بھی کوئی ادھورا لکھ سکتا ہے؟“

عمو علی نے کہا: ”نسرین بیٹی بہت ہوشیار ہے، اس کے جو خط ہمارے گھر آتے ہیں۔ وہ پڑھ کر کسی کو یقین نہیں آتا کہ جو بچی چھٹی جماعت میں پڑھتی ہے وہ ایسے عمدہ مضامین لکھ سکتی ہے۔“

دوبارہ چلے گئے۔ جہاں گرمی میں دم گھٹ رہا تھا۔ جب اُس نے نانی جان کو بھی ڈاٹھنے کی کوشش کی تو یوسف بھائی جان نے اتنے زور سے — اتنے زور سے اُس کے منہ پر تھپڑ مارا کہ وہ پانی میں گر پڑا۔

نانی بولی: ”بس اب چپ ہو جاؤ باقی کہانی گھر جا کر سنا دینا۔“

عمو علی نے یوسف کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ”میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں اور اگر نیک شہرت آپ کی نیکی کا صلہ ثابت ہو سکے تو میں آپ کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ اگر تم نسرین کے ساتھ جالندھر تک جا رہے ہو تو وہاں پہنچتے پہنچتے کافی مشہور ہو جاؤ گے!“

ویسے ابھی تو یہ ابتداء ہوتی ہے۔ نسرین ہمارے گھر پہنچ کر جب روکیوں کو اپنے سفر کے حالات سنائے گی تو یہ داستان بہت دلچسپ ہوگی اور جالندھر تک پہنچتے پہنچتے سفر کے یہ واقعات الف بلید کی داستان بن جائیں گے۔“

یوسف نے کچھ دیر سوچ کر کہا: ”ہمارے راستے اول تو لاہور ہی سے جدا ہو جائیں گے۔ ورنہ یہ ہو سکتا ہے کہ امرتسر تک ہم ایک ہی گاڑی میں جائیں۔ جہاں سے بہر حال مجھے گاڑی تبدیل کرنی پڑے گی۔“

بیگم فریدہ احمد نے کہا: ”نہیں بیٹا! تم جالندھر تک ہمارے ساتھ جاؤ گے دو چار دن وہاں ٹھہرو گے! میرا مطلب ہے کہ جالندھر میں تمہاری میزبان نسرین ہوگی اور میں بھی تمہارے قیام کے دوران اسی کے والدین کے پاس رہوں گی۔“

نسرین نے جلدی سے کہا: ”نانی جان! یہ وہاں ضرور جائیں گے۔“

یوسف نے کچھ سوچ کر کہا: ”ماں جی! میں پھر کسی وقت حاضر ہو جاؤں گا اور جب تک نسرین خود سے یہ نہیں کہے گی کہ اب تم جاسکتے ہو۔ میں وہیں ٹھہروں گا۔“

نسرین نے نانی سے لپٹ کر اُن کے کان میں کچھ کہا اور وہ بولی: ”بیٹا! نسرین کہتی ہے:

”بیٹا آج تم خوب آرام کر سکتے ہو۔ محمود علی کہہ گیا تھا کہ گاڑی جس پر ہمیں آسانی سے جگہ مل سکے گی رات بارہ بجے کے بعد روانہ ہوگی۔ انٹر کلاس کی جو ہوگی روہڑی سے ٹرین کے ساتھ لگتی ہے وہ بعض اوقات خالی جاتی ہے اور سیکنڈ کلاس کے ڈبے سے بھی زیادہ آرام دہ ہوتی ہے۔ ریل گاڑی دیکھ کر اسٹیشن سے ضرورت کے مطابق ٹکٹ تبدیل کر دئے جاسکتے ہیں“

اگلی صبح یوسف نماز ادا کرنے کے بعد دوبارہ بستر پر لیٹ گیا اور خلافت معمول گہری نیند سو گیا۔ جب اُس کی آنکھ کھلی تو چند عورتیں اور لڑکے اُس کے گرد جمع تھے اور سرین اُن سے اُس کی بہادری کے تھتے بیان کر رہی تھیں۔ اُس نے پل بھر کے لیے آنکھیں کھولیں پھر شرمار کر جلد ہی بند کر لیں۔ خاتون خانہ نے کمرے میں داخل ہو کر کہا ”بھئی! شور نہ مچاؤ۔ ہمارا مکان بہت تھکا ہوا ہے“ دوسری عورت بولی ”بہن یہ شیر معلوم ہوتا ہے خدا اسے نظر بد سے بچائے۔ چلو لڑکیو! اسے آرام کرنے دو“

سرین نے کہا۔ ”آئی یہ تو اس وقت دیکھنے والے تھے جب انہوں نے دیو جیے ملاج کو تھپڑ مار کر پانی میں گرا دیا تھا“

سرین کشتی کے واقعات کی ایک ایک تفصیل دہرا رہی تھی۔
نانی جان اچانک کمرے میں داخل ہوئیں اور بولیں ”باتونی لڑکی! اب چپ کر اور انہیں جگا کر ناشتے کا پوچھ لو“ یوسف نے اسے امداد غیبی سمجھ کر کہا۔ ”ماں جی! میں جاگ رہا ہوں“

”اچھا بیٹا! خاتون خانہ نے کہا۔ ”میں آپ کا ناشتہ لاتی ہوں“
تھوڑی دیر بعد یوسف اطمینان سے ناشتہ کر رہا تھا اور سرین اُس کے بیگ سے نوٹ بک نکال کر اپنا ایڈریس لکھ رہی تھی۔ ایڈریس لکھنے کے بعد اُس نے یوسف کو دکھاتے ہوئے کہا۔

”آپ یہ پڑھ لیں گے نا؟“
”ارے! تمہاری ہیمنڈ رائٹنگ تو واقعی بڑی خوب صورت ہے، نوٹ بک اُسی طرح بیگ میں رکھ دو اور یاد رکھو: جب تک ہمارے راستے جدا نہیں ہوتے، اُس کی حفاظت تمہاری ذمہ داری ہے“
سرین کی نانی نے کہا۔

باب - ۷

تو ناول بن جاتا ہے۔ یعنی یہ ایک افسانہ تھا کہ یوسف بھائی کے کشتی پر سوار ہوتے ہی ایک ملاح کی شامت آگئی تھی۔ نانی جان جب ہم سیلاب سے نکل آئے تھے تو یہ افسانہ ختم ہو گیا تھا۔ لیکن نانی جان! جان بھاندھنا بھی بہت دور ہے۔“

بیگم احمد نے جھنجھلا کر کہا: ”یا تو فی لڑکی! میری سمجھ میں تمہاری کوئی بات نہیں آتی۔“

”نانی جان! خدا کے لیے آہستہ بات کریں، وہ سن لیں گے تو کیا کہیں گے؟“

”اری کیا سن لیں گے وہ!“

نانی جان! میں یہ کہنا چاہتی ہوں۔ اگر اسی قسم کے ایک دو واقعات اور پیش آجائیں، فرض کرو کوئی خوف ناک ڈاکو ہمارے ڈبے میں گھس آئے اور بھائی یوسف پھر ڈاکو کے ساتھ وہی سلوک کریں جو اُس دن دیو شتم کے ملاح کے ساتھ کیا تھا۔ یعنی: یہ اُسے اٹھا کر گاڑی کے باہر پھینک دیں تو کیا یہ کوئی ناول نہیں بن جائے گا؟“

نانی نے کہا: ”میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ اس وقت سو جاؤ۔ میں صبح یوسف سے تمہارے سوال کا جواب پوچھ دوں گی۔“

صبح کی نماز کے وقت یوسف گہری نیند سے بیدار ہوا۔ ریل گاڑی ایک اسٹیشن پر رُکی۔ اُس نے نیچے اتر کر پلیٹ فارم پہنچا اور نماز سے فارغ ہو کر اپنے کپارٹمنٹ میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک آدمی اور اُس کے ساتھ تین عورتیں اپنا سامان اٹھائے اندر داخل ہو رہے ہیں اور اُس کا ہاتھ اُن سے کہہ رہا ہے: ”بھئی دیکھو! یہ انٹر کلاس کا ڈبہ ہے۔“

جس آدمی سے وہ مخاطب تھا۔ اُس کا رنگ گہرا سیاہی مائل تھا اور شکل بھی اُس کی کافی کمزور تھی۔ وہ بوڑھے سکھ کو یوں جواب دینے لگا: ”بابا! تم تو اس طرح بات کرتے ہو جیسے یہ گاڑی تمہارے باب دادا کی ملکیت ہو۔ ہمارے پاس انٹر کلاس کا سرکاری

رات انہوں نے کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر کھڑکی کی سیر کی اور پھر تانگے پر دھری سٹیشن پہنچ گئے اور ایک آدھ گھنٹہ پہلے کراچی سے آنے والی ایک سیرس کے ساتھ لگنے والے انٹر کلاس ڈبے میں چلے گئے۔ وہاں وہ عمر رسیدہ سکھ جیسے انہوں نے کشتی میں دیکھا تھا پلیٹ فارم پر ٹھہر رہا تھا۔ اُس نے یوسف کو دیکھتے ہی کہا:

”کل مجھے گاڑی نہ ملنے کا افسوس تھا، لیکن اب میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں۔ تم مجھے بہت یاد آتے رہے ہو۔ میں سوچتا تھا کہ اگر میں نے تمہارا ایڈریس پوچھ لیا ہوتا تو کسی دن تمہارے بزرگوں کو سلام کرتا۔ پھر عمر رسیدہ خاتون کی طرف متوجہ ہوا۔

”بی بی جی سلام! یوسف صاحب آپ کے رشتے میں کیا لگتے ہیں؟“

”بھائی جی! اسے میرا بیٹا سمجھ لیں۔“

”بی بی جی! وہ تو میں سمجھ گیا ہوں۔ ایسا لڑکا ہر ماں کا بیٹا اور ہر بہن کا بھائی ہوتا ہے۔ آپ اس طرف آرام سے لیٹ جائیں۔ بابو کہتا تھا کہ اس گاڑی پر نئی سواریاں آنے کی امید نہیں۔ آپ اس طرف کی دونوں سیٹوں پر قبضہ کر لیں۔“

کا کا جی! تم میرے پاس اس سیٹ پر آ جاؤ اگر کوئی سواری آئی تو ہم اُسے یہاں بٹھالیں گے۔“

جب گاڑی روانہ ہوئی تو سب آہستہ آہستہ اپنی نانی سے باتیں کر رہی تھی۔

”نانی جان! ایک کہانی ہوتی ہے دوسرا افسانہ ہوتا ہے اور اگر زیادہ کہانیاں جمع ہو جائیں

پاس ہے اور کوئی ہمیں اس ڈبے میں سفر کرنے سے نہیں روک سکتا۔ اگر یقین نہیں آتا۔
تو ٹکٹ چیکر کو بلا کر پوچھ لو۔ میں ریلوے کو بیکانیر سے لیبر سیلائی کرتا ہوں اور مجھے ایک
افسر کے حقوق حاصل ہیں۔“

اتنی دیر میں دو آدمی کپارٹمنٹ میں داخل ہوتے اور ان میں سے ایک نے کہا
”اچھا ٹھیکیدار جی! اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو حاضر کر دی جاتے۔“

ٹھیکیدار نے کہا: ”نہیں تم جاؤ۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں! ویسے
ان کو یہ شک ہے کہ ہم انٹر کلاس میں سفر نہیں کر سکتے اس لیے گارڈ کو یہاں بھیج دینا!“
اُس نے اپنا پانڈان اور ایک بکس نسرین کے پاؤں کی طرف رکھ دیا اور وہ جلدی
سے اُٹھ کر اپنی نانی کے پاس بیٹھ گئی۔

سکھ نے کہا ”اُدھی ٹھیکیدار تم اس طرف آ جاؤ۔ میں نے پہچان لیا کہ تم ایک
باگڑی ہو۔“

باگڑی نے بے اعتنائی سے مڑ کر سکھ کی طرف دیکھا اور اپنی عورتوں کے ساتھ ایک
سر سے پر بیٹھ گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بھی نسرین اور کبھی اس کی نانی کی طرف دیکھ رہا
تھا اور انہوں نے نفرت سے اپنے سر کھڑکی میں سے باہر نکال رکھے تھے۔

کچھ دیر بعد ایک عورت اپنی جگہ سے اُٹھ کر نسرین اور اُس کی نانی کے پاس آ بیٹھی۔
پھر اُس نے پاؤں اُٹھا کر سینٹ پر رکھ لیے۔ نسرین نے دیکھا کہ اُس کے پاؤں میں چاندی کے
دو یا تین موٹے موٹے کڑے پڑے ہوئے ہیں جو اُس کی کلاتیوں کی طرح موٹے تھے! یہی
حال دوسری عورتوں کا تھا۔

یوسف ناول پڑھنے میں مشغول تھا پھر بھی کبھی کبھی وہ اُن کی حرکات دیکھ لیتا تھا۔
اگلے سٹیشن پر اُس نے اُٹھ کر پوچھا:

”ماں جی! آپ کے لیے ناشتہ لاؤں؟“
”ماں بیٹا! منگوا لو۔ نسرین کو جھوک لگ رہی ہو گی۔“

یوسف باہر نکل گیا۔ جب بیرا ناشتہ لے کر آیا۔ اُس نے باگڑی عورت
سے کہا: ”انہوں نے ناشتہ کرنا ہے۔ اس لیے آپ درمیان سے ایک طرف ہٹ
جائیں۔“

وہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھی اور دروازے کے پاس بیٹھ گئی۔
کچھ دیر بعد یوسف نے چائے پینے کے بعد اپنے تھیلے سے ایک کتاب نکالی
اور پڑھنے میں مشغول ہو گیا! اچانک اُس کی نظر دوسری طرف جا پڑی:
نسرین سر ایسنگی کی حالت میں اُٹھ کر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی اور اپنی موٹی ٹیسی
باگڑی عورت کی بجائے ٹھیکیدار خورد و ماں بیٹھا ہوا تھا۔

ایک ٹانے کے لیے یوسف کا سارا خون سمٹ کر اُس کے چہرے پر آ گیا۔ اُس نے
جلدی سے آگے بڑھ کر نسرین کی طرف دیکھا اور اُس نے اپنے دوپٹے کا وہ حصہ جس پر پان کی
پیک کا داغ لگا ہوا تھا سامنے کر دیا۔

باگڑی کے بچے! تمہیں ہر جگہ گندگی پھیلانے ہوئے شرم نہیں آتی۔ اُس نے غصے
سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

باگڑی نے جواب دیا ”تمہیں غصہ کس بات پر آ رہا ہے بابو! میں نے کھڑکی سے باہر
تھوکا تھا لیکن ہوا کے زور سے اس لڑکی کے باہر ٹکے ہوئے دوپٹے کا سرا تھوک کے سامنے آ
گیا تھا۔“

یوسف چلا یا۔ ”یہاں سے اُٹھو جلدی کرو۔“

باگڑی نے کہا: ”یہ گاڑی کسی کے باپ۔۔۔۔۔“

اور ابھی اُس نے اپنا فقرہ پورا نہ کیا تھا کہ ایک زوردار طمانچے کی آواز سنائی دی۔

یوسف نے کہا: "باباجی! میرے ذہن میں تو یہی آتا ہے کہ انہیں گاڑی سے اٹھا کر باہر پھینک دوں یا خود گاڑی سے پھلانگ لگا دوں!"

"ذرا اپنا کان میرے قریب کر دو"

یوسف نے فوراً اُس کے حکم کی تعمیل کی۔ سکھ نے کہا: "ان عورتوں کی زبان کی کنجی تمہارے ہاتھ میں ہے نذر کنجی گھماؤ۔ یہ عورتیں خاموش رہ جائیں گی۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ جو مزے سے بیت انخلا سے سر نکال نکال کر اپنی عورتوں کی کارگزاری دیکھ رہا ہے۔ اُسے پکڑ لو۔ وہی کنجی ہے۔ جب وہ دہاتی دے گا یہ خاموش ہو جائیں گی۔"

یوسف اطمینان سے آگے بڑھا۔ اُس نے ٹھیکیدار کو چوٹی سے پکڑ کر اٹھایا۔ ساتھ ہی اسے سکھ کی آواز سنائی دی۔

"او کا کا! ہشیار ہو جاؤ! اس کے ہاتھ میں چاقو ہے۔"

یوسف نے جلدی سے ایک طرف ہٹ کر اُس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی لیکن چاقو کی نوک اُس کے بازو کو زخمی کرتے ہوئے نیچے پھسل گئی۔

جواب میں یوسف نے یکے بعد دیگرے چند بھر پور شگے رسید کر دیے اور وہ نیچے گر پڑا یوسف نے پھر اسے اٹھایا اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں باگڑی کی ٹانگیں گاڑی کے اندر تھیں اور جسم کھڑکی کے باہر تھا۔ وہ کہہ رہا تھا: "اگر اب میں نے کسی عورت کی آواز سنی، تو تمہیں کھڑکی کے باہر پھینک دوں گا۔"

باگڑی چلا یا: "اری کم بختو! تم میری جان سے کبھی چھوڑو گی بھگوان کے لئے چُپ ہو جاؤ۔"

عورتیں جو پہلے ہی یوسف کی خون آلود قمیص دیکھ کر سہمی ہوئی تھیں ایک دم خاموش ہو گئیں۔

یوسف نے اُسے گردن سے پکڑ کر کھڑکیا اور پھر اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ سیدھا بیت الخلا میں جاگرا۔ کپارٹمنٹ کے اندر جو اچانک ایک سکوت طاری ہوا تھا اُس میں پہلی آواز بوڑھے سکھ کی سنائی دی:

"کا کا جی! آپ ادھر آ جاؤ! میں نے اس باگڑی کی شکل دیکھتے ہی یہ محسوس کر لیا تھا کہ یہ اُس ملاح سے زیادہ ہی بے وقوف ہے۔"

نسرین نے کہا: "نانی جان! مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ یہ قصداً ب ناول سے بھی زیادہ طویل ہو جاتے۔ یقیناً، یہ تو ان بھوتوں میں سے ایک ہے جن کے قصے سنا کر آپ مجھے ڈرایا کرتی تھیں۔"

باگڑی عورتیں جو ایک نانی کے لیے سہم کر رہ گئی تھیں یکایک گالیاں دینے لگیں اور ان گالیوں کا ہدف یوسف سے زیادہ نسرین اور اس کی نانی تھیں جو الفاظ یوسف کی سمجھ میں آسکتے تھے وہ ناقابل برداشت تھے۔ اُسے ایسی عورتوں سے لڑنے کا کوئی طریقہ معلوم نہ تھا۔ وہ غصے اور بے بسی کی حالت میں اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔

نسرین کی نانی باہر دیکھ رہی تھی اور نسرین اُس کی گود میں منہ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بوڑھے سکھ نے یوسف کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"کیوں بیٹیا! آخر لڑکے لڑکے ہی ہوتے ہیں نا!"

"باباجی! یوسف نے بے چارگی کی حالت میں کہا:

"اگر انہوں نے زبان بند نہ کی تو میں انہیں گاڑی سے باہر پھینک دوں گا۔"

"واہ کا کا جی! سکھ نے کہا اتنے چھوٹے سے کام کے لیے اپنی جان خطرے میں یوں

ڈالو گے؟"

اور دیکھو! پھر وہ بولا: "تمہاری عورتیں جو گندی زبان استعمال کرتی رہی ہیں۔ اس کی سزا یہ ہے کہ اس معصوم بچے اور ماں جی دونوں سے معافی مانگو ورنہ میں ایک منٹ سوچے بغیر ان چڑیلوں کو ایک ایک کر کے چلتی گاڑی سے نیچے پھینک دوں گا۔"

باگڑی چلا یا۔ "میری طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھتی ہو، ماں جی کے پاؤں پکڑ لو۔ وہ آگے بڑھ کر بیگم احمد اور کبھی نسرین کے آگے ہاتھ جوڑنے لگیں۔ "ماں جی! ہمیں معاف کر دو۔ ہم سے غلطی ہو گئی، ہم ایسا کبھی نہیں کریں گی۔"

الگے اسٹیشن کے آثار نظر آنے لگے۔ تو یوسف نے کہا۔ "بس! اب چپکے سے اتر جاؤ۔ ہمیں تنگ نہ کرو۔"

اور وہ لوگ گاڑی رکتے ہی ایک منٹ کے اندر اندر اپنے ساز و سامان سمیت غائب ہو گئے۔



بوڑھے سکھ نے کہا۔ "بی بی جی میں ڈاکٹر کا پتہ کرتا ہوں۔" چند منٹ بعد وہ واپس آیا تو بیگم احمد نے پوچھا: "کیوں باباجی! ڈاکٹر نہیں ملا؟"

"ہن جی! میں نے الگے اسٹیشن پر پیغام بھیج دیا ہے۔ ڈاکٹر وہاں موجود ہوگا۔"

بوڑھے سکھ نے کہا۔ "یوسف میں بی بی جی کو محض اطمینان دلانا چاہتا ہوں۔ ورنہ ڈاکٹر بھی دیکھے گا تو شاید بچی بدلنے کی ضرورت محسوس نہ کرے گا۔ علاج میرے پاس موجود تھا۔ لیکن ہن جی کو بتاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ اچھا! اب گاڑی چلنے والی ہے۔ الگے اسٹیشن پر میں ڈاکٹر کو لے کر ہمیں آ جاؤں گا۔"

جب بوڑھا سکھ اطمینان سے بیٹھ گیا تو یوسف نے کہا۔ "باباجی! میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ سکھ مسکرایا، "شکر گزار تو مجھے ہونا چاہیے جو تمہاری وجہ سے ایک چھوٹے سے کام کے لیے زندہ رہا۔ ورنہ اگر کشتی پر تم نہ ہوتے تو میں نے یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ

"یوسف تم فوراً ادھر آؤ۔" نسرین کی نانی نے جلدی جلدی اپنی گھڑی سے ایک دوپٹہ نکالتے ہوئے کہا۔

بوڑھے سکھ نے اٹھ کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "مجھے چار انگل چوڑی پٹی پھاڑ دیں۔ ابھی زخم کس کر باندھنے سے خون بند ہو جائے گا۔ اور اسٹیشن پر پہنچتے ہی ہم ڈاکٹر کو بلا لیں گے۔"

نسرین کی نانی نے پریشانی کے عالم میں دوپٹے سے ایک طرف کپڑا اتارنے کی بجائے لمبے رخ پٹی پھاڑ دی۔

سکھ نے پٹی پکڑتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے یوسف کا بازو پکڑا اور کہا: "کاجی! آپ ادھر میری کھڑکی کے قریب آجائیے! میں اطمینان سے پٹی باندھ لوں گا تو ڈاکٹر کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔"

سکھ نے یہ کہہ کر سیٹ کے نیچے سے اپنا بیگ نکالا۔ اس میں سے ایک بوتل نکالی۔ پھر پٹی کا ایک ٹکڑا اٹار کر بوتل کے سیال باو سے تر کرتے ہوئے کہا۔ "یہ قیمتی تحفہ میرے بیٹے نے دیا۔ میرا خیال تھا کہ کسی خاص آدمی کو پیش کر دوں گا! آپ کو تھوڑی سی تکلیف تو ضرور ہوگی۔ لیکن اس موسم میں اتنے گندے چاقو کے زخم کو کسی ایسی چیز سے ہی صاف کیا جاسکتا ہے۔"

کمرے میں بدبو پھیل چکی تھی اور یوسف کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ سردار جی کی قیمتی شے کیا ہے؟

یوسف نے اپنے چہرے سے تکلیف ظاہر نہ ہونے دی اور باگڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"میں نہیں چاہتا کہ اس سفر میں میرے ہاتھ تم جیسے بد صورت آدمی کے خون سے رنگے جائیں اس لیے اپنا سامان اٹھا کر دروازے میں رکھ لو اور جو نہی الگ اسٹیشن آتے، اس کپڑے منٹ سے دفع ہو جاؤ۔"

شاید میری زندگی کا سفر ختم ہو گیا ہے۔“

انگلے شیش پر ڈاکٹر کیا ونڈر اور شیش ماسٹرینوں اس کے ڈبے میں پہنچ گئے۔
باہر پولیس کا ایک تھانیدار اور پولیس مین ریلوے شیش پر کھڑے تھے۔ ڈاکٹر نے پٹی کھول کر
زخم دیکھا اور مطمئن ہو کر کہا۔ ”زخم صاف کر کے دوبارہ پٹی کر دیتا ہوں۔ ٹانگے لگانے کی ضرورت
نہیں پڑے گی۔ احتیاطاً ایک ٹیکہ بھی لگا دیتا ہوں۔ یہ زخم بہت جلد مندمل ہو جائے گا۔
آپ کو چند گولیاں بھی دے جاتا ہوں۔“

بوڑھے سکھ نے کہا۔ ”ماں ڈاکٹر صاحب بھگوان آپ کا بھلا کرے۔ ٹیکہ ضرور لگائیے۔
زخمی کرنے والا بہت گنہگار تھا۔“

تھانیدار نے اندر گھسے ہوئے کہا۔ ”پرچہ کون لکھوائے گا اور ملزم کہاں ہے؟“
سکھ نے کہا۔ ”تھانیدار جی! آپ بہت دیر سے آتے ہیں اب تو کوئی بخومی ہی بتا
سکتا ہے کہ ملزم کہاں ملے گا؟“

آپ اپنی رپورٹ میں لکھ سکتے ہیں کہ ملزم نے بھلگنے سے پہلے جرم کی معافی مانگ لی تھی۔“
تھانیدار نے سوال کیا: کس سے معافی مانگی تھی؟“
”ہم سے جناب!“

تھانیدار نے جھنجھلا کر کہا۔ ”یہ کیا بات ہوئی؟“
زخم کسی کو آتا ہے اور معاف دوسرے کرتے ہیں۔“
سکھ نے کہا: ”تھانیدار جی! آپ تلخی سے بات نہ کریں۔ یہاں کا کاجی کی ماں جی بھی
بیٹھی ہوئی ہیں۔“

”کاجی کون ہے؟“ تھانیدار نے پوچھا۔

”یہی جس نے اُس پاگل ٹھیکیدار کو اُس کی بدزبانی کی سزا دی تھی۔“

”سردار جی! آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ پاگل ٹھیکیدار کون؟“

”جی پاگل ٹھیکیدار وہی تھا جس نے کاجی کو زخمی کیا تھا۔“

پھر مار بھی کھائی، توبہ بھی کی اور بھاگ بھی گیا۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ اُسی نے چاقو مارا تھا؟“

”تھانیدار جی! میں شروع سے یہی کہہ رہا ہوں۔ اب تو شاید وہ واپس بیکانیر جا چکا ہوگا۔“

تھانیدار نے دوبارہ سوال کیا۔ ”سردار جی! آپ سیدھی طرح کوئی بات نہیں بتا سکتے۔“

”تھانیدار جی! اگر مجھے یہ معلوم ہے کہ وہ بیکانیر کا رہنے والا ہے تو میں اس کے سوا

کیا سوچ سکتا ہوں کہ وہ واپس بیکانیر چلا گیا ہوگا؟“

”آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ بیکانیر کا رہنے والا ہے؟“

”جناب! وہ خود ہی تو یہ کہتا تھا اور راستے میں جو لوگ اُس سے ملنے آتے تھے ٹھیکیدار جی

کہہ کر اُسے سلام کرتے تھے! وہ بیکانیر کے باشندے معلوم ہوتے تھے۔ تین عورتیں اس
کے ساتھ تھیں۔ جن میں سے ہر ایک نے کم از کم ایک ایک سیرچائی ہیں رکھی تھی وہ بھی اپنے
دبے سے باگڑی عورتیں معلوم ہوتی تھیں اب میں اگر کوئی پولیس کا چھوٹا موٹا آفیسر ہوتا تو
شاید میرا دماغ سب سے طریقے سے نہ سوچتا اور میں یہ سمجھتا کہ یہ لوگ کسی اور علاقے کے باشندے
ہیں اور مجھے میری آنکھیں دھوکا دے دیتیں۔“

اس پر سب ہنس پڑے اور تھانیدار نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”سردار جی! آپ میری

عمر کے ہیں اور میں آپ کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔“

سکھ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”تھانیدار جی! جواب دینے کے لیے یہ جگہ ٹھیک بھی

نہیں۔“ یہ چھوٹا سا شیر ہے ناں! میں اس کے ساتھ بڑی دور سے سفر کر رہا ہوں اور میں

دوبارہ نہ لکھ چکا ہوں کہ جب کوئی بدتمیزی سے گفتگو کرتا ہے تو بڑی تیزی سے اس کے ہاتھ

حرکت میں آجاتے ہیں۔ آپ کو میں یہ بتا سکتا ہوں کہ وہ مجرم جس نے اس پر چاقو سے حملہ

کیا تھا، ریلوے کے سرکاری پاس پر سفر کر رہا تھا۔ زیادہ پان کھانے سے اُس کے دانت سیاہ

ہو چکے تھے اور اُس کے ساتھ جو تین عورتیں سفر کر رہی تھیں۔ وہ بھی پان کھاتی ہیں اور خوب تھوکتی ہیں۔

ٹیشن ماسٹر نے تھانیدار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تھانیدار صاحب! آپ کو وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ مجرم ایک خطرناک آدمی معلوم ہوتا ہے۔ آپ کی کوشش یہی ہونی چاہیے کہ وہ بھاگ نہ سکے۔“
”میں ابھی فون کرتا ہوں“ تھانیدار نے مڑتے ہوئے کہا۔
”ماں بھائی صاحب فون ضرور کیجئے۔“ سکھ نے کہا۔

ڈاکٹر اور اُس کا معاون بھی گاڑی سے اتر گئے اور جاتے ہوئے ڈاکٹر نے یوسف کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”یوسف صاحب! اب آپ آرام سے لیٹ جائیں۔ میں پولیس سے بھی کہہ دوں گا۔ کہ اس ڈبے میں ایک ایسی سواری ہے جسے کسی پاگل نے زخمی کر دیا ہے۔ اس لیے کسی اور کو راستے سے نہ بٹھایا جائے۔“



بیگم فریدہ احمد نے گاڑی سے کہا: ”بھائی! ڈرائنگ کار والے سے کہہ دیں کہ ٹھیک بارہ بجے ہم سب کا کھانا یہیں بھیج دیا جائے۔“
گاڑی نے پوچھا: ”ان سردار صاحب کے لیے بھی کھانا بھیج دیا جائے؟“
”سکھ نے جلدی سے جواب دیا۔“ نہیں بی بی جی! صبح میں ناشتے کے وقت پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا۔“

بیگم احمد نے کہا: ”اچھا، میرے سے کہنا کہ ان کے لیے ٹھنڈے دودھ کا ایک جگ لیتا آئے، چینی ڈال کر۔“
”سکھ نے کہا۔“ بہن جی دودھ ایسی چیز ہے جس سے میں انکار نہیں کر سکتا۔“

دوسری سیٹ پر یوسف لیٹ گیا اور بیگم احمد نے کہا۔
”بیٹا! زخم میں کوئی تکلیف تو نہیں؟“
”جی نہیں!“

نسرین بولی۔ ”ڈاکٹر کی دو گولیاں ابھی کھائیجیے۔ میں پانی لاتی ہوں۔“
اُس نے پانی کا گلاس لا کر پیش کیا!

یوسف نے گولیاں منہ میں ڈال کر پانی کا گھونٹ لیا اور پھر لیٹ گیا۔
نسرین بولی: یوسف بھائی! ٹیکے سے آپ کو درد ضرور ہوا ہوگا۔ جب انہوں نے ٹیکے کی سوئی آپ کے جسم میں چھبوتی تھی تو نانی جان نے فوراً دوسری طرف منہ پھیر لیا تھا اور میں اگر آنکھیں بند نہ کر لیتی تو شاید میری چیخ نکل جاتی۔ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو سوئی ابھی تک آپ کے بازو میں تھی۔ اور آپ آرام سے لیٹے ہوئے تھے۔ پھر میری طرف آپ نے دیکھا اور مسکراتے لگ گئے۔ بھلا اس میں مسکراتے کی کون سی بات تھی!

یوسف نے لیٹے لیٹے اپنا ہاتھ اُس کے سر پر رکھ دیا اور اُس کے بالوں سے کھیلنے ہوئے کہا: ”تمہیں براہ خوف زدہ دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی تھی۔“

”یعنی آپ کو درد بالکل نہیں ہوا۔“

”ہوا تھا لیکن اتنا ہلکا کہ میں نے محسوس بھی نہیں کیا۔“

”یہ سچ کہتی ہوں کہ خوف ناک سوئی دیکھ کر تو نانی جان بھی ڈر گئی تھیں۔“

”جب سوئی پتھون کو چھبوتی جائے لگے تو ماتیں ڈر جاتی ہیں۔ اگر میری ماں یہاں ہوتی تو شاید وہ ڈاکٹر کو برا بھلا کہنا شروع کر دیتی۔“

”لیکن یہ تو میری نانی جی ہیں۔“

”ماں کی ماں کا دل ماں سے بھی زیادہ نرم ہوتا ہے۔“

نسرین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا: ”میں آپ کا سرد یا دوں۔“

اشاعت مضمون یا افسانہ لکھنے نہیں دیتے تھے“
 نسرین کی نانی نے کہا۔ ”کیوں بیٹا! ایک پڑھے لکھے آدمی میں اتنا تعصب تو
 نہیں ہونا چاہیے“

یوسف نے کہا: ”میں نے ایف اے کا امتحان دینے سے پہلے ایک ناول لکھنا شروع کر دیا
 تھا۔ جسے میں آبا کے خوف سے چھپ چھپ کر لکھا کرتا تھا لیکن میں نے ابھی چند صفحات
 ہی لکھے تھے کہ ایک دن وہ اچانک میرے کمرے میں آگئے اور میں لکھے کاغذ چھپانے کی
 کوشش میں پکڑا گیا۔ انہوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ میں نے کیا لکھا ہے۔ اگر وہ پڑھ لیتے
 تو شاید واپس چلے جاتے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ چند صفحات بار بار پڑھوا کر سنتے مگر انہوں
 نے سارا مسودہ پرزہ پرزہ کر ڈالا اور میرے لیے غصہ پی جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا“
 نسرین نے کہا: ”میں آپ کے لیے دعا کیا کروں گی کہ اللہ تعالیٰ آپ کے لیے آپ
 کے آبا جان اور خاندان کے ہر آدمی کا دل نرم کر دے اور یہی دعا میری نانی جان، میرے آبا
 اکی، اور ہم سب آپ کے لیے کیا کریں گے“

”وہ کیوں؟“
 ”میں نانی جان کا سر دبایا کرتی ہوں اور اُمّی اور آبا کا بھی۔ اور کبھی کبھی اُمّی میرا سر دبایا
 کرتی ہیں!“
 ”مجھے سر دبانے کی عادت نہیں!“

”اگر کوئی مجھ جیسی بہن ہوتی تو آپ کو یہ عادت پڑ جاتی۔“
 ”اگر تم جیسی بہن ہوتی تو کئی ایسی عادتیں پڑ جاتیں جو اس وقت میرے ذہن میں بھی
 نہیں آتیں۔ مثلاً مجھے پڑھنے اور سوچنے کے ساتھ باتیں کرنے کی عادت بھی پڑ جاتی۔“
 ”آپ کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں سچ مجھ آپ کی بہن ہوتی اور ہمیشہ آپ کے پاس ہوتی
 تو آپ باتیں زیادہ کیا کرتے اور بڑا سیان بھی ہم بہت کیا کرتے۔“
 یوسف ہنس پڑا: ”یہ تمہاری بات تو میں کبھی بھی نہیں بھول سکوں گا۔ کہ تم مجھے ایک
 رٹا کا گنوا کر سمجھتی ہو۔“

”بالکل نہیں بھائی جان، آپ مجھے لڑتے ہوئے بھی بہت اچھے لگتے ہیں۔ میں آپ
 کے لیے یہ دعا کیا کروں گی کہ جب آپ ابھی کتا ہیں لکھا کریں تو ساری دنیا انھیں پسند کرے
 اور نانی جان بھی آپ کے لیے دعا کیا کریں گی۔“

”ماں جی! یوسف نے بیگم احمد کی طرف متوجہ ہو کر کہا: مجھے آج کل نیک لوگوں کی دعاؤں
 کی سخت ضرورت ہے۔ میری مصیبت یہ ہے کہ لوگ قلم سے روزی کمانا ممکن قرار دیتے
 ہیں اور — میری خواہش ہے کہ اپنا حلال رزق اس فن سے تلاش کروں۔“
 بیگم احمد نے یوسف کی جانب پورے انہماک سے دیکھا تو وہ انہیں ہمدرد
 پا کر کہنے لگا:

”میری بھینسی تو یہ ہے کہ میرے آبا جان بھی یہ برداشت نہیں کرتے کہ میری کوئی تحویہ
 کسی اخبار یا رسالے میں شائع ہو۔ وہ مجھے پڑھنے سے نہیں روک سکے لیکن مجھے کوئی قابل

باب - ۸

ریل گاڑی ملتان سے چلی تو بوڑھے سکھ نے کہا -

”کاجی! میرا نام جگت سنگھ ہے۔ خانیوال سے میں نے دوسری لائن پر جانا ہے

میرا پتہ شاید تمہیں زبانی یاد نہ رہے اس لیے میں اسے اخبار پر لکھ دیتا ہوں۔“

یہ کہتے ہوئے جگت سنگھ نے اخبار کو تھکایا ایک خالی جگہ پر چند الفاظ لکھنے کے

بعد یوسف کو اخبار دیتے ہوئے کہا: ”کاجی! اگر کبھی آپ اجالا آئیں تو مجھے ضرور ملیں۔

میرا گاؤں بڑیا سے بہت نزدیک ہے اور اجالا میں میری دو دکانیں بھی ہیں۔ وہاں کسی کے

سامنے میرا نام لے لیں۔ وہ آپ کو ہمارے گھر پہنچا دے گا۔“

”تمہارا ضلع گورداسپور ہی ہے نا؟ وہ بھی ہمارے گاؤں کے قریب ہے۔“

”جی ہاں۔“

”میں تمہاری باتوں سے سمجھ گیا تھا۔“

”میرا خیال ہے کہ تمہارے گاؤں کے کہیں آس پاس ہمارے کئی رشتے دار رہتے

ہیں؟“

”سردار جی میرا گاؤں دھاری وال ٹیشن سے قریب ہے۔“

”..... اد کا کاجی آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ آپ میاں عبدالرحیم کے بیٹے

ہیں۔“

یوسف نے کہا۔ ”جی ہاں اگر میں کبھی راوی کی طرف آیا۔ تو آپ کو سلام عرض

کرنے ضرور آؤں گا۔“

جگت سنگھ بولا ”بیٹا! تمہاری کچھ باتیں میرے کانوں تک پہنچی ہیں۔ مجھے

نہیں معلوم۔ تم کی لکھنا چاہتے ہو۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ بھگوان اچھے انسان بنانا ہے

وہ ان کی اچھی خواہشات بھی پوری کرتا ہے۔ اگر تم کسی چیز کو اچھا سمجھتے ہو۔ تو ڈٹے رہو اور

اس بات کی پرواہ نہ کرو کہ دنیا کیا کہتی ہے۔“

یوسف نے کہا۔ ”سردار جی! مجھے یقین ہے کہ کسی دن ہر اچھا آدمی میری کتابیں

پڑھ کر خوش ہوگا۔“

کچھ دیر وہ خاموش بیٹھے رہے۔ بالآخر یوسف نے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔ ”سردار جی!

شاید خانیوال قریب آ رہا ہے۔“

جگت سنگھ نے کہا۔ ”تم اطمینان سے بیٹھے رہو اور پلیٹ فارم کی طرف کوئی دروازہ

یا کھڑکی نہ کھولو۔ ورنہ بہت رش ہو جائے گا۔ میں کچھلی طرف سے اتر جاؤں گا اور یہ

خشش کروں گا کہ اس ڈبے سے لوگوں کا ہجوم روکنے کے لیے پولیس کی مستعدی میں

فرق نہ آتے۔“

”بی بی جی! سلام! چھوٹی شہزادی جی سلام۔“

جگت سنگھ اپنا بیگ اٹھا کر پچھلے دروازے سے اتر گیا۔

بیگم احمد ذرا سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں اور کچھ دیر کے لیے کبھی یوسف اور کبھی نسرتین

کی طرف دیکھتی رہیں۔ انہیں دلوں کے لیے یکساں پیارا آتا تھا اور وہ دونوں کے

مستقبل کیلئے یکساں دعائیں کر رہی تھیں۔ اچانک انہوں نے پوچھا۔

”یوسف بیٹا! کیا یہ ہو سکتا ہے کہ چند دن تک تم جالندھر آؤ اور تمہاری اتنی جان

بھی تمہارے ساتھ ہوں؟“

میں یہ چاہتی ہوں کہ تمہاری اور نسرتین کی اتنی میری زندگی میں ایک دوسرے

کی سیلیاں بن جائیں۔“

بیگم فریدہ احمد نے کچھ دیر خاموشی کے بعد کہا: نسرین بیٹی! کوڑے مجھے گلاب کے عطر کی خوشبویاں تحفے میں ملی تھیں اُن میں سے ایک نکال کر یوسف کے سوٹ کیس میں رکھ دو۔ تاکہ اپنی اتنی جان کے پاس میری طرف سے یہ تحفہ لے جائے۔ اس بیگم میں نہیں! سوٹ کیس کے اندر!“

”سنبھال کر رکھنا! کہیں توڑ نہ دینا!“

نسرین نے اُٹھ کر نانی اماں کا کبس کھولا۔ اُس میں سے ایک عطر گلاب کی شیشی نکالی اور وہ ریشم کے رومال میں لپیٹتے ہوئے یوسف سے کہا۔ ایسا سوٹ کیس کھول دیجئے۔ تاکہ میں احتیاط سے وہاں رکھ دوں

یوسف نے سوٹ کے نیچے پڑا ہوا سوٹ کیس نکال کر کھول دیا اور نسرین نے عطر کی شیشی اُس کے اندر رکھتے ہوئے کہا۔ ”بھائی جان جب آپ گھر جا کر سوٹ کیس کھولیں تو سب سے پہلے یہ شیشی نکالیں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی نوکر کی بے احتیاطی سے گر کر ٹوٹ جائے!“

”شہزادی صاحبہ آپ فکر نہ کریں۔ میں اپنی جان سے زیادہ ماں جی کے تحفے کی حفاظت کروں گا۔“

نسرین کی نانی نے نیکی پر سر رکھتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں تھیں

یوسف نے پہلے اخبار اٹھایا جس پر سکھ مسافر نے اپنا ایڈریس لکھا تھا۔ اسے بے توجہی سے اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر اسی طرح تہہ کر کے رکھ دیا۔ اُس کے بعد اُس نے اُٹھ کر اپنے بیگ سے ایک کتاب نکالی اور پڑھنے میں منہمک ہو گیا۔ گاڑی ایک سٹیشن پر رکی۔ وہ جلدی سے نیچے اُترا اور تھوڑی دیر بعد جب پلیٹ فارم کے نل سے وضو کر کے واپس آیا، تو کمپارٹمنٹ میں تین سواریاں جن میں سے دو ہندو اور ایک کوئی مسلمان زمیندار معلوم ہوتا تھا بیٹھ گئی۔ ایک ہندو اور ایک زمیندار خالی سیٹ پر اس طرح بیٹھے کہ جس جگہ چار

سواریاں آسکتی تھیں وہ صرف دو کے لیے کافی معلوم ہوتی تھیں۔ تیسرے کو باقی دو سیٹوں پر ایک عورت اور ایک بچہ کا آرام سے سونا پسند آیا اور اُس نے جھجک کر نسرین کا بازو ہلاتے ہوئے کہا۔

”او کالی! یہ سونے کا وقت نہیں ہے!“

”یوسف نے اُس کا بازو جھنجھوڑ کر پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا!“

”سامنے اُس سیٹ پر دو آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔ تم بچوں کو کیوں تنگ کرتے ہو؟“

ہندو کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اُس کے ساتھی نے ایک طرف کھسک کر سیٹ کا دُعا حصہ خالی کر دیا، جہاں یوسف کی کتاب اور اخبار پڑا ہوا تھا۔ یوسف نے کہا: جانیے وہ سیٹ خالی ہے۔ میں بیٹھے بیٹھے تنگ کیا ہوں اور کچھ دیر کھڑا رہنا چاہوں گا۔ بیٹے نے آگے بڑھ کر کتاب اور اخبار ایک طرف کر دیے اور اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اتنی دیر میں گاڑی چل پڑی۔

اس عرصے میں بنیا جس جگہ پر بیٹھا ہوا تھا وہاں سے اُٹھا اور اخبار اٹھا کر پڑھنے لگا! وہ ایک مسلمان کے پاس ایسا اخبار دیکھ لینا بھی کامیابی سمجھتا تھا۔ جس پر گاندھی ابوالکلام آزاد اور دوسرے کانگریسی لیڈروں کی تصویریں نمایاں تھیں۔

اُدھر انگریزی کی کتاب پر ایک نظر ڈال کر وہ پہلے ہی مرعوب ہو چکا تھا۔

اُس نے دوسرے ہندو ساتھی سے کہا۔

”سیٹ نارائن! اس! میں نیشنلسٹ مسلمان کو دیکھتے ہی پہچان لیتا ہوں!“

یوسف نے کہا۔ ”میں ایک مسلمان ہوں اور ایک مسلمان پہلے بھی مسلمان ہوتا

ہے اور بعد میں بھی مسلمان ہوتا ہے۔“

زمیندار بولا! بابو جی! میں تو ایک گنوار آدمی ہوں، یہ ہمارے پنڈت دگپار

جب کسی مسلمان پر خوش ہوتے ہیں تو اُسے نیشنلسٹ یا قوم پرست کہہ کر تھپکی دیتے ہیں۔ آپ سمجھائیں اس کا مطلب کیا ہے؟

یوسف نے جواب دیا: ”چوہدری جی! پنڈت صاحب کی تھپکیاں کئی مسلمانوں کو لے ڈوبیں گی اور ہندوؤں کا تو بالکل ستیاناس کر دیں گی۔“

پنڈت درگا پرشاد نے فوری طور پر موضوع بدلتے ہوئے کہا: ”میاں جی! آپ اس اخبار میں چند بھگتوں کی تصویریں دیکھ کر غصے میں آگئے یا کوئی اور بات ہے؟“

یوسف نے جواب دیا: ”پہلے میں چوہدری صاحب کے سوال کا جواب دیتا ہوں۔“

”چوہدری صاحب اگرچہ میری عمر اور تجربہ زیادہ نہیں ہے۔ پھر بھی اس بات کا یہ جواب دے سکتا ہوں کہ یہ دونوں الفاظ ان لوگوں کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں جو برہمنی سیاست کا مکروہ چہرہ پھپھانے کے لیے نقاب کا کام دے سکیں۔ اب پنڈت جی کے سوال کا جواب یہ ہے کہ اس اخبار میں ہندو دیش بھگتوں کے علاوہ اُن مسلمانوں کی تصویریں بھی دی گئی ہیں جن سے کانگریس باور داری کا کام لیتی ہے اور شاید آپ کے ساتھیوں نے میرے پاس یہ اخبار دیکھ کر سمجھ لیا تھا کہ میں بھی ان کی پسند کا جانور ہوں۔“

”اصل میں یہ اخبار ایک سکھ کے پاس تھا اور میرے پاس اس لیے پڑا ہوا ہے کہ اس پر اس کا ایڈریس لکھا ہوا ہے۔“

سیٹھ نرائن داس نے کہا: ”بابو جی! پنڈت درگا پرشاد نے آپ کو نیشنلسٹ کہا ہے کوئی گالی تو نہیں دی۔“

یوسف نے کہا: ”پنڈت جی بے وقوف نہیں۔ اور ایک عقل مند آدمی کو گالی دینے سے پہلے بہت کچھ سوچتا ہے۔“

زمیندار جس کا نام چوہدری الٹا بخش تھا۔ قہقہہ لگا کر بولا: ”میرا خیال ہے کہ عقل مند آدمی بحث شروع کرنے سے پہلے ہی یہ سوچ لیتا ہے کہ جس کے ساتھ بحث کرنے لگا ہوں۔ وہ کیا ہے؟ ورنہ اب تک پنڈت جی وہ ساری باتیں دہرا چکے تھے۔ جو وہ ہم سے کیا کرتے ہیں۔“

”جی ہاں!“

”میں اُسی وقت سمجھ گیا تھا۔ جب نرائن داس نے وہ کتاب کھول کر فوراً بند کر دی تھی۔ اگر اُس میں سے کوئی بات اُن کی سمجھ میں آجاتی تو یہ ہمارا سر کھا جاتے۔ میں نے دیکھا ہے کہ جب یہ ہندو اخبار قائد اعظم کے کوئی کارٹون شائع کرتے ہیں یا مسلمان لیڈروں کو بُرا بھلا کہتے ہیں تو سیٹھ نرائن اس خوشی سے بھولے نہیں سکتے اور کچھ پرچے خرید کر بانٹ دیا کرتے ہیں۔“

پنڈت درگا پرشاد نے کہا: ”چوہدری جی! ہمیں ایسے جھگڑوں سے کیا فائدہ ہمیں آپس میں شانتی اور پریم سے رہنا چاہیے۔ یہ دنیا چار دن کا میلہ ہے۔“

یوسف بولا: ”اور چار دن کے میلے کی ساری خوشی صرف پنڈت جی کے لیے ہے یا کسی اور کا بھی حصہ ہے؟“

”پنڈت جی یہ کب کہتے ہیں کہ کسی اور کا حق نہیں!“

”کتنے بھولے ہیں آپ؟ انگریز نے ابھی اپنا بستر پیٹا نہیں اور آپ اپنا بچھونا ڈالنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔“

ہمیں وہ شانتی اور پریم کا سبب دیتے ہیں اور خود انگریز سے خفیہ سودے بازیاں ہو رہی ہیں؛ کہ آپ نہ صرف اپنی سنگینیں ہمارے حوالے کر دیں بلکہ مسلمانوں کو اس طرح کس کر باندھ دیں کہ جب ہم انھیں قتل کرنا چاہیں تو وہ اپنی گردن تک نہ ہلا سکیں۔“

نرائن داس نے کہا: جن لوگوں نے بھارت ماتا کی آزادی کے لیے قربانیاں دی ہیں

میں ایک دیہاتی ہوں۔ میں نے بھارت کے برہمنوں کا مسلمانوں سے شوروں کا سا سلوک دیکھا ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ بنیا سا ہر کار غیر ہندوؤں کو کس طرح دونوں ہاتھوں سے لوٹتا ہے۔

میں نے ان مذہبی، اخلاقی اور سیاسی اداروں کا بھی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے جن کی بنیاد ہی نفرت پر رکھی گئی ہے۔ گاندھی اور اس کے چیلے ہندوستان پر حکمرانی کا جو خواب دیکھ رہے ہیں۔ اُس کا ماضی اس نفرت کی سیاہی میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہ بیسویں صدی کی تیز رفتار مشینوں کی جگہ پتھر اور دھات کے انتہائی مکروہ ترین ادوار کو واپس لانا چاہتے ہیں۔

چوہدری اللہ بخش نے کہا: میاں جی! میں نے کل واپس آنا تھا لیکن سیٹھ نارائن اہل مجھے آج ہی کھیچ لائے، شاید اس لیے کہ اللہ نے آپ سے ملاقات کروانی تھی جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ آپ سے باتیں کرنے کا بڑا لطف آیا کہ اب یہ لوگ پاکستان کے خلاف کچھ سوچ سجد کر بات کیا کریں گے۔ اگر مسلمان قوم میں آپ جیسے پندرہ بیس اور نوجوان موجود ہوتے تو پھر پاکستان بن کر رہے گا۔

چوہدری جی! آپ اطمینان رکھیں پاکستان کا ہر شہری مجھ جیسا ہی ہوگا۔

چوہدری اللہ بخش نے اخبار سے کاغذ کا ایک پرزہ پھاڑتے ہوئے کہا۔

”میاں جی! اگر یہ اخبار ایڈریس لکھنے کے کام آتا ہے تو میں بھی اپنا ایڈریس لکھ دیتا ہوں! جب کبھی آپ فخری (ساہیوال) آئیں تو مجھے ضرور ملیں۔ ہماری زمین بالکل شہر کے قریب ہے اور عام رہائش شہر میں ہے۔ اور اب بھی اگر آپ وہاں پہنچ سکیں تو ہمارے گھر تک ہاسانی آجائیں گے۔“

یوسف نے کہا: چوہدری صاحب! اس وقت تو ممکن نہیں پھر کبھی ملنے کی کوشش کروں گا۔ اور ضرور ملوں گا۔“

اُن پر ایسے الزام لگانا پاپ ہے! میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک پڑھے لکھے نوجوان کی زبان سے ایسے الفاظ نکل سکتے ہیں۔ کیا آپ کے خیال میں یہ قوم پرست مسلمان جنہوں نے آزادی کی جنگ میں جیل خانوں کی سختیاں برداشت کی ہیں اور یہ سکھ جو ہمیشہ آزادی کی جنگ میں دوسروں سے دو چار قدم آگے ہوا کرتے ہیں سب بے وقوف ہیں؟ یوسف نے کہا: ”نیشنلسٹ مسلمان اُس ہندو کا لگرس کے چہرے کے نقاب ہیں جس نے یہ سمجھ لیا ہے کہ گوراشاہی کے بعد بنیا اور برہمن شاہی قائم ہو جائے گی۔ نقاب دُنيا کو دھوکا دینے کے لیے ہوتا ہے۔ اسے اپنا کام لینے کے بعد اُٹ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ یہی بات سکھوں کی! تو۔۔۔ ان کے متعلق میں یہ مانتا ہوں کہ تم ان کے دل و دماغ میں بُری طرح گھس گئے ہو، لیکن وہ دن دور نہیں جب ان کے اندر بھی ایسے لوگ پیدا ہو جائیں گے، جو مکرو فریب کے ان گنت نقابوں میں تمہارے چہرے کے گھناؤنے خد و خال پہچان لیا کریں گے، لیکن وقت شاید بہت دیر سے آئے، بعض بد نصیب قومیں اُس وقت خواب غفلت سے بیدار ہوتی ہیں جب دشمن انہیں آہنی زنجیروں میں جکڑ لیتا ہے۔ یا اپنا خنجر اُن کے سینے پر رکھ لیتا ہے اور وہ اتنے بے بس ہو جاتے ہیں کہ اگر وہ چیخا بھی چاہیں۔ تو اُن کے حلق سے آواز نہیں نکلتی۔“

بابو جی! آپ کہاں پڑھتے ہیں؟

”میں اسلامیہ کالج کا طالب علم ہوں۔“

پنڈت درگا پرشاد نے کہا: ”میرا بھی یہی خیال تھا کہ ایسے نئے خیالات صرف وہاں پڑھنے والوں میں پیدا کیے جاتے ہیں۔“

”یوسف بولا: ”پنڈت جی! اگر آپ اسلامیہ کالج کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں۔“

تو اُس کے لیے آپ کو عقل کی ضرورت نہیں۔ میں نے غیہ اور برہمن ذہنیت کے متعلق جو

معلومات حاصل کی ہیں وہ مجھے اسلامیہ کالج سے نہیں بلکہ باہر سے حاصل ہوتی ہیں:

کیا اُسے؟

"نہیں!" ————— نسرين بولی، "انہوں نے خود ہی اُس کی مرمت کر دی تھی

اور وہ گاڑی سے اتر کر بھاگ گیا تھا۔"

گاڑی سے اترتے ہی نارائن داس نے پنڈت درگا پرشاد سے کہا۔

"پنڈت جی! آج آپ بچ گئے۔ ورنہ جب اپنی جگہ بنانے کے لیے تم مجی کو اٹھا

رہے تھے۔ اُس نے تمہاری طرف اس طرح دیکھا تھا، جیسے وہ تمہیں کچا کھا جائے گا۔"

نسرين نے پانی کا ایک گلاس اور حقیراس سے ایک برت کی ڈلی نکال کر اُس میں

ڈالنے کے بعد یوسف کو پیش کرنے ہوئے کہا "لیجیے! آپ کو پیاس لگ رہی ہے۔"

یوسف ایک ہی سانس میں سارا گلاس پی گیا اور پھر اُس نے پوچھا۔ "ایسا در لیجیے۔"

"شکر یہ لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ مجھے پیاس لگ رہی ہے؟" نسرين نے جواب

دیا۔ "واہ جی! اس کے لیے بھی کچھ سوچنے کی ضرورت ہے؟ آپ اتنی دیر کھڑے تقریر کر رہے

تھے۔ گرمی تھی اور پکھا آپ سے دُور تھا۔ آپ کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ کیونکہ گاڑی کے شور

میں بلند آواز سے بولنے کی ضرورت پڑی۔ مجھے کئی بار خیال آیا کہ آپ کو ٹھنڈا پانی پلاؤں۔

لیکن پھر سوچا کہ وہ احمق ہنس پڑیں گے۔"

"جی ہاں! وہ پھر بولیں! میں نانی جان سے بار بار کہہ رہی تھی کہ آپ کو بیٹھنے کو کہا جائے۔"

جب آپ اُس بننے سے اُٹھنے لگے تھے تو میں نانی جان کے کان میں کہہ رہی تھی۔ نانی جان!

اُس کی شامت آئی ہوئی ہے۔ اب ہم ناول سے بڑی چیز دیکھ رہے ہیں۔ لیکن خدا کا شکر

ہے کہ اُس بننے میں اتنی عقل ضرور تھی کہ اُس نے نرم ہو جانے میں عافیت سمجھی اور بجٹ

میں اُٹھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔"

————— ○ —————

نانی نے پوچھا۔ "بیٹا! گاڑی یہاں کتنی دیر ٹھہرے گی؟"

چوہدری صاحب! "یوسف صاحب! آپ صرف ملیں گے ہی نہیں۔ بلکہ آپ ہمارے

ماں چند دن قیام بھی کریں گے اور اگر شکار کا شوق ہو تو شکار کو چلیں گے! میرے چھوٹے

بھائی اسکول میں پڑھتے ہیں۔ شاید آپ کو دیکھ کر وہ کچھ بدل جائیں۔"

سیٹھ نارائن داس نے کہا: "دیکھا پنڈت جی! ہمارے دوست ابھی سے اس طرح

باتیں کرنے لگ گئے ہیں۔ جیسے پاکستان بن چکا ہے۔"

یوسف نے کہا: "پاکستان ضرور بنے گا لیکن یہ حقیقت تم برسوں تک جھٹلاتے

رہو گے۔"

نارائن داس نے باہر دیکھتے ہوئے کہا، "منٹگمری آ گیا ہے۔"

چوہدری اللہ بخش نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں جی! اب آپ کھڑے کھڑے تھک گئے ہوں گے۔ میں نے بیٹھنے کے لیے

اس لیے نہیں کہا کہ آپ کھڑے ہو کر باتیں کرتے ہوئے اچھے لگتے تھے۔ اب آپ تھک گئے

ہوں گے بیٹھ جائیں اور وعدہ کریں کہ جب کبھی آپ کو موقع ملے گا۔ آپ میرے پاس

ضرور ٹھہریں گے۔"

یوسف نے کہا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب بھی مجھے یہاں ٹھہرنے کا موقع ملے گا

تو میں آپ کو ضرور تلاش کر دوں گا۔"

————— ○ —————

چوہدری اللہ بخش رخصت کے وقت یوسف سے بغل گیر ہونے لگا، تو نسرين چلائی

"جی! ان کا بازو زخمی ہے۔"

چوہدری اللہ بخش نے حیرت سے پوچھا۔ "یہ بازو کیسے زخمی ہوا؟" جی! ایک بیوقوف

نے چاقو مارا تھا۔"

چوہدری اللہ بخش نے کہا۔ "وہ متعصب کانگریسی ہو گا؟ پولیس نے گرفتار نہیں

یوسف نے جواب دیا: "ماں جی! کوئی دس منٹ ٹھہرے گی۔"

"بیٹا! ایسا کرو کہ نسرین کو پلیٹ فارم پر گھملاؤ۔ بیٹھے بیٹھے تنگ تو میں بھی بہت آگئی ہوں لیکن مجھے لاہور پہنچنے کا انتظار ہوگا اور وہاں مجھے گھومنے کے لیے کافی وقت مل جائے گا۔" نسرین نے سر کا دوپٹہ اوڑھ لیا اور پلیٹ فارم پر اترتے ہی یوسف کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جب وہ دوبارہ گاڑی پر سوار ہوئے تو نسرین نانی کے کان میں سرگوشی کرنے لگی۔

"نانی جان! ایک بات سے میں بہت ڈر گئی تھی، جب وہ اُسی باگڑی کو گاڑی سے نیچے پھینک رہے تھے تو میں نے بڑی مشکل سے اپنی چیخ رو کی تھی۔ اُس وقت ایسے محسوس ہوا تھا جیسے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔"

یوسف نے مسکراتے ہوئے کہا: "شہزادی صاحبہ! یہ تو صرف ایک ڈرامہ تھا۔ تم نے یہ نہیں دیکھا ہوگا کہ میں نے ایک ہاتھ سے اُس کی ٹانگ پکڑ رکھی تھی۔"

"بھائی جان! میں بھی حیران تھی کہ وہ آدھا گاڑی سے باہر نکلا ہوا ہے مگر گرتا بھی نہیں اب معلوم ہوا ہے کہ آپ اُسے ڈرا بھی رہے تھے اور بچا بھی رہے تھے۔ بھائی جان! یہ وعدہ کیجئے گا کہ آپ کو مجھ پر کبھی غصہ نہیں آئے گا۔"

یوسف مسکرایا: "تم پر؟"

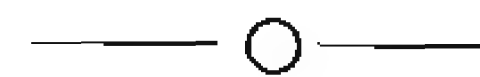
"اگر تم وعدے سے خوش ہو سکتی ہو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ مجھے ننھی نسرین پر کبھی غصہ نہیں آئے گا۔"

"ننھی نسرین نہیں! جب میں بڑی ہو جاؤں تب بھی!"

"جب آپ بڑی ہو جائیں گی تب بھی!"

"اور آپ کو دکھا دے گا غصہ بھی نہیں آئے گا۔"

یوسف ہنس پڑا: "میں یہ بھی وعدہ کرتا ہوں۔"



کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد یوسف نے اخبار اٹھا کر اس پر عمر رسیدہ سکھ کے لکھے پتے پر نظر ڈالی اور چونک پڑا:

"ماں جی! میں بھی حیران تھا کہ سردار جگت سنگھ نے اس پر اپنا ایڈریس لکھنے میں اتنی دیر کیوں لگائی۔ اصل میں انہوں نے 'وائڈریس' لکھے ہیں۔ ایک تو راوی کے کنارے اُنکے پرانے گھر کا ہے اور دوسرے ایڈریس میں اس گاؤں کا نام ہے جو ہمارے گاؤں سے کوئی دس میل دُور ہے اور میں وہاں سترہ تین چار بار گزر چکا ہوں۔"

نسرین! بھئی میں تمہیں پھر ایک تکلیف دے رہا ہوں۔ یہ اخبار پیٹ کر میرے سینڈ بیگ میں رکھ دو۔"

نسرین نے افسوسناک اور پرکے برتن پر پڑے ہوئے بیگ میں رکھ دیا اور پھر اپنی نانی کی طرف متوجہ ہو کر بولی: "نانی جان، یہ بات کتنی اچھی ہوئی کہ چچا جان لاہور میں ہوتے اور ہم آج اُن کے پاس ٹرک باتے۔"

"بیٹی! بات تو تمہیں ٹھیک ہی سوچھی ہے، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ بیک وقت انبالہ اور لاہور میں نہیں ہو سکتے اور تم پر بھی کہہ سکتی ہو کہ اگر تمہارے چھوٹے چچا ——— ولایت نہ جا چکے ہوتے تو تمہارے لیے اور زیادہ خوشی کی بات ہوتی۔"

"نانی جان! چھوٹے چچا جان کے متعلق تو میں بہت سوچا کرتی ہوں مجھے اس بات کا ہمیشہ افسوس رہا کہ فہمیدہ آپا ان کے ساتھ کئی بار چڑیا گھر کی سیر کر چکی ہیں لیکن جب بھی میں لاہور جاتی وہ اپنے امتحانوں میں مصروف ہوتے تھے۔"

"بیٹی! اپنی تعلیم ختم کر کے جب وہ لاہور واپس آئے گا تو میں اسے کہوں گی کہ وہ تمہیں جی بھر کر چڑیا گھر کی سیر کرائے اور اس بات کی کوشش کرے کہ چڑیا گھر والے تمہارے لیے وہاں ایک خوب صورت سا پنجرہ بنوادیں۔"

یوسف نے کہا: "ماں جی! شہزادی کے لیے سونے کا پنجرہ ہونا چاہیے۔"

نسرین نے کہا: ”بھائی جان! مجھے چچا جان نے انگلستان پہنچتے ہی خط لکھا تھا کہ جب وہ یورپ سے واپس آئیں گے تو ہمیں خوب چڑیا گھر کی سیر کرائیں گے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ کسی دن وہ بیرونی ممالک کا دورہ کریں گے تو مجھے بھی دنیا کے بہترین چڑیا گھر دکھانے ساتھ لے جائیں گے۔“

بیگم فریدہ احمد نے کہا: ”بیٹا! میں اب سوچتی ہوں کہ تمہارے ساتھ نسرین کے اتنی جلد مانوس ہو جانے کی وجہ یہ ہے کہ اسے تم میں اور — مجھ میں کوئی مشابہت نظر آتی ہے۔“

اداکارہ سے آگے یوسف نے مغرب کی نماز ادا کی اور جائے نماز اپنے بیگ میں رکھ کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ نسرین نے ہجھکتے ہوئے پوچھا: ”بھائی جان، آپ نے میرے لیے بھی دعا مانگی ہے۔“

”اں میں سب کے لیے دعا مانگا کرتا ہوں۔“

”بھائی جان! میں نے سب کے متعلق نہیں پوچھا صرف یہ پوچھتی ہوں کہ میرے لیے بھی دعا مانگی ہے یا نہیں؟“ یوسف نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا کہ تم بہت اچھی لڑکی ہو تمہیں دعاؤں کی ضرورت نہیں تاہم میں وعدہ کرتا ہوں کہ آج سے تمہارے لیے دعا کیا کروں گا۔“

بیگم احمد اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولیں ”نسرین نے تمہیں جانندھری میں اپنے والد کے گھر کا پتہ لکھ دیا ہے۔ میں امید کرتی ہوں کہ تم کسی دن ضرور آؤ گے۔ نسرین کے بھائی بہن اور والدین تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔“

یوسف نے کہا: ”ماں جی، میں انشاء اللہ ضرور آؤں گا۔“

نسرین بولی: ”بھائی جان! آپ کا یہ خیال درست نہیں تھا کہ اگر آپ دیر سے آئیں گے تو میں پہچان نہیں سکوں گی۔ اگر آپ کی صورت بدل بھی جائے تو بھی آپ کے

”بیٹا! بات یہ ہے کہ اس کے چچا ولایت سے بہت بڑے ڈاکٹر بن کر واپس آئیں گے۔ اس لیے ان کے لیے سنہری پنجرہ مہیا کرنا مشکل نہیں ہوگا۔“

نسرین نے مسکراتے ہوئے کہا: ”نانی جان، اگر آپ یہ وعدہ کریں کہ آپ نانا جان، امی، ابو، چچا اور چچیاں سب ہر روز مجھے دیکھنے کے لیے چڑیا گھر آکر کریں گے تو مجھے کوسے کے پنجرے میں رہنے پر بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا، لیکن میری بھی ایک شرط ہے کہ بھائی یوسف بھی مجھے دیکھنے آکر کریں گے۔۔۔۔۔ اور فہمیدہ آ بھی۔“

”بھتی وہ تو ضرور آئے گی اور مجھے یقین ہے کہ تمہارے لیے چنے، مونگ پھلی اور کالیوں کا راشن وہی لایا کرے گی۔“

یوسف نے کہا: ”ماں جی، یہ تو بہت زیادتی ہوگی! اس شہزادی کو تو چڑیا گھر کے اندر بھی بہت اچھے اچھے کھانے ملنے چاہئیں۔“

”بھائی جان! اس بات کی آپ فکر نہ کریں مجھے یقین ہے کہ آپا فہمیدہ میرے لیے بہترین کھانا لایا کریں گی۔“

بیگم فریدہ احمد نے کہا: ”بیٹا! یہ جس چھوٹے چچا کا ذکر کر رہی ہے وہ کچھلے دنوں ایم بی بی ایس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ چلا گیا ہے! اس کا بڑا بھائی جو فرج میں ڈاکٹر ہے۔ اس کی یہ خواہش ہے کہ اسے یورپ کے بعد کچھ عرصہ امریکہ بھی جانا چاہیے۔ بڑا دہن بیٹا ہے وہ، اس کا دوسرا چچا جس کا ایک گھر لاہور میں بھی ہے۔ پولیس انسپکٹر ہے۔ لاہور والا مکان اُسے اپنے سرال سے ملا۔ جب وہ لاہور میں ہوتا تھا تو اس گھر میں بہت رونق تھی۔ نسرین کا چھوٹا چچا تعلیم کے زمانے میں وٹاں گیا تھا اور اُس کی چچی بلقیس فہمیدہ کو بھی وہیں لے آتی تھی۔ ہم بھی اکثر وٹاں جایا کرتے تھے اور نسرین ہر بار یہ پروگرام لے کر جاتی تھی کہ وہ چھوٹے چچا کی انگلی پکڑ کر سیر کرے گی لیکن اتفاق ایسا ہوتا تھا کہ اُسے فہمیدہ کی طرح اس کے ساتھ چڑیا گھر دیکھنے کا کبھی موقع نہ ملا۔“

ماٹھے پر زخم کا نشان دیکھ کر میں پہچان لوں گی۔“

فریدہ احمد نے کہا: ”بیٹا یوسف میرے قریب آؤ۔“

یوسف جب قریب آیا تو انہوں نے اس کی پیشانی کے بائیں جانب شفقت سے

ماٹھ پھیرتے ہوئے پوچھا: ”بیٹا یہ زخم تمہیں کیسے لگا؟“

جی میں بچپن میں گھوڑے سے گر پڑا تھا تو کیلے پتھر سے زخم لگا تھا۔“

نسرین بولی: ”بہت خون بہا ہوگا ان کا اور ان کی امی بہت روتی ہوں گی۔“

یوسف نے مسکرا کر جواب دیا: ”جب میں گھر پہنچا تو میرے سر پر پٹی بندھی تھی اور

میری امی کو رونے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔“

نسرین کی نانی بولیں: ”بہادر بیٹوں کی مائیں رویا نہیں کرتیں۔“

”لیکن ان کو درد تو بہت ہوا ہوگا۔“

یوسف نے جواب دیا: ”مجھے یاد نہیں مجھے کیا محسوس ہوا تھا۔“

نسرین نے نانی سے لپٹ کر اس کے کان میں کچھ کہا اور وہ بولیں: ”بیٹا یوسف،

نسرین ایک بات پر بہت ناراض ہے اور وہ یہ ہے کہ تم نے جالندھر میں اس کے گھر جانے کی

دعوت ٹھکرا دی ہے۔“

”نہیں ماں جی، نسرین اپنی اچھی بچی ہے کہ اس بات سے ناراض ہوتی ہی نہیں۔“

نسرین نے پھر نانی کے کان میں کچھ کہا اور وہ بولیں: ”بیٹا وہ کستی ہے کہ نسرین اچھی بچی نہیں ہے۔“

یوسف نے کہا: ”ماں جی آپ اسے سمجھاتیے کہ میں امرتسر تک اس کے ساتھ رہوں

گا اور باتیں کرنے کے لیے کچھ اور وقت مل جائے گا۔ میں گھر پہنچتے ہی خط بھیجنا شروع کروں

گا اور کسی دن میرے خط میں یہ لکھا ہوگا کہ میں فلاں فلاں دن فلاں گاڑی سے شہزادی صابجہ

کو سلام کرنے کے لیے جالندھر پہنچ رہا ہوں۔“

نسرین ہنس پڑی اور نانی نے کہا: ”یہ تو بہت اچھا ہوگا کہ امرتسر تک ساتھ ہے۔“

جب لاہور دس منٹ کے فاصلے پر رہ گیا تو یوسف نے اٹھتے ہوئے کہا: ”میرا خیال ہے کہ اب میں عشاء کی نماز پڑھ ہی لوں تو بہتر ہے۔ اچھا نسرین تم یہ بتاؤ کہ تمہارے لیے کیا دعا مانگوں۔“

نانی نے نسرین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”بیٹا اس کے لیے یہ دعا مانگو کہ یہ پڑھائی میں زیادہ دلچسپی لے اور باتیں کم کرے۔“

نسرین نے لال پیلے ہوتے ہوئے کہا: ”میں کب زیادہ باتیں کرتی ہوں۔“ اس کی خوبصورت آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو رہی تھیں۔

سر پر ماٹھ پھیرتے ہوئے نانی نے کہا: ”میں تو مذاق کر رہی تھی۔“

”میں اب کوئی بات نہیں کروں گی۔“

”مجھ سے بھی بات نہیں کرو گی۔“ یوسف نے مسکراتے ہوئے پوچھا

”ماں، آپ سے بھی نہیں..... کسی سے بھی نہیں!!“

یوسف مسکراتا ہوا آگے بڑھ کر نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ جب اس نے دعا کے لیے

ماٹھ اٹھاتے تو اپنے بہن بھائیوں، عزیزوں کے ساتھ نسرین کا نام بھی شامل ہو چکا تھا۔

یوسف نے نماز سے فارغ ہو کر نسرین سے کہا: ”اللہ تعالیٰ سے تمہارے لیے

میں نے بہت کچھ مانگا ہے۔“

بیگم احمد نے کہا: ”بیٹا، اللہ نسرین کے لیے تم جیسے لوگوں کی دعائیں قبول فرمائے۔

یوں تو کبھی کبھی میں بھی اس کے جھگڑوں سے تنگ آجاتی ہوں مگر میں اس کے بغیر رہ بھی تو

نہیں سکتی۔“

نسرین نے چونک کر کہا: ”میں کب جھگڑا کرتی ہوں نانی جان؟“

”بیٹی میں یہ کہہ رہی تھی کہ مجھے تمہارے جھگڑوں پر بھی پیار آتا ہے۔“

”پھر وہی بات نانی جان! میں کہتی ہوں کہ میں جھگڑا نہیں کرتی آپ ہمیشہ مجھ پر

الزام لگاتی ہیں۔
”اچھا... اب خاموش ہو جاؤ۔ لاہور آنے والا ہے... اپنے بھائی سے باتیں کر دو۔“

سمجھ رہے ہوں گے کہ تم ان سے روٹھ گئی ہو۔
”نہیں، نانی جان وہ ایسا نہیں سمجھ سکتے انہیں معلوم ہے کہ میں ان سے نہیں روٹھ سکتی۔“

یوسف نے مسکراتے ہوئے کہا: ”نسرین ابھی تم مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ تم مجھ سے ناراض ہو چکی ہو۔“

”میں تو مذاق کر رہی تھی اور مجھے یہ معلوم تھا کہ آپ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ میں آپ سے مذاق کر رہی تھی۔“

”اچھا اب میرے پاس بیٹھ جاؤ اور مجھے اپنے اسکول کی باتیں سناؤ۔“ نسرین نے قریب بیٹھتے ہوئے کہا ”واہ جی، ہمارے اسکول کی باتیں بھی کوئی سننے والی ہوتی ہیں۔“
”گھنٹی بجتی ہے۔ حاضری لگتی ہے، پھر اسکول کی کاپیاں دیکھی جاتی ہیں، سب سے سناتے جاتے ہیں۔ کسی کو شاباش اور کسی کو ڈیرہ لگاتا ہے، کہا جاتا ہے۔ اور کسی کی پٹائی ہو جاتی ہے۔ کسی کی پٹائی کی باری آتی ہے تو گھنٹی بج جاتی ہے، وہ سزا سے بچ جاتی ہے۔ پس اسی طرح ہوتا ہے۔ میں تو چاہتی ہوں کہ جلدی جلدی اسکول سے نجات ملے اور کسی کالج میں جاؤں، کہتے ہیں دماغ پٹائی وغیرہ نہیں ہوتی!۔“

”اچھا نسرین کبھی تمہاری پٹائی ہوتی ہے؟“
نسرین مسکراتی ”واہ جی آپ کو یہ کیسے خیال آیا کہ میری پٹائی ہوتی ہوگی میں تو ہمیشہ فرسٹ آتی ہوں۔ نانی جان سے پوچھ لیجیے۔“

یوسف نے کہا ”مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں، مجھے یقین ہے کہ آپ ہمیشہ فرسٹ آتی ہوں گی۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ آپ اپنے خاندان کا نام روشن کریں گی۔“

اور مجھے توقع ہے کہ کسی دن اخبار میں تمہاری تصویر دیکھ کر میں مغز سے کہوں گا کہ اس بھولی بھالی لڑکی کو مدت سے جانتا ہوں۔“

نسرین نے کہا ”آپ کو یقین ہے کہ آپ مجھے بھول نہیں جائیں گے؟“ مجھے یقین ہے کہ یہ سفر میری زندگی کا یادگار سفر ہوگا اور اس کی ایک ایک بات مجھے یاد رہے گی۔
نسرین نے کچھ سوچ کر کہا ”پھر آپ نے یہ کیوں کہا تھا کہ میں آپ کو دیکھ کر پہچان نہیں سکوں گی؟“

”ارے... وہ تو مذاق تھا۔“

نسرین ہنس پڑی۔ ہنستے ہوئے اس کے معصوم چہرے میں ایک خاص قسم کی جاذبیت پیدا ہو جاتی تھی۔

گھر جا کر یہ بتاؤں گا کہ جالندھر میں ایک چھوٹی سی شہزادی تھی ہے تو مجھے یقین ہے کہ امی جان بھی تمہیں دیکھنے کے لیے میرے ساتھ چلی آئیں گی۔ تم خوش ہو گی نامیری امی کو دیکھ کر....!

”آپ سچ کہتے ہیں؟“

”میں تمہارے ساتھ کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا، میں کوشش کروں گا کہ امی جان، میرے ساتھ ضرور آئیں۔“

”آپ امی جان کو یہ بھی کہیں گے ناکہ میری امی جان اور فریدہ آپ کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوں گی۔“

بیگم احمد نے کہا ”بھئی یہ تو بہت ہی خوشی کی بات ہے اگر ہمیں یہ اطلاع ملی کہ آپ اپنی امی کے ساتھ جالندھر آ رہے ہیں تو میں ان کے استقبال کے لیے وہاں پہنچ جاؤں گی۔“

اس کے بعد مسز احمد اپنی بیٹی صفیہ اور اس کے شوہر نصیر کے متعلق باتیں کرتیں اور یوسف کے رشتہ داروں اور عزیزوں کے متعلق مزید سوالات پوچھتی رہیں۔ امر ترسرا گیا اور جب تک گاڑی وہاں کھڑی رہی۔ یوسف ان سے باتیں کرتا رہا۔ گفتگو کے دوران اس نے اپنا سوت کس اٹھا کر دروازے کے سامنے رکھ دیا۔ نسرین نے اچانک کہا: ”بھائی جان! میں خدا سے ایک دعا مانگتی ہوں۔“ ابھی میں یہ دعا کر رہی تھی کہ آپ یہاں سے اترنے کا خیال بھول جائیں اور گاڑی چل پڑے پھر آپ کو اترنے کا خیال اس وقت آئے جب گاڑی دور جا چکی ہو، پھر یہ خیال آیا کہ آپ تیزی سے چھلانگ بھی لگا سکتے ہیں۔ میں نے اللہ سے توبہ کی اور آپ سے معافی مانگتی ہوں۔“

نسرین! یوسف نے مسکراتے ہوئے کہا: ”تمہیں معلوم ہے کہ میں بھول جاتا تو مجھے خوشی ہوتی اور میں کبھی چلتی گاڑی سے چھلانگ نہ لگاتا۔“

گاڑی نے سیٹی بجائی اور نسرین نے کہا: ”بھائی جان گاڑی چل پڑی ہے۔“

”تم فکر نہ کرو“ یوسف نے اپنا سوت کس اٹھاتے ہوئے کہا۔

باب - ۹

لاہور پہنچ کر انہیں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ سامان قلی کے حوالے کرنے کے بعد وہ ٹھہرتے ہوئے ایک خالی پلیٹ فارم کی طرف نکل گئے۔ بیگم فریدہ احمد، یوسف سے اس کے عزیزوں اور رشتہ داروں کے متعلق پوچھتی رہیں لیکن نسرین خلات توقع خاموش تھی کیونکہ کراچی سے آنے والی گاڑی کچھ دیر سے پہنچی اس لیے انہیں جان کر گاڑی کا زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا اور وہ جالندھر کی گاڑی پہنچتے ہی اس پر سوار ہو گئے۔ یوسف نے کہا: ”نسرین تم ابھی تک غصے میں ہو اور اب تو ہم گاڑی بھی بدل رہے ہیں۔“ نسرین نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے منہ پھیر لیا۔ بیگم فریدہ احمد نے کہا: ”بھئی... نسرین غصے میں نہیں، صرف اداس ہے۔ اگر تمہارا جلدی خط نہ آیا تو اس کی اداسی گھر والوں کو بہت پریشان کرے گی۔ اگر تم اسے یقین دلا سکو کہ تم بہت جلد جالندھر آؤ گے اور اسے خط بھی لکھتے رہو گے تو اس کا موڈ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔“

یوسف نے نسرین سے پوچھا: ”کیوں نسرین تمہیں میرے اس وعدے پر یقین نہیں کہ میں جالندھر ضرور آؤں گا اور تمہیں خط بھی لکھتا رہوں گا۔ نسرین صرف یہ جواب دے کہ خاموش ہو گئی۔“ بھائی جان، میں دعا کیا کروں گی کہ آپ ضرور آئیں۔“

یوسف نے اس کا موڈ ٹھیک کرنے کی نیت سے اپنے گاؤں کی دلچسپ باتیں شروع کر دیں۔ نسرین کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی، لیکن یہ مسکراہٹ دلکش قہقہوں میں تبدیل نہ ہو سکی، پھر اس نے کہا: ”نسرین میرے دل میں ایک اور بات ہے۔ جب میر

”ماں جی! خدا حافظ“

”نسرین خدا حافظ اور آپ اپنی امی ابو اور اپنی آپا کو بھی میرا سلام کہیے گا“

”بھائی جان گاڑی تیز ہو رہی ہے“ وہ چلائی۔

یوسف اطمینان سے سوٹ کیس سمیت نیچے اتر گیا اور پیٹ فارم پر ایک نوجوان کھڑا تھا وہ بھاگتا ہوا آگے بڑھا اور یوسف سے لپٹ گیا۔

نسرین گاڑی سے سرنکلے آوازیں دے رہی تھی۔ بھائی جان بھائی جان....

یوسف نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا لیکن اسے یہ موقع نہ ملا کہ وہ دوسرے نوجوان کی گرفت سے آزاد ہو کر بھاگے اور اُس کی بات سُنے۔ البتہ اس نے سُنہ اس طرف کر کے بے بسی کی حالت میں اپنا ہاتھ ہلانا شروع کر دیا اور نسرین جسے اس نے باہر سرنکلے دیکھا تھا اس کی نگاہوں سے اُجھل ہو گئی۔ اس نے تملاکر کہا احمق آدمی میرا ہینڈ بیگ آگے چلا گیا ہے۔

”بھئی، اگر آوازیں دینے والی لڑکی تمہیں جانتی ہے تو تمہیں اپنے ہینڈ بیگ کے

متعلق اتنا پریشان نہیں ہونا چاہیے۔۔۔ اُسے آج ہی خط لکھ دو“

”یا منظور، تم ہر بات، ہر کام بے وقت کرتے ہو“

”میں نہیں سمجھتا کہ اس بیگ میں کوئی قیمتی چیز ہوگی لیکن اگر کوئی ایسی چیز ہے تو

تم میرے ساتھ چلو جس اسٹیشن پر انہیں اترنا ہے میں اس کے اسٹیشن ماسٹر کو ریلوے پولیس کے دفتر سے فون کر دوں گا۔ تمہیں صرف ان لوگوں کے متعلق بتانا پڑے گا جو ریل کی کے ساتھ سفر کر رہے ہیں۔ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ایک سب انسپکٹر میرا رشتہ دار ہے اور میں پچھلے ہفتے سے اس کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔ آج تم بھی میرے پاس ٹھہرو گے اور وہ تمہارا بیگ وہیں منگوا دیں گے“

”یار، گولی مارو اپنے رشتہ دار کو میں نے امرتسر پہنچ کر اُن سے اجازت اس لیے

نہیں لی کہ یہاں رُک جاؤں گا“

”بھئی میں تمہاری پریشانی دور کرنا چاہتا ہوں“

”مجھے کوئی پریشانی نہیں، اس بیگ میں کوئی قیمتی چیز نہیں تھی صرف ایک ایڈریس

تھا جو وہیں رہ گیا“

”کس کا ایڈریس تھا؟“

”کسی کا تھا، تمہیں اس سے کیا“

”منظور نے گرم ہو کر کہا۔“ یوسف صاحب آج کچھ زیادہ ہی موڈ خراب ہے آپ کا“

”میرا موڈ بالکل ٹھیک ہے۔ اب تم بتاؤ کہ دھاریوال کی طرف جانے والی گاڑی میں

کتنی دیر ہے“

”یار اس میں کافی وقت ہے ہم اطمینان سے ڈائننگ روم میں جا سکتے ہیں“

”ورنہ ڈائننگ روم میں بیٹھتے ہیں“

”بھئی، میں بیٹھنا نہیں، ٹہلنا چاہتا ہوں“

”یہ تو اور بھی اچھی بات ہے“ منظور نے اس کا سوٹ کیس پکڑتے ہوئے کہا۔

”چلو میں تمہارا سوٹ کیس پہلے کیس رکھوا دیتا ہوں اس کے بعد ہم کافی دیر گھوم سکیں

گے“ یوسف اس کے ساتھ چل دیا۔ ”سوڈا واٹر کے اسٹال پر منظور نے سوٹ کیس

دکاندار کے سامنے رکھتے ہوئے کہا ”بھئی، ہمیں دو بوتلیں کھول دو اور اس

سوٹ کیس کا خیال رکھو“ ”یہ گھومنے کے بعد گاڑی پر سوار ہونے کے لیے پہنچ

جائیں گے۔ یوسف نے ایک بوتل پی کر گلاس رکھ دیا تو منظور نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور

اس نے بوتل کھول کر گلاس میں انڈیل دی۔

”بھئی نہیں مجھے اور نہیں چاہیے۔۔۔ یوسف نے کہا، لیکن منظور کے اصرار

پر اس نے گلاس اٹھا لیا چند منٹ بعد وہ پیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے اور یوسف کے

تھپتھپانے والے دے رہے تھے۔ ایک گھنٹے بعد یوسف منظور سے بخلیگی ہو کر گاڑی پر سوار

کرتے ہوئے کہ غلطی ہو رہی ہے۔ میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ کیا غلطی ہو سکتی ہے؟
 بیٹی اگر وہ احمق نہیں ہے تو میڈیکل کالج سے ایڈریس معلوم کر کے گھر تلاش کر لے گا۔
 پھر وہ ایک ذہین لڑکا ہے اگر وہ ویسے بھی جالندھر پہنچ گیا تو کسی وقت کے بغیر نہیں تلاش
 کر لے گا۔ اگر اسے کسی کا نام یاد نہ رہا ہو تو بھی اسے اتنا تو معلوم ہے تمہارا ایک چچا فوج میں
 ڈاکٹر دوسرا پولیس انسپکٹر اور ایک یہاں ڈاکٹر ہی کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت
 گیا ہے۔“

نسرین قدرے اطمینان کے ساتھ کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ پھر اُس نے اٹھ کر
 اوپر سے بیگ اٹھایا۔ اسے کھولا اور ضخیم نوٹ بک نکالتے ہوئے کہا: دیکھتے نانی جان!
 اگر میں اسے کہتی کہ اس نوٹ بک پر اپنا ایڈریس بھی لکھ دو اور جانے سے پہلے وہ ورقہ
 پھاڑ کر وہ مجھے دے دیتا! تو کتنی اچھی بات ہوتی۔ کتنی بے وقوف ہوں میں! پھر اُس
 نے صفحہ اُلٹ کر دیکھا تو دائیں طرف کے چند صفحات پر ”میرا بچپن“ کے عنوان سے چند
 صفحات لکھے ہوئے تھے۔ اس نے پہلے صفحے سے چند سطور پڑھیں۔ یہ الفاظ نہیں بلکہ
 محرک اور محرک زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی تھیں۔

عام حالات میں وہ شور مچا دیتی۔ نانی جان دیکھئے! اُس نے کیا لکھا ہے؟ ساری
 کاپی بھری ہوئی ہے نانی جان! یہ ایک کتاب ہے لیکن اب وہ بڑی مشکل سے اپنی زبان بند
 رکھنے اور دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ نانی نے پوچھا۔
 ”بیٹی! اب بتاؤ۔ سید حامد میرے ساتھ لڑھیلے چلو گی۔ یا تمہیں جالندھر تمہارے
 گھر چھوڑ کر جاؤں۔“

”دیکھتے نانی جان! بیس دن میں آپ کے ساتھ رہی ہوں۔ آپ اب اتنے ہی دن
 ہمارے گھر رہیں گی۔ اگر ہم پہاڑوں پر گئے تو آپ کو ساتھ جانا پڑے گا۔ ممکن ہے کہ اب جان
 کو فرصت نہ ملے لیکن اگلے سال وہ ڈیرہ دون جانے کے پروگرام کو تبدیل نہیں کریں گے۔ یہ بھی

ہو رہا تھا۔ گاڑی چل پڑی۔ یوسف کے ساتھ اس نے بھاگتے ہوئے کہا ”یار مجھے موقع ملا
 تو کسی دن تمہارے گاؤں آؤں گا۔“
 ”بھائی ضرور آؤ لیکن اس وقت گاڑی سے ذرا دُور رہو۔“

چند منٹ بعد نسرین جب اپنی سیٹ پر بیٹھی تو وہ بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں
 ضبط کر رہی تھی۔ ”ارے بگلی! نانی نے کہا۔“ میں جانتی ہوں کہ جو لوگ بچوں کے ساتھ اتنا
 پیار کرتے ہیں۔ وہ بہت اچھے ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یوسف کسی اچھے خاندان
 سے تعلق رکھتا ہے لیکن تم روکیوں پڑی ہو جو اتنا پیار کرتے ہوں ان کی یاد سے خوشی
 حاصل ہونا چاہیے۔“

نسرین نے ایک بیمار بچی کی طرح کچھ کہے بغیر اپنا سر جھکا لیا۔ پھر وہ ہرڑا کر اٹھی۔
 ”نانی جان! نانی جان! اُدھر دیکھئے۔ جس بات سے مجھے خوف محسوس ہوتا ہے وہ ہو کر
 رہتی ہے۔“

”کیا ہوا؟“ نانی اماں نے پریشان ہو کر پوچھا۔
 ”نانی جان! اُدھر دیکھئے۔ وہ اپنا ایک بیگ یہیں چھوڑ گئے ہیں“ پھر کیا ہوا
 ہم ساتھ لے جاتیں گے اور جب وہ آئے گا تو اُسے مل جائے گا۔ اس میں پریشانی کی کیا
 بات ہے۔“ جس نوٹ بک میں میں نے اپنا ایڈریس لکھ کر دیا تھا وہ بیگ میں تھی اب
 وہ ہمارے پاس کیسے آئے گا؟۔ شاید اُسے میری کچھ باتیں یاد رہ گئی ہوں!“
 ”اچھا اُس نے تم کو اپنا ایڈریس لکھ کر دیا تھا۔“

”نہیں نانی جان! اُس نے تو اپنے خط میں اپنا ایڈریس لکھ کر بھیجنا تھا۔“

”عجیب بے وقوف ہے وہ!“
 ”نہیں نہیں! نانی جان وہ بے وقوف نہیں تھا۔ میں بے وقوف تھی۔ یہ محسوس

شاید کئی مہینے ریلوے لائن اور سڑکیں بند رہیں گی۔
 ”ماں جی! آپ نے بہت اچھا کیا۔“

چند منٹ بعد وہ تانگوں پر سوار ہو چکے تھے اور کوئی نصف گھنٹے بعد وہ تانگے سے
 اتر کر ایک مکان کے اندر داخل ہو گئے۔ بوندا باندی آہستہ آہستہ تیز ہو گئی۔ ڈیوڑھی میں
 صفیہ ایک نوکرانی کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ بیگم فریدہ احمد کے ساتھ گلے لگ کر ملی۔ پھر اُس
 نے جھک کر نسرین کو پیار کیا اور وہ بڑے کمرے میں داخل ہو گئے۔ نانی نے کرسی پر بیٹھتے
 ہوئے کہا: نصیر بیٹا! تمہارے گھر روشنی کیوں اتنی مدھم ہے؟

نصیر نے پریشان ہو کر جواب دیا ”ماں جی! روشنی تو اسی طرح کی ہے۔ اگر آپ کہیں
 تو ایک بڑا بلب لگوادیا جاتے۔“

صفیہ نے کہا ”ماں جی!“ روشنی پانچ منٹ میں تیز ہو جاتے گی۔
 ”بیٹی تو ٹھیک ہے نا۔“

”امی جان میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

فہمیدہ برابر والے کمرے سے نمودار ہوئی۔ ”میں نماز پڑھ رہی تھی۔ نانی جان! آج
 کافی دیر آپ کا انتظار کرتی رہی۔ پھر میں نے سوچا آپ کے آنے تک نماز پڑھ لیتی ہوں۔“
 نانی نے اٹھ کر اسے گلے لگایا اور پھر اس کا سر، اُس کی پیشانی، بڑی بڑی چمکدار
 آنکھیں اور خوب صورت چہرہ چومنے لگی۔

”میری آنکھوں کی روشنی!“ میں نے سیلاب عبور کرنے کا فیصلہ اس لیے کیا تھا
 کہ میں کسی تاخیر کے بغیر تمہیں دیکھوں اور سفر کے دوران تم ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے
 تھیں۔ نسرین اٹھو۔ اپنی بہن کے ساتھ کھڑی ہو جاؤ اور جب تک میں نہ کہوں وہاں ہے
 نہ ہلنا۔“

نسرین مسکراتی ہوئی اٹھ کر اُس کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ ان کے والدین ہنسنے لگے اور

تو ممکن ہے کہ نانی جان اگلے سال شملہ جائیں اور آپ مجھے اور آپا فہمیدہ کو بلا لیں آپ یہ تو
 کہہ سکیں گی کہ اپنی پیاری بچہوں کے بغیر میرا پہاڑوں پر جی نہیں لگے گا۔ اس سفر میں اگر فہمیدہ
 آیا ہمارے ساتھ ہوتی تو آپ کتنا خوش ہوتیں۔ پھر ان کی موجودگی میں ہمیں یہ پریشانی تو نہ
 ہوتی کہ وہ اپنے بیگ کے ساتھ ہمارا ایڈریس بھی چھوڑ گئے ہیں۔ نانی جان مجھے یقین ہے کہ اگر
 فہمیدہ آیا ہمارے ساتھ ہوتیں تو یوسف بھائی ہمیں جالندھر پہنچا کر واپس جاتے یہ بھی ممکن تھا
 کہ وہ دو دن ہمارے پاس گزارتے۔“

جالندھر اسٹیشن پر بیگم احمد نے قلی کو سامان اتارنے کے لیے کہا اور نسرین نے جلدی
 سے بیگ اٹھالیا۔ وہ گاڑی سے اتر رہے تھے کہ ظہیر خان وہاں پہنچا اور اس نے نانی کو سلام
 کرنے کے بعد سر جھکاتے ہوئے کہا ”نانی جان آبا جان بھی آرہے ہیں۔ اُن کے ساتھ نوکر بھی۔“
 نانی نے ظہیر کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا ”بیٹا اب تو ہم نے قلی کو کہہ دیا ہے۔“

ایک قد آور آدمی جو سفید شلوار قمیص اور سر پر ترکی ٹوپی پہنے ہوئے تھا، مسافروں کو
 ادھر ادھر ہٹاتے ہوئے آگے بڑھا اور اس نے کہا ”ماں جی! السلام علیکم۔ ہم سب نے آنا تھا
 لیکن ان بادلوں کا کوئی اعتبار نہیں تھا۔ دوپہر سے تین چار بار بارش ہو چکی ہے اور اب بھی
 ایسا نظر آتا ہے یہ بادل رات کو ٹوٹ کر برسیں گے۔“

نسرین نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا ”ابا جی! وہ سیلاب
 جس سے ہم گزرے تھے بڑا خوفناک تھا۔“

باپ نے اُسے اٹھا کر اپنے ساتھ چٹالیا اور بیگم فریدہ احمد کی طرف متوجہ ہوتے
 ہوئے کہا: ”ماں جی! خالدہ، حسن علی اور عمر یہاں آتے تھے اور پرسوں واپس چلے گئے۔
 اگر انہیں معلوم ہوتا کہ آپ سیلاب سے گزر کر آ رہی ہیں تو وہ رک جاتے۔“

”بیٹا! خدا کا شکر ہے کہ میں شکار پور سے واپس نہیں چلی گئی ورنہ وہ یہ کہتے تھے کہ

فمیدہ کے چہرے پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھیلتی گئی۔ یہاں تک کہ اس کے سرخ و سفید چہرے اور اس کی چمکدار آنکھوں سے قیمتی پھوٹ نکلے۔

بیگم فریدہ نے کہا ”بیٹی صفیہ! خدا ان کو نظر بد سے بچاتے یہ دونوں شہزادیاں ہیں ایک چھوٹی اور ایک بڑی۔ اور جب میری تھکا دسٹ دُور ہو جائے گی تو میں تمہیں اطمینان سے بتاؤں گی کہ میرے دماغ میں شہزادیوں کا خیال کیوں آیا ہے۔“

”فمیدہ! آؤ میرے پاس بیٹھ جاؤ۔“

فمیدہ اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی اور نانی نے اس کا اپنی گود میں لیتے ہوئے کہا: ”بیٹی! میں بہت اداس ہو گئی تھی تمہارے بغیر۔ تمہیں شہزادی لہلا ناپسند ہے نا؟“

نانی جان! اس نے جواب دیا۔ ”میں صرف ایک بیٹی ہوں۔ آپ کی، امی کی اور ابو کی۔“

بیگم فریدہ بولی ”بیٹی! تمہاری آواز، تمہارا قد و قامت، تمہارے ہاتھ، تمہارے بازو، تمہارے پاؤں اور تمہاری آنکھیں دیکھنے والے تمہیں، ہمیشہ ایک شہزادی سمجھیں گے۔“

فمیدہ نے پریشان ہو کر بیٹھتے ہوئے اپنی ماں سے کہا ”امی جان! نانی جان کو بھوک لگی ہوگی، کھانا لگا دوں۔“

”ہاں بیٹی! لگا دو۔“

جب وہ کھانے کے کمرے کی طرف جا رہے تھے تو نصیر نے کہا ”ماں جی! میں نے کبھی غور نہیں کیا لیکن آپ کی باتوں سے مجھے بھی یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ ایک غریب آدمی کے گھر شہزادیاں پیدا ہو گئی ہیں۔“

اور اگر خالدہ بہت بڑی نہ ہو چکی ہوتی تو میں کہتا، خالدہ ہماری بڑی شہزادی ہے۔“

صفیہ نے کہا ”امی جان! ان کے لیے دعا کیا کریں۔“

”بیٹی! میں ہر سانس کے ساتھ ان کے لیے دعا کیا کرتی ہوں۔ فمیدہ جتنی مجھے پیاری لگتی ہے اُسی قدر مجھے اس کی فکر رہتی ہے اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اس کے لیے میری بہت

سی دعائیں قبول ہو سنے والی ہیں۔ دیکھو! نسرین سفر کے جو حالات بیان کرے انہیں اطمینان سے سنا، اُسے جھپٹک نہ دینا۔“

کھانا کھانے کے بعد نسرین اور فمیدہ بالا خانے کے ایک کمرے میں چلی گئیں بارش اب تیز ہو چکی تھی اور کھڑکیوں سے ٹھنڈی ہوا آرہی تھی۔ نسرین نے کہا:

”آپا جان! اگر میں نے باتیں شروع کر دیں تو آپ کو غمزدہ نہیں آئے گی۔ اس لیے آپ سو جائیں۔ میں اطمینان سے آپ کے ساتھ بڑی دلچسپ اور بڑی لمبی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“

”دیکھو نسرین! کئی دن میں تمہاری آواز نہ سننے کے باعث اداس ہو گئی تھی۔ اب تم جب تک چاہو، بولتی رہو۔ سکھر سے اباجان کو فون پر بتایا گیا تھا کہ تمہارے ساتھ ایک بہاد اور قابل اعتماد آدمی نے سیلاب عبور کیا ہے اور امرتسر تک تمہارا ساتھ دے گا جس کی ٹو علی اور اُس کی بیوی نے تعریف کی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ امرتسر تک تمہارے ساتھ سفر کرے گا۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ اگر وہ اتنا اچھا تھا تو نانی جان اسے ساتھ کیوں نہیں لائیں۔ ہمیں شکریہ کا موقع تو ملنا چاہئے تھا۔“

نسرین بولی: آپا جان حیرت تو آپ کو اس وقت ہوگی جب آپ میری باتیں نہیں لگی، مجھے اس بات کا کم افسوس نہیں کہ میں بجائی یوسف کو یہاں نہیں لاسکی۔ سارے سفر کے دوران میں یہ سوچتی رہی کہ کاش آپ میرے ساتھ ہوتیں اور اسے اپنی آنکھوں سے دیکھتیں پھر نسرین نے ابتداء سے آخر تک کے واقعات سنا دیئے۔

دُوسرا حصہ

ممکنہ ہو تو خاک اور مٹھنڈی نہریں

پاپ = ۱۰

رات دو بجے کے قریب یوسف گاڑی سے اُترا تو اسٹیشن پر چند آدمی جو اُسے لینے آتے ہوتے تھے۔ اُس کے گرد جمع ہو گئے کوئی اُس سے مصافحہ کر رہا تھا اور کوئی بغل گیر ہو رہا تھا۔ ایک لمبے ترننگے سکھ نوجوان نے آگے بڑھ کر فرجی طریقے سے اسے سیلوٹ کیا۔ یوسف نے اُس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ارے بہادر سنگھ! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ بہادر سنگھ نے جواب دیا: ”جی کل آوارہ گردی کرتے ہوئے تمہارے گاؤں جا نکلا تھا دہاں سے معلوم ہوا کہ تمہارے آدمی دو دن سے رات کی گاڑی دیکھنے جاتے ہیں۔ اس لیے آج میں بھی یہاں آ گیا۔“ تم نے بہت پریشان کیا سب کو اگر کوڑے میں رک گئے تھے تو تار بھیج دیا ہوتا۔“

یوسف نے جواب دیا، شاید دریائے سندھ کا بند ٹوٹ جانے سے جو سیلاب آیا ہے، تم نے اُس کے متعلق نہیں سنا۔“

”یار وہ تو میں نے سنا ہے لیکن سیلاب تو کہیں شکار پور کے پاس آیا ہے؟“ یوسف نے ہنسنے ہوئے کہا۔ ”بھئی کوڑے آتے ہوئے شکار پور سے گزرنا پڑتا ہے اور شکار پور سے آگے ریلوے لائن ٹوٹ گئی تھی۔ اب بتاؤ فوج میں کب بھرتی ہوئے تھے؟“

”بھاتی صاحب میں فوج میں بھرتی نہیں ہوا۔ بھگوان کی کربا سے مجھے پولیس میں نوکری مل گئی ہے۔“

جو دھری صاحب نے بھی میری بڑی مدد کی تھی وہ یہ کہتے تھے کہ تم بہت جلد اے اسیں۔ آتی ہو جاؤ گے۔“

”نہیں اُسے سونے دو اور تم بھی سو جاؤ۔“

قدسیہ یہ کہہ کر یوسف کی طرف متوجہ ہوئی، بیٹا۔ میرا خیال ہے کہ سفر کرنے والوں کی نسبت انتظار کرنے والوں کو زیادہ تھکاوٹ محسوس ہوتی ہے۔ میں ساری رات تمہاری خیریت کی دعائیں مانگا کرتی تھی اور مجھے دن کے وقت بھی نیند نہیں آتی تھی۔ کبھی کبھی جی میں آتا تھا کہ میں اڑ کر کوئٹہ پہنچ جاؤں۔ بیٹا! تم نے اتنے دن میرے بغیر کیسے گزار لیے“ یوسف نے جواب دیا۔ ”امی جان۔ مجھے معلوم نہیں کہ اتنے دن کیسے گزر گئے۔ لیکن مجھے ایک نئی بات معلوم ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ مجھے آپ کی یاد سے بھی ایک سکون ملتا تھا۔ آپ جس قدر میری آنکھوں سے دور ہوتی ہیں اتنا ہی میرے دل کے قریب ہوتی ہیں میں تصور میں اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے آپ کو دیکھا کرتا تھا۔ آپ سے باتیں کیا کرتا تھا۔ امی جان! اب آپ سو جائیں کل میں آپ کو بہت دلچسپ باتیں سناؤں گا۔“

”بیٹا! میرے لیے تمہاری ہر بات دلچسپ ہوتی ہے اور میں یہ چاہتی ہوں کہ تم بسلتے رہو اور میں سنتی رہوں۔ تمہاری باتوں سے میری ساری تھکاوٹ دور ہو جائے گی اور وہ غصہ بھی جاتا رہے گا جو مجھے دو دن سے تم پر آ رہا ہے۔“

”امی جان“ یوسف نے کہا ”آپ کا غصہ اتارنے کے لیے میرے پاس ایک بہت اہم چیز تھی۔ میں حیران ہوں کہ آپ کو دیکھنے کے بعد وہ میرے ذہن سے کیسے نکل گئی۔“ یوسف بھاگتا ہوا نیچے گیا اور دو منٹ بعد اس نے ایک ریشمی رومال میں لپیٹی ہوئی عطر کی شیشی ماں کو دیتے ہوئے کہا۔ ”امی جان عطر کی شیشی اور ریشمی رومال اس خاتون کا تحفہ ہے جسے پہلی بار دیکھ کر مجھے یہ محسوس ہوا تھا کہ آپ کی شکل و صورت کے اور لوگ بھی ہو سکتے ہیں اور میں نے پہلی ملاقات میں ہی اسے ماں جی کہنا شروع کر دیا! گلاب کا یہ عطر یقیناً بہت اچھا ہو گا اور میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ میں گھر پہنچتے ہی آپ کو پیش کر دوں گا۔ امی جان، اس معزز خاتون کے ساتھ ایک شہزادی بھی تھی۔“

ایک آدمی نے یوسف کا سوٹ کیس اٹھا لیا اور اُس نے بہادر سنگھ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اچھا بہادر سنگھ! بہت بہت شکریہ تم نے بڑی تکلیف کی۔ اب اپنے گھر جا کر آرام کرو۔“

جب تم ڈیوٹی پر جاؤ گے تو میں تمہیں رخصت کرنے آؤں گا۔“ بہادر سنگھ نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا:

”تمہارے آنے کی خوشی مجھے نوکری مل جانے سے کم نہیں ہوگی۔ آج میں ہیڈ ماسٹر صاحب کو بھی سلام کرنے گیا تھا۔ وہ تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔“

”میں بھی انہیں بہت یاد کرتا ہوں۔“ یوسف نے جواب دیا۔



گاؤں میں داخل ہونے کے بعد یوسف نے ایک نوجوان سے اپنا سوٹ کیس پکڑتے ہوئے کہا: ”بھئی اب تم سب جا کر آرام کرو۔“

وہ سب منتشر ہو گئے اور یوسف حریلی کی ڈیوٹی کی طرف بڑھا۔

سب سے پہلے اُس کی والدہ نیم دا دروازے سے باہر نکلیں اُس نے جلدی سے آگے بڑھ کر اپنا سر جھکایا۔ ماں نے اُس کا سر پکڑ کر اُس کی پیشانی آنکھوں اور گالوں پر بوسے دیتے۔ پھر دادی اور چچی اُس سے پیار کرنے لگیں۔

چھوٹے بھائی محمد صدیق نے اُس کے ساتھ لپٹ کر سبکیاں لیتے ہوئے کہا: ”بھائی جان! مجھے بھی ساتھ لے جایا کریں نا۔“ یوسف نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”صدیق! جب تم بڑے ہو صاحب آگے تو ہم اکٹھے جایا کریں گے اور امی جان بھی ہمارے ساتھ ہوا کریں گی۔ اب اگر میں تمہیں ساتھ لے جاتا تو امی جان کے پاس کون رہتا؟“

صدیق نے کہا ”بھائی جان، عانتہ آدھی رات تک آپ کا انتظار کر کے سو گئی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ جب بھائی جان آئیں تو مجھے جگا دینا۔“

ماں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”کیا لگتی تھی وہ اس کی؟“

”جی امی جان... وہ اس کی نواسی تھی۔ اگر آپ اس کو دیکھ لیں تو آپ کو یقین نہیں آئے گا کہ یہ ایک شہزادی کے سوا کچھ اور ہو سکتی ہے۔“

”بیٹا! جس خاتون کو تم نے دیکھتے ہی ماں کہہ دیا تھا اس کی یقیناً نواسی کوئی شہزادی ہوگی... کیا عمر تھی اس کی؟“

”امی جان وہ چھٹی جماعت میں پڑھتی ہے لیکن بہت ہوشیار ہے۔“

”بیٹا میں پوچھ رہی ہوں عمر کیا تھی؟“

”یہی کوئی دس گیارہ سال کی ہوگی، میں نے ان سے کہا تھا کہ میری امی جان تمہیں دیکھنے کے لیے کسی دن جالندھر آئیں گی۔ امی جان اس کی نانی کہتی تھیں۔ اس شہزادی کی بڑی پسندیدہ بھی ایک شہزادی ہے۔ امی جان مجھے یقین ہے کہ آپ ان لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔“

ماں نے ایک ہی سانس میں کئی سوال پوچھ لیے اور یوسف کو کوسٹ میں قیام اور اس کے بعد امرتسر تک سفر کے تمام واقعات بیان کر خیر پڑے۔ صبح کی اذان ہو رہی تھی۔ ماں نے کہا ”بیٹا خدا تمہیں نظر بد سے بچائے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ شہزادی جسے تم نے نہیں دیکھا میرے ان پسندوں کی تعبیر ہوگی جو میں ایک مدت سے دیکھا کرتی تھی۔ میں ان کے گھر ضرور جاؤں گی۔ تم صبح ہوتے ہی انہیں خط لکھ دو کہ میری ماں کو شہزادیاں دیکھنے کا بہت شوق ہے اس لیے ہم آپ کی طرف سے خط کا جواب ملتے ہی جالندھر پہنچ جائیں گے۔“

یوسف نے کچھ سوچ کر کہا ”امی جان، میں نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ میرا جو بیگ گاڑی میں رہ گیا تھا۔ اس کا ایڈریس اس کے اندر تھا مجھے صرف یہ یاد ہے کہ ان کی نانی کا نام بیگم فرید احمد تھا، نواسی کا نام سرین تھا۔ نانی لدھیانہ میں رہتی ہیں اور سرین کے والدین جالندھر میں رہتے ہیں۔“

”اور فرمیدہ بھی جالندھر میں...“

”جی ہاں اور کہاں ہوگی۔“

ماں نے کچھ سوچ کر کہا ”ارے بیٹا یہ کون سا ایسا معرہ ہے جو حل نہیں ہو سکتا۔ جب انہوں نے تمہیں اپنا ایڈریس دیا تھا تو تم نے بھی انہیں اپنا ایڈریس ضرور دیا ہوگا اور اگر وہ اتنے اچھے لوگ ہیں جتنا تم بیان کرتے ہو اور انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان کا ایڈریس تمہارے سے تھیلے میں پڑا ہوا ہے وہ بہت جلد تمہیں خط لکھیں گے۔“

یوسف نے کہا ”امی جان یہی ایک حماقت تو مجھ سے ہوئی تھی کہ میں نے اپنا ایڈریس انہیں نہیں دیا۔ دادا جان مرحوم کہا کرتے تھے ہر بات میں اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت ہوتی ہے اگر ان سے ملنے میں ہمارے کوئی بہتری ہے تو وہ ہمیں اور ہم انہیں تلاش کر لیں گے۔“

”ہاں بیٹا یہ کوئی مشکل بات تو نہیں تم کو کوسٹ میں ان کے رشتہ داروں کو جانتے ہو اور جالندھر میں جس خاندان کا لڑکا ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ گیا ہے اسے بڑی آسانی سے تلاش کیا جاسکتا ہے۔“

”امی جان! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب مجھے اپنی تعلیم سے فرصت ملے گی ہم دونوں جگہ جگہ سیر کے لیے جایا کریں گے اور میرا پہلا کام یہ ہوگا کہ میں آپ کے ساتھ جالندھر جا کر انہیں تلاش کر دوں۔“

”اچھا بیٹا! اب تم اپنی چارپائی گھسیٹ کر برآمدے میں لے جاؤ اور نماز پڑھ کر اطمینان سے سو جاؤ۔ جب تک تمہاری نیند پوری نہیں ہوگی میں کسی کو ادھر نہیں آنے دوں گی۔ پریشان تو میں بہت ہوتی ہوں کہ تم اُن کا پتہ اپنے تھیلے میں چھوڑ آئے ہو، لیکن مجھے اس میں بھی اللہ کی کوئی حکمت نظر آتی ہے۔“

یوسف گہری نیند سے بیدار ہوا تو اس کی چھوٹی بہن عائشہ اس کے بستر کے قریب کھڑی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ عائشہ نے کہا۔ ”السلام علیکم بھاتی جان! میں دوبار آپ کو جگانے کے لیے آئی ہوں۔ اگر اب بھی آپ اچانک کر دے بدل کر آنکھیں نہ کھولتے

تو میں آپ کی نیند خراب کرنے کی جرأت نہ کرتی۔ بھائی جان! آپ یہیں منہ دھولیں تو لیہ صاحبہ اور پانی سب کچھ میں نے یہاں رکھ دیا ہے اور آپ کے لیے صاف کپڑوں کا جوڑا بھی کرسی پر پڑا ہے۔ میں جا کر انہیں کستی ہوں کہ بھائی جان لباس تبدیل کر رہے ہیں۔ آپ کا بڑی دیر سے انتظار ہو رہا ہے۔“

”بھئی کون انتظار کر رہا ہے میرا؟“ یوسف اٹھا اور ٹوٹا اٹھا کے ایک طرف بیٹھ گیا۔ ”جی وہی چھوٹے گاؤں والے۔ میرا مطلب ہے امینہ اس کی امی اور ان کی ایک رشتہ دار۔ ان کا نوکر ہر روز آپ کا پتہ کرنے آتا تھا اور وہ بھی امی جان کے پاس ہر دوسرے تیسرے دن آ جایا کرتی ہیں۔ امینہ کی ماں کستی تھیں میری بیٹی کو کھلی ہوا بہت پسند ہے۔ اس لیے برسات کے دن وہ یہیں گزارنا چاہتی ہے۔ چھٹیاں بھی ہوتی ہیں نا بھائی جان برسات میں، اس لیے۔ اچھا بھائی جان! میں نیچے جاتی ہوں۔ آپ جلدی آئیں ورنہ مجھے دادی جان کی ڈانٹ ڈھپٹ سنا پڑے گی۔ وہ گھر میں سب سے ناراض ہیں کہ جب آپ آتے تھے تو انہیں اُسی وقت کیوں نہیں بتایا گیا۔ وہ بھی دوسرے آپ کو دیکھ کر گئی ہیں۔“

دس منٹ بعد یوسف نیچے پہنچا۔ ایک طرف دسح والا ان کے سامنے کشادہ برآمدے میں اس کی والدہ، دادی، چچیوں کے پاس رشیدہ، اس کی بیٹی امینہ اور چراغ بی بی بیٹھی ہوئی تھیں۔ رشیدہ ایک ہٹی کٹی اور خوب کھانے والی جفاکش قسم کی عورت تھی۔ یوسف نے اُسے سلام کیا اور اُس نے دعائیں دیتے ہوئے کہا: ”آؤ بیٹے! بیٹھ جاؤ۔ قدیر بہن، ان کا ناشتہ یہیں منگوا لو۔“

”بہن اب تو کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔ آپ کچھ دیر باتیں کریں۔ یوسف بیٹا تم دو دھ بیو گے یا لسی؟“

یوسف نے کہا: ”عائشہ میرے لیے لسی کا ایک گلاس لے آؤ نمک ڈال کر“ پھر وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے امینہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ آپ لوگ یہاں آئے اور میں

یہاں گھر میں موجود تھا مگر مجھے اطلاع ابھی ابھی ہوئی اس لیے مجھے آنے میں دیر ہو گئی۔“

”جی ہاں۔ گریسوں کی ساری چھٹیاں یہیں گزارنی ہیں اور اگر کسی اور طرف نہ نکل گئے تو انشاء اللہ آپ سے ملاقات ہوتی رہے گی۔ ہمارے نوکر نے صبح اطلاع دی تھی کہ آپ آ گئے ہیں اور امی جان آپ کو پوری فیملی کے ساتھ کھانے کی دعوت دینے چل پڑی ہیں! اب جان چند دن کے لیے امرتسر اور لاہور چلے گئے ہیں ورنہ وہ خود یہاں آتے۔ چچی جان نے ہمیں یہ جواب دیا ہے کہ وہ آپ سے مشورہ کیے بغیر ہماری دعوت قبول کرنے کا فیصلہ نہیں کر سکتیں۔“

یوسف مسکرایا۔ ”آپ کو معلوم ہے کہ امی جان کا ہر فیصلہ میرے لیے حکم ہوتا ہے۔“

امینہ مسکراتی: ”یہ ہمیں معلوم ہے۔ لیکن آپ کے ہونے کا مسئلہ بھی بہت اہم ہے۔“

امینہ کھلتے ہوئے سانسوں سے رنگ اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی ایک صحت مند لڑکی تھی اس وقت اس کا قد وقامت بھی موزوں دکھائی دیتا تھا لیکن اس کے ہاتھ اس کے جسمانی تناسب سے قدرے چھوٹے معلوم ہوتے تھے۔ یوسف کی نگاہ اس کے ہاتھوں پر اس لیے پڑ گئی تھی کہ اس نے ناخن ذرا بڑھا رکھے تھے اور ان پر سرخ پالش چڑھا رکھی تھی یوسف کسی سوچ میں پڑ گیا تھا۔

امینہ بولی: ”یوسف صاحب فرمائیے دعوت کے لیے آپ کا موڈ کب تک ٹھیک ہو جائے گا۔“

”آپ کو یہ کیسے خیال آیا کہ امی جان کی کسی خواہش کے مقابلے میں میرے موڈ کے کوئی معنے ہو سکتے ہیں؟“

امینہ کی ماں بولی: ”واہ بھئی آپ کو یہ معلوم ہی نہیں کہ آپ کی امی آپ کو کتنا چاہتی ہیں اور آپ کے موڈ کو کس قدر اہمیت دیتی ہیں۔“

یوسف نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”میری امی جان کو یہ بھی معلوم ہے کہ ان کا ہر اشارہ میرے لیے حکم کی حیثیت رکھتا ہے، اگر وہ ابھی کہہ دیتیں کہ آج دوپہر کے وقت

آپ کے ہاں دعوت ہے تو میرا موڈ اُسی وقت بن جاتا۔

رشیدہ نے ہنستے ہوئے کہا: ”ناجیسی اتنی جلدی نہ کرو جس جگہ رہتے ہیں، دعوت کرنا آسان نہیں۔“

امینہ نے کہا: ”یوسف صاحب یہ بات پکی ہو گئی کہ دعوت کی تاریخ پر ہمیں آپ کے موڈ کے متعلق کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ اور اباجان کے واپس آتے ہی ہم آپ سب کی دعوت کریں گے۔“

”جی ہاں طے ہو گیا۔“ یوسف نے جواب دیا۔

یوسف کی چچی نے کہا: ”بیٹا! تم نے چراغ بی بی سے کوئی بات نہیں کی، وہ امینہ کے ماموں کی بیٹی ہے۔ ہمیں رشیدہ اور امینہ تو کبھی کبھی ملا کریں گی۔ وہ زیادہ تر اپنے گاؤں میں ہی رہا کرے گی۔“

یوسف کی ماں نے کہا: ”بیٹا! چراغ بی بی کے باپ نے میاں عبدالکریم کے کئی اور کاموں کے علاوہ ان کی زمین کا انتظام بھی سنبھال لیا ہے اور سنا ہے کہ میاں صاحب مزید زمین خریدنے کی فکر میں ہیں۔“

یوسف نے کہا: ”امی جان! یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے ہمیں ایک طاقت ور ہمسایہ مل جائے گا۔“

یوسف کی دادی صحن سے نمودار ہوئی اور اس نے کہا: ”اری لڑکیو! مہمانوں کو کچھ کھلاؤ پلاؤ گی بھی یا باتیں ہی کرتی رہو گی۔“

یوسف نے آگے بڑھ کر سلام کرتے ہوئے کہا: ”دادی جان! آپ کے مہمان بھوکے نہیں رہیں گے۔“

دادی نے اس کے سر پر دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ”بیٹا! اللہ تمہیں بہت عزت اور بہت ترقی دے۔ میں نے ان سب سے جھگڑا کیا تھا کہ جب بیٹا آیا تھا تو تم نے مجھے

بلایا کیوں نہیں تھا۔“

”دادی جان! میں نے آتے ہی کہا تھا کہ دادی جان کی نیند خراب نہ کی جائے۔“

”مگر کہیں کا تمہیں معلوم ہے کہ میں کتنی باریہ پوچھ چکی ہوں کہ تم بیدار ہوتے ہو کہ نہیں۔“

”دادی جان! آپ کو پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ نے مجھے جگا دیا ہوتا۔“

”اور میں تمہاری نیند کیوں خراب کرتی۔“

”دادی جان! تھوڑی سی نیند خراب ہوتی اور اس کے عوض مجھے آپ سے سینکڑوں

دعائیں ملتیں۔“

”اچھا تمہارا خیال ہے کہ تمہاری نیند خراب کیے بغیر میں تمہیں عین نہیں دیتی۔“ دادی جان

میں یہ تو نہیں کتا لیکن آپ کی جو دعائیں میں نیم خوابی کی حالت میں سنا کرتا تھا وہ مجھے بہت

یاد آتی ہیں۔“

دادی نے غور سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور کہا: ”قدسیہ

بیٹی! تمہاری یہ بات بالکل صحیح ہے کہ تمہارے بیٹے کی پیشانی پر روشنی دکھائی دیتی ہے۔“ امینہ

نے اُٹھ کر کہا: ”دادی جان! آپ میرے پاس بیٹھ جائیں۔“

”رشیدہ! تمہاری لڑکی بڑی ذہین ہے۔“ دادی نے امینہ کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا: ”معلوم تھا کہ میں اس کے سوا کسی کے قریب نہیں بیٹھوں گی۔ مجھے بہت پیاری لگتی ہے یہ۔“



تھوڑی دیر بعد وہ کمرے کے اندر وسیع دسترخوان کے گرد بیٹھے کھانا کھا رہے تھے جسے

دیہاتی معیار کے مطابق کافی پزیرگرفت سمجھا جاتا تھا۔ کھانے میں میٹھے کی جگہ آمروں سے بہتر کوئی

چیز نہ تھی اور یوسف کا چچا غلام نبی علاقے کے باغات سے بہترین پودوں سے چونسے والے آموں

کا ایک ٹوکرا اکٹھا لایا تھا۔

جب مہمان خواتین جانے کے لیے اُٹھیں تو دادی نے کہا: ”یوسف جاؤ ان کو ان کے

گاؤں تک چھوڑ آؤ۔“

یوسف نے جواب دیا: ”دادی جان، مجھے کچھ تھکاوٹ سی محسوس ہو رہی ہے۔ اگر آپ حکم دیتی ہیں تو چل پڑتا ہوں ورنہ شاید تھوڑی دیر اور سونے سے میری طبیعت ٹھیک ہو جاتے۔“

”ارے بیٹا! تمہیں کس نے کہا تھا کہ تم بالا خانے میں جا کر گرمی میں سو جاؤ۔ تپش لگ گئی ہے میرے چاند کو۔ جاؤ جا کر سو جاؤ۔ میں نائن اور اس کے بیٹے کو ان کے ساتھ بھیج دیتی ہوں۔“

یوسف نے کہا: ”اوپر والا کمرہ ہوا دار ہے۔ میں ہوا دار علاقوں سے گھوم کر آیا ہوں۔ نیچے گھٹن میں مجھے نیند نہیں آئے گی۔ اگر آپ حکم دیں تو میں باہر باغ میں چلا جاتا ہوں۔“

”بیٹا! جہاں چاہتے ہو جاؤ لیکن سو جاؤ۔ لڑکیو! تم کیا دیکھتی ہو۔ جاؤ نا اس کا سر دباؤ۔ گھر میں کدو کا روغن ہوگا۔ اس کی مالش کرو۔“

”دادی جان! میں سونے سے بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔“

”اچھا جاؤ نا جلدی کرو۔ قدسیہ بیٹی! یہ کسی اور کی نہیں مانے گا۔ تم اپنے ہاتھ سے اس کے سر پر کدو کے روغن کی مالش کرو۔“

قدسیہ نے کہا: ”آؤ بیٹا! تمہاری دادی پریشان ہو رہی ہیں۔“

یوسف نے کہا: ”مہمانوں کو تو رخصت ہو لینے دیں۔ دادی جان۔“

یوسف کی چچیاں اور خاندان کی دوسری عورتیں بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کر رہی تھیں۔

”آؤ“ دادی نے مہمانوں کی جانب متوجہ ہو کر کہا۔

وہ دادی کے پیچھے چل پڑیں باقی خواتین نے باہر کی ڈیوڑھی تک ان کا ساتھ دیا۔ وہ ڈیوڑھی میں باتیں کر رہی تھیں کہ نوکر نائن اور اس کے بیٹے کو لے کر پہنچ گیا اور وہ دادی کے بعد باری باری سب سے مل کر رخصت ہوئے۔ دادی واپس آئیں تو قدسیہ سیڑھیوں سے

نیچے اتر رہی تھی۔

”اری بیٹی! تمہیں کیا جلدی پڑی ہے میں نے کہا تھا۔ اس کے سر پر کدو کے روغن کی مالش کرو۔“

قدسیہ نے کہا: ”ماں جی وہ سو گیا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ بیٹی! تم نے اچھی طرح دیکھا ہے۔ کہیں بخار تو نہیں تھا اُسے۔“

”ماں جی۔ اگر یوسف کو بخار ہو تو مجھے اچھی طرح دیکھے بغیر بھی معلوم ہو جاتا ہے آپ بالکل فکر نہ کریں۔ جب وہ بیدار ہوگا قہقہے لگاتا ہوا آپ کے پاس آئے گا۔“

”اچھا میں جا کر دعا کرتی ہوں۔“

دادی یہ کہہ کر یوسف کے چچا معین الدین کے گھر چلی گئیں۔

عصر کی نماز کے بعد قدسیہ اوپر گئی تو یوسف لیٹے لیٹے ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ ماں اس کے قریب بیٹھ گئی اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ یوسف نے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی اور ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کوئی خاص بات کرنا چاہتی ہیں اور آپ کسی بات پر بہت خوش ہیں۔“

”تمہاری دونوں باتیں صحیح ہیں بیٹا! میں اس بات پر خوش ہوں کہ تم ان کے ساتھ نہیں گئے۔ خدا معلوم مجھے ان لوگوں سے کیوں انجھن محسوس ہوتی ہے۔“

”امی جان! یوسف نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا: ”اگر آپ کی انجھن کا باعث وہ لڑکی ہے تو یہ انجھن ہمیشہ کے لیے دور ہو جانی چاہیے لیکن میں حیران ہوں کہ آپ نے جلدی ان کی دعوت قبول کیوں کر لی۔“

”بیٹا! اگر میں دعوت قبول نہ کرتی تو دادی اماں فوراً ایسا فیصلہ سنا دیتیں جو تمہارے آبا جان کے خیالات کی تائید میں ہوتا اور پھر میں کچھ نہ کر سکتی۔“

”اباجان کے خیالات امی جان.....“

”بیٹا! میں یہ جانتی ہوں کہ وہ عبدالکریم کی دولت سے کتنے مرعوب ہیں جس زمین کا ذکر تم نے آج سنا ہے اس کے متعلق تمہارے آبا جان کو تین ماہ سے معلوم تھا۔ وہ ایک دفعہ انہیں امرتسر اپنے گھر بھی لے گیا تھا اور دس دن کی چھٹی میں سے انہوں نے تین دن واپس گزارے تھے اور گھر آکر اس کی شاندار دعوتوں کی بے حد تعریف کی تھی۔ ان کے جگہ جگہ پھیلے ہوئے کاروبار کا وہ اکثر ذکر کیا کرتے ہیں۔ ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ اس کے بھٹوں کی تعداد کتنی ہے اور ان سے کتنی آمدنی ہوتی ہے۔ تمہارے آبا جان کو وہ لاہور میں دو وسیع پلاٹ بھی دکھا چکے ہیں۔ جہاں دو عالی شان کوٹھیاں تعمیر ہونے والی ہیں ایک امینہ کے لیے اور دوسری اس کے بھائی کے لیے۔ بیٹا! مجھے اس بات سے خوف آتا ہے کہ تمہارے خاندان کے لوگ کہیں تمہیں جکڑ کر ان کے آگے نہ ڈال دیں۔ تمہاری دادی جان سے مجھے کوئی شکایت نہیں۔ وہ تم سے بے حد پیار کرتی ہیں اور ابھی تم نے ہوش نہیں سنبھالا تھا کہ انہوں نے تمہاری منگنیاں شروع کر دی تھیں۔ انہیں اتنی لڑکیاں پسند آئی تھیں کہ میں تعداد بھی نہیں بتا سکتی۔ لیکن جب انہیں یہ بتا دیا جائے کہ یوسف کا اس میں فائدہ نہیں تو وہ فوراً اپنی سوچ کا رخ بدل لیتی ہیں۔ لیکن تمہارے آبا جان سے میں بہت ڈرتی ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایسی صورت حال پیدا کر دیں کہ تم جانتے اور سمجھتے ہوئے کوئی غلط فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جاؤ۔“

”امی جان! یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ آبا جان مجھ پر کوئی غلط فیصلہ نہیں ٹھونس سکتے۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔“

”بیٹا! جب تک میں زندہ ہوں انشاء اللہ کوئی ایسا خطرہ پیش نہیں آئے گا لیکن مجھے سوچتے ہوئے بہت تکلیف ہوتی ہے کہ کسی دن تمہیں تنہا ایسے حالات کا مقابلہ کرنا پڑے جو اس وقت تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکتے۔“

”امی جان! آپ ایسی باتیں کیوں کہتی ہیں۔“ یوسف نے بھراتی ہوئی آواز میں کہا اور ماں

کی گود میں سر رکھ کر ایک بچے کی طرح سسکیاں لینے لگا: ”اللہ آپ کا سایہ ہمیشہ میرے سر پر رکھے۔ امی جان آپ کو یہ سوچنا بھی نہیں چاہیے کہ جب میں آپ کے سایے سے محروم ہو جاؤں گا تو میں زندہ رہنا پسند کروں گا۔“

ماں نے بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا: ”ارے! میرا شیر بیٹا رو رہا ہے۔ میں کتنی بے وقوف ہوں میں نے کیسی بات کہہ دی ہے۔ بیٹا! تمہارے ساتھ ہزار برس زندہ رہ کر میں دعا کروں گی یا اللہ مجھے اور زندگی دے۔ اب تم مطمئن ہو۔“

یوسف نے مسکراتے ہوئے اشبات میں سر ہلا دیا۔

باب - ۱۱

چوتھے روز یوسف مغرب کی نماز کے بعد گاؤں سے باہر سر کے لیے نکل گیا۔ اچانک مکئی اور کما کے کھیتوں کی اوٹ میں پگڑنڈی سے ہر دیال سنگھ اس کا بیٹا جگجیت سنگھ اور چراغ بی بی نمودار ہوتے اور وہ انہیں دیکھ کر رک گیا۔ ہر دیال سنگھ جس کی عمر پالیس سال سے اوپر تھی۔ عبدالکریم کا مزارع تھا اور عبدالکریم کی جائداد کی دیکھ بھال میں اسے قائم دین کے ساتھ ایک ثانوی پوزیشن حاصل تھی۔ اس کا بیٹا جگجیت سنگھ عبدالکریم کی بیوی کو ماں جی اپنے کو آپا کہتے ہوئے فخر محسوس کرتا تھا اور اسے گھر کے چھوٹے موٹے کاموں کے عوض صاف ستھرے کپڑے ملتے تھے۔ ہر دیال سنگھ پسینے سے شرابور ہو کر بری طرح ٹانپ رہا تھا۔ چراغ بی بی چند قدم پیچھے تھی اور بڑی مشکل سے اپنی چینیں ضبط کر رہی تھی۔ ابھی ہر دیال سنگھ بات کرنے کے لیے اپنی سانس درست کر رہا تھا کہ اُس نے قریب آکر رونی آواز میں کہا "چوہدری یوسف جی ہمیں بچائیے جگجیت سنگھ سے پوچھ لیجئے۔ ڈاکو آج رات ہمیں قتل کرنے اور لوٹنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ جگجیت سنگھ نہر کے کنارے درخت کے اوپر چڑھ کر جامن اتار رہا تھا۔ ہمارے دشمن اور وہ ڈاکو ارجن سنگھ و ماں آگئے اور یہ خوف کے مارے چھپ گیا۔"

یوسف نے سر ہلا کر کہا "تم یا تو رو لویا بات کرو۔ یہ جامن کے ساتھ ڈاکوؤں کا کیا تعلق ہے اور چھپ کون گیا تھا؟"

چراغ بی بی نے دردناک آواز میں کہا "وہ ہمیں قتل کر دیں گے اور رات ہوتے ہی ہمارے گھر پر حملہ ہو جائے گا۔ مجھے امینہ نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ ابا شہر گیا ہوا ہے اور فضل دین

خدا جانے کہاں غرق ہو گیا ہے۔ میاں جی نے آج آنا ہے۔ خدا کرے وہ شام تک پہنچ جائیں لیکن آپ جگجیت سے پوچھ لیں کہ ڈاکو کتنے خطرناک ہیں۔"

چراغ بی بی پھر رو رہی تھی۔ یوسف نے کہا۔

"اب تم خاموش ہو جاؤ اور سیدھی ہمارے گھر چلی جاؤ اور وہاں کسی سے یہ بات نہ کرو کہ ہمارے گھر ڈاکو پڑنے والا ہے۔ رونے کے لیے پیٹے در دیا سر درد کا بہانہ کر لینا، لیکن ڈاکوؤں کا ذکر نہ کرو۔ سن لیا تم نے؟"

"جی نہیں کروں گی میں ڈاکوؤں کا ذکر۔"

"اچھا جگجیت، تم بتاؤ کیا ہوا تھا؟"

جگجیت بولا "جی، چھوٹی بی بی جی کو جامن بہت پسند ہیں اور میں نہر کے قریب ایک درخت پر چڑھ کر جامن توڑ رہا تھا کہ مجھے گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی۔ ہمارے گاؤں کے دو آدمی لنگا سنگھ اور بھن سنگھ آموں کے باغ کی طرف سے نکل کر اس درخت کی چھاؤں میں رک گئے جس پر میں جامن توڑ رہا تھا، سوار نے گھوڑا روک کر اترتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ہم تھوڑی دیر کے لیے یہیں بیٹھ جاتے ہیں۔" میں نے تو انہیں دُور سے دیکھ کر ہی پہچان لیا تھا۔ وہ ارجن سنگھ ڈاکو تھا جب وہ بیٹھ گئے تو ارجن سنگھ بولا "لنگا سنگھ! میرے چار آدمی رات ہوتے ہی تمہارے گھر پہنچ جائیں گے۔ تم نے اپنے بال بچوں کو اندھیرا ہوتے ہی بھن سنگھ کے گھر بھیج دینا ہے اور یہ بھی پتہ کر چھوڑنا کہ آج عبدالکریم واپس اپنے گھر آگیا ہے یا نہیں اور ان کی حویلی کے اندر کتنے آدمی ہیں اور ان پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے ہمیں کون سی مشکلات پیش آسکتی ہیں۔" اُس ڈاکو کو یہ بھی معلوم تھا کہ بڑی بی بی اور چھوٹی بی بی سونے کے زیور پہنتی ہیں اور اگر نیچے عبدالکریم اور قائم دین کو پکڑ لیا جائے تو اُپر زینے کا دروازہ کھلوا یا جاسکتا ہے، مجھے بار بار یہ خیال آتا تھا کہ انہیں کہیں یہ معلوم نہ ہو جائے کہ میں درخت پر ان کی باتیں سن رہا ہوں۔ میں خوف سے کانپ رہا تھا کبھی کبھی ان کی باتیں بھی نہیں سنائی دیتی تھیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے

”میاں جی میں سورج ڈوبتے ہی یہاں پہنچ جاؤں گا۔“
یوسف نے باقی آدمیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”تم ہمارے خانے میں بیٹھو، میں چراغ بی بی کو چھوڑ کر ابھی آتا ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد وہ اپنی دادی، والدہ اور گھر کی دوسری خواتین کے سامنے کھڑا تھا۔
”چراغ بی بی کی طبیعت بہت خراب ہے یہ کسی بھوت سے ڈر گئی ہے اور اس خوف کا اثر یہ ہے کہ یہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد چنچیں مارتی ہے۔ ایک دوائی سے اس کی طبیعت کچھ ٹھیک ہو گئی ہے لیکن چونکہ بھوت خطرناک معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے یہ یہیں رہے گی۔ اگر بھوت زیادہ خطرناک ثابت ہوا اور اس نے دوبارہ جینا شروع کر دیا تو اسے پھیلی کوٹھڑی میں بند کر دیں۔“
”لیکن یہ یہاں کیسے پہنچی؟“ دادی نے پوچھا،

”دادی جان! اسے یہاں تک لانے کے لیے گاؤں سے دو آدمی آئے تھے۔“
چراغ بی بی خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی لیکن یوسف کے سامنے کوئی بات نہ کر سکی۔
نوبکے کے قریب بارش شروع ہو چکی تھی اور گنگا سنگھ بے چینی سے اپنے مہانوں کا انتظار کر رہا تھا۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا تو اس نے بھاگ کر گنڈی کھولی۔ اس کے ساتھ ہی دو آدمی بھتوں نے ڈھلائے باندھ رکھے تھے اندر داخل ہوئے اور ایک نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لی دوسرا اُسے دھکیلتا ہوا صحن سے آگے کمرے میں لے گیا۔
تیسرے آدمی نے اُسے آن کی آن میں رسی سے جکڑ کر فرش پر ڈال دیا۔ اس کی پگڑی کا ایک سرا اس کے منہ میں اس طرح ٹھونس دیا کہ اس کے حلق سے آواز نہیں نکل سکتی تھی۔ دو منٹ میں یوسف کے علاوہ آٹھ آدمی وہاں جمع ہو چکے تھے۔ پھر کسی اور نے دروازہ کھٹکھٹایا اور تین آدمی اور ڈھلائے باندھے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ صحن میں جو چار آدمی ڈھلائے باندھے ہوئے کھڑے تھے انہیں کسی زور آزمائی کی ضرورت پیش نہ آئی۔ وہ اطمینان سے انہیں باقی ساتھیوں کے پاس لے گئے اور باندھ کر گنگا سنگھ کے پاس لٹا دیا۔ دس منٹ بعد دو اور ان کے قابو میں آچکے تھے۔

منہ سے چیخ نکل جائے گی اور میں نیچے گر پڑوں گا۔ جب وہ چلے گئے تو میں ڈرتے ڈرتے درخت سے اُترا اور سیدھا میاں جی کے گھر پہنچا۔ بڑی بی بی شاید میرا اعتبار نہ کرتی لیکن چھوٹی بی بی نیچے بیٹھی ہوتی تھی۔ جب میں نے مانپتے کانپتے انہیں ساری باتیں بتائیں تو انہوں نے فوراً میرے پتا جی کو بلایا اور یہ کہا کہ ہم کسی سے اس کا ذکر نہ کریں اور فوراً یوسف صاحب کے پاس جائیں۔ یوسف نے پوچھا۔

”اور چراغ بی بی کو بھی انہوں نے بھیجا تھا۔“
ہر دیال سنگھ بولا نہیں جی، جب میں بی بی جی سے باتیں کر رہا تھا تو اس نے دینے سے چنچیں مارتی شروع کر دیں اور پھر روتی ہوئی ہمارے ساتھ چل پڑی۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر چھوٹی بی بی نے کہا۔

”نہیں نہیں اسے لے جاؤ۔ اس کا جانا بہتر ہوگا۔“
یوسف نے مڑ کر چراغ بی بی کی طرف دیکھا اور کہا ”چراغ بی بی تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو تمہیں معلوم نہیں کہ ڈاکو جس جگہ رونے کی آواز سنتے ہیں وہاں فوراً پہنچ جاتے ہیں۔“
چراغ بی بی نے منہ میں دوپٹہ ٹھونسے ہوئے کہا ”جی میں بالکل نہیں سوتی گی۔“
یوسف نے کہا ”ہر دیال سنگھ! تم سب میرے ساتھ آؤ۔ مجھے گاؤں سے چند آدمی لے جانے پڑیں گے۔“

گھر پہنچ کر یوسف نے گاؤں کے دس آدمیوں کو جمع کر کے چند ہدایات دیں اور پھر ایک رقعہ لکھ کر بتوکے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔
”بتو! تم فوراً تھا نیدا کو میرا یہ رقعہ پہنچا دو اور شام ہونے سے پہلے واپس پہنچنے کی کوشش کرو۔ آج رات ہم نے ایک بہت بڑا شکار بچھڑا ہے۔“ میاں جی، شکار کے لیے میری برہمی کی ضرورت بھی ہوگی؟“
”ہاں لیکن اندھیرا ہونے سے پہلے ہم نے میاں عبدالحکیم کے گاؤں پہنچ جانا ہے۔“

ہے۔ لیکن اب تمہیں اپنا پستول پھینک دینا چاہیے۔ تیز برجھی تمہاری کمر کو چھو رہی ہے اور تمہارا ساتھی بشن سنگھ اگر دائیں باتیں دیکھ سکے تو اسے ایک نیزہ اور تلوار دکھاتی دے گی۔ فضل دین اس کے ہاتھ سے پستول پکڑ لو۔“

ارجن سنگھ ایک ثانید تذبذب کی حالت میں کھڑا رہا لیکن جب پیچھے سے بتورنے برجھی کو فوراً دبا تو اس نے بھرا ہوا پستول نیچے پھینک دیا۔ یوسف نے کہا ”اس کی اچھی طرح تلاشی لو۔“

اب تو اور فضل دین دونوں اس کی اطمینان سے تلاشی لینے کے بعد ایک خنجر ایک چاقو اور اٹھائیس گولیاں برآمد کر چکے تھے۔ فضل دین ارجن سنگھ کے باقی ساتھیوں کو مضبوط رسی کے ساتھ جکڑ چکا تھا لیکن وہ مطمئن نہ تھا وہ بھاگ کر گھر گیا اور ایک پلنگ کی نئی نواڑ کے دو بٹل اٹھا کر لے آیا۔ اُس نے سب سے پہلے ارجن سنگھ کو باندھا پھر اس کے ساتھیوں کو دوبارہ کسا۔ اس کے بعد ان سب کو تھانے پہنچانے کے لیے حویلی کے اندر ایک گڈے پر ڈالا گیا تو باقی نواڑ استعمال کی گئی۔ حالت یہ تھی کہ ڈاکوؤں کے ہاتھ پاؤں بھی بندھے ہوئے تھے۔ اور ارجن سنگھ کے ہاتھ بھی اس طرح باندھ دیئے گئے تھے کہ ایک سے دوسرا جدا نہ ہو سکے۔ گڈے پر ڈالنے وقت ان کے آرام کا بھی خیال کیا گیا تھا او ان کے نیچے کچھ پرالی ڈال دی گئی تھی لیکن نواڑ کا جو حصہ بچ گیا تھا۔ اس کے ساتھ وہ گڈے کے تختے کے ساتھ اس طرح کس کر باندھ دیئے گئے تھے کہ ارجن سنگھ پیٹھ کے بل سب کے نیچے پڑا ہوا تھا اور باقی سب کا بوجھ اس کے اوپر تھا۔ بارش تیز ہو چکی تھی اور پانی میں بھیگ جانے کے باعث نئی نواڑ کا کچھاؤ بتدریج زیادہ بڑھ رہا تھا۔ ارجن سنگھ اور اس کے ساتھی ایک ناقابل برداشت اذیت کی حالت میں دھاتی دینا چاہتے تھے۔ لیکن ان کے منہ فضل دین نے اس احتیاط سے بند کیے تھے کہ کسی کے حلق سے آواز نہیں نکل سکتی تھی۔ یوسف نے جگجیت سنگھ کی حویلی کا دروازہ کھلوا یا فضل دین سے کہا ”تم جا کر

پھر کوئی بس منٹ گزر گئے اور انہیں ارجن سنگھ کے متعلق مایوسی ہونے لگی۔ بارش میں کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ بشن سنگھ اپنے مکان کا دروازہ کھول کر باہر نکلا ”سردار جی! آپ نے بہت دیر کر دی۔ میں تو بارش میں کھڑے کھڑے ٹھٹھڑا رہا تھا۔ آپ کو اتنے آدمی جمع کرنے کی ضرورت نہ تھی۔“

”کیا بچتے ہو۔ میں نے صرف چار آدمی بھیجے ہیں۔“

”جناب! گنگا سنگھ نے اپنی کارگزاری دکھانے کے لیے زیادہ آدمی جمع کر لیے ہوں گے ورنہ یہاں تین چار آدمی بھی کافی تھے اور اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپ سے مایوس ہو کر اندر بیٹھ گیا ہے۔“

”او گنگا سنگھ کے بچے! ارجن سنگھ نے کہا ”بے وقوف خاموش رہو۔ میاں بیکرم گاؤں میں آگیا ہے نا۔“

اندر سے دروازہ کھلا اور جگجیت سنگھ نے کہا ”جی وہ آگیا ہے۔“

”میرے آدمی کہاں ہیں؟“

یوسف نے کہا۔ ”آئیے، وہ اندر بیٹھے ہوتے ہیں۔“

”گنگا سنگھ کہاں ہے؟“

”جی وہ ان کے ساتھ باتیں کر رہا ہے۔“

”کن کے ساتھ باتیں کر رہا ہے۔“

”مہانوں کے ساتھ۔“

”مہمان کون ہیں؟“

”جن کو اس نے مدد کے لیے بلایا ہے۔“

”بڑا بد معاش ہے۔“

”بد معاش وہ ہوتا ہے جو رات کے وقت نیتے لوگوں کے گھر میں پستول لے کر پھرتا

چھ ساتھی نیچے گڈے کے اندر آپ کی نئی نواڑ سے اس طرح بندھے ہوئے پڑے ہیں کہ وہ سانس بھی نہیں لے سکتے۔

”لیکن بیٹا یہ کیسے ہوا؟ مجھے تو فضل دین کی قسموں پر بھی یقین نہیں آ سکتا۔ وہ ایک ہی پلنگ کی نواڑ کافی سمجھتا تھا۔ میں نے زبردستی نواڑ کے دونوں نئے بندل اُسے دے دیئے تھے۔ یہ نواڑ میں نے پچھلے ہفتے ہی امرتسر سے منگوائی تھی۔“

”چچی جان! معلوم ہوتا ہے کہ یہ نواڑ بنائی ہی ڈاکوؤں کے لیے گئی تھی۔ قائم دین نے اُسے اتنی احتیاط سے استعمال کیا ہے کہ وہ سانس بھی نہیں لے سکتے۔“

عبدالکریم نے کہا: ”بیٹا! آپ نے ان ڈاکوؤں کو گرفتار ہی نہیں کیا بلکہ میرے گھر سے اکیس ہزار روپیہ نقد انعام حاصل کرنے سے انہیں محروم بھی کر دیا ہے۔ اب میں صبح ہوتے ہی اکیس ہزار روپیہ بیان رکھنے کی بجائے قائم دین کے ہاتھ امرتسر واپس بھیج دوں گا یا گورداسپور کے بنک میں جمع کرادوں گا اور سیٹھ دینا ناتھ کو اطلاع بھیج دوں گا کہ میں نے چند دن کے لیے زمین خریدنے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔“

”کون سی زمین خریدنے کا ارادہ؟“

”بیٹا! سیٹھ دینا ناتھ نے اپنے گاؤں کے ایک زمیندار سورن سنگھ سے زمین کا سودا کر دیا تھا اور کل میں نے رقم کی ادائیگی کے لیے گورداسپور پہنچنا تھا۔“

یوسف نے چپا ”دینا ناتھ کو اس بات کا علم تھا کہ آپ آج رات رقم لے کر گھر پہنچ جائیں گے؟“

”ہاں میں اس کے ساتھ وعدہ کر کے آیا تھا۔ میں نے سورن سنگھ سے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ

میں بنک سے کورے نوٹ لے کر آؤں گا۔“

امینہ نے کرسیاں گھسیٹ کر آگے کرتے ہوئے کہا۔

”جناب! اگر ڈاکوؤں کے بھاگ جانے کا خطرہ نہیں تو آپ اطمینان سے بات کریں۔“

یوسف نے عبدالکریم کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا: ”میاں صاحب! اگر دینا ناتھ کو یہ

اپنی جوہلی کا چھانک کھلاؤ۔ پولیس کے آنے تک یہ گڈا تمہاری جوہلی میں رہے گا۔“
 دس منٹ بعد عبدالکریم اور گاؤں کے دوسرے لوگ علاقے کے مشہور و معروف ڈاکو ارجن سنگھ کو مارچ کی روشنی میں ایک ناقابل یقین حالت میں دیکھ رہے تھے عبدالکریم نے سر پر چھتری تان رکھی تھی اور اس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ اس نے اچانک جگجیت سنگھ کو تھکی دیتے ہوئے کہا۔

”بیٹا! تم بہت بڑے انعام کے حق دار ہو لیکن چراغ بی بی تمہارے ساتھ گئی تھی اُسے ڈاکو پکڑ کر تو نہیں لے گئے۔“

یوسف نے بڑی مشکل سے سنہی ضبط کرتے ہوئے کہا: جی آپ اس کی فکر نہ کریں۔ میں اُسے اپنے گھر چھوڑ آیا ہوں! پھر اس نے تلو کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ تم ابھی تھانیدار کی طرف جا کر انہیں میرا سلام کہو اور یہ بتاؤ کہ ہم نے ڈاکو ارجن سنگھ اور اس کے چھ ساتھی پکڑ لیے ہیں اور انہیں تھانے بھیجا جا رہا ہے۔“

عبدالکریم نے کہا: ”بیٹا! یہ بہتر نہیں ہے کہ پولیس ان خطرناک آدمیوں کو خود گرفتار کر کے یہاں سے لے جاتے؟“

یوسف نے جواب دیا: ”اب یہ خطرناک نہیں ہیں۔ اب میرے آدمی تھانے تک ان کے ساتھ جائیں گے۔“

جگجیت سنگھ: ”تم مضبوط سیلوں کی ایک جوڑی لے آؤ۔“

عبدالکریم نے کہا: ”بیٹا! ذرا اوپر جا کر بچوں کو تسلی دے آؤ۔ انہیں یقین نہیں آتا کہ ڈاکو پکڑے جا چکے ہیں۔“

”آئیے“ یوسف نے کہا اور عبدالکریم اس کے ساتھ چل دیا۔ امینہ اس کی ماں اور بھائی بالائی منزل کے رُکے میں کھڑے تھے۔ یوسف نے آگے بڑھ کر سلام کرنے کے بعد کہا: ”چچی جان! میں آپ کو یہ یقین دلانے کے لیے آیا ہوں کہ ڈاکو ارجن سنگھ اور اس کے

معلوم تھا کہ آپ رو پیسے کر آرہے ہیں تو آپ اُسے یہ بالکل نہ کہیں کہ آپ نے سودا ملتی کر دیا ہے بلکہ یہ لکھیں کہ آپ کا منشی پرسوں ایک ضروری کام سے فارغ ہوتے ہی رات کی گاڑی پر رقم لے کر پہنچ جائے گا اور سردار سورن سنگھ کو خوش کرنے کے لیے نئے نوٹوں کے علاوہ ایک ہزار چمکتے ہوئے نئے سکہ بھی لیتا آئے گا۔

میاں جی! میں آپ کو یہ بعد میں بتاؤں گا کہ میں یہ کیوں کہہ رہا ہوں لیکن یہ بہت ضروری ہے۔ ان ڈاکوؤں کے گرفتار ہو جانے سے بھی زیادہ ضروری۔ اگر دینا نا تھا یہ پوچھے کہ آپ پیسے ساتھ لے کر کیوں نہیں آتے تو آپ اپنے منشی کا دیر سے بنک پہنچنے کا عذر یا کوئی اور بہانہ پیش کر دیں۔ آپ اپنے منشی کو بھی یہ خط لکھ دیں کہ وہ پرسوں رات گاڑی پر سوار ہو کر یہاں آنے کے لیے تیار رہے۔ باقی ہدایات کے لیے ہمیں آپ کے نوکر فضل دین سے کام لینا پڑے گا۔ کیونکہ ہر رات خط میں نہیں لکھی جاسکتی۔ ہو سکتا ہے کہ ڈاکوؤں کی گرفتاری کا سن کر دینا نا تھا چند دن آپ کے پاس آنے سے اجتناب کرے لیکن آپ کی کامیابی اس میں ہے کہ آپ اسے اس بات پر قائل کر لیں کہ زمین خریدنے کے بارے میں آپ کے ارادے میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ ٹھیک اس وقت میرا خیال یہی ہے۔ اب تو میں اسے یہاں تک یقین دلاؤں گا کہ میں اس کی مدرسے چالیس پچاس ایکڑ زمین اور بھی خریدنا چاہتا ہوں۔ اگر زمین کا کوئی اچھا ٹکڑا مل گیا تو میری کوشش یہ ہوگی کہ یہاں بجلی بھی پہنچ جائے۔ ملاقات کے دوران اگر آپ اس کے ذہن میں یہ ڈال دیں کہ آپ کی وجہ سے پولیس کے ساتھ اس کے چھوٹے موٹے کام آسانی سے نکل جایا کریں گے تو یہ اور بھی بہتر ہوگا۔

عبدالکریم نے کہا ”بیٹا! میں سب سمجھتا ہوں۔ میں صبح دینا نا تھا کو ایسا خط لکھوں گا کہ وہ بھاگتا ہوا یہاں آئے گا۔“

”بچا جی آپ کا منشی پرسوں رات رقم لے کر شام کی گاڑی پر ٹیشن پر پہنچ جائے گا اور سورن سنگھ کے لیے نئے نوٹوں کے علاوہ ایک ہزار چمکتے ہوئے سکہ بھی لائے گا۔ پھر اگلی صبح گورداس پور پھری میں جسٹری کے وقت یہ رقم اس کے حوالے کی جائے گی۔“

”بیٹا! میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ قائم دین نے اوپر آکر کہا۔ ”ہر دیال سنگھ نے گڈے کے ساتھ بیل جوت دیتے ہیں اور فضل دین کہتا ہے شاید پولیس بھی آرہی ہے۔“

”بھئی شاید کا کیا مطلب؟“

”جی وہ یہ کہتا ہے کہ گھوڑوں کی ٹاپ سائی دے رہی ہے۔“

عبدالکریم نے کہا ”گھوڑوں پر ڈاکو بھی آسکتے ہیں۔ یوسف نے اٹھ کر بندوق منبھاتے ہوئے کہا ”نہیں جی اب یہ خطرہ نہیں ہو سکتا۔ آپ اوپر سے دروازہ بند کر لیں۔ میں نیچے دیکھتا ہوں۔“

پانچ منٹ بعد قائم دین نیچے سے آوازیں دے رہا تھا۔

”میاں جی، پولیس پہنچ گئی ہے۔“

عبدالکریم گلی میں پہنچا تو تھانیدار گھوڑے سے اتر کر ٹارچ کی روشنی میں بندھے ہوئے ڈاکوؤں کا معائنہ کر رہا تھا

”یار! مجھے تو ان کا سر پیر نظر نہیں آ رہا۔“

فضل دین نے کہا ”جناب یہ سات آدمی ہیں۔ چار جوارجن سنگھ کے ساتھ آئے تھے دو جو

اس گاؤں سے اس کے ساتھ ملے تھے اور جناب ساتواں جرن سنگھ ہے۔“

”تھانیدار نے جواب دیا ”کیا جانتے ہو؟ وہ ساتواں کہاں ہے؟“

”جناب، ساتواں نیچے ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے گڈے کے نیچے؟“

”نہیں جناب ساتواں ان کے نیچے ہے۔“

”لکن کے نیچے؟“

”ان چھ کے نیچے جو اس کے اوپر پڑے ہوئے ہیں۔“

”میں ٹارچ روشن کرتا ہوں۔ اگر آپ غور سے دیکھیں وہ تھوڑا بہت نظر آجائے گا۔“

”وہ زندہ ہے؟“

”جناب جب اُسے باندھا گیا تھا تب تو بالکل زندہ تھا۔ اب یہ دیکھنے کے لیے اُسے کھولنا پڑے گا۔“

”ہم ان سب کو ہتھ کڑیاں لگانا چاہتے ہیں۔ تم انہیں ایک ایک کر کے کھولنا شروع کر دو۔“

”جناب یہ ایک ایک کر کے نہیں کھلیں گے۔“

”کیا بکواس ہے۔ یہ ایک ایک کر کے کیوں نہیں کھلیں گے۔“

”جناب، یہ ایک ایک کر کے اس لیے نہیں کھلیں گے کہ میں نے انہیں اپنے ہاتھوں سے باندھا ہے۔“ فضل دین نے فخریہ انداز میں جواب دیا۔

ہر دیال سنگھ نے کہا: ”سرکاری گڑے پر بندھے ہوئے ہیں۔ انہیں وہیں رہنے دیں۔“

اور گڑے کو اسی طرح تھالے لے چلیں۔ میاں یوسف کے آدمی ساتھ جائیں گے۔“

”میاں یوسف صاحب میاں عبدالرحیم کے صاحبزادے جنہوں نے مجھے رقعہ لکھا

تھا۔ وہ نہیں ہیں؟“

یوسف نے اطمینان سے جواب دیا: ”تھانیدار صاحب، میں یہیں ہوں اور میرے

خیال میں زیادہ مناسب یہی ہے کہ رات یہاں ہتھ کڑیاں لگا کر ان کے گرد پہرہ دینے کی بجائے

انہیں تھانے بھیج دیں۔ میں دس قابلِ اعتماد آدمی اسی وقت آپ کے ساتھ روانہ کر سکتا

ہوں اور اگر آپ ضرورت محسوس کریں تو میں خود بھی آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔“

”میاں صاحب! بلوکی باتیں سننے کے بعد مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ ارجن سنگھ کو آپ

نے گرفتار کر لیا ہے۔ میں نے اسی وقت گورداسپور کے انسپکٹر صاحب سے بات کی تھی۔ انہوں

نے ایس پی صاحب کو خبر دی تھی اور فوراً مجھے یہ حکم دیا تھا کہ میں خود جا کر تصدیق کروں کہ ارجن سنگھ

کیسے گرفتار ہوا۔ انسپکٹر صاحب کو میں نے آپ کا رقعہ ملنے کی بھی اطلاع دی تھی اور اس کے بعد

جب تک آپ کا آدمی دوبارہ میرے پاس نہیں آیا ان کے دو ٹیلیفون آپکے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کو اس کا رگزاری پر ایک بڑا انعام ملے گا۔“

”میں نے جو کیا ہے وہ ایک فرض سمجھ کر کیا ہے اور انعام کے لیے میں اپنا ساتھ دینے والے کو آگے کروں گا۔“

ایک ہیڈ کانٹریبل نے کہا: ”جناب، مجھے تو یہ سانس لیتے ہوئے بھی دکھائی نہیں دیتے۔“

یوسف نے کہا: ”ان کے منہ سے کپڑے نکال دو۔“

فضل دین نے پوچھا: ”جی سب کے منہ سے؟“

”ہاں سب کے منہ سے۔“

”جناب میرا مطلب ہے ارجن سنگھ کے منہ سے بھی؟“

”ہاں۔ اس کا سانس لینا زیادہ ضروری ہے۔“

”اچھا جی۔ کام تو بہت مشکل ہے لیکن میں کوشش کرتا ہوں۔“

یوسف نے غصے میں آ کر کہا: ”کوشش نہیں یہ ضروری ہے۔“

فضل دین نے کہا: ”ہر دیال سنگھ! میری مدد کرو ورنہ تم میاں جی سے جو نواڑ چل

کرنا چاہتے ہو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔“

میں ٹارچ سے روشنی کرتا ہوں اور تم اس جگہ سے نواڑ کاٹ دو جہاں سے ہمارے

ہاتھ ارجن سنگھ کے منہ تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ نقصان نہیں ہوگا۔“

یوسف نے تھانیدار، اے ایس آئی، ہیڈ کانٹریبل اور پولیس کے آٹھ سپاہیوں سے

کہا: ”چلیے میاں صاحب کی خواہش ہے کہ آپ اندر جا کر چائے پی لیں۔“

تھانیدار نے کہا: ”بھئی فضل دین، اگر اوپر کے دو تین آدمیوں کو ہتھ کڑیاں لگا

دینے کے لیے جگہ بنا لو تو ہماری تسلی ہو جائے گی اور ہم اطمینان سے میاں صاحب کی چائے

پی لیں گے۔“

کو بھی تسلی دینا ضروری ہے۔ میں انشاء اللہ کل آپ سے ملوں گا۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو بچوں کو چند دن کے لیے ہمارے گھر بھیج دیں کیونکہ اس واقعہ کے بعد ان کا خوفزدہ ہونا ایک قدرتی بات ہے۔

”بیٹا اگر تم یہ نہ کہتے تو بھی میں یہی کرتا۔“

چچا جی! آپ آرام سے سو جائیں۔ اب یہاں دوبارہ ڈاکوؤں کے حملے کا کوئی خطرہ نہیں تاہم میں چند آدمی آپ کے گاؤں کی حفاظت کے لیے بھیج دوں گا۔
یوسف نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو عبدالکریم تذبذب کی حالت میں اپنی بیوی کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے کہا۔

”بیٹا یوسف! ذرا ٹھہرنا تمہاری چچی کچھ کننا چاہتی ہے۔“

رشیدہ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا یوسف! تمہارے چچا جس کام سے جھجھک محسوس کرتے ہیں اس کے لیے مجھے آگے کر دیا کرتے ہیں۔ یہ تو بیٹا، ہم تمام عمر تمہاری نیکیوں کا صلہ نہیں دے سکتے لیکن ہماری خواہش ہے کہ یہ چھوٹا سا نذرانہ قبول کر لو۔“

رشیدہ نے ایک رومال میں بندھے ہوئے پانچ پانچ سو روپے کے دس نوٹ یوسف کو پیش کر دیے۔ یوسف نے تڑپ کر دیکھتے ہوئے ہرے کہا۔ ”چچی جان! چچا جان! یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ نے مجھے کیا سمجھا ہے۔“

عبدالکریم نے کہا۔ ”بیٹا! تم نے روپے کے ساتھ ہماری عزت اور جانیں بھی بچائی ہیں۔“
یوسف نے کہا۔ ”چچا جی! میں نے جو کچھ کیا ہے وہ کسی معاوضے کے لیے نہیں کیا۔ رشیدہ نے مجھے سمجھایا تھا کہ میں آپ کو پانچ ہزار روپیہ پیش کر کے حماقت کر رہا ہوں لیکن بیٹا یہ بات میرے ذہن میں نہیں آسکتی تھی کہ آپ میرے گھر سے خالی جائیں گے۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو مجھے معاف کر دو۔“

یوسف نے کہا۔ ”چچی جی! میں خالی ہاتھ لے کر نہیں جا رہا۔ میں یہ یقین لے کر جا رہا

یوسف نے کہا۔ ”جناب میرے مسلح آدمی یہاں موجود ہیں اور اگر کوئی یہاں موجود نہ ہوتا تو بھی صرف تو ہی اپنی برہمی کے ساتھ کافی تھا۔“

چائے پر بیٹھتے ہوئے یوسف نے تھانیدار سے کہا۔

”جناب! آپ ان قیدیوں کو حوالات میں بھیجنے کی بجائے تفتیش کے سلسلے میں دوچار

دن کے لیے تھانے میں روک سکتے ہیں؟“

”جی ہاں۔ ان کا جسمانی ریمانڈ کیا جاسکتا ہے۔“

”تو انسپکٹر صاحب سے میری طرف سے درخواست کیجئے کہ وہ ان قیدیوں کو پانچ چھ روز کے لیے تھانے میں ہی رہنے دیں۔ سردست میں اس کی وجہ نہیں بتا سکتا لیکن یہ ہے بہت ضروری۔“

تھانیدار نے کہا ”یوسف صاحب! یہ تو اتنی معمولی سی بات ہے کہ اگر میں ٹیلی فون پر بھی کہہ دوں کہ یوسف صاحب کی یہ خواہش ہے کہ انہیں روک لیا جائے تو انہیں روک لیا جائے گا۔“

وہ چلتے پی کر اٹھنے کو تھے کہ فضل دین بھاگتا ہوا اندر آیا اور کہنے لگا۔

”جناب، وہ سب زندہ ہیں اور ارجن سنگھ بھی زندہ ہے لیکن بڑی گالیاں دیتا ہے۔“

”کس کو گالیاں دیتا ہے؟ ایک سپاہی نے پوچھا۔“

”جی باندھنے والے کو گالیاں دیتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک اسے میرا نام معلوم

نہیں۔“ تھوڑی دیر بعد گڈاروانہ ہو چکا تھا۔ پولیس کے ذواں اور نو سواروں کے علاوہ گاؤں کے آدمی اس کے ساتھ جا رہے تھے۔ یوسف نے عبدالکریم کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اچھا چچا مجھے اجازت دیجئے۔“

عبدالکریم نے کہا۔ ”بھئی یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ باقی رات آپ یہیں رہیں گے۔“

”دیکھیے چچا جان میرا اس لیے جانا ضروری ہے کہ اتمی جان پریشان ہوں گی اور چراغ بی بی

ذکر جس کھاٹ کے گرد سات خوفناک بھوت گدھوں کی صورت میں اپنی ٹانگوں کے ساتھ گھنگر باندھ کر ناچا کرتے تھے، خوف سے چیخ مار کر بیہوش ہو گئی تھی۔ خوش قسمتی سے سائیں جی کا ایک مژید اپنے تکیے میں موجود تھا۔ اُس نے اس کے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار کر دم کیا اور اسے ہوش آ گیا۔ پھر اسے لمبوں کے عرق میں پانی اور نمک ملا کر پلایا گیا تو وہ بالکل ٹھیک ہو گئی۔ جب یوسف واپس آیا تو وہ اس سے کئی سوال پوچھنا چاہتی تھی۔ لیکن اس نے یوسف اتنا کہہ کر دوسری طرف چلا گیا کہ ”انشاء اللہ صبح کو وہ سب یہاں آجائیں گے۔ اور ڈاکو پکڑے جا چکے ہیں، ان کے متعلق فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔“

صبح ہوتے ہی میاں عبدالکریم اور اس کے بال بچے یوسف کے گھر پہنچ گئے۔ تمام دین اپنی بیوی کے ساتھ آیا ہوا تھا اور تھوڑی دیر وہاں ٹھہر کر وہ یوسف کے چچا سے مشورہ کرنے کے بعد گھر کی حفاظت کے لیے ان کا ایک نوکر ساتھ لے کر واپس چلا گیا۔ اپنی ماں کو خیریت کرتے ہوئے چراغ بی بی نے اچانک اس کے ساتھ چلنے کا فیصلہ کر کے گھر کی عورتوں کو حیران کر دیا جن کا خیال تھا کہ اب مدت تک اس کے دل پر ڈاکوؤں کا خوف طاری رہے گا۔ اس کے طرز عمل سے ان تمام باتوں کی نفی ہوتی تھی جو چراغ بی بی کے خوف دہرا اس کے متعلق گھر کی لڑکیوں نے امینہ کو بتائی تھیں۔ امینہ کی ماں کو اس بات کا احساس ہوا کہ وہ چڑ گئی ہے تو اس نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا ”نہیں چراغ بی بی ہم تم کو نہیں جانے دیں گے۔ امینہ کا تمہارے بغیر نہیں لگے گا۔ کل پرسوں سب واپس چلے جائیں گے۔“ چراغ بی بی کی ماں عالم بی بی نے کہا۔

”دیکھو لڑکی! جب شام ہوگی تو تم پھر چینی مارتی ہوئی واپس آؤ گی۔ آرام سے یہاں ہی رہو۔“ چراغ بی بی کو اس کے تیور دیکھ کر کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔

یوسف باہر مہمان خانے میں عبدالکریم اور اس کے نوکر فضل دین سے تفصیلی باتیں کر رہا تھا۔ عبدالکریم اپنی کارگزاری کی پوری تفصیلات سنانا چاہتا تھا، لیکن یوسف نے یہ

ہوں کہ اللہ نے مجھے کسی نیکی کی توفیق دی تھی۔“

رشیدہ بولی۔ ”لیکن بیٹا! آپ یہ تو نہیں چاہیں گے کہ میں آپ کے ساتھیوں کو کوئی انعام دوں۔“

”نہیں چچا جان!“

”جب ہم آپ کے گاؤں میں آئیں گے تو میں انہیں ایک ایک کر کے بلاؤں گا اور آپ انہیں کھلے دل سے انعام دے سکیں گے۔“

”اب مجھے اجازت دیجئے۔“

یوسف مصافحہ کر کے وہاں سے چل دیا۔ بارش تھم چکی تھی اور جسم کی گرمی سے اس کے کپڑے خشک ہو چکے تھے۔ گاؤں کی مسجد کے قریب پہنچ کر اس نے بتو سے کہا۔

”بتو! تم جاؤ اور ہمارے گھر سے روٹی منگو کر کھانے کے بعد آرام کر دو۔ میں نماز پڑھ کر آتا ہوں۔“

جب وہ نماز پڑھ کر باہر نکلا تو بتو دروازے سے چند قدم دور کھڑا تھا۔

”بتو! تم گئے نہیں۔“

”آپ کو معلوم تھا کہ میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔“

چند منٹ بعد وہ ڈیوڑھی کے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے وکر سے کہہ رہا تھا، ”بتو کو کھانا کھلا دو۔“

چراغ بی بی چند عورتوں کے درمیان چھت کے ایک حصے پر بیٹھی ہوتی تھی۔ گزشتہ چند گھنٹوں میں ڈاکوؤں، بھوتوں، چڑیلوں، جنوں اور سانپوں کے قصے سن کر کسی باریجاری کی حالت میں آنسو بہا چکی تھی۔ اس سے اظہار ہمدردی کے لیے گاؤں کی وہ بیانی عورتیں بھی وہاں جمع ہو چکی تھیں جنہوں نے بذات خود یا جن کے کسی جان پہچان والے نے اپنی آنکھوں سے کسی خوفناک چڑیل، کسی چھوٹے سے چھلاوے یا مہیب دیو کو دیکھا تھا۔ ایک ایسی بڑھیا کا

کہہ کر بات مختصر کر دی۔

”پہلے مجھے یہ بتائیے کہ انہوں نے آپ کو خط کا جواب کیا لکھا ہے۔ اگر وہ خط آپ کے پاس ہے تو میں پڑھ لیتا ہوں۔“

عبدالکریم نے جیب سے کاغذ کا ایک پرزہ نکال کر اُسے پیش کر دیا۔

سیٹھ دینا ناتھ نے لکھا تھا ”دوست مہربان جناب میاں عبدالکریم صاحب، شکریہ کہ بھگو ان کی کرپانے آپ کو ڈاکوؤں سے بچا لیا۔ اس نرخی کے موقع پر آپ کو کچھ دان کرنا چاہیے۔ میں آپ کے حکم کے مطابق سردار سورن سنگھ کو لے کر پرسوں ریلوے اسٹیشن پر پہنچ جاؤں گا۔ امید ہے کہ ہم دوپہر تک رجسٹری کا کام ختم کر کے بس پر واپس آجائیں گے۔“

زیادہ آداب

عبدالکریم نے اپنی جیب سے دوسرا خط نکالتے ہوئے کہا۔

”برخوردار یہ بھی پڑھ لو۔ یہ اس خط کی نقل ہے جو میں نے اسے بھیجا تھا۔“

یوسف نے خط کھول کر اس پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”میاں صاحب! یہ آپ نے بہت ٹھیک کیا۔“

اس نے خط لپیٹ کر میاں صاحب کو واپس دیتے ہوئے فضل دین سے مخاطب ہو کر کہا۔

”تم نے منشی صاحب کے نام میاں صاحب کا خط لے لیا ہے۔“

”جی ہاں، انہوں نے زبانی مجھے ساری باتیں سمجھا دی ہیں۔“

عبدالکریم نے کہا ”برخوردار میں نے اسے یہ بھی سمجھا دیا ہے کہ وہ لہے کا ایک بھاری

بکس لے کر آئے جس کو مضبوط تالا لگا ہوا ہو۔“

یوسف نے کہا۔ فضل دین، یہ تمہارا دوسرا کارنامہ ہوگا۔ تمہاری مدد کے لیے

ہمارے آدمی ہر جگہ موجود ہوں گے۔ تم نے آرام سے اترنا ہے کچھ دیر کسی بہانے اسٹیشن پر

رُک جانا ہے اور نہیں تو پاس علوانی کی دکان سے منشی کو گرم پکوڑے یا دودھ منگوادینا

اور اُسے ویٹنگ روم میں بٹھا دینا۔ میاں صاحب کی ہدایت کے مطابق وہ اتر کر سے سیکڑے کلاس میں آئے گا۔“

فضل دین نے کہا ”جی میں سمجھ گیا ہوں۔“

”میاں جی یہ لڑکا بڑا ہوشیار ہے۔ ہماری تھوڑی سی نواز تو ضائع ہوئی ہے،

لیکن اس نے بہت سوچ کر یہ سب کچھ کیا ہے۔“

اچھا فضل دین تم جاؤ اور رات واپسی پر یہاں سے ہو کر جانا۔

یوسف عصر کی نماز کے بعد باہر کی جوہلی میں اپنے چچا حیدر علی اور میاں عبدالکریم

کے ساتھ ایک نئے اور کشادہ مکان کے آگے آئے میں بیٹھا ہوا تھا۔ وسیع صحن میں آم اور لیموں

کے پودے تھے اور ایک کونے میں بیری کا ایک تن آور درخت تھا۔ بڑبھاگتا ہوا اندر آیا

اور اس نے کہا ”میاں جی، پولیس کا کوئی بڑا افسر آ رہا ہے اور اس کے پیچھے حوالدار بھی ہے

بڑے صاحب نے آتے ہی یہ پوچھا ہے کہ یوسف صاحب کہاں ہیں۔“

”اور تم اس کا گھوڑا پکڑ کے اور اسے اس طرف لانے کی بجائے وہاں سے بھاگ

آتے ہو۔“

”نہیں جی، گھوڑے تو چوکیدار اور بڑا عیسائی نے پکڑ لیے ہیں۔ حوالدار نے مجھے کہا

تھا کہ فوراً بھاگ کر یوسف کو اطلاع کرو۔ حوالدار نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔“

یوسف اٹھ کر پھاٹک کی طرف بڑھا لیکن اتنی دیر میں ایک بارعب آدمی جو پولیس

انسپکٹر کی دردی پہنے ہوئے تھا، اندر داخل ہوا۔ یوسف نے آگے بڑھ کر مصافحے کے لیے

مانٹھ بڑھاتے ہوئے کہا ”جناب آپ غالباً انسپکٹر عبدالعزیز ہیں!“

آنے والے نے چند بار سر سے پاؤں تک یوسف کی طرف دیکھا اور گرم جوشی سے

مصافحہ کرتے ہوئے کہا ”میرے متعلق آپ کا اندازہ درست ہے لیکن اگر آپ کے نوکر

مجھے یہ نہ بتاتے کہ آپ جوہلی کے اندر موجود ہیں تو شاید میں آپ سے یہی پوچھتا کہ وہ بہادر

نوجوان کہاں ہے جس نے ایک انتہائی خطرناک ڈاکو کو گرفتار کیا ہے۔“

یوسف نے کہا ”جناب یہ میرے چچا حیدر علی ہیں۔ یہ میاں عبدالکریم ہیں جن کے گھر ڈاکہ ڈالنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن آپ کے ساتھ شاید عملے کے کچھ لوگ اور بھی آئے ہیں۔“

”بھائی میرے ساتھ آنے والے کی فکر نہ کریں۔ میں نے اسے باہر چار پائی پر بٹھا دیا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ وہ چوکیدار سے خاطر کر دانا جانتا ہے۔ میرا مقصد صرف آپ کو مبارک باد دینا اور آپ سے چند باتیں کرنا ہے۔ آپ تشریف رکھیں۔“

”بلو! بھاگ کر ہمارے نوکر سے کہو کہ ہمیں کے شربت کا ایک جگ لے آئے اور پھر اس کے بعد چائے کا انتظام کر دے۔“

انسپکٹر نے کہا ”بھتی ایک چیز کافی نہیں؟“

یوسف نے جواب دیا ”نہیں جناب، شربت سے آپ کی پیاس بجھاتی جائے گی اور اس کے بعد چائے سے آپ کی تھکاوٹ دور ہو جائے گی۔“

عبدالعزیز نے کہا ”ان دونوں چیزوں سے پہلے مجھے گھرے کے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پلا دو۔“

یوسف نے اٹھ کر قریب ہی پڑی ہوئی ایک مٹی کی صراحی اٹھائی اور یکے بعد دیگرے ٹھنڈے پانی کے دو گلاس مہمان کو پیش کر دیے۔ جب تیسرا گلاس بھر کر پیش کرنے لگا تو عبدالعزیز نے کہا۔

”نہیں بھتی ابھی نہیں یہ بعد میں پی لوں گا۔ آپ کا پانی ٹھنڈا ابھی ہے اور میٹھا بھی، میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کی کارگزاری کی خبر آئی جی تک پہنچ چکی ہے اور ایس پی صاحب آپ پر بہت خوش ہیں۔ آپ کے لیے پولیس میں اور ترقی کا راستہ کھل گیا ہے۔“

یوسف نے جواب دیا ”جناب، یہ جو کچھ ہوا ہے اس میں میرا کوئی ذاتی مقصد

شامل نہیں تھا بلکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی ذاتی مقصد لے کر اس کام میں ہاتھ ڈالتا تو شاید معاملہ اتنی خوش اسلوبی سے انجام نہ پاتا۔“

بہر حال یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جسے کسی صورت میں حکومت نظر انداز نہیں کرے گی۔ آپ کو اپنی ذاتی حفاظت کے لیے اسلحہ رکھنے کے لیے سہولت فراہم کرنا پولیس کی ذمہ داری ہے۔ آپ اپنے ساتھیوں میں سے جن قابل اعتماد آدمیوں کی سفارش کریں گے انہیں بھی بندوق یا پستول کے لائسنس دے دیے جائیں گے۔ میں آپ کو یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کی خواہش کے مطابق ہم نے تمام ملزموں کا ایک ہفتے کے لیے رہمانڈ لے لیا ہے اور اگر آپ نے ضرورت محسوس کی تو انہیں ہم مزید عرصے کے لیے بھی یہاں روک لیں گے۔“

یوسف نے کہا ”جناب، جس مقصد کے لیے میں انہیں روکنا چاہتا تھا وہ انشاء اللہ بہت جلد پورا ہو جائے گا۔“

”آپ کو کسی مہم میں پولیس کے نفاذ کی ضرورت ہے؟“

”جی ہاں، جن مقامی افسروں پر آپ پوری طرح اعتماد کر سکتے ہیں ان میں سے دو تین کو کم دیں کہ وہ کل صبح نماز سے پہلے یہاں آئیں اور مجھ سے ملیں۔ میں خود تھانے اس لیے نہیں جانا چاہتا کہ میری بھاگ دوڑ سے ڈاکوؤں کے ساتھی چوکنے ہو جائیں گے۔“ عبدالعزیز نے کہا ”میں سمجھ گیا۔ اب آپ سے یہ بھی نہیں پوچھوں گا کہ آپ کو ارجن سنگھ کی آمد کا پتہ کیسے چلا تھا۔“

یوسف نے کہا ”جناب آپ کو بتا دینے میں کوئی حرج نہیں لیکن دو دن بعد آپ ساری باتیں سنیں گے تو زیادہ لطافت اندوز ہوں گے۔“

چائے کے دوران عبدالعزیز بار بار غور سے یوسف کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چائے ختم کرنے کے بعد اس نے کہا ”بیٹا یوسف، تمہیں دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ میں تمہاری والدہ اور بزرگوں کو مبارکباد دیتا ہوں۔ اگر میری یہاں سے تبدیلی نہ ہوئی تو تم سے ملنے کے کئی مواقع

ملیں گے۔“

یوسف نے اس قوی بحشت اور حلیم الطبع آدمی کو پہلی بار غور سے دیکھا اور کہا ”سر، اس دنیا کا یہ بھی ایک المیہ ہے کہ جن لوگوں کو دیکھ کر ہمیں خوشی حاصل ہوتی ہے وہ اچانک اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اگر ایسے پی صاحب کے دل میں میری کوئی قدر و منزلت ہوئی اور مجھے کوئی انعام مانگنے کا موقع ملا تو میری پہلی اور آخری درخواست یہ ہوگی کہ انسپکٹر صاحب کو اس وقت تک یہاں رہنے دیا جائے جب تک کہ میں انہیں اچھی طرح نہیں دیکھ لیتا۔“

عبدالعزیز نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا ”بیٹا، بارت یہ ہے کہ ایسے پی صاحب کی قدردانی کی وجہ سے ہی تو تبدیل کیا جا رہا ہوں، وہ خود تبدیل ہو رہے ہیں اور جس جگہ وہ جاتے ہیں مجھے ہمیشہ کچھ عرصہ پہلے وہاں بھیج دیتے ہیں۔“

تھوڑی دیر بعد گاؤں کے آدمی حویلی سے باہر انسپکٹر عبدالعزیز اور حوالدار رستم گھ کو گھوڑوں پر سوار ہوتا دیکھ رہے تھے۔

پاپ - ۱۲

اکلی صبح یوسف گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے گاؤں سے ایک میل دور سردار بیلا سنگھ کے گاؤں پہنچا۔ لوگ بیلا سنگھ کی حویلی کو گاؤں سے باہر ایک کشادہ جھیل کے کنارے کنارے جایا کرتے تھے۔ اب اس گاؤں سے شہر کی طرف کھیتوں میں سے ایک مستقل راستہ بن گیا تھا۔

کھیتوں کے کنارے چلنے کی وجہ سے یہ راستہ ذرا لمبا ہو گیا تھا۔ لیکن اب لوگ اپنی عورتوں کے لیے یہی راستہ پسند کرتے تھے جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ کبھی کبھی جھیل کا پانی گاؤں سے گزرنے والے راستے تک پہنچ جاتا تھا۔ سردار بیلا سنگھ نے لوگوں کی سہولت کے لیے کنارے کی مینڈ کا کچھ حصہ اُونچا کر دیا تھا، لیکن اس کے کتے دُور سے آنے والے مسافروں کی بُو پا کر ہی بھونکنا شروع کر دیتے تھے اور کئی نسلوں کے کتوں کی مختلف آوازیں ایک ایسا سماں پیدا کرتی تھیں کہ لوگ گاؤں سے دُور ہی رہنا پسند کرتے تھے۔ اس لیے پڑوس کے دیہات کو اس بات کا بہت کم علم ہوتا تھا کہ بیلا سنگھ کے گاؤں میں کیا ہو رہا ہے۔

یوسف نے جھیل کے دوسرے کنارے چکر لگانے کے بعد سردار بیلا سنگھ کی حویلی کے پھاٹک کے سامنے گھوڑا روکا اور کتے پورے زور شور سے بھونکنے لگے۔ یوسف گھوڑے سے اُترا اور اطمینان سے حویلی کے اندر داخل ہو گیا۔

کھلے بالوں کو کنگھی کر رہی تھی۔ اس کی بیٹی بھاگتی ہوئی اُس کے قریب پہنچی اور بولی "ماں جی! اٹھ کر دیکھو تو سہی آپ کل سے اپنے شیر بھتیجے کو یاد کر رہی تھیں۔ ہر نام کو رنے جلدی سے اپنے بال درست کیے اور سر پر چادر لے کر آگے بڑھی اور اپنے دونوں ہاتھ یوسف کے سر پر رکھتے ہوئے بولی "آج چاند کہاں سے نکل آیا ہے۔ میرے سوہنے، میرے گھبرو، میرے شیر بھتیجے میں کل سے تمہارے گھر جا کر تمہاری ماں جی کو سلام کرنے کا سوچ رہی تھی۔ ادھیڑ! اپنے ویر کے لئے دودھ لاؤ۔" اجیت کرنے قریب آکر کہا۔ "ماں جی! بھائی یوسف اس وقت دودھ نہیں پیا کرتا" ہیل سنگھ نے کہا "بے وقوف دودھ ہر وقت پیا جاسکتا ہے اور دودھ سے بہتر کیا ہے ہمارے گھر میں تمہارے بھائی کے لئے۔"

"پتا جی! یہ صبح ناشتے کے ساتھ چائے پیتے ہیں۔ دوپہر کے وقت لٹو، سادہ پانی یا لیموں کا شربت پیتے ہیں۔ شام کو چائے پیتے ہیں اور رات کو سوتے وقت دودھ پیتے ہیں۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہے کہ یہ دودھ کس وقت پیتے ہیں اور کس وقت نہیں پیتے؟" "پتا جی اگر دیر جی ہمارے گھر نہیں آتے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ انہوں نے بہنوں کے لیے اپنے گھر کے دروازے بند کر لیے ہیں۔ میں دوڑا کرتی تھی تو سیدھی ان کے گھر جاتی تھی۔ ان کی ماں، چچیاں، بہنیں اور دادی سب مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں۔ اس لیے مجھے بھائی کی سب عادتیں معلوم ہیں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ گاؤں کی لڑکیاں ان سے بہت ڈرتی تھیں لیکن میں ان سے نہیں ڈرتی تھی۔ پتا جی! میں آج بھی ان سے نہیں ڈرتی تھی۔ اگرچہ یہ مدت کے بعد ہمارے گھر آئے ہیں۔"

"بھئی آج ان سے ڈرنے کی خاص بات کیا تھی؟"

"پتا جی! آپ ہی تو کہتے تھے کہ میرے شیر بھتیجے نے ڈاکو ارجن سنگھ کو گرفتار کیا ہے۔"

کشادہ صحن سے ایک نوجوان اور صحت مند لڑکی بھاگ کر آگے بڑھی اور اُس نے بلا جھجک اُس کے ہاتھ سے گھوڑے کی لگام پکڑتے ہوئے کہا۔ "دیر جی! آپ کیسے راستہ بھول گئے۔ وہ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے یوسف کی طرف دیکھ کر اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ دیر جی اگر آپ میرا نام بھول گئے ہیں تو بتا دوں؟"

"جیتو پڑیل میں تمہارا نام کیسے بھول سکتا ہوں۔ اپنے پتا جی کو بلاؤ۔"

"وہ اندر ہیں۔ آپ سیدھے اندر چلے جائیں۔ وہ ابھی شکار کھیل کر آئے ہیں اور آپ میرا نام تو سیدھی طرح لیا کریں۔"

یوسف نے گھوڑے کی رسی کھولتے ہوئے کہا۔ "ہاں بہن اجیت کو مجھے یہ خیال ہی نہیں رہا کہ اب تم بڑی ہو گئی ہو۔ میں گھوڑا باندھتا ہوں تم جا کر اپنے پتا جی کو بتا دو کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"دیر جی میں اتنی بڑی تو نہیں ہو گئی کہ آپ مجھے جیتو نہ کہہ سکیں۔ کہتے پتا جی کو خبر دے چکے ہیں کہ کوئی آیا ہے۔ میں گھوڑا باندھ دیتی ہوں آپ سیدھے اندر چلے جائیں وہ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ وہ خود بھی آپ کے گھر جانا چاہتے تھے اور ماں جی تو بہت ہی خوش ہوں گی۔"

یوسف نے جلدی سے گھوڑے کا سا کھونٹے سے باندھ دیا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا حویلی کے اندرونی حصے میں داخل ہوا۔

سردار ہیل سنگھ بیری کے درخت کی چھاؤں میں ایک بھاری پلنگ پر لیٹا ہوا تھا اور اُس کا نوکر بڈھا سنگھ اُس کے پاؤں دبا رہا تھا۔

وہ یوسف کو دیکھتے ہی اٹھا اور ننگے پاؤں بھاگ کر اُس سے لپٹ کر بلند آواز میں بولا۔ "اجیت کی ماں۔ دیکھو کون آیا ہے۔" اجیت کی ماں صحن کے کونے میں درمی بین عورتوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اور ایک اُس کے

یوسف نے کہا: "چچا، ڈاکوؤں کو یہ معلوم ہے کہ کل شام کی گاڑی پر امترس کی طرف سے ایک مالدار آدمی کا منشی ایک بڑی رقم لے کر آئے گا اور وہ راستے میں اسے لوٹنے کی کوشش کریں گے۔ ہم نے پولیس کی مدد سے ان ڈاکوؤں کو پکڑ لیا ہے۔" بیلا سنگھ نے کہا: "یار میرے ساتھ سیدھی بات کیا کرو۔ یہ تو میں سمجھ گیا ہوں کہ ایسا مالدار آدمی عبدالکریم ہی ہوگا لیکن مجھے صاف بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہے؟"

"چچا عبدالکریم کا نوکر اور ہمارے چند آدمی اس کے منشی کو اسٹیشن لینے جائیں گے چونکہ اب کچھ دنوں کے لیے وہ اس کے بال بچے ہمارے گھر ہی رہیں گے۔ ڈاکو راستے پر کسی جگہ واردات کریں گے۔ یہ جگہ اسٹیشن سے پرانی نہر تک ہو سکتی ہے۔ راستے میں سردار ہنگا سنگھ کی حویلی بھی آتی ہے۔ آپ کے پاس ایسے کتے ہیں جن کو ہنگا سنگھ کی حویلی کے اندر بٹھا دیا جائے اور ضرورت کے وقت ان سے کام لیا جائے۔ میرا مطلب ہے۔ وہ بلاوجہ بھونکنا شروع کر دیں۔"

بیلا سنگھ بولا، "اب بھتیجے میں تمہارا مطلب سمجھ گیا ہوں امیر سے پاس آٹھ کتے ایسے ہیں جو خاموشی سے میرے آدمیوں کے ساتھ رہیں گے اور وہ صرف اسی وقت حملہ کریں گے جب انہیں شکارا جائے گا تمہیں جس جس جگہ حملے کا خطرہ ہوگا وہاں اس پاس ہم دو کتے چھپا دیں گے۔ تم نے میری کتوں والی حویلی نہیں دیکھی چلو وہاں بارہ کتے ایسے ہیں جنہیں ہم نہر سے کچھ دور بٹھا دیں گے۔ جب دوسرے کتے بھونکیں گے تو انہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ پھر تم ایک عجیب تماشا دیکھو گے چلو پہلے میرے کتے دیکھ لو۔"

"چچا میں نے آپ کے کتے دیکھے ہوئے ہیں۔"

"تمہارے آدمیوں کے پاس چند مارچیں ضرور ہونی چاہئیں تاکہ میرے آدمیوں سے کتے چھوڑنے میں غلطی نہ ہو جائے۔"

"چچا یہ بندوبست میں پہلے کرچکا ہوں۔ جب گاڑی سے عبدالکریم کا منشی اترے

اب اس علاقے پر اس کا رعب چھا جائے گا۔"

"پھر تم ان سے ڈری کیوں نہیں؟"

"پتہ جی میں ان کی چڑیل بہن ہوں اس لیے۔"

"اچھا تم جاؤ ہمیں بتائیں کرنے دو۔" بیلا سنگھ نے یوسف کو بازو سے پکڑ کر کھاٹ پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "یار یوسف، آنا تو مجھے چاہیے تھا اور میں یہ خبریں سن کر بے چین بھی ہوا تھا لیکن میں نے سوچا کہ جب تک تم میں سے کوئی نہ بلائے مجھے وہاں نہیں جانا چاہیے۔ اگر مجھے کسی لڑائی کی اطلاع ہوتی تو میں اپنی برہمی چمکانا اور بھاگتا ہوا وہاں پہنچ جاتا۔"

"نہیں چچا، یہ ایک ایسا کام تھا جس کے لیے لڑائی کی ضرورت نہیں تھی اور اب بھی جس کام کے لیے میں آپ کے پاس آیا ہوں اس کے لیے کسی لڑائی کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔"

"او یاں کام بتاؤ۔ میں یہ سوچ لوں گا کہ لڑائی کی ضرورت ہے کہ نہیں۔"

"چچا! بات یہ ہے کہ اب ایک بڑا شکار پکڑا جانے والا ہے۔"

"یار، اس کا نام بتا دو۔ ساری بات میری سمجھ میں آجائے گی۔ یہ ڈاکوؤں

کی پارٹی کا کوئی اور آدمی تو نہیں؟"

"چچا، ڈاکو بھی پکڑے جائیں گے مگر بڑے شکار کو آپ بھی بڑا شکار ہی کہیں گے۔"

"آج آپ شکار سے کچھ تھک کر تو نہیں آتے؟"

"نہیں یار، شکار کہاں ہوتا ہے آج کل۔ لیکن یہ کتے چند دن گوشت نہ کھائیں

تو بیمار ہو جاتے ہیں۔ میں صبح ان کتوں کو لے کر نکلتا تھا اور انہوں نے جو گیڈرا خروگوش،

بتے مارے ہیں وہ انہی کے کام آئیں گے۔ آج کل اگر کبھی مچیلیوں کا شوق ہو تو مجھے

پیغام بھیج دیا کرو۔ اب بڑے شکار کے متعلق بتاؤ۔"

”چچا میں شہر نہیں جا رہا اور کل تک مجھے جانا بھی نہیں چاہیے۔“
 ”اچھا میں سمجھ گیا ہوں کہ تم لوگوں کی نگاہوں سے دُور رہنا چاہتے ہو، لیکن میں
 یہ چاہتا تھا کہ اسٹیشن تک راستے پر ایک نظر ڈال آؤں۔“
 ”چچا وہاں تک تو میں آپ کے ساتھ جاسکتا ہوں۔ شاید آپ کوئی کام کی
 بات سمجھا سکیں۔“

”بیٹا چلو میں تمہیں بہت سی کام کی باتیں سمجھاؤں گا۔“
 ”جیتو نوکر سے کہو میرے گھوڑے پر زین ڈال دے۔“
 نفوڑی دیر بعد یوسف اور بیلا سنگھ گھوڑوں پر سوار ہو کر حویلی سے باہر
 نکل رہے تھے۔

بیلا سنگھ نے اپنے گھوڑے کو آگے کرتے ہوئے کہا: ”یوسف میرے پیچھے رہو۔
 ہم گاؤں کے اوپر سے چکر لگانے کے بعد پرانی نہر سے راستہ پکڑیں گے۔“
 کوئی اڑھائی گھنٹے وہ اسٹیشن سے کوئی ایک فرلانگ تک اور پھر وہاں سے
 واپسی پر تمام کن راستوں کا معائنہ کرنے کے بعد واپس آئے تو ان کے گھوڑے
 پسینے سے بھگے ہوئے تھے۔

یوسف نے بیلا سنگھ کے گھر سے ٹھنڈے پانی کے دو اور گلاس پینے کے بعد
 کہا: ”چچا شام ہوتے ہی آپ میرے گاؤں آجائیں۔ اگر پیدل آئیں تو بہتر ہوگا۔ ہماری
 باہر کی بیٹھک میں پہنچ جائیں وہاں حویلی کے اندر چارہ گائے گاؤں اور پولیس کے آدمی
 موجود ہوں گے۔“

”بہت اچھا بھتیجے، میں وہاں آجاؤں گا۔“
 یوسف گھوڑے پر سوار ہونے لگا۔ تو بیلا سنگھ بولا:
 ”دیکھو بھتیجے اب بھی یہ نہیں بتاؤ گے کہ یہ بڑا شکار کون ہے؟“

گا تو میرے آدمیوں کے علاوہ پولیس کے آدمی بھی ساتھ چل پڑیں گے اور ان میں سے
 چند آدمیوں کے ہاتھ میں ٹارچیں ہوں گی۔ ڈاکو کسی بکری یا کما کے کھیت سے نکل کر حملہ
 کریں گے اور ان کی طرف ٹارچ کی روشنیاں کر دی جائیں گی۔ ہمارے باقی ساتھی
 ہنگامہ سنبھال کر حویلی میں ہوں گے۔ حوالدار صبح میرے پاس آیا تھا اور میں نے تمام
 پلان سمجھا دیا تھا۔ آپ ایک اور خبر سن کر خوش ہوں گے کہ وہ بہادر سنگھ جو آپ کا
 شکار دیکھنے آیا کرتا تھا۔ یہاں پہنچ جائے گا۔“

”یار وہ لڑکا جو پولیس میں بھرتی ہوا تھا۔ اس کی ترقی ہوئی کہ نہیں۔“
 یوسف نے کھانا دہریہ بابا ناگ کے تھلنے میں ہے وہاں سے چار آدمی اپنے ساتھ لے کر آئے۔
 میں نے اپنے تھانے دار سے اسے بلانے کے لیے کہا تھا اور اُس نے انسپکٹر سے
 کہہ کر اسے یہاں بلا لیا ہے۔“

”اچھا اب تم اس بڑے شکار کے متعلق بتاؤ گے یا نہیں بتاؤ گے وہ بھی پکڑا
 جائے گا یا نہیں۔“

بڑے شکار کو آپ دو تین روز میں دیکھ لیں گے اور حیران رہ جائیں گے۔
 ”یار نام نہیں بتاؤ گے اُس کا؟“

”چاچا ابھی یہ آپ کسی پر ظاہر نہ کریں۔ ابھی میں آپ کو نہ بتاؤں تو بہتر ہوگا
 میں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ آپ اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔“

”اچھا جی، اگر بہت زیادہ خوشی کی بات ہے تو میں دو تین دن صبر کر لیتا ہوں
 ورنہ تکلیف تو پڑی ہوگی اس بات سے کہ جو چیز مجھے پہلے معلوم ہو سکتی تھی وہ دن
 بعد میں معلوم ہوگی۔ لیوں تو ہمارے باغ میں ملیں گے نہیں۔ ٹھنڈا پانی پی لو اور
 شہر سے تمہیں سوڈا واٹر کی تین چار بوتلیں پلا دوں گا۔ جیتو پانی لاؤ ٹھنڈا ابلدی کرو۔“
 اجیت ٹھنڈے پانی کا ایک بڑا گلاس لائی اور یوسف نے پینے کے بعد کہا۔

یوسف مسکرایا اور ادھر ادھر دیکھ کر اُس نے بلا سنگھ کے کان میں کہا "جی میں ابھی یقین سے نہیں کہہ سکتا صرف اثنا بتا سکتا ہوں کہ آپ اسے اچھی طرح جانتے ہیں"

بلا سنگھ چند قدم اس کے پیچھے آوازیں دیتا ہوا بھاگا: "او یوسف، ٹھہرو! ٹھہرو! میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں"

لیکن یوسف نے مڑ کر نہ دیکھا۔ یوسف گاؤں پہنچا اور مسجد اور باہر کی چوٹی کے درمیان لیکن کے ایک درخت کی چھاؤں میں بہادر سنگھ ایک کھاٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ یوسف اس کے قریب پہنچتے ہی گھوڑے سے کود پڑا اور گاؤں کے چوکیدار پیراں دتہ نے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔

بہادر سنگھ بھاگتا ہوا آگے بڑھا اور یوسف سے بغل گیر ہوتے ہوئے بولا: "یار ہمیں تمہارے کارنامے کی خبر مل گئی تھی۔ ہمارے تھانے کے سب لوگ حیران تھے۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ یوسف صاحب سے ہر بات ممکن ہے پھر جب انسپکٹر کی طرف سے ہمارے تھانے میں یہ فون آیا کہ کسی مہم میں بہادر سنگھ کی ضرورت ہے تو میں نے تھانے دار سے کہا کہ یقیناً میری سفارش یوسف نے کی ہوگی"

یوسف مسکرایا "یار میں نے ہی یہ درخواست کی تھی کہ مجھے ایک نئی مہم میں بہادر سنگھ کی ضرورت ہے"

بہادر سنگھ نے کہا "بھگوان تمہیں زیادہ عزت دے اور تمہیں ہت بڑا فخر بتائے میں یہاں تھانے میں حاضری دے کر اپنے گاؤں جانے کی بجائے سیدھا یہاں بھاگتا ہوا آیا تھا میں نے آپ کو ایک اور سوار کے ساتھ دیکھا تھا اور دور سے تمہارا گھوڑا پہچان لیا تھا لیکن تم اپنے گھر آنے کی بجائے دور سے ہی واپس چلے گئے تھے"

یوسف نے پیراں دتہ سے مخاطب ہو کر کہا "پیراں دتہ بہادر سنگھ کو بیٹھک میں لے جاؤ۔ میں ان کے لیے کھانے کا انتظام کرتا ہوں"

بہادر سنگھ نے کہا "یوسف جی! کھانا تو میں ڈیرہ بابا نانک سے کھا کر نکلا تھا۔ بٹالہ پہنچ کر بھی کچھ پیٹ پوجا کی تھی پھر یہاں تھانے میں حاضری دی تو حوالدار پریم سنگھ نے زبردستی سستی کے دو گلاس پلائے تھے اور مٹھائی بھی کھلا دی تھی یہاں پہنچ کر بھی میں نے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پی لیا ہے"

یوسف نے پیراں دتہ سے کہا "پیراں دتہ تم ان کے لیے ہمارے گھر سے لیموں کے شربت کا ایک جگ لے آؤ"

"اچھا جی میں آپ کا گھوڑا باندھ کر لے آتا ہوں"

یوسف نے بہادر سنگھ سے مخاطب ہو کر کہا: "یار آؤ تم بھی بیٹھک میں کچھ دیر آرام کر لو۔ میں کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کروں گا اور پھر تمہیں ایسی باتیں سناؤں گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے"

"یوسف جی! میں تو آپ کو دیکھ کر ہی خوش ہو جاتا ہوں"

یوسف نے کہا "تمہیں معلوم ہے کہ میرے ساتھ دوسرا سوار کون تھا؟"

"جن جی جب آپ گزارا ہے تھے تو میں دوسرے کو کیوں دیکھتا؟"

"یار وہ سردار سیلا سنگھ تھا اور آج یہیں پر اُس سے تمہاری ملاقات ہوگی"

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے"

"بہادر سنگھ یہاں اور لوگوں سے بھی تمہاری ملاقات ہوگی۔ اس لیے تم پانی

پینے کے بعد سو جاؤ، جب وہ لوگ آجائیں گے تو تمہیں جگا دیا جائے گا"

یوسف بہادر سنگھ کو بیٹھک میں چھوڑ کر باہر نکلا تو اُسے سر پیٹ گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی۔ وہ کشادہ راستے کے سامنے رُک گیا۔

چند ثانیے کے بعد سردار بیلا سنگھ نے گھوڑا روکتے ہوئے کہا۔
 ”دیکھو یوسف جو بات تم چلتے چلتے کہہ آئے تھے اس کے بعد مجھے غنیمت کیسے
 آسکتی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ تم نے جان بوجھ کر گھوڑا نہیں روکا تھا۔“
 یوسف نے کہا ”چچا چلو بیٹھک میں تھوڑی دیر آرام کرو آپ کے لیے لمبوں
 کا شربت آرہا ہے۔“

”دیکھو بھتیجے اگر مجھے بڑے شکار کے متعلق سب کچھ نہیں بتاؤ گے تو میں لمبوں
 کا شربت نہیں پیتوں گا۔“

”چچا اس وقت تو میں آپ کو صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ کل رات اگر میاں
 عبدالکریم کے منشی کو راستے میں لوٹنے والے قابو میں آگئے تو اس علاقے کے بہت
 سے ڈاکوؤں کے ساتھ دینا ناتھ کا تعلق ثابت ہو جائے گا۔“

بیلا سنگھ نے کہا ”یاریہ تو مجھے کئی سال سے معلوم ہے۔“
 ”لیکن چچا ابھی تک کسی نے یہ ثابت نہیں کیا لیکن پرسوں آپ اپنی آنکھوں
 سے دیکھیں گے کہ اگر ڈاکو کے چہرے سے نقاب اتار دیا جائے تو اس کی کیا حالت
 ہوتی ہے۔ آئیے بیٹھک کے اندر آپ کا ایک اور بھتیجا آپ کا انتظار کر رہا ہے۔
 وہ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوگا۔“

وہ سوہلی میں داخل ہوئے تو بہادر سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بیلا سنگھ نے آگے بڑھ کر اُسے
 گلے لگا لیا۔

پیراں دتہ لمبوں کے شربت کا جگ اٹھائے اندر داخل ہوا اور اس نے
 نیپائی پر جگ رکھ کر بیٹھک کی الماری سے شیشے کے گلاس نکالے اور جگ کے ساتھ
 نیپائی پر رکھ دیے۔

یوسف نے گلاس بھرتے ہوئے کہا ”پیراں دتہ تم بھاگ کر ایک اور جگ لے
 آؤ۔“ بیلا سنگھ نے کہا ”باریہ کافی ہوگا۔ دو گھنٹے بعد اگر ہمیں پیاس محسوس ہوئی تو ہم

اور منگوالیس گئے۔“
 بہادر سنگھ نے کہا ”بھائی صاحب آپ جا کر آرام کریں میں چچا جی سے باتیں
 کروں گا۔“

بیلا سنگھ نے کہا ”ہاں بھائی تم تنک گئے ہو گے۔ جاؤ آرام کرو۔“
 یوسف نے کہا ”چچا آپ بھی تھوڑی دیر سو جائیں، اس کے بعد ہم یہاں
 چلتے پتیں گے۔“

بہادر سنگھ نے کہا ”ہاں چچا بھائی یوسف کے گھر کی چائے بہت اچھی ہوتی ہے۔“
 بیلا سنگھ نے اٹھ کر ایک کھاٹ پر لیٹتے ہوئے کہا۔
 ”یار یوسف کے گھر کی ہر چیز اچھی ہوتی ہے۔ ایسی چھاؤں بھی تو نہیں ہے
 ہمارے گاؤں میں۔“

بہادر سنگھ تم بھی تھک گئے ہو گے۔ کرسی آگے کر لو اور مجھے یہ بتاؤ کہ اب
 تمہارے حوالدار بن جانے میں کتنی دیر ہے؟
 یوسف نے باہر نکلتے ہوئے کہا ”کوئی دیر نہیں، چچا جی۔“
 بہادر سنگھ نے کہا:

سردار جی یوسف جو بات کہا کرتے ہیں وہ ہو جایا کرتی ہے۔ کسی دن جب وہ یہ
 کہیں گے کہ میں تمہارا نیا دار بن جاؤں گا تو مجھے یقین ہو جائے گا۔“
 بیلا سنگھ نے کہا ”ارے بھئی تمہارا دوست ہے، تو تم بڑے خوش قسمت ہو۔“
 ”ہاں سردار جی، جب تک میں یوسف کا دوست نہیں بنا تھا۔ مجھے کافی بیوقوف
 سمجھا جاتا تھا۔“

”یار میں تو تمہیں بیوقوف نہیں سمجھتا تھا۔ جیتو کی ماں تمہیں بہت یاد کیا
 کرتی تھی۔ آج میں نے اُسے بتایا کہ تم یوسف کے پاس آ رہے ہو تو وہ بہت خوش
 ہوئی تھی۔ اب تو تم نے ہماری طرف آنا جانا بالکل چھوڑ دیا ہے۔“

منشی نے اپنی چھتری کھول کر سر کے اوپر لیتے ہوئے کہا

”تمہیں کیسے یقین ہے کہ یہ بارش ختم جائے گی۔ میں تو امرتسر سے یہی حالت دیکھتا آ رہا ہوں اور پچھلے اسٹیشنوں کے جو مسافر مجھے ملے تھے وہ بھی یہی کہتے تھے کہ بارش دُور دُور تک ہو رہی ہے۔“

”منشی جی! آپ فکر نہ کریں آپ رات بھی وٹینگ روم میں ٹھہر سکتے ہیں۔“
”اور اس مصیبت کا کیا کریں گے؟“ منشی جی نے کس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”جناب اس کی آپ فکر نہ کریں۔ اس سے آگے اس کس کو گھر پہنچانا میری ذمہ داری ہے۔ یہاں اسٹیشن ماسٹر بھی آپ کا خیال رکھیں گے اور ہمارا ایک آدمی آپ کے پاس موجود رہے گا۔“

منشی نے تلملا کر کہا ”بے وقوف! میں کام کے لیے آ رہا ہوں۔ خدمت کروانے کے لیے نہیں آیا۔ ہم بارش ذرا کم ہوتے ہی یہاں سے چل پڑیں گے۔“
ہوا کا تیز جھبکا آیا اور منشی صاحب چھتری کے ساتھ اڑتے ہوئے چند قدم دُور چلے گئے۔ فضل دین نے اُسے بھاگ کر کلاوے میں لیتے ہوئے کہا ”منشی جی پھتری ہاتھ سے چھوڑ دیجئے اور آرام سے وٹینگ روم میں بیٹھ جائیے۔“

منشی نے گرج کر کہا ”بیوقوف اُس کس کو کہاں رکھو گے؟“
”کس کی فکر نہ کریں۔ منشی صاحب، وہاں میرے آدمی موجود ہیں اور انہیں معلوم ہے کہ اُس کے اندر کیا ہے انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ اگر یہ کس کسی نے اُٹھایا تو ہماری سب کی شامت آجائے گی۔“

”لیکن میری چھتری؟“
”جناب وہ کہیں نہیں جاسکتی۔“

”سردار جی میں اور میرے پتا جی بھی آپ کو بہت یاد کیا کرتے ہیں کسی دن سرکار پر نکلیں تو ہمارے گاؤں کی طرف آجائیں نا۔“
”اچھا بیٹا اپنے پتا جی کو میرا پر نام کہنا۔“

بیلا سنگھ نے باتیں کرتے کرتے آنکھیں بند کر لیں اور چند منٹ بعد وہ گہری نیند سو رہا تھا۔

اگلے روز شام کی گاڑی آنے سے دو گھنٹے پہلے بارش شروع ہو چکی تھی اور تیز ہوا کے جھونکوں کے باعث مسافر خانے کے چھپر کا زیادہ تر بارش کے چھینٹوں کی زد میں آچکا تھا اور مسافر درمیانی حصے میں سمٹ رہے تھے۔ گاڑی کوئی چالیس منٹ لیٹ تھی۔ آسمان پر بادل اس قدر گہرے تھے کہ پانچ بجے سے پہلے ہی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شام ہو چکی ہے۔

ٹھیک پانچ بجے گاڑی پہنچی۔ سوار ہونے والوں کی طرح اترنے والوں کی تعداد بھی بہت کم تھی۔ فضل دین، منشی شمس الدین کو آوازیں دیتا ہوا گاڑی کے ساتھ ساتھ ادھر ادھر بھاگ رہا تھا کہ سیکیٹیڈ کلاس کے کپارٹمنٹ سے منشی شمس الدین نے گرج کر کہا۔

”بیوقوف مجھے آوازیں کیوں دے رہے ہو۔ سامان اُتارو۔“
فضل دین نے لوہے کا کبس اتار کر پیٹ فارم پر رکھ دیا اور چلا آیا۔
”منشی جی! آپ خدا کے لیے نیچے اُتریں۔ گاڑی جانے والی ہے۔“
”شمس الدین نے کہا۔“ بھئی! تمہارا مطلب ہے کہ میں ابھی سے نکل کر پانی میں کھڑا ہو جاؤں۔ گاڑی چلنے لگے تو اُتر جاؤں گا۔“

وٹینگ روم میں آپ کے آرام کا بندوبست ہو چکا ہے۔ یہ کس بھی وہیں رکھوا دیا جائے گا۔ جب بارش ختم جائے گی ہم چل پڑیں گے۔“

تو آپ اس سے پورا فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے؟
 فضل دین نے منشی کے کان میں کہا "منشی جی یہ کوئی شرارتی آدمی ہے اس کے
 ساتھ بحث نہ کریں۔"
 پھر اس نے سکھ سے مخاطب ہو کر بلند آواز میں کہا "سردار جی اگر منشی صاحب
 یہاں ٹھہر سکتے تو بڑی اچھی بات ہوتی لیکن یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم بھیگ تو گئے ہیں،
 رکنے سے کیا فائدہ؟"

منشی نے کہا "یار اب تو اندھیرا ہو رہا ہے۔"
 "آپ کو اندھیرے سے خوف نہیں کھانا چاہیے۔ مسافر خانے میں چند اور
 آدمی اس طرف جانے والے ہیں۔ تمہارے لیے ان کے ساتھ جانا بہتر ہوگا۔"
 منشی نے کہا "نہیں جی، میں کسی کے ساتھ نہیں جاسکتا۔ مجھے کیا معلوم
 کہ ان میں سے کوئی ڈاکو نہ نکل آئے؟"
 فضل دین نے کہا "سردار جی ہمارے منشی صاحب رات کے وقت کچھ
 اور پانی میں چلنے سے گھبراتے ہیں۔"
 "تو پھر ٹیک ہے اگر کسی وجہ سے ناواقف لوگوں کے ساتھ چلنا پسند نہیں کرتے
 تو ابھی سے چل پڑیں۔ میں کب روکتا ہوں کسی کو؟"
 فضل دین نے اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "یار اٹھاؤ یہ
 بکس اور چلو۔"

ایک آدمی نے بکس اٹھا کر دوسرے کے سر پر رکھ دیا منشی اور فضل دین ان کے
 پیچھے چل پڑے۔
 وہ کوئی ایک فرلانگ گئے ہوں گے کہ جوار کے کھیت سے اچانک تین
 آدمی نمودار ہوئے اور ان کے آگے چل پڑے۔

تین ہوا کا ایک اور جھونکا آیا اور چھتری اُلٹ گئی۔ فضل دین منشی کو سہارا دے کر
 وینگ روم کے اندر لے گیا۔ ایک آدمی نے بکس وینگ روم میں لا کر رکھ دیا اور فضل دین
 سے مخاطب ہو کر کہا "فضل دین یہ بہت بھاری ہے۔ منشی جی نے اس کے اندر کیا
 ڈالا ہے؟"
 "بھئی مجھے کیا معلوم اس کے اندر کیا ہے۔"۔ چسکتا ہے کہ گھر سے کپڑوں کے
 ساتھ کوئی دزنی برتن یا کوئی اور چیزیں رکھ دی ہوں۔"

منشی نے کہا "فضل دین اس وقت کہیں سے چائے مل جائے گی میرا بُرا
 حال ہو رہا ہے۔"
 "منشی جی! چائے اسٹیشن ماسٹر کے گھر سے آجائے گی اور تازہ برفی میں پل ہی
 حلوائی سے لے آؤں گا۔"
 "بھئی برفی ذرا زیادہ لانا مجھے بھوک محسوس ہو رہی ہے۔"
 "جی آپ فکر نہ کریں برفی اتنی زیادہ آئے گی کہ سب پیٹ بھر کر کھائیں گے۔
 میرے گاؤں کے آدمی بھی اور قلی بھی! یوسف صاحب نے ان سب لوگوں
 کی تواضع کرنے کے لیے کہا تھا۔"

کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد بارش ذرا کم ہوئی تو منشی نے کہا "بھئی اب یہاں سے چلو۔"
 فضل دین نے کہا "نہیں منشی جی یہاں کچھ دیر اور ٹھہرنے میں ہمارا فائدہ ہے۔
 بھیگ تو ہم ویسے ہی گئے ہیں۔"

ایک لمبا تڑنگا سکھ وینگ روم میں داخل ہوا اور اس نے منشی جی سے
 مخاطب ہو کر کہا "بھائی صاحب اگر ریوے کی طرف سے آپ کو سہولت مل رہی ہے

منشی شمس الدین نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اسے محسوس ہوا کہ چند آدمی اس کے پیچھے بھی آرہے ہیں۔ اس نے پریشان ہو کر کہا۔

”یار ڈاکو ہمیں گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔“
فضل دین نے کہا ”منشی جی اگر وہ ڈاکو ہیں تو ہمیں کیا کہیں گے۔ سامان میاں صاحب کا ہے ہم لڑے بغیر ان کے حوالے کر دیں گے۔“
منشی نے کہا ”تمہارا مطلب ہے کہ ہم بھاگنے کی کوشش بھی نہیں کریں گے۔“
منشی جی یہ بوجھ اٹھا کر بھاگ کون سکتا ہے؟“
منشی نے کہا ”یار میاں جی نے مجھے حکم بھیجا تھا کہ میں رقم کے ساتھ چاندی کے ایک ہزار سکتے بھی لاؤں۔“

”منشی جی یہ انہوں نے اس لیے کہا ہو گا کہ دیہاتی تھے سکتے لے کر خوش ہوتے ہیں۔ اگر آپ نے صرف نوٹ لے کر آنا ہوتا تو ہمارا کوئی آدمی گھوڑے پر آتا اور آپ سے رقم لے کر چند منٹ میں گھر پہنچ گیا ہوتا۔“
بکس اٹھانے والے آدمی نے کہا ”یار بوٹے میں تھک گیا ہوں، اب باقی راستہ تم یہ بوجھ اٹھاؤ۔“

دوسرے آدمی نے بکس اٹھا کر سر پر رکھ لیا۔ اب وہ کما د اور مکئی کے کھیتوں کے درمیان پانی میں ڈوبی ہوئی بگڑی ہوئی سے گزر رہے تھے۔ ان کھیتوں سے آگے ایک دھان کا کھیت تھا جس سے آگے کما د کے وہ کھیت تھے جو مانگا سنگھ کی حویلی سے ایک فرلانگ آگے تک نکل جاتے تھے۔

انہوں نے مشکل دھان کا کھیت عبور کیا ہو گا کہ پچھلے کما د کے کھیت سے چار آدمی بھاگ کر آگے بڑھے اور ایک نے بلند آواز سے کہا ”اگر جان بچانا چاہتے ہو تو یہیں رُک جاؤ۔“

بوٹا سنگھ بھاگ کر چند قدم آگے نکل گیا لیکن ایک آدمی نے اس کا پیچھا کرتے ہوئے کہا ”رُک جاؤ اور یہ بکس یہیں رکھ دو، ورنہ گولی مار دوں گا۔“ بوٹا نے کہا ”جی میں تو ایک مزدور ہوں مجھے آپ گولی کیوں مارتے ہیں۔ یہ لیجیے بکس اور اس نے بکس اُچھال کر کھیت میں پھینک دیا۔

منشی سہمی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا ”جناب میری تلاشی لے لیں میں پرانے مال کے لیے نہیں مردوں گا۔ میری جیب میں صرف بارہ روپے دس آنے ہیں۔“
ڈاکو نے کہا ”ادھر لاؤ بارہ روپے اور دس آنے اپنے پاس رکھ لو۔“
منشی نے اپنی جیب سے بٹوان نکال کر پیش کرنے ہوئے کہا۔

”جناب آپ خود ہی نکال لیجیے مجھے ڈر ہے کہ نمی کی وجہ سے دس کا نوٹ پھٹ جائے گا۔“

ڈاکو نے کہا ”یار تم تو بڑے اچھے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ بارہ آنے نکال لو اور بڑے ہمارے حوالے کر دو۔“

ڈاکو نے دوسرے آدمی کی طرف متوجہ ہو کر کہا،
”تمہارے پاس کیا ہے؟“

”کچھ نہیں جناب میں تے برنی کی ایک ڈلی کاغذ میں پیٹ کر جیب میں رکھ لی تھی لیکن اس کی حالت منشی جی کے نوٹ سے زیادہ خراب ہو چکی ہوگی۔“
”تم دونوں یہیں ٹھہرو اور اگر ہماری اجازت کے بغیر کوئی یہاں سے ہلا تو ہم گولی مار دیں گے۔“

دوسرے ڈاکو نے جو بوٹا کے ساتھ کھڑا تھا آواز دی:

”یار ان سب کو یہاں لے آؤ۔ یہ بکس ایک مصیبت ہے۔“ ڈاکوؤں کے اشارے سے وہ آگے چل دیے اور بوٹا کے گرد کھڑے ہو گئے۔

ایک ڈاکو نے پوچھا "او منشی سچ بتاؤ اس میں کیا ہے۔ یاد رکھو ابھی ہم یہ کس کھلو کر دیکھیں گے۔"

منشی نے جواب دیا "جناب اس میں جو کچھ ہے وہ اب آپ کا ہے میاں صاحب کے گھر سے مجھے بند کس دیا گیا تھا مجھے صرف اتنا معلوم ہے اس میں ایک ہزار چاندی کے روپے ہیں اور کچھ کپڑے ہوں گے۔"

ڈاکو نے بڑا کی طرف متوجہ ہو کر کہا "تم یہ کس اٹھاؤ ہم پانی سے نکل کر کسی جگہ اسے کھلو امیں گے اور اگر یہ بات غلط نکلی تو ہم منشی کا سر کاٹ کر اس کبس میں بند کر دیں گے۔"

"سرکار مجھے تو آپ کچھ نہیں کہیں گے نا۔"

"بھئی تمہیں پوری مزدوری کے علاوہ انعام بھی ملے گا۔ اب جلدی۔ اس پانی سے نکلو۔ آگے کما دکی مینڈھ پر ہم یہ کس کھلو کر دیکھ لیں گے۔"

فضل دین نے کہا "اٹھاؤ بڑا اور سامنے کما د کے اُدبچے کنارے کی طرف لے جاؤ۔"

ڈاکو نے کہہ "تم آگے آگے چلو ہم تمہارے پیچھے پیچھے آتے ہیں۔ ہمارے ساتھ کوئی چالاک کی تو ہم گولی مار دیں گے۔"

"بھائی ڈاکو جی ہمیں گولی کھانے کا کوئی شوق نہیں۔ ہم اتنے غریب ہیں کہ ہماری لاش بھی کوئی نہیں اٹھوائے گا۔"

"اچھا چلو ہم تم کو بھی انعام دیں گے۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس کبس میں کیا ہے؟"

"جناب مجھے صرف یہ پتہ ہے کہ منشی کوئی رقم لے کر آ رہا ہے مجھے یہ نہیں معلوم کہ روپے کتنے ہیں اور نوٹ کتنے ہیں۔"

"اچھا ہم ابھی کھلو کر دیکھ لیں گے۔"

فضل دین آگے آگے چل رہا تھا اور کما د کے قریب پہنچ کر مینڈھ کے ساتھ ساتھ

دائیں ہاتھ چلنے لگا۔

ڈاکو نے کہا "بس اب مینڈھ پر کس رکھ دو ہم اسے کھلو کر دیکھنا چاہتے ہیں۔"

فضل دین نے کہا "ڈاکو جی سرکار اس طرف کھیت کا کونا بہت اُدبچا ہے، آپ وہاں اطمینان سے دیکھ سکیں گے۔"

"اچھا چلو ہم خود بھی مینڈھ کا سنگھ کی حویلی سے دُور رہنا چاہتے ہیں۔"

وہ کھیت کے کونے میں پہنچے تو فضل دین نے تین کھیتوں کے کونوں کے درمیان قدرے بلند جگہ پر کس رکھ دیا۔

ایک ڈاکو نے اپنی ٹانج جلاتے ہوئے کہا۔ "اسے کھلو۔"

فضل دین نے جواب دیا: "تالا چابی کے بغیر نہیں کھلے گا۔ میں گھر سے کوئی ہتھوڑا ساتھ لے کر نہیں آیا تھا۔"

ڈاکو گرجا "او منشی کے بچے یہ تالا کھولو۔"

منشی نے جواب دیا "سرکار اس تالے کی ایک چابی امرتسر میں میاں صاحب کے گھر میں ہے اور دوسری میاں صاحب کے پاس ہے۔ میرے پاس جو پیسے تھے وہ میں نے آپ کو دے دیئے چابی کے لیے آپ میری تلاشی لے سکتے ہیں۔"

ڈاکو نے گرج کر کہا "بے وقوف ہمارا وقت ضائع نہ کرو۔"

فضل دین بولا "ڈاکو جی جناب منشی جی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ آپ کا وقت بھی ضائع ہوتا ہے اور انھیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ گاؤں کے راستے میں آپ ان کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اب آپ تسلی سے ہم سب کی تلاشی لے لیں اور ہمیں چھوڑ دیں۔"

ڈاکو نے کہا "اور یہ کس تمہارا باپ اٹھائے گا۔"

بوٹانے کہا "یہ کس اتنا بھاری نہیں جناب میں اسے پچھلے کھیتوں تک

اپنے سر پر اٹھا کر لایا ہوں۔“
ڈاکو نے کہا ”تم بکو اس نہ کرو، ہم یہ کب کھلوائیں گے ورنہ تم سب کی ہڈیاں
توڑ دیں گے۔“

منشی نے کانپتے ہوئے کہا ”جناب ڈاکو صاحب میں بوڑھا آدمی ہوں میری
ہڈیاں توڑنے کی بجائے آپ اس کب کھولیں نہیں توڑ ڈالتے، مجھے یقین ہے کہ آپ
اپنے ہاتھ سے بھی یہ تالا توڑ سکتے ہیں۔“

ڈاکو نے جھجک کر ایک ہاتھ سے تالا توڑنے کی کوشش کرتے ہوئے
غضب ناک ہو کر بولا۔ ”ایک منٹ کے اندر اندر چابی نکالو اور تالا کھول دو، ورنہ
ہم تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو گولی مار کر یہیں پھینک جائیں گے۔“

بوٹا چلایا ”سرکار میں ان کا ساتھی نہیں ہوں۔ میں مسلمان بھی نہیں ہوں، ایک
غریب عیسائی ہوں، مجھے گولی مار کر آپ کیا لیں گے، مجھے جو ایک روپیہ مزدوری ملنی
تھی وہ آپ منشی صاحب کے حساب سے کاٹ لیں۔“

”بیوقوف منشی صاحب کو ایک منٹ کے اندر اندر سارا حساب بھول جائے گا۔“
فضل دین نے کہا ”ایسا نہ کیجئے جناب اگر منشی صاحب حساب بھول گئے تو
ہمیں پچھلے مہینے کی تنخواہ کون دے گا؟“

قریب ہی سے ایک قہقہہ سنائی دیا۔ اس کے ساتھ ہی تین آدمی بھونکتے
ہوئے کتوں کی رستیاں پکڑے ہوئے نمودار ہوئے۔

ڈاکو بدحواس ہو کر پیچھے ہٹے تو چند اور کتے بھونکتے ہوئے پیچھے مکئی کے
کھیت سے نکلے اور وہ ٹھٹک کر رہ گئے۔

پھر ایک سرپٹ گھوڑا سوار بائیں طرف سے کیچڑ اور پانی میں نمودار ہوا اور
آن کی آن میں دھان کا کھیت عبور کر نیچے بعد ان کے قریب آ پہنچا۔

انہوں نے دائیں ہاتھ نہر کی طرف بھاگنے کی کوشش کی لیکن اُدھر سے
پستول چلنے کی آواز سنائی دی اور آن کی آن میں ایک اور گھوڑا سوار نمودار ہوا اور اُس
نے آواز دی ”تم اس وقت چاروں طرف سے پولیس کے گھیرے میں ہو، اپنے ہتھیار
پھینک دو، ورنہ سب مارے جاؤ گے۔“

اس کے ساتھ ہی چاروں اطراف سے انہیں ٹاریوں کی روشنی دکھائی دینے
لگی۔ ایک ڈاکو نے سوار کی طرف بندوق چلانے کی کوشش کی، لیکن کسی نے کما د کے
کھیت کے کنارے سے فائر کیا گولی اس کے بازو کو چھوتی ہوتی گزر گئی اور ڈاکو نے اپنی
بندوق پھینک دی۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اپنی تلواریں اور برچھیاں پھینک دیں۔
فضل دین نے جلدی سے ایک ڈاکو کی گردن دو بچتے ہوئے کہا۔ صاحب جی اس
ڈاکو کے پاس ایک چھوٹا سا پستول بھی ہے۔ کُرتے کی جیب کے اندر، دوسروں کو بھی
اچھی طرح دیکھ لیں۔ ان کے پاس پھرے بھی ضرور ہوں گے۔“

بندوق چلانے والا آگے بڑھا اور ایک آدمی جس نے بڑی مشکل سے ایک خونخوار
کتے کو ختم رکھا تھا۔ بیلا سنگھ تھا جس کا آدھا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔

سوار سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا ان کے قریب آچکا تھا۔ یوسف تھا۔
بیلا سنگھ نے ایک آدمی سے ٹارچ لے کر ڈاکوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا:
”اگر تمہارے کوئی ساتھی کا د کے اندر چھپے ہوئے ہیں تو انہیں آواز دے کر بلا لو ورنہ
چند خونخوار کتے چھوڑ دیے جائیں گے اور وہ ان کی بوٹیاں نوچ ڈالیں گے۔“

ایک منٹ بعد ڈاکوؤں کو ہتھکڑیاں لگائی جا رہی تھیں فضل دین نے کہا ”سردار جی
اپنے آدمیوں کو آواز دیں کہ وہ کتے چھوڑ دیں۔ میرا خیال ہے کہ پیچھے مکئی کے کھیت میں ان
کے کوئی اور ساتھی بھی موجود ہوں گے۔“

بیلا سنگھ نے آواز دی ”اُدھر مکئی کے کھیت میں کتے چھوڑ دو، میں روشنی

ہمیں تھوڑی دیر سردار منگ سنگھ کی حویلی میں ٹھہر جانا چاہیے۔ وہاں آپ سب کے لیے گرم گرم چائے تیار ہوگی۔ اگر مناسب ہو تو آپ ڈاکوؤں کو نٹھانے کے لیے جانے کے لیے پولیس کے اور آدمی منگوائیں۔“

بہادر سنگھ نے کہا ”نہیں سردار جی پولیس کے اور آدمیوں کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں۔ ڈاکوؤں کو ہم اسی طرح ہانکے ہوئے لے جائیں گے۔ بھائی یوسف جی! آپ تھک گئے ہوں گے۔ سیدھے گھر جائیں اور ہمیں بھی چائے اس وقت مزے لگیں گی جب ہم ڈاکوؤں کو حوالات میں بند کر دیں گے۔“

پریم سنگھ نے کہا ”ہاں یوسف صاحب بہادر سنگھ ٹھیک کہتا ہے۔ آپ سردار منگ سنگھ کے نوکر سے کہتے جائیں کہ ہم اس کی چلتے پھرتے دن پی لیں گے۔“ یوسف نے کہا ”ٹھیک ہے لیکن میں جانے سے پہلے آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔“

پریم سنگھ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اُس کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور چند قدم دُور جا کر کہا ”یوسف جی فرمائیے کیا حکم ہے۔“

”نہیں بھائی صاحب ایک مشورہ ہے۔“
حوالدار نے کہا ”جناب ہمیں تمام بڑے افسروں کا حکم ہے کہ آپ کے مشورے کو حکم سمجھا جائے۔“

یوسف نے کہا ”اچھا جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ تھا نیدار اور انسپکٹر کے کانوں تک پہنچا دو کہ بڑے افسروں کے سامنے اور دینا ناٹھ کی موجودگی میں کھولا جائے۔“
میاں عبدالکریم کے پاس اس کی ایک چابی ہوگی وہ صبح لینا آؤں گا شاید میاں عبدالکریم خود بھی وہاں آجائے۔“

پریم سنگھ نے کہا ”جناب آج جو کچھ ہوا ہے اُس کی بہت سی باتیں ہماری

کرتا ہوں۔“

بیلا سنگھ کے آدمیوں کے ساتھ بہادر سنگھ اُس طرف بڑھا اور تھوڑی دیر بعد مکئی کے کھیت کی طرف کتوں کے بھونکنے کے ساتھ دو آدمیوں کے چیخنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ بیلا سنگھ بھاگ کر آگے بڑھا اور اُس نے مکئی کے کھیت کے قریب پہنچ کر بلند آواز میں کہا ”کتوں کو روکے رکھو لیکن ڈاکوؤں کو اپنے گھیرے سے باہر نہ نکلنے دو۔“
تو کی آواز سنائی دی۔ ”سردار جی اب یہ نہیں نکل سکتے۔“

تھوڑی دیر بعد دو آدمی جنگی گرز میں بہادر سنگھ اور بیلا سنگھ نے دبوچ رکھی تھیں۔ مکئی کے کھیت سے نمودار ہوئے۔ کتے جن کی رشتیاں سردار بیلا سنگھ کے آدمیوں کے ہاتھ میں تھیں ان پر چھپنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بہادر سنگھ اپنی بندوق کے ساتھ اور تلو اپنی برچی تانے ناچتا ہوا ان کے پیچھے آ رہا تھا۔ جب وہ دھان کے کھیت میں داخل ہوئے اور ٹاسی کی روشنی ان کے چہرے پر پڑنے لگتی تو تلو ان کے گرد چکر لگانے کے بعد بھاگ کر برچی تانے آگے بڑھنا لیا۔ جب برچی ان کے جسم کے کسی حصے کو چھوئے لگتی تو وہ اپنا ہاتھ روک لیتا۔ ڈاکو خوف سے چیختے ہوئے کبھی اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں اور کہنیوں میں چھپا لیتے تھے اور کبھی کچھڑ میں گر پڑتے تھے۔ دیکھنے والے قہقہے لگا رہے تھے۔

یوسف نے اپنا گھوڑا آگے کرتے ہوئے کہا ”تو بھی اب یہ ناچ ختم کرو۔“

تھک جاؤ گے، ابھی ہمیں بہت کام ہے۔ اگر موقع ملا تو پولیس کے بڑے افسروں کے سامنے تمہارے کرتب دیکھے جائیں گے۔ پھر وہ بیلا سنگھ کی طرف متوجہ ہوا۔

”چچا اس دن بھی تلو اسی طرح ناچ رہا تھا۔ جب میں نے بندوق سے پر دیسی درخت پر بلا مار ڈالا تھا۔“

بیلا سنگھ نے پریم سنگھ سے کہا ”پریم سنگھ اب بارش رک گئی ہے۔ میرا خیال ہے

پریم سنگھ نے جواب دیا "کہ اس حالت میں تو وہ اور زیادہ جلدی کرے گا۔ اس علاقے میں کوئی واردات اس کے علم کے بغیر نہیں ہوتی اور یہ جاننا اس کے لیے بہت ضروری ہوگا کہ چھ اور ڈاکو گرفتار کیسے ہو گئے اور ان میں سے ایک کے متعلق تو مجھے بتایا ہے کہ وہ دینا ناتھ کے اپنے گاؤں کا آدمی ہے۔"

یوسف نے پوچھا "تم نے اس کے گاؤں کے آدمی کو پہچان لیا ہے؟"

"جناب اُسے بٹو اور سردار بیل سنگھ کے ایک ساتھی نے اچھی طرح پہچان لیا ہے۔"

سردار جی کے کتے نے اُسی کی ٹانگ سے تھوڑا سا گوشت نوچا تھا۔

"اُسے پٹی کی ہے؟"

"جی بٹو نے اُسی کی بگڑی بھاڑ کر بیٹی باندھ دی تھی وہ یہ کہتا تھا کہ زخم پر تھوڑی سی سرخ مرچیں چھڑک دی جائیں تو یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا اور اُسے اولاً ہرنے کا بھی خطرہ نہیں رہے گا۔"

یوسف نے کہا "نہیں نہیں حوالدار صاحب آپ جانتے ہی اُس کے لیے ٹیکے کا انتظام کریں اگر کتوں نے کسی اور آدمی کو کاٹا ہے تو اُسے بھی ٹیکے لگوانے پڑیں گے۔"

بیل سنگھ نے اُس کے بڑے کتے کو دیکھنا کہیں میرے کتوں کو نہ مار دینا کوئی ان بدعنوانوں کے حصے کے ٹیکے میرے کتوں کو نہ لگا دے۔

بہادر سنگھ نے کہا "نہیں سردار جی ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ کتوں کے ٹیکے آدمیوں کو نہیں لگاتے جاتے۔ ویسے آپ کے کتے بہت قیمتی ہیں۔ اس لیے ہر سال انھیں ٹیکے ضرور لگا دینے چاہئیں۔"

یوسف نے کہا "سردار جی بہادر سنگھ ٹھیک کہتا ہے۔ اس علاقے میں اپنے کتوں

سمجھ سے باہر ہیں۔ لیکن آپ سب انہیں سمجھتے ہیں۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ جو باتیں پولیس کے لیے جاننا ضروری ہیں وہ مجھے بتادیں یا آپ ایک مفصل رپورٹ لکھ کر اپنے ساتھ لے آئیں۔ رپورٹ اس لیے بہتر ہوگی کہ جوابات آپ کہیں گے وہ پولیس کی سمجھ میں جلدی آجائے گی۔"

"میں کوشش کروں گا۔ شاید اس کی ضرورت بھی ہو۔ اب یہ سوچنا تمہارا کام ہے کہ دینا ناتھ کو کس طرح سے بلایا جاسکتا ہے۔"

پریم سنگھ نے بہادر سنگھ کو آواز دی۔ "بہادر سنگھ ذرا ادھر آؤ۔"

بہادر سنگھ بھاگتا ہوا آگے بڑھا اور پریم سنگھ بولا۔ "بہادر سنگھ یوسف صاحب چاہتے ہیں کہ تمہارے میں یہ کس سیٹھ دینا ناتھ کی موجودگی میں کھولا جائے مجھے یقین ہے کہ ان ڈاکوؤں کی گرفتاری کی اطلاع ملتے ہی انسپکٹر، ڈی ایس پی اور شاہ ایس پی صاحب بھی صبح تمہارے پہنچ جائیں۔ اب تم بتاؤ کہ دینا ناتھ کو صبح بلانے کا کیا طریقہ ہے؟"

بہادر سنگھ نے جواب دیا "کوئی خاص طریقہ نہیں جناب آپ ابھی اپنے ایک سپاہی کو بھیج دیں کہ صبح پولیس کے کوئی بڑے افسر تمہارے میں علاقے کے معتبرین سے ملنا چاہتے ہیں۔"

سردار بیل سنگھ اُسے اپنے گاؤں سے کوئی گھوڑی دے دیں گے اور جب وہ دینا ناتھ کے گھر پہنچ کر یہ بتائے گا کہ مجھے شام سے کچھ دیر پہلے یہ حکم ملا تھا اور میں بس معتبر آدمیوں کے ساتھ دیہات کا چکر لگانے کے بعد یہاں پہنچا ہوں تو آپ دیکھیں گے کہ اُسے باقی رات نیند نہیں آئے گی۔ اگر یوسف صاحب کے گاؤں کا چوکیدار پیراں دتہ بھی اُس کے گھر یہ پیغام پہنچا دے کہ تمہارا صاحب کا حکم آیا ہے تو بھی وہ حاضر ہو جائے گا۔"

نے ضرورت محسوس کی تو یہ حاضر ہو جائیں گے۔“

پریم سنگھ نے کہا ”یوسف صاحب میں شہر کے قریب پہنچتے ہی فضل دین اور بلو کے سوا آپ کے تمام آدمی واپس بھیج دوں گا۔ اگر انہیں چند گھنٹے ٹھہرنا ضروری ہوا تو ان کے آرام کا پوری طرح خیال رکھا جائے گا۔ آپ گھر جا کر آرام کریں اور بھگوان کے لیے رپورٹ لکھنا نہ بھولیے گا یہ ہو سکتا ہے کہ ایس پی صاحب خود وہاں پہنچیں اور ہماری اگٹ پلٹ باتیں سن کر خفا ہو جائیں۔“

”تم فکر نہ کرو۔ چچا بیلا سنگھ مجھے اجازت ہے۔“
”ہاں بھتی جاؤ۔“

یوسف نے گھوڑے کی باگ موڑتے ہوئے ایڑ لگائی آن کی آن میں پانی سے بھرے ہوئے کھیتوں میں اس کے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز آہستہ آہستہ مدھم مڈھم ہونے لگی

کوٹیکے لگوانے اور آوارہ کتوں کو مارنے کا انتظام کریں۔“

بیلا سنگھ نے کہا ”نا بابا ایسا نہ کرنا۔ جب پہلی دفعہ آفسر صاحب کے آدمی آئیں گے تو یہاں سے کوئی بد معاش انہیں میرے گھر بھیج دیگا۔“

یوسف نے کہا ”نہیں سردار جی میں خود پہلی دفعہ آفسر کے پاس جا کر اس بات کا بھی بندوبست کر دوں گا کہ آپ کے کتے محفوظ رہیں۔ اب اگر آپ بھی نیچے کے قریب تھانے پہنچ جائیں تو اچھا ہوگا۔“

بیلا سنگھ نے کہا ”وہ کس لیے، ہم نے جو کام کرنا تھا وہ کر دیا ہے۔“

”سردار جی وہ اس لیے کہ وہاں بڑا شکار موجود ہوگا۔ بہادر سنگھ آپ کے ساتھ جاتے گا اور رات آپ کے پاس رہے گا۔ صبح میں اپنے گاؤں کے چوکیدار پیراں دتہ کو بہادر سنگھ کے ساتھ بھیج دوں گا۔ آپ اسے ایک گھوڑی دے دیں۔ تاکہ یہ میرے گاؤں کا چکر لگانے کے بعد سیدھا وہاں سے پنڈت دینا ناتھ کی ملاقات کے لیے چلا جائے۔“

بیلا سنگھ نے کہا ”گھوڑی تو میں دے دوں گا۔ مگر میں پنڈت دینا ناتھ سے اس کی ملاقات کا مطلب نہیں سمجھا۔“

سردار جی جب آپ اطمینان سے کھانا کھا کر بیٹھیں گے تو بہادر سنگھ آپ کو بہت

کچھ بتا سکے گا۔ اور جو باتیں اسے معلوم نہیں وہ تھانے میں آپ پر ظاہر ہو جائیں گی۔“

بیلا سنگھ نے عاجز ہو کر کہا ”یار یہ پڑھے لکھے لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں یوسف جی

مطلب یہ ہے کہ مجھے آج رات بھی آرام سے نیند نہیں آئے گی۔ آخر وہ کیا بات ہے، جو مجھ سے چھپانا ضروری ہے؟“

یوسف نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا: ”چچا ہو سکتا ہے کہ

بہادر سنگھ اگر ہماری نہیں تو کم از کم اتنی باتیں ظاہر کر دے کہ آپ آرام کی نیند سو سکیں۔

حوالدار صاحب آپ پولیس اسٹیشن پہنچ کر میرے آدمیوں کو چھٹی دے دیں۔ صبح اگر آپ

باب - ۱۳

تھانے دار نے کہا ”یوسف صاحب ہمیں حکم ہے کہ آپ کے ہر مشورے پر سوچے بغیر عمل کیا جائے لیکن یہ تھا اگر آپ تھوڑا سا حل کر دیتے تو ہمیں بڑی خوشی ہوتی“

یوسف نے کہا ”آپ فکر نہ کریں۔ تھوڑی دیر میں سارے معاملے حل ہو جائیں گے۔“
حوالدار نے آگے بڑھ کر کہا ”یوسف صاحب آپ کا آدمی اور شاید پنڈت دینا ناتھ بھی ان کے ساتھ آ رہا ہے۔“

یوسف نے سب انسپکٹر سے کہا ”بیلہ سنگھ بھی آ رہا ہے وہ ایک بہادر آدمی ہے اور عزت کا مستحق ہے۔ میں تھوڑی دیر اپنے آدمیوں کے ساتھ باسٹ کر کے آتا ہوں۔“

یوسف تیز چلتا ہوا آگے بڑھا اور کچھ دیر تھانے کے چھاٹک کے قریب اپنے گاؤں کے آدمیوں سے باتیں کرتا رہا۔ اتنی دیر میں موٹر سائیکل کی آواز آئی اور سڑک کے کنارے کھڑے ایک کانسٹیبل نے آواز دی، ”انسپکٹر صاحب آ رہے ہیں۔“
انسپکٹر تھانے کے احاطے کے اندر داخل ہو کر رکا اور موٹر سائیکل سے اتر کر اس نے یوسف کے ساتھ گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور اس کے ساتھ باتیں کرتا اور اشاروں سے اسے واپس کھڑے لوگوں کے سلام کا جواب دیتا ہوا ایک کمرے میں چلا گیا۔

چند منٹ بعد دینا ناتھ اپنی سب سے بڑی بھاری بھر کم گھوڑی پر سوار نمودار ہوا۔ تھانیدار کے اشارے پر ایک سپاہی نے بھاگ کر گھوڑی کی ٹانگ پر چڑھ کر دینا ناتھ کو اتارنے کے لیے سہارا دیا۔ تھانیدار نے آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔
”اوسٹھ جی انسپکٹر صاحب تشریف لے آئے ہیں۔ تھوڑی دیر تک آپ سے ملاقات کریں گے، انھوں نے مجھے ٹیلی فون پر کہا تھا کہ کوڑوں کے نئے گروہ کی گرفتاری کے سلسلے میں سیٹھ جی کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جائے گا۔ آپ اس طرف کرسی پر تھوڑی دیر کے لیے

لگے دن نو بجے کے قریب تھانے میں اچھا خاصا میڈلگاہ ہوا تھا۔ آسمان پر بادل تیر رہے تھے اور نمی سے لدی ہوئی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔
یوسف گھوڑا دوڑاتا ہوا وہاں پہنچا۔ ایک کانسٹیبل نے بھاگ کر گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور وہ سیدھا تھانے دار کے کمرے میں چلا گیا۔ تھانے دار اس سے بتل گیا ہو کر ملا اور بولا ”یوسف صاحب انسپکٹر صاحب نے ٹیلی فون پر پورے تھانے کو ہی کارگزاری پر مبارک باد دی ہے وہ کہتے تھے کہ ایس پی صاحب بہت خوش ہیں ہو سکتا ہے کہ وہ خود یہاں تشریف لائیں اور آپ کو ملاقات کے لیے بلا لیں۔ ورنہ آپ کو ان کے پاس گوردا سپور جانا پڑے گا۔ انسپکٹر صاحب تھوڑی دیر تک یہاں پہنچ جائیں گے حوالدار نے مجھے بتایا ہے کہ آپ کے مشورے پر دینا ناتھ کو دس بجے کے قریب یہاں پہنچنے کا پیغام بھیج دیا گیا ہے۔“

یوسف نے کہا ”آج موسم خوشگوار ہے۔ آپ کرسیاں کنسی ایسی جگہ ڈالیں جہاں سے حوالات کے اندر آکر ہمیں اچھی طرح دیکھ سکیں۔ اگر ضرورت پڑی تو حوالات سے چند آدمیوں کو باہر لانا پڑے گا۔ آپ کو دینا ناتھ کے ساتھ بڑی عزت سے پیش آنا چاہیے اور حوالات کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کی زیریں خدمات کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔“

یہ ایک بکری کے ساتھ شیر کو بٹھانے والی بات تھی اور بہادر سنگھ بڑی مشکل سے مسکراتے ہوئے دانت چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بیلا سنگھ اُسے بڑی طرح گھور رہا تھا۔ لیکن دینا ناتھ نے اُس کی طرف دیکھنے کی بجائے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے دبار کھانٹا وہ چاہتا تھا کہ دوسری طرف منہ موڑے لیکن اُس طرف حوالات کی سلاخوں سے ڈاکو اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔



تھانے کے ایک کمرے میں جب انسپکٹر عبدالعزیز اور یوسف کے درمیان گزشتہ رات کے واقعات پر گفتگو شروع ہوئی تو یوسف نے اُسے ایک لفافہ پیش کرتے ہوئے کہا ”جناب میں اس بات پر معذرت خواہ ہوں کہ میں نے دو دن قبل آپ کو گزشتہ رات کے متوقع واقعات کے متعلق نہیں بتا دیا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ سنگھ میرے قیاس تک محدود تھا۔ اور یہ ہو سکتا تھا کہ میرا قیاس سراسر غلط ثابت ہوتا تو میرا مذاق اڑایا جاتا۔ آپ مختصر سی رپورٹ جو میں نے رات کے وقت لکھی تھی پڑھ لیجئے۔ پھر اس سلسلے میں شاید آپ کو کوئی اصلاحات کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔“

انسپکٹر عبدالعزیز نے مسکراتے ہوئے لفافے سے چند فلکیپ سائز کے کاغذات نکال کر غور سے یوسف کی طرف دیکھا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ یوسف میز پر سے اخبار اٹھا کر دیکھنے لگا اور کوئی دس منٹ تک کمرے میں سکوت طاری رہا۔

انسپکٹر نے کاغذ ترک کر کے لفافے میں ڈالتے ہوئے کہا ”اگر ہمارے ایس پی صاحب اردو پڑھ سکتے تو وہ آپ کو بڑے سے بڑے انعام کا مستحق سمجھتے۔ اب میں انگریزی میں ترجمہ کر کے انھیں پیش کروں گا اور میرا خیال ہے کہ اُن کے ساتھ تمہاری ملاقات زیادہ ضروری ہو جائے گی۔ آپ سے کئی سوال پوچھے جائیں گے اور اگر آپ کے جوابات اس تحریر کی طرح

بیٹھ جائیں۔ پریم سنگھ انہیں وہاں بٹھا دو۔“
دینا ناتھ حوالدار کے ساتھ چل دیا اور پریشانی کے عالم میں کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”سردار پریم سنگھ جی انسپکٹر صاحب سے کسی نے شکایت تو نہیں کی؟“
”سیٹھ جی یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ انسپکٹر صاحب جی اچھے کو اچھا برے کو بُرا سمجھتے ہیں اور سچ بات ظاہر کرنے سے بھی کبھی نہیں جھکتے۔“
دینا ناتھ نے کہا ”یار حاکموں کا کوئی پتہ نہیں ہوتا۔ میں تو تلے پہنچنے کا حکم سُن کر ہی ڈر گیا تھا۔“

”پنڈت جی وہ کانسٹیبل جو آپ کے پاس گیا تھا، بہت سمجھ دار ہے اگر اُس نے آپ سے کوئی گستاخی کی ہے تو اُسے سخت سزا دی جائے گی۔“
”نہیں تھانیدار صاحب وہ تو بہت ہی شریف لڑکا ہے اور ساتھ والے گاؤں کا چوکیدار پیراں دتہ جو اُن کے ساتھ آیا تھا وہ بھی بہت اچھا آدمی ہے۔“
”یہ سچے سے بہادر سنگھ نمودار ہوا اور اُس نے قریب آکر کہا۔“ پنڈت جی جب افسر اچھے ہوتے ہیں تو ماتحت بھی اچھے ہوتے ہیں۔ آپ ہمارے انسپکٹر صاحب سے مل کر زیادہ خوش ہوں گے۔“

سردار بیلا سنگھ گھوڑا دوڑاتا ہوا احاطے میں داخل ہوا۔
ایک سپاہی نے اُس کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور بہادر سنگھ بھاگ کر آگے بڑھا اور اس نے بیلا سنگھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔
”چچا جی۔ آئیے بیٹھیں انسپکٹر صاحب تھوڑی دیر تک آپ سے ملاقات کریں گے۔“

بیلا سنگھ اُس کے ساتھ آگے بڑھا اور دینا ناتھ کے قریب سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

یوسف نے قدرے توقف کے بعد جواب دیا "چچا جی میرا اپنا فیصلہ بھی یہی تھا کہ میں کوئی انعام قبول نہیں کروں گا۔ اگر ریوالور کا لائسنس مل جائے تو میں خرید سکتا ہوں لیکن مجھے اُن لوگوں کے متعلق بہت تشویش رہے گی جو میری وجہ سے ڈاکوؤں کی نظر میں آچکے ہیں۔ ان بد معاشوں کے متعلق میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ جس قدر لوگوں کو اپنے اسلحہ سے ڈرانا پسند کرتے ہیں اسی قدر زیادہ دوسروں کے اسلحہ سے ڈرتے بھی ہیں۔"

عبدالعزیز نے کہا "تم ابھی ان کے نام لکھو دو انھیں کسی دن بہت جلد ایس پی صاحب کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔"

یوسف نے کہا "میرے گاؤں سے سب سے پہلے بلوکا نام لکھ لیجئے۔ دوسرا بوطا عیسائی ہے۔ یہ دونوں اپنے وسائل سے بندوق کبھی نہیں خرید سکتے۔ تیسرا پیراں دتہ چوکیدار ہے اور وہ ایک کھانہ سے حکومت کا ملازم بھی ہے۔ اُس کو بھی بندوق مل جائے تو

اچھا رہے گا۔ ہمارے خاندان سے صرف تین آدمی ایسے ہیں جو لائسنس حاصل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں اور اسلحہ اپنی جیب سے خرید سکتے ہیں۔"

عبدالعزیز نے کہا "آپ اُن کی طرف سے درخواست لکھ کر مجھے بھجوا دیں۔"

یوسف نے کہا "میاں عبدالکریم کے پاس سپتول ہے۔ ان کے ایک نوکر فضل دین کو بندوق کے لائسنس کی ضرورت ہوگی اور وہ اُسے خریدنے کے لیے پیسے بھی دے دیں گے۔"

اُن کے گاؤں کا دوسرا آدمی جس کی میں پُر زور سفارش کرتا ہوں۔ اُس کے لیے جب آپ عبدالکریم سے بات کریں تو علیحدگی میں پوچھیں کہ وہ اُسے بندوق خرید کر دینا پسند کریں گے یا حکومت کی طرف سے بندوق بطور انعام مل جائے تو وہ کوئی اور انعام دے دیں گے۔ میں نے جن لوگوں کے نام لئے ہیں وہ علاقے کے امن کے لیے

موثر ہوتے تو ایس پی صاحب آپ کے لیے بہترین دوست ثابت ہوں گے اور میری طرح ان کی رائے بھی یہ ہوگی کہ ہماری پولیس کو آپ جیسے ہونہار نوجوانوں کی ضرورت ہے۔"

یوسف نے کہا "جناب میں نے جو کچھ کیا ہے۔ وہ میری زندگی کے کسی پروگرام کا حصہ نہیں۔ آپ یوں سمجھ لیجئے کہ چلتے چلتے میرے راستے میں ایک خطرناک موڑ آیا تھا اور اللہ کے کرم سے میں بے خوف و خطر اُس سے بچ کر نکل گیا۔"

عبدالعزیز نے کچھ دیر سوچ کر کہا "یوسف بیٹا تمہیں آج سے مجھے پولیس افسر کی بجائے اپنا دوست سمجھنا چاہیے اور اس بات پر کبھی حیران نہیں ہونا چاہیے کہ مجھے تمہاری زندگی کے ہر موڑ سے دل چسپی ہوگی۔"

"شکریہ چچا جان مجھے آپ ناشکر گزار نہیں پائیں گے۔"

"اور جن لوگوں کو تمہارے مشورے سے یہاں بلوایا گیا ہے۔ اُن کے متعلق ایس آئی نے میرے ساتھ مفصل گفتگو کی تھی اور میں بہت سی باتیں سمجھ گیا ہوں۔ اس کیس کو دینا ماتھ کے سامنے کھولنے کا معنا مجھے آپ کی رپورٹ پڑھ کر سمجھ میں آیا ہے لیکن ان لوگوں سے ملاقات کرنے سے پہلے میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ تم نے اپنی بہادرانہ کارگزاری سے کسی دشمن پیدا کر لیے ہیں اور کئی تمہارے حامد بھی ہو سکتے ہیں۔ میں تمہیں پورے ملک کے لیے بندوق اور سپتول کا لائسنس دلوادوں گا۔"

میرا خیال ہے کہ ایس پی صاحب خود بھی آپ کو ذاتی حفاظت کے لیے اسلحہ بطور انعام دینے کی کوشش کریں گے۔ لیکن میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ کو کوئی ایسی پیش کش قبول نہیں کرنی چاہیے جس سے آپ کا پولیس کے ساتھ کوئی تعلق بھی ریکارڈ میں آجائے۔ میں یہ بھی مشورہ دوں گا کہ تعلیم کے دوران آپ کسی نئے کیس میں الجھنے کی کوشش نہ کریں۔ ایس پی صاحب اگر کسی انعام کی پیش کش کریں تو ادب سے انکار کر دیں۔ اس طرح اُن کے دل میں آپ کی عزت اور بڑھ جائے گی۔"

بہت کارآمد ثابت ہوں گے۔

ہر دیال سنگھ کے بیٹے جگجیت سنگھ کی عمر بہت چھوٹی ہے۔ لیکن وہ گڑبوش اور عقل سے کام نہ لیتا تو جیسے یہ دونوں کامیا بیاں حاصل نہ ہوتیں۔

عبدالعزیز مسکرایا "اُس کے متعلق جو آپ نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے وہ بہت دلچسپ ہے اور میں کو ششمن کروں گا کہ اسے گورنمنٹ کے خرچ پر تعلیم دلوائی جائے اور اس کے بعد پولیس میں لے لیا جائے۔"

"میرا خیال ہے کہ سردار بیل سنگھ کے متعلق مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں وہ ایک چھوڑ کر دوچار بندوقیں خرید سکتے ہیں لیکن ان کو صرف کتوں کا شوق ہے۔ وہ بڑے بہادر اور کارآمد آدمی ہیں اسلحہ کے سلسلہ میں آپ خود ان سے بات کریں تو وہ بہت خوش ہونگے۔ اپنی رپورٹ میں میں پریم سنگھ حوالدار اور بہادر سنگھ کانسیٹیل کی کارگزاری کے متعلق لکھ چکا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ان کی حوصلہ افزائی کی جائے تو آگے چل کر وہ اچھے افسر ثابت ہوں گے۔"

"ان دونوں کی سفارش کر دی جائے گی اور بہادر سنگھ کو ترقی دے کر اس تھانے میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ آپ ان دونوں کو یہ خوش خبری دے سکتے ہیں۔"

"چچا جی، یہ خوش خبری اگر آپ کی طرف سے ہو تو بہتر ہے۔ اب آپ باہر کھلی ہوا میں ان سے ملاقات کریں اور وہیں اس کبس کا مالا کھلوائیں عجلد الکرم صاحب اپنے ساتھ چابی لے آئے ہوں گے۔ روپے گننے کے لیے دینا نا تھ کو کہیں اگر سبیاں اُس جگہ رکھو ادی گئی ہیں۔ جہاں سے حوالات کے قیدی اچھی طرح دیکھ سکیں۔ آپ جس قدر دینا نا تھ کے ساتھ تپاک سے ملیں گے۔ اُسی قدر وہ پریشان ہوگا۔"

عبدالعزیز نے پوچھا "تمہارا کیا خیال ہے۔ دینا نا تھ کو گرفتار کر لیا جائے۔ کیونکہ اس کبس کو کھولنے کے بعد ثبوت ہمارے پاس کافی ہو جائیں گے اور شاید

گرفتار ہونے والے ملزموں میں سے کوئی اُس کے خلاف گواہی بھی دے دے۔"

یوسف نے کہا "جناب میں اُس کی گرفتاری کا مشورہ نہیں دوں گا۔ ویسے آپ مجھ سے بہتر سوچ سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اُسے عزت سے رخصت کیا جائے۔ اس کا فوری فائدہ یہ ہوگا کہ علاقے میں چوروں اور بد معا شوں کا بڑا اڈہ ختم ہو جائے گا۔ میرا مطلب ہے کہ اس کا کوئی اعتبار نہیں کرے گا اور اُس کی قدرتی سزا آج کے دن سے شروع ہو جائے گی۔ باہر ملاقات کرنے والے آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

آسمان ابر آلود ہے اور بڑی خوشگوار ہوا چل رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ چند منٹ میں فارغ ہو جائیں گے اور اس کے ساتھ ہی اس ڈرامے میں میرا ذاتی پارٹ ختم ہو جائے گا اور میں اپنی تعلیم پر پوری توجہ دے سکوں گا۔"

اسکپٹر نے کہا "بیٹا یوسف میں خود یہ نہیں چاہتا کہ آپ کو ایسی الجھنوں کا دوبارہ سامنا کرنا پڑے۔ ایک بات سے میں بہت خوش ہوں کہ تم مضبوط اعصاب کے مالک ہو۔ لیکن گزشتہ واقعات کے بعد یہ ضروری ہو گیا ہے کہ اگر کوئی خطرہ پیش آئے تو تم اپنے آپ کو بہترین نشانہ باز ثابت کر سکو۔ تمہیں نشانہ کی مشق کر دانے کے لیے کسی ماہر استاد کی خدمات حاصل کرنا ہماری اولین ذمہ داری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں بہترین نشانہ باز بننے کے لیے زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ اب میرے ساتھ تمہارا یہ معاہدہ ہونا چاہیے کہ تمہیں جب فرصت ملا کرے گی تم ہیڈ کوارٹر میں میرے پاس آیا کرو گے اور میں کبھی کبھی چلتے پھرتے تمہارے ہاں پہنچ جایا کروں گا۔ شاید ابھی تم یہ نہ سمجھ سکو کہ میں تم سے اس قدر مانوس کیوں ہو گیا ہوں۔ لیکن کسی دن ہم ایک دوسرے کے لیے مہم نہیں رہیں گے۔"

"چچا جان میرا خیال ہے کہ ہم اب بھی ایک دوسرے کے لیے مہم نہیں ہیں۔"

دو میل پیدل چلنا پڑے گا۔

بہت اچھا سر۔ جس دن آپ مناسب سمجھیں گے۔ اسے بلا لیا جائے گا۔
سر میں اسے کہہ دیتا ہوں کہ وہ جب چاہے آپ سے مل سکتا ہے۔

انسپکٹر نے ریسپور رکھ دیا اور تھانیدار سے مخاطب ہوا: ”آپ ملاقاتیوں
سے کہہ دیں کہ میں اٹھ کر ان کے پاس آنے والا تھا کہ ایس پی صاحب کا فون آ گیا۔
ایس پی صاحب اس بات پر خوش ہیں کہ پنڈت دینا ناتھ جیسے بااثر لوگ اس کمپن
میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ یکس وہاں رکھو اور اگر میاں عبدالکیم کے پاس اس کی چابی
موجود ہے تو اسے کھلوادو۔ ورنہ تالہ تڑوا دو اور پنڈت دینا ناتھ سے کہو کہ وہ روپے
گفتا شروع کر دے میں یوسف صاحب کے ساتھ ابھی آتا ہوں“

تھانیدار کمرے سے باہر نکل گیا اور انسپکٹر نے اٹھتے ہوئے کہا ”یوسف صاحب۔
آپ یہ سمجھ گئے ہوں گے کہ ایس پی صاحب مجھ سے کیا باتیں کر رہے تھے، وہ کل تمہارے
گاؤں آنا چاہتے تھے لیکن میں نے کہہ دیا ہے کہ راستہ خراب ہے اب وہ کسی دن فرصت
کے وقت آپ کو بلائیں گے لیکن انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ آپ جب چاہیں ان سے
مل سکتے ہیں۔

یوسف نے کہا ”چچا جان مجھے آپ یوسف صاحب کیوں کہتے ہیں صرف یوسف
کیوں نہیں کہتے؟“

”اچھا یوسف اچلو تمہارے چچا نے کا اہم ترین سہیل بھی دیکھ لیں وہ باہر نکلے تو
دائرہ میں بیٹھے ہوئے آدمیوں کے درمیان چٹائی بچھا کر اس کے اوپر کس رکھا جا رہا تھا،
انسپکٹر یوسف کے ساتھ باتیں کرنا ہوا آگے بڑھا اور وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

انسپکٹر نے باری باری سب سے مصافحہ کیا اور دینا ناتھ کے ساتھ زیادہ گرمجوشی
دکھانے کے بعد کہا۔

”منو بیٹا ایک بات میں تمہیں بتا ہی دوں کہ میں زیادہ عرصہ یہاں نہیں رہوں گا
ایس پی صاحب یہاں سے تبدیل ہو کر جا رہے ہیں اور وہ اپنی تبدیلی سے پہلے ہی مجھے
اُس جگہ بھیج دیا کرتے ہیں جہاں انہیں تبدیل ہو کر جانا ہوتا ہے۔

ہم دس گیارہ برس سے ساتھی چلے آ رہے ہیں۔ وہ اس بات پر بہت خوش
تھے کہ تمہاری وجہ سے اس ضلع میں ان کے سروس ریکارڈ میں بہت بڑے کارنامے کا
اضافہ ہوا ہے۔ وہ اتنے کھلے دل کے آدمی ہیں کہ اگر کسی دن گھوڑے پر سوار ہو کر تمہارے
گاؤں کی طرف نکل آئیں تو بھی مجھے تعجب نہیں ہوگا“

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور تھانے دار نے اندر آ کر ریسپور اٹھایا اور کان سے لگانے
کے بعد انسپکٹر کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

”سر ایس پی صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں“

انسپکٹر نے ریسپور پکڑ کر کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

”لیکن سر۔ سر یہ دونوں ڈاکے ایک ہی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جس کا لیڈر
ارجن سنگھ تھا۔ سرسٹر یوسف نے بڑی تفصیل کے ساتھ تمام واقعات لکھ دیئے ہیں۔ جو
آپ دل چسپی سے پڑھیں گے اور اس کا ترجمہ شام تک آپ کی خدمت میں پیش
کر دوں گا۔

سرسٹر یوسف اس وقت میرے پاس بیٹھے ہیں اور ڈاکوؤں کی گرفتاری کے
ساتھ تعلق رکھنے والے تقریباً تمام لوگ باہر بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں یہاں سے فارغ
ہوتے ہی ہیڈ کوارٹر پہنچ جاؤں گا۔ سر میں پانچ بجے آپ کے ہنگامہ پر حاضر ہو
جاؤں گا۔ سر اگر یہ ممکن ہو سکے تو یوسف اور اس کے گاؤں کے لوگ اسے اپنی عزت
افزاتی سمجھیں گے۔

لیکن ان دنوں گاؤں میں کارلے کر جانا بہت مشکل ہوگا۔ یہاں سے ہمیں تقریباً

رقم سکوں میں لینا منظور کر لی۔ اس دفعہ میں نے منشی کو یہ ہدایت کی تھی کہ وہ ایک ہزار روپے اور باقی رقم گورداسپور کے بینک کے نام ڈرافٹ کی صورت میں لے آئے۔ کسی نے مشورہ دیا تھا۔ کہ گاؤں میں اتنا ہی کیش لے کر آنا تھا، لیکن میرے منشی کو کسی ضروری کام کے لیے کہیں جانا پڑا اور میں اُسے ہدایت دیکر یہاں اپنے گاؤں میں آ گیا تھا۔

”تو آپ کے خیال میں ارجن سنگھ نے کہیں سے یہ سُن کر ڈاکہ ڈالنے کی کوشش کی تھی کہ آپ رقم لے کر آنے والے ہیں۔“

”جی ہاں، لیکن یہ ایک معجزہ تھا کہ ارجن سنگھ اور اُس کے ساتھیوں کا یہ وار خالی گیا اور میری عزت کے ساتھ میرا رویہ بھی بچ گیا۔ ڈاکوؤں کی دوسری کوشش کی وجہ یہ تھی کہ انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ میرا منشی گاڑی پر رقم لے کر آ رہا ہے۔“

انسپکٹر نے دینا ناتھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”لیکن جناب ڈاکوؤں کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ آپ کا منشی پیسے لے کر آ رہا ہے۔“

دینا ناتھ کا چہرہ بھیگے ہوئے جوتے کی طرح ہو رہا تھا اور وہ ادھر ادھر ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اُس کے گلے پر چھری رکھی جا رہی ہے۔

عبدالکریم نے جواب دیا ”جناب ایسی باتیں پوشیدہ نہیں رہیں میرے لیے زمین بیچنے والے کو یہ یقین دلا ضروری تھا کہ میرا منشی پیسے لے کر آ رہا ہے اور وہ شام کی گاڑی پر پہنچ جائے گا اور اگلے دن ہم کچھری میں رجسٹری کروانے چلے جائیں گے۔ میں نے پٹرت دینا ناتھ سے بھی کہا تھا کہ وہ زمین کے مالک کو یقین دلاتیں کہ میری طرف سے کوئی وعدہ خلافی نہیں ہوگی اور میں نے زیادہ احتیاط اس لیے بھی نہیں برتی تھی کہ منشی نقد صرف ایک ہزار روپیہ لے کر آ رہا تھا۔ باقی رقم میرے نام گورداسپور بینک میں کیش ہونے والے ایک ڈرافٹ کی صورت میں تھی اور وہ اگر ڈاکو لے بھی جاتے تو میرا کچھ نہ بگڑتا۔ ویسے لوہے کا بکس اٹھا کر کسی ڈاکو کے

”سیٹھ جی آپ کو تکلیف ہوئی، میں چند ضروری کاغذات دیکھنے کے بعد آپ کے پاس آنے والا تھا۔ کہ ایس پی صاحب کا فون آ گیا۔ وہ پولیس کے ساتھ آپ جیسے بااثر لوگوں کے تعاون سے بہت خوش نظر آتے تھے۔ انسپکٹر عبدالعزیز کی آواز حوالات تک پہنچ رہی تھی اور دینا ناتھ کا چہرہ اُتر رہا تھا۔“

وہ کہہ رہا تھا ”بعض لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ ڈاکوؤں کے انتقام کا نشانہ بن گئے، آپ ایسے لوگوں کو حوصلہ دیں کہ حکومت ہر حال میں ان کی حفاظت کرے گی اور کسی کا بال بیکا نہیں ہوگا۔“ پھر وہ عبدالکریم کی طرف متوجہ ہوا۔

”میاں صاحب آپ کا بکس کھل جائے گا، یا تالہ توڑنا پڑے گا۔“

”جی آپ حکم دیں ابھی کھل جائے گا۔“

”اچھا تو تکلیف کیجئے۔“

عبدالکریم نے اٹھ کر بکس کا تالہ کھولا اور ڈھکنا اُپر اٹھا دیا۔

انسپکٹر نے یوسف کے ساتھ کُرسی پر بیٹھتے ہوئے تنہا نے دار سے مخاطب ہو کر کہا ”کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ حساب کتاب کا کام پٹرت دینا ناتھ کے سپرد کر دیا جائے۔“

”ہاں جی اس کام کے لیے اُن سے بہتر اور کون ہو سکتا ہے؟ آئیے سیٹھ، جی آپ اطمینان سے بیٹھ کر یہ رقم گنیں آپ کے ہاتھ بھی میلے نہیں ہوں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سکتے ابھی ابھی ٹکسال سے نکل کر آتے ہیں۔“

انسپکٹر نے پوچھا ”میاں صاحب آپ کو اتنا وزنی بکس میاں منگوانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“

عبدالکریم نے کہا ”جی کچھلی دفعہ میں نے زمین کا سودا کیا تھا تو فروخت کرنے والوں نے یہ کہا تھا کہ ہمیں نوٹوں کی بجائے چاندی کے روپے چاہئیں۔ میں نے گورداسپور کے بینک سے انھیں ایک ہزار نوٹوں کے بدلے سکتے لے دیتے تو انہوں نے وزن دیکھ کر باقی

انسپکٹر نے اطمینان سے موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔
 پریم سنگھ تمہارے اور بہادر سنگھ کے متعلق مسٹر یوسف نے بہت اچھی باتیں
 کہی ہیں۔ امید ہے کہ تم بہت جلد کوئی اچھی خبر سنو گے۔
 انسپکٹر کے روانہ ہوتے ہی تنہا ندر نے کہا ”بھتی سیٹھ دینا ناتھ بہت تھک گئے
 ہیں۔ تم ان کی گھوڑی لے آؤ اور انہیں عورت کے ساتھ رخصت کرو۔
 اور گھوڑی لانے والے سپاہی نے سیٹھ جی کی عزت افزائی یوں کی کہ گھوڑی حوالات
 کے بالکل قریب کھڑی کر دی۔ یہاں ڈاکو سلاخوں سے منہ لگاتے اُسے غضبناک نگاہوں سے
 دیکھ رہے تھے۔

حوالدار اور بہادر سنگھ نے دینا ناتھ کے بھاری بھر کم وجود کو سہارا دے کر اٹھایا اور
 اُسے کشاں کشاں گھوڑی کے قریب لے گئے۔ جب دینا ناتھ گھوڑی پر سوار ہونے لگا تو
 حوالاتوں نے بلند آواز میں گالیاں دینا شروع کر دیں۔ سب سے بلند آواز دوسری واردات میں
 پڑے جانے والے اس آدمی کی تھی جسے سردار بیلا سنگھ کے کتوں نے پکڑ کر اس کی پٹلی
 کا کچھ گوشت بھی نوچ لیا تھا اور جسے صبح سویرے پیٹ پر ٹیکہ لگایا گیا تھا اور ڈاکٹر نے جو
 گورداسپور سے ٹیکہ لگانے آیا تھا۔ یہ کہتا تھا کہ ایسے چودہ ٹیکے لگیں گے۔

ایک سپاہی دینا ناتھ کی گھوڑی کی باگ پکڑ کر ٹرک پر لے گیا لیکن حوالات سے
 بدستور گالیوں کی آواز آتی رہی۔ دینا ناتھ کے ہونٹ لٹکے ہوئے تھے۔ گردن جھکی ہوئی
 تھی اور وہ اپنے دل میں کہہ رہا تھا ”سگوان یہ کیا ہوا؟“ — کیوں ہوا؟ — بھگوان
 میری مدد کر — میں بہت دان کروں گا۔ میں کبھی تمہارے کا رخ نہیں کروں گا۔ میں
 کسی کے خلاف جھوٹی گواہی نہیں دوں گا۔ دینا ناتھ اپنے گرد و پیش سے بے خبر بڑبڑاتا
 چلا جا رہا تھا۔ اُسے یہ احساس نہ تھا کہ وہ بازار اور منہر کے پل سے گزر چکا ہے۔ کئی لوگوں نے
 راستے میں اُسے سلام کیا لیکن سیٹھ جی نے کسی کی طرف توجہ نہ دی۔ اُسے ایک انجانے خوف

لیے بارش اور کچھڑ میں بھاگنا آسان نہ تھا۔ یوسف صاحب نے میرے منشی کو حفاظت
 سے پہنچانے کے کافی انتظامات کر رکھے تھے اور پولیس بھی بہت چوکس تھی۔
 انسپکٹر نے کہا ”پنڈت جی آپ پیسے گنتے جاتیں تاکہ یہاں میرا کام جلدی
 ختم ہو جاتے۔ پہلے اس بکس میں سے وہ ڈرافٹ نکال کر دیکھ لیں۔ میاں صاحب
 اس سلسلے میں آپ ان کی مدد کریں“

میاں عبدالکریم نے اُبٹھ کر بکس سے ایک چھوٹا سا چمڑے کا تھیلہ نکالا۔
 اُسے اطمینان سے کھولا اور ڈرافٹ نکال کر انسپکٹر کو پیش کر دیا۔
 دینا ناتھ جس کے ہاتھ لرز رہے تھے، اب ذرا اطمینان سے روپے گنتے
 لگا۔ بالآخر اُس نے کہا۔

”جناب یہ پورا ایک ہزار روپیہ ہے“
 انسپکٹر نے کہا ”شکریہ سیٹھ صاحب اب آپ آرام سے کرسی پر بیٹھ جائیں اگر
 آپ تھک گئے ہیں تو گھر جا کر آرام کریں“
 تنہا ندر نے کہا ”ہاں جی میں بھی یہ محسوس کر رہا ہوں کہ یہ بہت تھک گئے ہیں“
 انسپکٹر بیلا سنگھ کی طرف متوجہ ہوا

”سردار بیلا سنگھ حکومت آپ کی کارگزاری پر بہت خوش ہے۔ ممکن ہے
 کہ ایس پی صاحب آپ کو اچانک بلا لیں۔ تنہا ندر صاحب آپ اپنی تفتیش جاری
 رکھیں۔ ایسے مقدمات میں وعدہ معاف گواہوں سے بہت کچھ معلوم ہو جایا کرتا ہے۔
 ممکن ہے کہ جو پھندا لگ چکا ہے اس میں اور بھی کئی ڈاکو پھنس جائیں۔ میں ایک
 ضروری کام سے واپس جا رہا ہوں، لیکن میں آپ سے نئی اطلاعات پوچھتا رہوں گا“
 انسپکٹر نے اُبٹھ کر اپنی موٹر سائیکل کا رخ کرتے ہوئے پریم سنگھ کو اشارہ
 کیا۔ وہ بھاگ کر تیزی سے آگے بڑھا۔

”اوہ مرگیا — مرگیا، مجھ پر کس نے حملہ کیا تھا؟“

اُن کے بیٹے روپ چند نے جواب دیا ”پتا جی دوسرے گاؤں کے وہ آدمی جو آپ کو لے کر آتے تھے۔ یہ کہتے تھے کہ آپ کھجے کے قریب سے گزرتے ہوئے تار سے زخمی ہو گئے تھے۔ وہ بے ہوشی کی حالت میں آپ کو یہاں لائے تھے۔ بڑے اچھے آدمی تھے وہ پتا جی، میں نے انھیں دو دو روپے انعام دیے تھے“

دینا ناتھ نے درد سے کراہتے ہوئے کہا ”اُن کو گولی مارو، وہ مجھے پاس ہی ہسپتال کیوں نہ لے گئے“

تھوڑی دیر بعد پنڈت جی کو گڈے پر لا کر ہسپتال پہنچایا جا رہا تھا۔ ان کی حالت یہ تھی کہ وہ ہسپتال پہنچتے ہی نہیں بار بے ہوش ہو چکے تھے۔

شام تک یہ قصہ اُس پاس کے تمام دیہات میں مشہور ہو چکا تھا۔

بڑوس کے گاؤں کا ایک کچھ جیون سنگھ جسے دینا ناتھ کے ساتھ خدا واسطے کام کرتا تھا ہر محل میں اس واقعہ کی یہ تشہیر کرتا تھا کہ دینا ناتھ اتنا بد معاش اور مغرور ہے کہ جب لوہے کی تار سامنے آگئی تب بھی یہ اپنی گھوڑی پر اکڑ کر بیٹھا رہا۔ اُس نے چار دانت نکلوا لیے۔ ناک زخمی کر دیا لیکن اس کی اکڑ میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں اُس سے پوچھتا ہوں کہ ”بیوقوف کے بچے اگر تو سر جھکا لیتا تو یہ حشر تو نہ ہوتا۔ یہ بھی اس کی خوش قسمتی تھی کہ تار اس کی گردن کو نہیں لگی تھی، ورنہ دینا ناتھ جی کا بولو رام ہو گیا ہوتا۔“

اکلا دن یوسف کے لیے بڑا اہم تھا۔ آسمان ابر آلود تھا اور خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ آٹھ بجے ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع چکی تھی۔

دس بجے کے قریب جب بارش ذرا تیز ہو چکی تھی۔ پریم سنگھ گھوڑا بھگاتا ہوا گاؤں پہنچا اور اُس نے یوسف کو اطلاع دی ”جناب مبارک ہو۔ انسپکٹر عبدالعزیز کا فون آیا ہے کہ آج شام چار بجے ایس پی صاحب اور ڈپٹی کمشنر صاحب نے آپ کو ملاقات“

سے سپینہ آ رہا تھا۔ گھوڑی ریوے سٹیشن کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی اس جگہ سے کچھ آگے داییں طرف مڑی جہاں پلیٹ فارم ختم ہو چکا تھا اور ریوے لائن عبور کرنے کے بعد جب وہ کھجے کے قریب سے گزر رہا تھا، تو اچانک تین آدمی سامنے آگئے۔ گھوڑی اپنا راستہ بند پا کر اچانک کھجے کی طرف ہٹ گئی اور اطمینان سے کھجے اور اسے سہارا دینے والی تار کے درمیان سے گزر گئی۔

دینا ناتھ کو اب اپنے گرد و پیش کا ہوش نہ تھا۔ اُس نے سامنے کے آنے والوں کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا تھا اور نہ ہی اُس تار کا کوئی نوٹس لیا تھا جو کھجے سے کوئی چھ سات قدم دور ایک کھونٹے کے ساتھ بندھی تھی۔ سیٹھ جی کی عافیت پسند گھوڑی نے اپنے لیے نئی گزرگاہ دیکھ لی تھی لیکن جب گھوڑی کی گردن آگے نکل گئی تو تار پہلے سیٹھ جی کی ٹھوڑی کو لگی۔ وہاں سے پھسلی تو اوپر کے چار دانت نکالنے کے بعد ناک کو بری طرح زخمی کر گئی۔ سیٹھ جی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ ایک طرف لڑھک گئے۔

دیہاتیوں نے بھاگ کر پنڈت جی کو سہارا دیا لیکن وہ بے ہوش ہو چکے تھے اور منہ اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ ایک آدمی نے ہمت کی، وہ گھوڑی کے پیچھے بیٹھ گیا اور دوسرے نے لگام پکڑ لی گھوڑی اپنی سست رفتاری کے باعث بہت مشہور تھی لیکن اب اُسے بھوک لگی ہوئی تھی۔ اور وہ جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتی تھی۔

سیٹھ جی گھر پہنچے تو وہاں کھرام مچ گیا۔ انھیں گھوڑی سے اتار کر بستر پر لٹا دیا گیا۔ اُن کا منہ اس قدر سو جا ہوا تھا کہ شکل بھی پہچانی نہیں جاتی تھی۔ پہلے اُن پر دسی ٹوٹکے آزمائے گئے اور جب انھیں کچھ ہوش آیا تو اُنھوں نے پوچھا میں کہاں ہوں؟

گھر والی سے جواب ملا ”مہاراج اپنے گھر میں“

”میں زندہ ہوں؟“

مہاراج بھگوان کی کرپا سے آپ زندہ ہیں۔“

کے لیے بلایا ہے۔“

یوسف نے مسکراتے ہوئے کہا ”بہادر کس بات کی سردار جی؟“

پریم سنگھ نے جواب دیا ”جناب آپ کو خوشی ہو یا نہ ہو، لیکن ہمارے تھانے کا ہر آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ اُس کے لیے خوشی کا دن ہے۔ ہمیں ایسا نظر آتا ہے کہ ہمارے تھانے کے سپاہیوں سے لیکر افسروں تک کو بہت جلد ترقیاں مل جائیں گی۔ کسی علاقے میں ایک نیک بخت پیدا ہوتا ہے تو سب کا بھلا ہوتا ہے۔“

یوسف مسکرایا ”حوالدار صاحب، آپ یہی سننا چاہتے ہیں کہ آپ اے ایس آئی

کب بنیں گے؟“

پریم سنگھ مسکرایا ”میرے لیے آپ کا مسکرا دینا ہی کافی ہے لیکن اگر آپ

زبان سے کہہ دیں تو میں سمجھوں گا کہ میں اے ایس آئی ہو گیا ہوں۔“

”اچھا بھئی میں کہہ دیتا ہوں کہ تم جلد اے ایس آئی ہو جاؤ گے۔ اے اے ام سے یہاں بیٹھ جاؤ اور بارش رکنے کا انتظار کرو۔ آج تم کھانا نہیں کھاؤ گے۔“

پریم سنگھ نے کہا ”میاں جی یہ بارش رکنے والی معلوم نہیں ہوتی۔ میں کل سے

یہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ بادل جب برسنا شروع کر دیں گے تو خوب برسیں گے اور مجھے

تھانیدار کا یہ حکم ہے کہ میں پیغام دے کر فوراً واپس پنچوں تاکہ وہ انسپکٹر صاحب

کو اطلاع دے سکیں کہ آپ ان کے پاس جا رہے ہیں۔ دیکھئے بارش اب آہستہ آہستہ

تیز ہو رہی ہے۔ آپ دو بجے کے قریب تھانے پہنچ جائیں۔ ہم وہاں سے آپ کو

لاری پر رخصت کریں گے۔ بہادر سنگھ خاص طور پر یہ کہتا تھا کہ آپ ذرا پہلے آئیں۔“

”اگر بارش کی یہی حالت رہی تو میں سمجھتا ہوں کہ مجھے لاری کی بجائے گھوڑے پر

یہاں سے گوردا سپور پہنچ جانا چاہیے اس لیے آپ انسپکٹر صاحب کو فون پر یہ

اطلاع دے دیں کہ میں سیدھا ایس پی صاحب کے دفتر پہنچ کر انھیں تلاش کروں گا۔“

”جناب آپ کی ایس پی اور ڈی سی سے ملاقات ہے۔ آپ خیال رکھیں کہ آپ کے کپڑے بھیکے ہوئے نہیں ہوں گے۔“

”یوسف نے کہا“ ایس پی اور ڈی سی کو معلوم ہو گا کہ بارش پر میرا کوئی کنٹرول نہیں اور اگر میں بس پر جاؤں تو بھی بھیک جاؤں گا۔“

”بہت اچھا جیسے آپ کی مرضی لیکن بہادر سنگھ کو بہت افسوس ہو گا۔ وہ آپ کو دینا ناتھ کے متعلق بہت کچھ سننا چاہتا تھا۔“

وہ دینا ناتھ کے پاس گیا تھا؟“

”جناب وہ دینا ناتھ کو ہسپتال میں تین بار دیکھ چکا ہے اور ہر مرتبہ اپنے ساتھ

نئے لوگوں کو لے جاتا ہے۔ میرا مطلب ہے تھانے کے لوگوں کو نہیں، علاقے کے

لوگوں کو اور جب وہ اس کے متعلق باتیں کرتے ہوئے اپنی مسکراہٹ چھپانے کے

لیے اپنے منہ پر ہاتھ رکھتا ہے تو بڑا عجیب لگتا ہے۔ کل شام وہ مجھے بھی لے گیا تھا۔

دینا ناتھ کی اتنی بڑی حالت ہے۔ چہرے کی سوزش سے اُس کی آنکھیں دکھائی نہیں

دیتیں۔ وہ مشکل سے بولتا ہے۔ صبح بہادر سنگھ اُسے دیکھ کر آیا تھا تو اُس نے

بتایا تھا کہ دینا ناتھ کو بولنے کی تکلیف سے بچانے کے لیے ڈاکٹر نے اُس کے منہ

پر پٹی باندھ دی ہے۔ اُس کے دل میں ایک ہی کچھتا ہے کہ اُس نے سیٹھ دینا ناتھ

کو تار میں پھنس کر دانت نکلاتے نہیں دیکھا۔“

یوسف نے کہا ”بہادر سنگھ ایک سیدھا سا آدمی ہے۔“

”ہاں جی سیدھا تو بہت ہے۔ لیکن اُس نے ایک کمال کیا ہے کہ صبح جوتے

ہی کہیں سے فوٹو گرافر کو تلاش کر کے تین چار آدمیوں کے ساتھ وہاں لے گیا تھا اور

انہوں نے دینا ناتھ کے تیمار داروں کو کچھ کہنے کا موقع دیتے بغیر اُسے بستر سمیت اٹھوا

کر باہر روشنی میں رکھ دیا تاکہ فوٹو گرافر اُس کی تصویریں لے سکے۔ دینا ناتھ کو یہ خبر نہیں

باب = ۱۴

شام کے وقت یوسف کے مہمان خانے میں کافی چہل پہل تھی۔ اس کے والد شام کی گاڑی سے گھر پہنچ گئے تھے گاڑی کے سرکردہ اور اس پاس کے دوسرے لوگ بمعہ عبد الرحیم فضل دین پہلے ہی وہاں موجود تھے اور انہیں بہادرانہ کارناموں پر مبارک باد دی جا رہی تھی سردار بیلا سنگھ اور بہادر سنگھ بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ جیون سنگھ نک مرچ لگا کر دینا ناتھ کے زخمی ہونے کا قصہ بیان کر رہا تھا۔

یوسف کے والد اور جوہلی میں جمع ہونے والے دوسرے لوگوں کو یوسف کے آنے کا انتظار تھا۔ چوں چوں اندھیرا ہو رہا تھا اُن کا اضطراب بڑھ رہا تھا۔ بہادر سنگھ نے اٹھ کر کہا ”چچا جی میں تھلنے جا کر فون کروانا ہوں کہ وہ اب تک کیوں نہیں آتے۔“ یوسف کے والد نے کہا ”بیٹا تھوڑی دیر اور انتظار کرو۔ ورنہ میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔“

اچانک بٹونے کہا ”جناب یوسف صاحب آرہے ہیں“ اور چند ثانیے بعد جوہلی میں سکوت طاری تھا اور گھوڑے کی ٹاپ سنائی دے رہی تھی۔

دو منٹ بعد یوسف جوہلی میں داخل ہو کر ہانپتے ہوئے گھوڑے سے اُترا۔ میاں عبد الرحیم اُسے پیار سے گلے لگانے کے لیے آگے بڑھے لیکن یوسف نے کہا۔ ”ابا جی میرے کپڑے کچھ ٹسے بھرے ہوئے ہیں۔“

تھی کہ اُس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ بہادر سنگھ اٹھا اٹھا کر اُس کے پوز بناتا تھا اور جب ہسپتال کے ڈاکٹر اور نرسیں متوجہ ہوتے تو بہادر سنگھ بڑے اطمینان کے ساتھ اس کا بستر اندر رکھوا کر روانہ ہو چکا تھا۔

بیوقوفی تو دراصل دینا ناتھ کے بیٹے کی تھی۔ اُس نے تھانے میں یہ رپورٹ لکھوائی تھی کہ اُس کے چچا جی اس لیے تار میں پھنس کر زخمی ہو گئے تھے کہ وہ غلط جگہ لگی ہوئی تھی اور انہیں یہ بھی شبہ ہے کہ اُن کی گھوڑی سیدھے راستے جا رہی تھی لیکن کسی دشمن نے ہانک کر اُس کا رخ بدل دیا تھا۔

بہادر سنگھ نے اُس کھبے اور تار کی تصویریں بھی بنوائی ہیں اور جو کچھ وہ رپورٹ میں بیان کرے گا، بہت دلچسپ ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ جب آپ گورڈا سپوسے واپس آئیں گے۔ بہادر سنگھ آپ کا انتظار کر رہا ہوگا۔“

میری یہ بات ایس پی صاحب سے پہلے ہو چکی تھی کہ میں کوئی انعام کسی صورت میں نہیں لوں گا۔ اس لیے فیصلہ یہ ہوا کہ ایس پی صاحب نے اپنے ذاتی اسلحہ سے تحفہ کے طور پر ایک خوب صورت ریوالور منگوایا اور مجھ سے یہ کہا کہ میں آپ کو ذاتی طور پر یہ تحفہ پیش کر رہا ہوں حکومت کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور مجھے امید ہے کہ تم اس بات کا خیال رکھو گے کہ میں یہاں سے تبدیل ہو کر جا رہا ہوں اور جب کسی دن تم میرے پاس کوئی تحفہ لے کر آؤ گے تو میں اُسے بخوشی قبول کروں گا۔ ڈی سی صاحب نے بھی مجھ سے پوچھا تھا کہ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ لیکن میں نے اُن سے صاف کہہ دیا تھا کہ اپنے لئے سب کچھ میں خود کروں گا۔ اور اگر میں نے دوسروں کے لیے یا اس ملک کے لیے کوئی اچھا کام کیا تو کبھی اُس کا کوئی معاوضہ نہیں لوں گا۔ جب میں رخصت ہونے لگا تو ڈی سی صاحب نے کہا تھا کہ تم نے اپنی رپورٹ میں جو سفارشات کی ہیں، وہ سب منظور کر لی جائیں گی اور ایس پی صاحب نے بھی جیسے ہی کہا تھا کہ جب تمہیں کوئی کام پڑے سیدھا ڈی سی کے پاس چلے آنا۔

بہادر سنگھ نے پوچھا ”جی میرے اور حوالدار کے متعلق بھی“

”ہاں بھئی امید ہے کہ تمہارا کام بھی ہو جائے گا۔“

پریم سنگھ نے کہا ”یار ذرا اپنا پستول تو دکھاؤ۔“ یوسف نے ریوالور پیٹی سمیت اتار کر اس کو پیش کر دیا۔ اُس نے چراغ کی روشنی میں ریوالور نکال کر ایک ہی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”یار بہت خوب صورت ہے، یقیناً بہت قیمتی ہوگا۔“

”بہادر سنگھ نے کہا ”یار ایس پی کا ذاتی ریوالور کوئی کم قیمت کا تو نہیں ہو سکتا۔“ یوسف نے کہا ”حوالدار صاحب دو تین دن تک انسپکٹر صاحب میرے لیے بہت سی گولیاں لے کر آئیں گے تاکہ میں مشق کر سکوں۔ اُن کے ساتھ ایک نشانہ باز بھی

باپ نے اُسے گلے لگا کر بوسہ دیتے ہوئے کہا ”ارے بیٹا مجھے اُس وقت بھی تم پر اسی طرح پیار آیا کرتا تھا۔ جب تم بہت چھوٹے تھے اور بھاگتے ہوئے گر کر مٹی میں لت پت ہو جایا کرتے تھے۔۔۔۔۔ مجھے تمہارے کارنامے پر فخر ہے۔“ یوسف سے یہ بات سننے کے لیے سب بے چین تھے کہ ایس پی اور ڈی سی سے اُس کی ملاقاتوں کا کیا نتیجہ نکلا ہے۔ بہادر سنگھ زیادہ دیر تک ضبط نہ کر سکا۔ اُس نے کہا ”بھائی صاحب یہ تو بتائیے کہ گورڈ اسپورس کیا ہوا۔ آپ نے اتنی دیر کیوں لگائی؟“

”بھئی میں پہلے انسپکٹر صاحب سے ملا تھا۔ انہوں نے میرے لباس پر کیچڑ دیکھا تو نہلا دھلا کر اپنے نئے کپڑے پہنا دیئے تھے۔ خوش قسمتی سے ہمارا قدر برابر ہے۔ ورنہ میں کارٹون دکھاتی دیتا۔ وہ مجھے ایس پی صاحب کے پاس لے گئے۔ ایس پی صاحب نے کچھ دیر دونوں وارداتوں کے متعلق باتیں کیں۔ وہ بہت خوش تھے۔ پھر وہ چند آدمیوں کو ٹیلی فون کرنے کے بعد مجھے ڈی سی کے پاس لے گئے۔ جب میں انسپکٹر صاحب کے ساتھ وہاں پہنچا تو پولیس اور محکمہ مال کے انسپر بھی، ڈی سی کے گھر آئے ہوئے تھے میرا تعارف کرایا گیا۔ مجھے ان دونوں ڈاکوؤں کے متعلق دوبارہ ان کے سوالات کے جوابات دینے پڑے اور وہاں کافی دقت لگ گیا اور ایک عجیب بات ہوئی۔ ڈی سی نے اچانک پوچھا ”تمہاری حفاظت کے لیے تمہارے گاؤں سے یا پولیس اسٹیشن سے کتنے آدمی آئے ہیں؟“ میں نے جواب دیا۔ ”جی میں اکیلا گھوڑے پر سوار ہو کر آیا ہوں۔“ دوسرا سوال مجھ سے یہ پوچھا گیا کہ تمہارے پاس کوئی اسلحہ ہے؟ میں نے جواب دیا ”میرے پاس کوئی اسلحہ نہیں۔ خطرے کے وقت صرف اپنے گھوڑے پر بھروسہ کر سکتا تھا۔“ ڈی سی نے چند منٹ ایس پی سے باتیں کیں اور وہیں فیصلہ ہوا کہ میرے لیے اسی وقت ایک ریوالور کا انتظام کیا جائے۔

آئے گا۔ جو ایک دو دن میرا مہمان ہوگا۔ اور انسپکٹر صاحب شاید آپ کے لیے بھی کوئی اچھی چیز لے کر آئیں۔“

عبدالرحیم نے کہا: ”اچھا بیٹا اب اندر جا کر کھانا کھا لو۔“

یوسف نے پوچھا: ”ابا جی آپ کھانا کھا چکے ہیں؟“

”ہاں بھئی میں نے نماز مغرب کے بعد میاں عبدالکریم کے ساتھ کھانا کھا لیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری اتنی اور دادی کے سوا گھر کے باقی سب لوگ کھا چکے ہیں یقیناً وہ تمہارا انتظار کر رہی ہوں گی۔“

پریم سنگھ نے پستول چمڑے کے غلاف میں بند کر کے پیٹی والیں دیتے ہوئے کہا: ”یوسف جی پستول دینے والوں نے آپ کو یہ نہیں سمجھایا تھا کہ رات کو چلتے وقت اسے لوڈ کر کے رکھنا چاہیے۔“

یوسف نے جواب دیا: ”رات کے وقت میری ساری توجہ اپنے راستے پر تھی۔ اور اگر کوئی اچانک نظر آ جاتا تو میرے لیے راستہ بدل کر نکل جانا آسان ہوتا۔ میں بلاوجہ آج نشانہ بازی کے موڑ میں بھی نہیں تھا۔“

آپ نے کھانا کھا لیا ہے۔؟

”جی ہاں، ہم سب کھا چکے ہیں۔ آپ جائیں۔“

یوسف نوکر کو گھوڑے کے متعلق ہدایات دے کر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا گھر پہنچا۔ اس کی ماں حسب معمول ڈیوڑھی کے دروازے پر موجود تھی اور اس مرتبہ اس کے دائیں بائیں امینہ اور اس کی ماں بھی کھڑی تھیں۔

یوسف نے حسب معمول سلام کہہ کر ماں کے سامنے سر جھکا دیا اور وہ اس کی پیشانی چومنے لگی۔

رشیدہ نے کہا:

”بہن یوسف کی بہت بڑی کامیابی مبارک ہو۔“

امینہ بولی: ”چچی جان میں بھی آپ کو مبارک باد دیتی ہوں اور یوسف صاحب آپ کو بھی۔“

”شکریہ، لیکن مجھے معلوم نہیں کہ مجھے کیا کامیابی ہوئی ہے۔“
رشیدہ نے کہا: ”بیٹا خدا کا شکر ادا کرو۔ ایس پی اور ڈی سی کا آپ کو اتنی عزت سے بلانا کوئی معمولی بات نہیں۔“

”جی یہ ایک رسمی سی بات تھی۔“

”لیکن تمہارے چچا تو کہتے تھے کہ اس ملاقات کے بعد تمہارے لیے کامیابی کے دروازے کھل جائیں گے۔“

”جی یہ ایک معمولی سی بات تھی۔ اتنی جان مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“
”چلو بیٹا۔ تمہارا کھانا ابھی تیار ہو جائے گا۔ میں نے تمہارے لیے صاف کپڑے غسل خانے میں رکھوا دیے ہیں۔ تم نہالو اتنی دیر میں تمہارا کھانا گرم ہو جائے گا۔“

— ○ —

یوسف نے کھانے کے بعد نماز پڑھی تو اس کے باپ نے اُپر سے آواز دی:
”بیٹا یہاں آ جاؤ میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

یوسف جلدی سے اُپر پہنچا اور ایک کرسی اٹھا کر کھلی چھت پر باپ کے قریب بیٹھ گیا۔ باپ نے کچھ سوچ کر کہا:

”یوسف مجھے سچ سچ بتاؤ کہ ڈی سی اور ایس پی نے صرف تمہارے پستول کا ذکر کیا تھا یا تمہارے مستقبل کے بارے میں بھی کوئی باتیں کی تھیں؟“

”جی میرے مستقبل کے متعلق وہ اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے تھے کہ آگے چل کر اگر تمہیں کسی ملازمت کی ضرورت پڑے تو بلا جھجک میرے پاس چلے آنا۔ ایس پی صاحب

نے تو یہاں تک کہا کہ تم بی اے کرتے ہی میرے پاس آؤ اور میں پولیس سروس کے لیے تمہاری مدد کروں گا۔ ڈی سی صاحب نے کہا تھا تمہیں سول یا فوجی سروس میں ہماری ضرورت پڑی تو تمہاری پوری مدد کی جائے گی۔
”اور تم نے کیا جواب دیا تھا۔“

”جی میں نے یہی کہا تھا کہ میں بی اے یا ایم اے کرنے کے بعد اپنے مستقبل کا فیصلہ کروں گا۔“

”برخوردار جو پروگرام تمہارے ذہن میں ہے۔ وہ میں ابھی طرح جانتا ہوں۔ تمہارے دماغ پر اب تک رائٹر بننے کا بھوت سوار ہے۔ میرا خیال تھا کہ کالج کے نئے ماحول میں تمہارے خیالات بدل جائیں گے۔ وہاں تمہارے پر فیئر تمہیں یہ سمجھا سکیں گے کہ ہمارے ملک میں کوئی رائٹر ایسا نہیں جس نے عزت اور فراغت کی روزی کمانی ہو لیکن تمہارے خیالات میں شاید کوئی فرق نہیں آیا۔ اب تمہیں ایک زریں موقع ملا تھا اور تم نے یہ کہہ دیا کہ آگے چل کر سوچوں گا۔ جیسے وہ لوگ اس بات کا انتظار کرتے رہیں گے کہ تم ابھی طرح سوچ لو اور پھر وہ تمہیں تمہاری پسند کی ملازمت دلوادیں گے۔“

یوسف نے کہا ”ابا جی میں آپ کی ٹانگیں دبا دوں۔“

”نہیں پہلے میرے سوال کا جواب دو کہ تم زندگی میں کیا کرنا چاہتے ہو۔“

”ابا جی میں تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“

”باپ نے غصے سے پوچھا ”تعلیم حاصل کرنے کے بعد کیا کرنا چاہتے ہو۔“

”ابا جان اس وقت میں آپ سے صرف ایک وعدہ کر سکتا ہوں کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد جو کچھ میں کروں گا آپ اس پر فخر کیا کریں گے اور میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے آپ کو ندامت ہو۔“

”دیکھو یوسف ایسی باتیں تمہاری ماں کو خوش کر سکتی ہیں۔ مجھے نہیں۔ میں ایک حقیقت پسند آدمی ہوں۔“

یوسف نے جواب دیا ”ابا جی آپ مطمئن رہیں۔ میں بھی پوری حقیقت پسندی کے ساتھ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچا کرتا ہوں۔“

قدسیہ بیگم دودھ کا ایک جگ لے کر اوپر آئیں اور ایک گلاس بھر کر یوسف کے والد کو پیش کرتے ہوئے کہا ”لیجئے دودھ پیجئے اور میرے بیٹے کو پریشان نہ کیجئے۔ آپ کو دنیا میں اس کی وجہ سے کسی جگہ شرمندگی نہیں اٹھانی پڑے گی۔“

عبدالرحیم نے کچھ کے بغیر گلاس پکڑ لیا اور ماں نے بستر پر بیٹھتے ہوئے یوسف کی طرف متوجہ ہو کر کہا ”بیٹا تم نے اپنے ابا جی کو بہت پریشان کیا۔ اتنی دیر نہیں لگانی چاہیے تھی تمہیں۔ عبدالکریم کی بیٹی کہتی ہے کہ ہمیں کچھ بانٹنا چاہیے۔ امینہ کی ماں بھی بہت خوش تھی۔“

”امی جان مجھے اُن کی خوشی کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ انہوں نے ملاقات کے لیے بلایا تھا اور میں ان سے مل کر آیا ہوں۔ کچھ باتیں عبدالکریم صاحب سے بھی تعلق رکھتی ہیں وہ صبح بتا دوں گا۔“

عبدالرحیم نے پوچھا ”عبدالکریم سے کون سی باتیں تعلق رکھتی ہیں؟“

”جناب ایک تو یہ ہے کہ انہیں فضل دین اور اپنے ایک مزارع کو بندو قیں خرید کر دینی پڑیں گی۔ انہیں لائسنس مل جائے گا۔ ہمارے گاؤں سے تلو اور بوٹا عیسائی اور پیراں دتہ چوکیدار کو بھی بندو ق کے لائسنس مل جائیں گے اور سرکاری اسلحہ خانے سے بہت سستی قیمت پر بندو قیں نکلوا دی جائیں گی۔ گاؤں کے لوگ بخوشی ان کے لیے چندہ جمع کر دیں گے۔“

عبدالرحیم نے کہا ”بیٹا میں لاہور تبدیل ہو گیا ہوں اور مجھے پندرہ دن کی چھٹی

دعا کیا کریں۔ میں آپ کو یہ بتانے آئی تھی کہ رشتہ دار اور اس کی بیٹی بہت اصرار کرتی ہیں کہ ہم پرسوں یا اس سے لگے روز اُن کے ہاں کھانا کھائیں۔ انہوں نے ہمارے علاوہ آپ کے بھائیوں اور اُن کے بیوی بچوں کو بھی بلایا ہے۔“

یوسف نے کہا: ”امی جان آپ نے اُنھیں یہ نہیں بتایا کہ ہم لاہور جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔“

”بیٹا میں نے اُنھیں بتایا تھا کہ ہم لاہور جا رہے ہیں اور اُنھوں نے ایک درخواست کر دی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم ایک روز پہلے روانہ ہوں اور ایک رات امرتسر میں اُن کے ہاں قیام کریں۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ امرتسر میں آپ کی دعوت پھر بھی کھالیں گے۔ ابھی تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ یہاں یوسف اور اُس کے آبا جی کی مصروفیات کیا ہوں گی۔“

عبدالرحیم نے کہا: ”عبدالکریم نے تو مجھے دیکھتے ہی دعوت کھانے کا وعدہ لے لیا تھا اور وہ کئی بار کہہ چکا ہے کہ جب میں امرتسر سے گزروں اُن کے ہاں ضرور ٹھہرا کروں۔ وہ خواہ کہیں ہوں مکان پر نوکر میری خدمت کے لیے موجود ہوں گے۔ انہوں نے لاہور میں بھی مکان کے لیے کافی زمین خریدی ہوئی ہے اور جب مکان مکمل ہو جائے گا تو وہ لاہور میں منتقل ہو جائیں گے۔ جب اُنھیں معلوم ہوا کہ میں لاہور تبدیل ہو کر جا رہا ہوں تو بہت خوش ہوا تھا۔ آدمی تو بہت سادہ سا معلوم ہوتا ہے لیکن جائیداد بہت بناتی ہے اُس نے۔ کئی جگہ ٹھیکے لے رکھے تھے۔ دو مربع ایک کو بھٹی لال پور میں ہے اور اب یہاں بہت سی زمین خریدنا چاہتا ہے۔“

نیچے سے یوسف کی دادی کی آواز سنائی دی: ”یوسف تم کہاں ہو؟“

یوسف اُٹھ کر بھاگتا ہوا نیچے اُترا اور دادی کو فریشتے میں چار سیڑھیاں اُپر روکتے ہوئے بولا: ”دادی جان میں نے سلام کہا تھا لیکن آپ نماز پڑھ رہی تھیں۔“

عبدالرحیم سو گیا ہے؟

ملی ہے اور تم ان دس دنوں میں اتنا کچھ کر چکے ہو کہ اُسے جلد سمیٹنے کی صورت نظر نہیں آتی۔ میں نے لاہور میں مکان لے لیا ہے اور چپڑا اسی کو چھوڑ آیا ہوں اور پرسوں وہ یہاں آجائے گا اور دو دن بعد تمہیں بھی اُس کے ساتھ لاہور چلے جانا چاہیے تاکہ کالج کھلنے سے پہلے کچھ تیاری کر لو۔“

قدسیہ نے کہا: ”آپ اپنے بیٹے کو کوئی خوشی کی بات بھی بتا دیا کریں۔“

”بیٹا خوشی کی بات یہ ہے کہ اب ہم لاہور میں آگئے رہا کریں گے۔“

یوسف نے کہا: ”آبا جی یہ بات تو مجھے اتنے ہی معلوم ہو جانی چاہیے تھی۔“

باپ نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ”بیٹا مجھے معلوم ہے کہ تم بے حس و حال ہو گئے لیکن مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ جب تمہیں یہ بتایا جائے گا کہ ہم سب لاہور جا رہے ہیں تو تم مجھے اپنی ملاقات کے متعلق تمام باتیں بتانا بھول جاؤ گے۔ اب تمہاری ماں کی موجودگی میں بھی میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں تمہاری باتوں سے خوش نہیں ہوں۔ تمہیں ایک سنہری موقع ملا تھا لیکن تم نے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا۔“

”آبا جی میں نے وہی کیا ہے جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ جب میں گیا تھا تو وہ سب مجھ سے اُٹھ کر ملے تھے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ جب میں اُن سے رخصت ہونے لگوں تو میرا قد و قامت اُن کی نگاہوں میں چھوٹا ہو جائے۔“

”سچ کہو تم نے اُنھیں بھی یہ بتا دیا تھا کہ تم ناول لکھنے کے لیے پیدا ہوئے ہو۔ اس لیے اور کچھ نہیں کرو گے۔“

قدسیہ نے فوراً مداخلت کی ضرورت محسوس کی اور کہا: ”اب بلاوجہ اپنا موڈ مت خراب کیجئے۔ اگر یوسف نے ایسی بات کہی ہوتی تو آپ کو اتنے ہی بتا دیتا۔ اس نے اپنی تعلیم کے بارے میں آپ سے جو وعدے کیے ہیں وہ سب پورے کیے ہیں اور تعلیم کے بعد میرا بیٹا جس کام میں ہاتھ ڈالے گا اُس میں کامیاب ہوگا۔ آپ اس کیلئے

”بکومت۔ یہ تم سب جانتے ہو اور اس کی ماں بھی جانتی ہے کہ یہ لڑکا رشیدہ کی لڑکی کے سوا کسی کو پسند نہیں کرے گا۔“

یوسف نے جلدی سے دادی کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”دادی خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔ کوئی سن لے گا تو کیا کہے گا۔“

”بے وقوف یہ کوئی انوکھی بات ہے۔ کوئی یہ تو نہیں کہے گا کہ لڑکی اور لڑکا ایک دوسرے کے ہم پلہ نہیں تھے۔“

”دادی جان جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے۔ آپ کو میرے لیے لڑکیاں پسند کرنے اور لڑکیوں کے لیے مجھے پسند کرنے کے سوا اور کوئی کام نہیں رہا۔ اگر امی جان مداخلت نہ کرتیں تو خدا جانے کتنی بار میری منگنی ہو چکی ہوتی۔“

”بے وقوف اس دفعہ وہ مخالفت نہیں کرے گی۔ وہ دل سے خوش ہے۔“ یوسف نے اپنا منہ دادی کے کان کے قریب لے جا کر کہا ”دادی جان اگر سارا زمانہ خوش ہو جائے تو بھی میں خوش نہیں ہوں۔ خدا کے لیے مجھے زندگی میں کوئی کام کرنے دیجئے۔ آپ اگر مجھے آبا جی سے گالیاں دلوانا چاہتی ہیں اور گھر آتے مہمانوں کی بے عزتی بھی کروانا چاہتی ہیں تو آپ اپنا شوق پورا کر لیجئے۔ وہ آپ کی مبارک تجویز سنتے ہی مجھے بلا لیں گے۔ اس کے بعد آپ میرا انکار اور ان کی گالیاں سنیں گی۔ شاید وہ دو چار تھپڑ مارنے کے لیے بھی تیار ہو جائیں۔ لیکن وہ بات نہیں ہوگی۔ آپ کو میری منگنی کے لیے کافی انتظار کرنا پڑے گا۔ چچی جان آپ بھی جانتیں دادی جان کے ساتھ، گالیاں سن لیں اور پھر مہمانوں کو بھی بلا لیں تاکہ انھیں یہ گلہ نہ ہے کہ دادی جان نے ان کا مقدمہ پوری طرح نہیں لڑا۔“

دادی نے تلملا کر کہا ”میں لعنت بھیجتی ہوں ان سب پر میں تمہارے ایک بال کے بدلے ان سب کو قربان کر سکتی ہوں۔ اگر تمہاری مرضی نہیں تھی تو تم نے مجھے پہلے کہہ

یوسف نے سرگوشی کے انداز میں جواب دیا ”دادی جان آپ آرام سے میری بات سنیں۔ آپ اس وقت اُوپر جا کر جو موضوع چھیڑنا چاہتی ہیں۔ اس سے بہت بدمزگی پیدا ہوگی۔“

”نالائق میں کون سا موضوع چھیڑنا چاہتی ہوں۔“
”دادی جان خدا کے لیے آمستہ ہو لیے۔ آبا جان آپ کی آواز سنیں گے تو آپ کو اُوپر بلا لیں گے اور پھر وہ تماشہ شروع ہو جائے گا۔ میرے ساتھ آئیے ہم چچی جان کے گھر میں آرام سے باتیں کریں گے۔“
دادی کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن یوسف اُسے ہاتھ سے پکڑے برابر کے مکان کے صحن میں لے گیا۔

چچی نے پوچھا ”کیا ہوا بیٹا دادی کو اس طرح کیوں لیے پھرتے ہو۔“
”چچی جی خدا کیلئے انھیں منع کریں یہ آدھی رات کے وقت تماشہ شروع کروانا چاہتی ہیں۔“
دادی نے یوسف کو کان سے پکڑ کر ہلکی سی چپت رسید کرتے ہوئے کہا۔
”بے وقوف کیا کہتے ہو۔“

”چچی جان خدا کے لیے دادی جان کو سمجھائیے، آبا جی تھکے ہوئے ہیں انھیں نیند بھی آرہی ہے اور غصہ بھی۔ دادی جان اُوپر جا کر وہی پرانا مسئلہ چھیڑنا چاہتی ہیں۔ پہلے تو آپ سب اس پر ہنسا کرتے تھے لیکن آج دادی جان کچھ زیادہ سنجیدہ معلوم ہوتی ہیں۔ اور مجھے ڈر ہے کہ جب میں کچھ کہوں گا تو آبا جان آپ سے باہر ہو جائیں گے۔“
دادی نے کھاٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا ”مکار کہیں کا۔ شرم نہیں آتی۔ بے وقوف میں اُس دن ہی سمجھ گئی تھی جب تم نرس تھیلی پر دکھ کر ڈاکوؤں سے مقابلہ کرنے کے لیے چلے گئے تھے۔“

چچی نے ہنستے ہوئے کہا ”دادی آپ کیا سمجھ گئی تھیں۔“

عبدالرحیم نے کہا "یار بلا وجہ کیوں ان اکبھنوں میں پڑتے ہو۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تم اس دعوت کو زیادہ سے زیادہ بیس افراد تک محدود کر دو۔ اس میں ہمارے گھر کے چیدہ چیدہ افراد آجائیں گے۔ اگر زیادہ تکلیف کرنا چاہتے ہو تو ڈاکوؤں سے بچ جانے کی خوشی میں سٹھائی بانٹ دینا بہتر ہوگا کہ سٹھائی دعوت سے پہلے تقسیم کر دی جاتے۔"

"میاں جی کیا یہ اچھا نہیں ہوگا کہ سٹھائی کی ایک ٹوکری میں تھانے میں بھی بھیج دوں؟"

"میرا خیال ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے میاں صاحب لیکن آپ کے خاندان کے تمام مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے دعوت میں شریک ہونے چاہئیں۔ میرے پاس پچاس آدمیوں کا انتظام ضرور ہوگا۔"

تیسرے دن یوسف باہر کی حویلی کی ایک دیوار کے ساتھ ٹکے ہوئے تختے پر پستول کے نشانہ کی مشق کر رہا تھا اور اس کا والد، انسپٹر عبدالعزیز اور پولیس کا ماہر نشانہ باز جسے عبدالعزیز ساتھ لے کر آیا تھا تعجب سے اسے دیکھ رہے تھے جب اس نے یکے بعد دیگرے چند گولیاں نشانے پر لگائیں تو نشانہ باز نے کہا "یوسف صاحب آپ نے انسپٹر صاحب کو یہ کیوں نہیں بتایا تھا کہ آپ اس کام میں بھی ماہر ہیں۔"

یوسف نے جواب دیا "معاف کیجئے آج شروع کرنے سے پہلے میں آپ کو یہ بتانا بھول گیا تھا کہ پرسوں جتنی گولیاں میں اس پستول کے ساتھ لایا تھا انھیں استعمال کر کے مجھے کافی مشق ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ میں کبھی کبھی آج کی کارروائی چلا کر بھی دیکھا کرتا ہوں۔ ریوالور اور بندوق چلانے سے پہلے میں نے ہوائی بندوق کے ساتھ بہت مشق کی جو آج نے مجھے ساتویں جماعت میں لاکر دی تھی۔"

عبدالعزیز نے یوسف سے پوچھا "یوسف اب تمہاری چھٹیاں کتنی رہ گئی ہیں۔"

یوسف نے قریب بیٹھتے ہوئے کہا "دادی جان میری مرضی ہوگی تو سب سے پہلے آپ کو ہی کہوں گا۔" دادی نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "بیٹا خدا سے ہر اچھی چیز میں تمہارے لیے مانگا کرتی ہوں اور میں یہ دعا کرتی ہوں جو لڑکی تمہیں پسند آئے اُس جیسا دنیا میں کوئی نہ ہو۔ یہ امینہ جیسی لڑکیاں اُس کے قریب کھڑی ہوں تو لوگ کہیں کہ یہ اُس کی نوکرانی ہے۔ میں تو یہی سمجھتی رہی تھی کہ تم اس لڑکی کو پسند کر چکے ہو۔"

"دادی جان آپ سونے سے پہلے میرے لیے دعا کریں گی نا۔"

"کیوں نہیں کروں گی۔ تمہارے لیے دعا کیے بغیر مجھے نیند کیسے آسکتی ہے۔"

"چلتے میں آپ کو چھوڑ آؤں۔"

"جدا زیادہ عوشام نہ کرو۔ میں اپنا راستہ دیکھ سکتی ہوں۔" دادی نے روکھے پن سے کہا اور اٹھ کر دوسرے مکان میں چلی گئی۔

یوسف کی چچی نے کہا "خدا یا تیرا شکم ہے ورنہ میں تو محسوس کر رہی تھی کہ آج کوئی آندھی آرہی ہے۔ یوسف تم بہت عوش قسمت ہو، اتنا کچھ کہہ جاتے ہو لیکن دادی بُرا نہیں مانتیں۔"

"چچی جان بات یہ ہے کہ دادی جان ہی بہت اچھی ہیں۔"

صبح یوسف کے گھر سے رخصت ہوتے وقت عبدالکریم نے کہا۔

"میاں جی میں چاہتا ہوں کہ آپ کے ساتھ آپ کے سارے گاؤں کے لوگوں کی دعوت کا انتظام کروں۔ میرے گاؤں کی تھوڑی سی آبادی ہے۔ انھیں بھی بلا لیا جائے گا۔ مسلمانوں کے لیے تو کھانا پکانے والے نانی کا انتظام ہو جائے گا۔ لیکن دوسروں کے لیے جس سکھ یا ہندو باورچی کا انتظام کرنا پڑے گا۔"

”جی میری چھٹیاں کوئی پندرہ دن تک ختم ہو جائیں گی لیکن آج جی کی تبدیلی لاہور ہو چکی ہے۔ اس لیے مجھے چند دن پہلے ہی یہاں سے جانا پڑے گا۔“

میاں عبدالرحیم نے کہا ”انسپیکٹر صاحب اگر اسے یہاں کوئی کام ہو تو میں اپنی رخصت میں دو چار دن کا اضافہ کر داسکتا ہوں۔“

”میاں صاحب کوئی خاص کام نہیں۔ میرے دل میں خیال آیا تھا کہ یوسف جیسے نوجوان کو ہر وہ کام آنا چاہیے جس کا بیسویں صدی کے نوجوانوں کے لیے جاننا بہت ضروری ہے۔ میرا خیال تھا کہ یوسف کو موٹر چلانا بھی سیکھ لینا چاہیے۔ اگر یہ چند دن میرے پاس آجایا کرے تو اس کے لیے کار اور ڈرائیور کا انتظام ہو سکتا ہے۔ آپ کو اس بات پر حیران نہیں ہونا چاہیے کہ میرے پاس کار کہاں سے آگئی۔ وہ میری بیوی کو جیز میں ملی تھی جس کا اس کے سوا کوئی مصرف نہیں کہ کوئی ڈرائیور لگ سیکھنا چاہے تو میں اسے دے دیا کروں مجھے ڈرائیور کو بھی تنخواہ نہیں دینا پڑتی۔ وہ میرے سسر کا پرانا ملازم ہے اور تنخواہ بھی وہیں سے حاصل کرتا ہے۔“

فضل دین حویلی میں داخل ہوا۔ اور ایک ہی نظر میں صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد اُس نے محسوس کیا کہ یوسف اور اُس کے والد کھانے کے متعلق بھول چکے ہیں۔ بٹونے اسے دیکھ لیا اور آگے بڑھ کر پوچھا ”کیوں فضل دین خیر تو ہے؟“

فضل دین نے جواب دینے کی بجائے سوال کیا ”انسپیکٹر صاحب کب آتے ہیں؟“

ابھی تھوڑی دیر ہوئی ہے وہ آتے ہی یوسف صاحب کی نشان بازی دیکھنے لگ گئے تھے۔ تمہیں معلوم ہے کہ مجھے بندوق ملنے والی ہے اور یوسف صاحب کہتے تھے کہ اگر میاں عبدالکریم تمہاری مدد کرنے پر تیار ہو گئے تو تمہیں اور ہریال سنگھ کو بندوق کا لائسنس مل جاتے گا۔“

”انسپیکٹر کب تک یہاں ٹھہریں گے؟“

”معلوم نہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ جلدی چلے جائیں گے۔“

فضل دین نے کہا ”سنو تو اگر ایک کام کرو تو ہمارے ٹھیکے دار صاحب تم پر بہت خوش ہوں گے اور انعام بھی دیں گے۔“

”یار کام تو سناؤ۔“

فضل دین نے کہا ”دیکھو بلو تم بہت تیز بھاگتے ہو۔ تم فوراً ہمارے گھر پہنچ کر میاں صاحب کو اطلاع دو کہ انسپیکٹر صاحب یہاں آتے ہوئے ہیں اگر وہ اسی وقت یہاں آجائیں تو انہیں دعوت میں شریک کیا جاسکتا ہے۔ جھوٹ موٹ تو کوئی بیغام میں بھی دے دوں گا لیکن شاید وہ مانیں یا نہ مانیں۔“

دیکھو تو جلدی کرو۔ میاں صاحب تمہیں انعام دیں گے۔“

بلو دواں سے کچھ کے بغیر بھاگ نکلا۔

حویلی میں جمع ہونے والے بڑے انہماک سے نشان بازی دیکھ رہے تھے۔ یوسف کے انٹرکٹر کے علاوہ انسپیکٹر عبدالعزیز اور یوسف کے والد نے بھی باری باری چند فائر کیے اور اختتام پر انسپیکٹر نے یوسف سے کہا ”میرا خیال ہے اب بارود ضائع کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ آپ اس امتحان میں پاس ہو گئے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ڈرائیور لگ سکنے میں بھی آپ کو دیر نہیں لگے گی۔ یہاں آس پاس کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آتی ورنہ اپنی کار میں یہاں بھیج دیتا۔ اب دو چار دن کے لیے تمہیں گورڈا سپور آنا پڑے گا۔“

عبدالکریم بانپتا ہوا حویلی میں داخل ہوا اور اُس نے آگے بڑھ کر انسپیکٹر سے مصافحہ کرنے کے بعد یوسف سے شکایت کے لمحے میں کہا ”دیکھتے آپ نے مجھے اطلاع ہی نہیں دی کہ انسپیکٹر صاحب یہاں تشریف لاتے ہوئے ہیں۔“

یوسف کے والد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”یار پریشانی کی کوئی بات نہیں جو بات آپ کنا چاہتے تھے وہ اب بھی کہی جاسکتی ہے۔“

عبدالعزیز نے کہا "میں عام حالات میں شاید نہ رکتا لیکن میاں صاحب اگر اس لڑکے کو اس قدر نیکی کا مستحق سمجھتے ہیں تو میں ان کی دعوت سے انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن میں کھانا کھاتے ہی چلا جاؤں گا۔"

ڈیڑھ گھنٹہ بعد یہ سب رگ عبدالکریم کے گھر میں دعوت کھا رہے تھے۔ عبدالکریم نے بیس بچیں ہندو اور سکھ مہمانوں کی دعوت کا انتظام ہر دیال سنگھ کے گھر کر وار کھا تھا۔ جب انسپٹر عبدالعزیز دعوت سے فارغ ہو کر حویلی سے باہر نکلا تو اس پاس کے دیہات کے کئی آدمی اسے سلام کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تھے اور جب وہ روانہ ہوا تو عبدالکریم نے چپکے سے ایک طرف ہو کر پانچ روپے کا نوٹ بلو کو تھما دیا اور اس کے بعد فضل دین اور ہر دیال سنگھ وہاں جمع ہونے والوں میں مٹھائی تقسیم کرنے لگے۔ دس دن بعد صبح نو بجے یوسف کے والدین اپنے بال بچوں سمیت لاہور جانے والی گاڑی پر سوار ہو رہے تھے۔ گھر کا سامان ان کا ملازم ٹرک پر دو گھنٹے پہلے لے جا چکا تھا۔ اسٹیشن پر ان کے اپنے گاؤں اور اس پاس کے دیہات کے کئی لوگ جن میں خواتین بھی تھیں۔ انھیں نصرت کرنے آئے ہوئے تھے۔ عورتیں باری باری قدسیہ سے گلے مل کر یہ تاکید کر رہی تھیں "دیکھو آج ہمیں بھول نہ جانا ہر دوسرے تیسرے مہینے پھر حاضر رکھنا۔ جب اطلاع ملا کرے گی تو ہم سب آپ کو لینے کے لیے اسٹیشن پر آیا کریں گے" سردار بیلا سنگھ کی بیوی عبدالرحیم سے کہہ رہی تھی "بھائی جی ہماری بہن کو وہاں قید نہ کر دینا۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے ان کو یہاں بھیج دیا کرنا ورنہ قدسیہ بھائی کی تمام سہیلیوں کو لے کر میں کسی دن لاہور پہنچ جاؤں گی"

گاڑی چلنے میں ابھی دس منٹ تھے کہ اسٹیشن پر عبدالکریم، رشیدہ، امینہ اور اس کا بھائی علی اکبر نمودار ہوئے۔ ان کے پیچھے فضل دین اور ہر دیال سنگھ سامان اٹھائے

انسپٹر نے پوچھا "کیا بات ہے عبدالکریم صاحب ہم نے آپ کے دو آدمیوں کے لیے اسلحہ کے لائسنس حاصل کرنے کا بندوبست کر لیا ہے۔ ایک فضل دین ہے اور دوسرا ہر دیال سنگھ۔ آپ کے گھر کی حفاظت کے لیے کسی اور کو اسلحہ کی ضرورت ہو تو وہی سی صاحب اس کے لیے بھی منظوری دے دیں گے"

صاحب بہت شکریہ، یوسف نے بتایا تھا کہ اسلحہ کی ضرورت میں ان کے لیے اسلحہ خریدنے کا بندوبست ہو گا۔ میں نے اس وقت کہہ دیا تھا کہ میں بوری قیمت داکروں گا۔ لیکن اس وقت ایک اور درخواست لے کر آیا ہوں اور وہ یہ ہے کہ آپ میرے گھر کھانا کھائیں"

عبدالعزیز نے جواب دیا "اگر میں نے ٹھہرنا ہوتا تو آتے ہی یوسف کو کہہ دیتا کہ کھانا کھا کر جاؤں گا لیکن مجھے ذرا جلدی ہے"

عبدالکریم نے کہا "جناب کھانے کا وقت تو ہونے والا ہے اور کھانا تیار ہے۔ یوسف کے خاندان کے سب لوگ وہاں تشریف لائیں گے۔ اگر آپ دعوت میں شریک ہو جائیں تو مجھے بہت خوشی ہوگی"

عبدالرحیم نے کہا "یہ دعوت اس خوشی میں ہو رہی ہے کہ ٹھیکیدار صاحب کو ایک مصیبت سے نجات ملی ہے۔ اگرچہ سنگھ ڈاکو کا پکڑے جانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اگر کوئی خاص بات مانع نہ ہو تو آپ ان کی دعوت ضرور قبول کریں"

یوسف نے کہا "یہ دونوں گاؤں میں آج مٹھائی بھی تقسیم کر وار ہے میں اور انھوں نے ایک اور بڑا اچھا کام کیا ہے اور وہ یہ کہ ہر دیال سنگھ کا لڑکا جگجیت سنگھ جس کے متعلق آپ نے بھی حکومت سے سفارش کی ہے کہ اسے تعلیم دلوائی جائے اور پھر اسے پولیس میں ملازمت دلوائی جائے۔ جب یہ بات میں نے میاں صاحب کو بتائی تھی تو انہوں نے فوراً کہا تھا کہ اس کی تعلیم کا سارا خرچہ میں برداشت کر دوں گا"

امرتسر میں عبدالکریم اپنے بال بچوں کے ساتھ اتر گیا لیکن جاتے جاتے اُس نے عبدالرحیم اور اُس کے بال بچوں کے لیے سوڈا واٹر کے علاوہ چند درجن کیلے اور سیب رکھوا دیے اور گاڑی کی روانگی تک خواتین آپس میں باتیں کرتی رہیں جب گاڑی وہاں سے واپس ہوئی تو قدسیہ اٹھ کر ایک گھر کی کے سامنے بیٹھ گئی۔ اگلے اسٹیشن پر یوسف نے آکر پوچھا۔

”امی جان آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ امینہ اور اُس کی ماں نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔“

ماں نے جواب دیا ”بیٹا میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن ان لوگوں کو اتنا تکلف نہیں کرنا چاہیے تھا۔ پانی تو خیر ہم نے پینا ہی تھا لیکن وہ کیلے اور سیب بھی زبردستی یہاں رکھوا گئے ہیں اور ماں بیٹی اس بات پر بھی اصرار کرتے تھے کہ ہم کسی دن لاہور سے امرتسر آئیں اور ایک دو دن ان کے گھر میں رہیں۔“

یوسف نے جواب دیا ”امی آپ پریشان نہ ہوں لاہور میں ہمیں اور بہت سے کام ہوں گے اتنی دیکھنے والی جگہیں ہوں گی کہ آپ کسی اور شہر کا رخ کرنا پسند نہیں کریں گی۔ گاڑی نے دسل دی اور یوسف اپنے ڈبے میں چلا گیا۔“

اگلے دن یوسف اپنی امی کو لاہور کی تاریخی عمارت دکھا رہا تھا۔ دودن میں وہ شاہی مسجد شاہی قلعہ، جہانگیر کا مقبرہ اور چڑیا گھر دیکھ چکے تھے۔ تیسرے دن وہ شالامار باغ کی سیر کر رہے تھے اور کھانا اپنے ساتھ لاتے ہوئے تھے۔ قدسیہ گیم کو لاہور کی ہر اچھی عمارت میں بھی اپنے بیٹے کی کوئی نہ کوئی خوبی نظر آتی تھی۔

شالامار باغ میں وہ کھانا کھانے کے بعد ایک جگہ درختوں کی گھنی چھاؤں میں سستار ہے تھے کہ قدسیہ نے اچانک کہا ”بیٹے جب میں شیش محل دیکھ رہی تھی تو

آرہے تھے۔ عبدالرحیم نے حیران ہو کر پوچھا ”میاں صاحب آپ اب کہاں جا رہے ہیں؟“ جی رات اچانک بچوں نے پھٹیوں کے باقی دن امرتسر میں گزارنے کا پروگرام بنایا تھا۔ زیادہ خوشی تو اس بات کی تھی کہ وہ امرتسر تک آپ کے ساتھ جائیں گے۔ رشیدہ تو یہ امید بھی لے کر آتی ہے کہ آپ ایک دن امرتسر رکھنے پر رضا مند ہو جائیں گے۔“

”یار اس وقت تو ممکن نہیں، پھر کبھی سہی۔“ عبدالکریم کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن گاڑی نے سٹیج بجائی اور امینہ اور اس کی ماں انٹر کلاس کے زمانہ کپارٹمنٹ کی طرف بھاگیں، جہاں قدسیہ سیکم اور اس کی لڑکی انھیں شاخوں سے ہلارہی تھیں عبدالکریم اور عبدالرحیم یوسف کے ساتھ اُس سے پچھلے کپارٹمنٹ میں بیٹھ گئے۔ گاڑی چل پڑی اور قدسیہ جو ہر وقت مسکرانے کے لیے بیتاب رہتی تھی اب غلاف معمول سنجیدہ اور مغموم نظر آرہی تھی۔

امینہ نے پوچھا ”خالہ جان کیا بات ہے۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ ”میں ٹھیک ہوں بیٹی۔“ قدسیہ نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے گھر چھوڑتے ہوئے ایک اکچھن سی محسوس ہوتی ہے اور گاؤں سے نکلتے وقت مجھے یہ خوف محسوس ہوتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں یہ درخت اور کھیرت دوبارہ نہ دیکھ سکوں۔“ رشیدہ بولی ”بہن جی! اصل میں آپ سفر کی تیاری میں تھک گئی ہیں۔ ویسے گھر سے نکلتے وقت ایسی باتیں ہر آدمی کے ذہن میں آتی ہیں۔ آپ لیٹ جائیں میں آپ کا

سر دباؤں ہوں۔“

”رشیدہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”نہیں بہن لیٹ جاؤ کافی جگہ ہے۔“

رشیدہ نے اُسے بازوؤں سے پکڑ کر لٹا دیا اور خود ذرا ایک طرف ہٹ کر

بیٹھ گئی۔

ایک اہم پروگرام شروع ہو چکا ہوگا۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ جنہیں آپ دیکھنے کے لیے بے قرار ہیں۔ خود مجھے تلاش کر لیں گے۔ سردست آپ صرف یہ دعا کیا کریں کہ وہ لوگ ہمیں صرف اسی صورت میں ملیں جب کہ ہماری اور ان کی کوئی بہتری ہو۔“

ماں نے کہا ”بیٹا میں نے صرف ایک بچی اور ایک معمر خاتون کے متعلق تمہارے منہ سے جو باتیں سُنی ہیں اُن سے میں جو کم از کم توقع رکھ سکتی ہوں۔ وہ یہ ہے کہ اُن کے خاندان کا ہر فرد ایک اچھا انسان ہوگا۔“

”امی جان! جب آپ کسی کو اچھا سمجھیں گی تو میں سوچے سمجھے بغیر اسے اچھا سمجھنے لگ جاؤں گا۔ لیکن اگر آپ نے ابھی سے دادی جان کی طرح سوچنا شروع کر دیا۔ تو مجھے بڑی اکھن ہوگی۔ وقت آنے پر میری ہر بات آپ کی خواہش کے عین مطابق ہوگی۔“

ماں نے کہا ”بیٹا میں تمہیں دادی جان کی طرح پریشان نہیں کروں گی۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے اس بات سے خوف محسوس ہوتا ہے کہ وقت بڑی جلدی گزر جاتا ہے اور ہمارے سارے خواب ادھورے رہ جاتے ہیں۔ بیٹا! جب مجھے کبھی اچانک یہ خیال آتا ہے کہ کسی دن میرا وقت بھی گزر جائے گا تو میں تمہارے متعلق بہت بے چین ہو جاتی ہوں۔ میں اس بات سے بھی خوف کھاتی ہوں کہ تم میرے بعد کوئی غلط فیصلہ قبول کرنے پر مجبور نہ ہو جاؤ۔“

”امی جان خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کریں۔ میں آپ کی پسند کے خلاف کوئی فیصلہ قبول نہیں کر سکتا اور میں اتنا سمجھ سکتا ہوں کہ آپ کیا پسند اور کیا ناپسند کرتی ہیں۔“

”بیٹا مجھے تمہاری عقل پر بھروسہ ہے اور میرے دل میں کبھی یہ خیال نہیں آنا چاہیے کہ تم اپنے متعلق کوئی غلط فیصلہ مت قبول کرنے پر تیار ہو جاؤ گے لیکن میں ایک ماں ہوں نا

مجھے خیال آیا تھا۔ کہ یہاں کبھی شہزادے اور شہزادیاں رہتی ہوں گی۔ بیٹا! لاہور دیکھ کر تم نے تو یہ کبھی نہیں سوچا کہ اگر تم کسی بادشاہ کے گھر پیدا ہوتے تو تمہارے والدین تمہارے لیے دنیا کی سب سے خوب صورت شہزادی تلاش کرتے۔“

یوسف نے زخم خوردہ سا ہونے کی طرف دیکھا اور کہا ”امی جان یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ اگر آپ کسی جھوٹے پٹری میں ہوتیں تو بھی مجھے کسی کے محل پر شک نہ آتا۔“ اور ان الفاظ کے ساتھ اُس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

ماں نے منہم لہجے میں کہا ”ارے بیٹا تم آزرده ہو گئے میں تو حاق کر رہی تھی لیکن بیٹا میں یہ دعا ضرور کرتی ہوں کہ میری بیوی جیسی ہوجس پر شہزادیاں رشک کریں۔ تم نے ایک دن کہا تھا کہ کسی دن جانہنہ والوں کا ایڈریس معلوم کرنے کی کوشش کرو گے اور پھر انھیں خط لکھ گے۔ لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں ان کا خیال نہیں آیا۔“

”امی جان جب مناسب وقت آئے گا تو میرے لیے ان کا ایڈریس معلوم کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔“

”بیٹا مناسب وقت کب آئے گا؟“

”امی جان جب میں اپنی زندگی کی اہم ذمہ داریاں پوری کر لوں گا! میں پہلے اپنی تعلیم مکمل کروں گا۔ پھر مجھے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی ضرورت ہوگی اور اس کے بعد آپ اطمینان سے شہزادیاں تلاش کر سکیں گی۔“

”بیٹا تمہارے لیے شہزادیاں اپنے گھروں میں بیٹھی نہیں رہیں گی۔ تم کوئی ایسا طریقہ سوچ سکو گے کہ میری ان کے گھر تک رسائی ہو سکے؟“

”امی جان اگر آپ اس بات پر خوش ہو سکتی ہیں تو میں بی اے فائنل کے دوران آپ کو ان کا ایڈریس معلوم کر دوں گا۔ زیادہ بہتر تو یہ ہوتا کہ میں بی اے کا امتحان پاس کر لیتا تو آپ اس مسئلے کی طرف توجہ دیتیں۔ لیکن چند مہینوں میں میری زندگی کا

یہ ہندوؤں کے جارحانہ عزائم کے خطرات کو محسوس کرتا تھا۔ وہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں واشگاف الفاظ میں یہ کہا کرتا تھا کہ پاکستان کا حصول کسی کی پسند یا ناپسند کا مسئلہ نہیں ہے یہ برصغیر کے مسلمانوں کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ کانگریس کی گزشتہ چند برس کی تاریخ اُسے ازبر تھی۔ وہ مسلم اقلیت کے صوبوں میں کانگریسی حکومت کے مظالم کی داستانیں بیان کرتا تو اُسے پڑھنے یا سننے والے ایسا محسوس کرتے کہ کچھ دنوں کی داستانیں اُن کی آنکھوں کے سامنے دہرائی جا رہی ہیں اُس کے والد اخباروں میں اُس کی تحریروں پڑھ کر اور اُن کی تعریف میں لوگوں کی باتیں سن کر بہت خوش ہوا کرتے تھے لیکن وہ اس بات پر خفا ہو جایا کرتے تھے۔ کہ میرے لڑکے نے آگے بڑھنے کے بہترین مواقع ضائع کر دیے ہیں۔ اب بھی وہ چاہے تو فوج اور پولیس میں اُس کے لیے ترقی کے راستے کھلے ہیں لیکن یہ بات اُس کے ذہن میں نہیں آتی کہ دنیا میں روزی کمانے کے لیے کچھ کام بھی کرنا پڑتا ہے اور جب کبھی یوسف کی موجودگی میں اس قسم کی بحث شروع ہو جاتی تو وہ نرمی سے یہ کہہ کر بحث ختم کر دیتا۔ "ابا جی! اس وقت ہماری پہلی ضرورت پاکستان ہے۔ جب پاکستان بن جائے گا تو مجھے چھوٹے سے چھوٹا کام کرنے میں بھی روحانی تسکین حاصل ہوگی۔ لیکن اگر میں ہندو کی غلامی میں رہ کر لاکھوں کمالوں تو بھی خوشحالی کی وہ زندگی میرے لیے موت سے بدتر ہوگی۔ ابا جی! جب پاکستان بن جائے گا۔ تو میں آپ سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی سب سے بڑی توقع پوری کر سکوں گا۔"

امتحان سے چند ہفتے قبل ایک اخبار میں "راہ نجات" کے عنوان سے لاہور کے ایک اخبار نے اُس کی تصویر کے ساتھ اس کا ایک طویل مضمون تین قسطوں میں شائع کیا۔ اخبار کے ایڈیٹر نے مضمون نگار کے بارے میں خوب تعارفی سطور لکھی تھیں۔ ان میں اُس کے گاؤں اور خاندان کا خاص طور پر ذکر کیا تھا اور یہ بھی لکھا تھا کہ یہ ہونہار

اور میرے دل میں بُرے بُرے خیالات آتے رہتے ہیں۔
یوسف نے کہا "امی جان، میرے متعلق آپ اپنے دل میں بُرے خیالات نہ لایا کریں۔ میں جو کچھ دنیا میں کرنا چاہتا ہوں۔ اُس کے لیے بڑی ہمت کی ضرورت ہے اور مجھے یقین ہے کہ میں آپ کی دعاؤں سے برسوں تک ہمت حاصل کرتا رہوں گا۔
امی جان! مجھے یہ بھی یقین ہے کہ آپ سو برس تک میرے لیے دعا کرنے کے لیے زندہ رہیں گی۔ آپ کے تمام خواب پورے ہوں گے اور میں اپنے مستقبل کے متعلق جو خواب دیکھا کرتا ہوں آپ ان سب کی تعبیریں دیکھیں گی۔"
"بیٹا! تم پھر مجھے دادی کی طرح سوچنے کا طعنہ دو گے لیکن یہ مان لو کہ میرا سب سے پیارا خواب یہی ہے کہ میں ایک بار اپنی ہونے والی بہو کو دیکھ لوں۔"
"امی جان! آپ صرف یہ دعا کیا کریں کہ وہ جس کا آپ کو انتظار ہے آپ کی بہترین توقعات پوری کر سکے اور ہم سب کے لیے اللہ کی رحمتیں لے کر آئے ابھی یہ فیصلہ نہ کریں کہ وہ کون ہے اور کہاں ہے، بزرگوں کو ایسے معاملات اپنی دعاؤں کے بعد اللہ پر چھوڑ دینے چاہئیں۔ چلیں اب دیر ہو رہی ہے۔"

کالج کھلنے کے بعد یوسف کچھ وقت اپنے امتحان کی تیاری کے لیے نکال لیتا تھا۔ لیکن جو وقت وہ پہلے افسانوی ادب کا مطالعہ کرنے پر صرف کیا کرتا تھا وہ اب تحریک پاکستان کی نذر ہو رہا تھا۔ وہ اخبارات اور رسائل کے لیے مضامین بھی لکھا کرتا تھا اور کالج کے مباحثوں میں حصہ بھی لیا کرتا تھا۔ وہ کالج کے سینئر طلباء کے اُس گروہ میں شامل ہو چکا تھا جن کے ذہنوں پر علامہ اقبال کے افکار چھائے ہوئے تھے۔ وہ جس قدر تاریخ پڑھ چکا تھا اسی قدر شدت سے وہ مسلمانوں کے مستقبل کے

طالب علم ہشتی رانی، پیرا کی اور شاہ سواری میں بھی مہارت رکھتا ہے۔ تحریک پاکستان کے ساتھ اُس کی دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ جب کالج سے فرصت ملتی ہے تو وہ پاکستان کے رضا کاروں کے ساتھ قرب و جوار کے دیہات میں تقریریں کرنے چلا جاتا ہے۔ جس دن مضمون کی آخری قسط شائع ہوئی اُس دن اُس نے اپنی ماں سے کہا "امی جان! مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ کی ایک بہت بڑی خواہش جلد پوری ہونے والی ہے"

ماں نے کہا "بیٹا! میں تمہارے مضمون بار بار پڑھا کرتی ہوں کہیں تم یہاں بھی وہی نالائق کر گئے جو تم نے گاڑی میں کی تھی۔ یہ پڑھ کر تو کسی کو معلوم نہیں ہو سکے گا کہ ہم لاہور میں کہاں رہتے ہیں"

"امی جان! میرا کالج اس گھر سے زیادہ مشہور ہے۔ اگر کسی نے صرف میرا نام اور اسلامیہ کالج لکھ کر بھی بھیج دیا تو مجھے خطر مل جاتے گا"

ایک دن عبدالکریم اور اُس کی بیوی اُن کے گھر مٹھائی لے کر آئے۔ قدسیہ نے کہا "ہن مٹھائی کا شکریہ لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ ہمیں کس بات کی مبارک باد دینی چاہیے"

رشیدہ نے جواب دیا "ہن یہ مٹھائی ہم لاہور میں اپنی نئی کوٹھی کی بنیاد رکھنے کی خوشی میں تقیم کر رہے ہیں اور اُس کے مکمل ہوتے ہی امرتسر سے یہاں آجائیں گے جو زمین ہم نے خریدی تھی وہ دو کوٹھیوں کے لیے کافی ہے۔ یہ جو کوٹھی ہم نے بنوانی شروع کی ہے امید ہے کہ ہوگی اور دوسری اکبر کے لیے بنے گی"

"قدسیہ نے کہا "ہن یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ ہمارے قریب آجائیں گی"

رشیدہ نے کہا "امید ہے کہ اتنے امید سے دو وعدے کیسے تھے۔ ایک یہ کہ

جب وہ میٹرک کر لے گی تو ہم لاہور میں اپنی نئی کوٹھی میں آجائیں گے اور دوسرا یہ کہ اُس کا انعام ایک نئی کار ہوگی۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ جب میں اداس ہوا کروں گی تو امید سے کہا کروں گی "بیٹی چلو تمہاری خالہ سے مل آئیں"۔ قدسیہ نے بڑی کوشش کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہا "ہن اگر خدا توفیق دے تو ہمیں بچوں کی ہر اچھی خواہش پوری کرنی چاہیے" "ہن امید ہے کہ موٹر چلانے کا بے حد شوق ہے۔ اگر امتحان سر پر نہ ہوتا تو آج وہ ہماری موٹر چلا کر یہاں لاتی۔ ہمارا نوکر فضل دین کہتا تھا کہ انسپکٹر عبدالعزیز صاحب نے یوسف کو ڈرائیونگ سکھانے کا انتظام گورداسپور میں کر دیا تھا اور وہ یہاں آنے سے پہلے کافی حد تک سیکھ چکے ہیں"

"ہن! یوسف ہر کام بہت جلد سیکھ جاتا ہے۔ آپ نے اسے دریا میں کشتی چلاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اُس نے اتنی مہارت پیدا کر لی ہے کہ ملاح بھی ذنگ رہ جاتے ہیں"

رشیدہ نے کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد واپس جانے کا ارادہ کیا لیکن قدسیہ نے اُسے یہ کہہ کر روک لیا "ہن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں آپ کو کھانے کے وقت رخصت کر دوں۔ جاؤ صغریٰ بیٹھک میں جا کر امید کے ابو سے کہو کہ آپ کو کھانے کے لیے رکنا پڑے گا"

باب - ۱۵

گزشتہ چند ہفتوں میں نسرین کئی بار فمیدہ کو کوئٹہ سے امرتسر تک اپنے سفر کے واقعات سننا چکی تھی۔ فمیدہ کے لیے یہ ایک ایسی داستان تھی جس کے بار بار دہراتے جانے سے اُس کی دل چسپی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا وہ لکھنے پڑھنے سے فارغ ہونے کے بعد جب کبھی اچھے موڈ میں ہوتی تو کہتی۔

”ہاں نسرین سناؤ نا تمہارے یوسف بھائی نے اُس دیو قامت اور بد تمیز ملاح کو ایک ہی تھپڑ سے کیسے چپت کر دیا تھا؟ اور تمہارے یوسف بھائی نے گاڑی میں اُس خوفناک صورت باگڑی کی کیسے مرمت کی تھی۔ اچھا نسرین یہ بتاؤ کہ اگر تمہیں وہ سانپ نظر آجاتا جسے تمہارے بھائی جان یوسف نے درخت کے ساتھ لٹکا ہوا دیکھا تھا تو پھر تم کیا کرتیں؟“ اور نسرین ان واقعات کو ایک بار پھر دہراتے ہوئے اپنی ذہانت سے اُن کی دل چسپی میں کوئی نہ کوئی نیا اضافہ کر دیتی۔

عام طور پر دونوں بہنیں بالائی منزل کے کشادہ کمرے میں رہا کرتی تھیں۔ فمیدہ خود بھی محنتی تھی اور نسرین سے بھی محنت کر دیا کرتی تھی۔ لیکن رات کے وقت پڑھائی ختم کرنے کے بعد انھیں تفریحی گفتگو کرنے کا موقع ملتا تو ادھر ادھر کے واقعات، اخباری یا

ریڈیو کی خبروں کے متعلق مختصر سی گفتگو کے بعد وہ یوسف کا ذکر شروع کر دیتیں۔ ایک دن نسرین نے کہا ”آپا جان! ہم نے سکول کا کام کر لیا ہے اور اب چھٹیاں ختم ہونے والی ہیں۔ اگر آپ کو بھائی جان یوسف کے پسند کی کوئی چیز پڑھنے کا شوق ہو تو وہ آپ کو مل سکتی ہے۔“

”کہاں سے مل سکتی ہے؟“

”آپا جی! بھائی جو تھیلہ بھول گئے تھے۔ اُس میں چار کتابیں ہیں جن کے متعلق میرا خیال ہے کہ وہ کوئی اچھے ناول ہوں گے۔ ایک بڑے سائز کی کاپی پر اُن کے ہاتھ کی تحریر ہے۔ آپا جان! میں آپ سے پوچھتی ہوں کہ ایسی کتاب جو کسی کی امانت ہو اُس کی اجازت کے بغیر پڑھنا گناہ ہے نا؟“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی؟“

”آپا جی! میں نے ان کا تھیلہ کھول کر کاپی کے چند صفحے پڑھے تھے اور پھر مجھے احساس ہوا تھا کہ جب بھائی جان کو یہ معلوم ہوگا کہ میں چوری چھپے ان کی کتاب پڑھتی رہی ہوں تو وہ بہت حفا ہوں گے اور شاید خدا بھی مجھ سے خوش نہ ہو۔“

”کیسے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔“ نسرین تمہارے بھائی جان اگر اتنے اچھے ہیں تو انہوں نے کوئی اچھی بات ہی لکھی ہوگی۔ اس لیے اگر انہوں نے تمہیں پڑھنے سے منع نہیں کیا تھا، تو تم پڑھ سکتی ہو۔“

آپا جان! بھائی جان کی باتیں سمجھنا مجھے ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ شاید آپ بہتر سمجھ سکیں۔“

”اچھا! نکالو وہ مسودہ کہاں ہے؟ میں دیکھتی ہوں تمہارے بھائی کو لکھنا بھی آتا ہے کہ نہیں۔“

”آپا جان! ابھی لاتی ہوں۔“ نسرین بھاگتی ہوئی عجبی کمرے میں گئی اور وہاں سے

پڑھ کر سناتی ہوں“

نسرین نے اُس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا۔

”آپا جان! خدا کیلئے مجھے ضرور سناتے“ اور فہمیدہ اپنی بہن کو مستقبل کے ایک ناول نگار کی تحریر پڑھ کر سننا رہی تھی۔



”میں اپنے ماضی کے رستوں پر نظر دوڑاتا ہوں تو مہینوں اور برسوں کی دستوں سے آگے، میرے پاؤں کے نشان زندگی کے اُس کنارے تک پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں سے میرے شعور کی ابتدا ہوتی ہے۔ سپنے اور حقیقتیں آپس میں گڈ بٹھونے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ اُس دور میں ہواؤں کی لرزش سے گاؤں کے ارد گرد پھیلے ہوئے درختوں میں جو سرسراہٹ پیدا ہوتی تھی وہ میرے لیے جدا جدا راگنیوں کی حیثیت رکھتی تھی۔“

جب ہم رات کے وقت کھیلا کرتے تھے تو میں ادھر ادھر دیکھے بغیر یہ سمجھ جایا کرتا تھا کہ میں نکلاں درخت کے نیچے یا قریب کھڑا ہوں۔

میں نے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہوش سنبھالا تھا جسکے شمال مشرق میں بلند برفانی پہاڑوں کا ایک طویل سلسلہ دکھائی دیتا تھا جنوب کی طرف ایک تاریخی نشیب تھا، جہاں برسات کے دنوں میں جھلیں اور جوہر بھر جاتے تو پانی کی چمکتی ہوئی چادر دُور تک پھیل جاتی تھی۔ جب غروب آفتاب کے قریب، سُرخ بدلیاں سورج کے قریب آجاتی تھیں اور اُن کے عکس میں ایک طرف کانگرہ کی برفانی چوٹیاں سونے اور شکر کے انبار دکھائی دیتی تھیں اور دوسری طرف اُن سے پیدا ہونے والی روشنی سطح آب پر عکس ہو کر ایک دلکش منظر پیش کرتی تھی۔ تو مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پہاڑ کبھی بہت قریب آجاتے ہیں اور کبھی بہت دُور دکھائی دیتے ہیں۔

مسودہ نکال کر لے آئی۔

”لیجئے آپا جان“۔ اس نے کہا ”میں نے اُن کا تھیلا الماری میں سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ اگر آپ نے اُن کی یہ کتاب پسند کی تو مجھے امید ہے کہ آپ انگریزی زبان کی چار اور کتابیں بھی پسند کریں گی جو اُن کے تھیلا میں پڑی ہوئی ہیں“

فہمیدہ نے مسودہ کھول کر پہلے صفحے پر ایک سرسری نظر ڈالی اور پھر پورے انہماک سے پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔ نسرین اپنی بہن کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کا چہرہ خوشی سے دھمکتا تھا۔ جب آدھ گھنٹہ فہمیدہ اُس کی طرف متوجہ نہ ہوئی تو اُس نے کہا ”آپا جان! میں آپ کے لیے گرم دودھ لاتی ہوں“

فہمیدہ نے بولنے کی بجائے صرف ہاتھ سے اشارہ کر دیا وہ بھاگتی ہوئی نیچے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے دودھ کا گلاس لا کر فہمیدہ کو پیش کیا۔ فہمیدہ نے اُس کی طرف دیکھے بغیر گلاس پکڑ لیا اور دودھ پینے کے دوران بھی وہ پڑھنے میں مصروف رہی۔ نسرین اُس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ کر اُس کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ دیکھ رہی تھی۔ جب اُسے نرسیند آنے لگی تو اُس نے کہا۔

”آپا جان! آپ تھک جاتیں گی۔ باقی کل پڑھ لیں“ فہمیدہ نے ہاتھ بڑھا کر اُس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

”ادھر آؤ نسرین“۔ نسرین آگے بڑھی اور اُس نے مسودہ ایک طرف رکھ کر اُسے گود میں بٹھالیا اور پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”نسرین! تم نے آتے ہی یہ مسودہ مجھے پڑھنے کے لیے کیوں نہ دیا؟“

”آپا جی مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ کو یہ پسند آئے گا“

فہمیدہ نے کہا ”تم اگر اس کے چند صفحات پڑھ لیتیں تو اب تک کئی بار پورا مسودہ پڑھ چکی ہوتیں۔ اگر تمہیں نرسیند آرہی ہے تو سو جاؤ۔ درنہ میں تمہیں شروع کا کچھ حصہ

جب برف گچھل جاتی تھی تو ان پہاڑیوں کی شکل کچھ اور دکھائی دیتی تھی اور جب برف بڑتی تھی تو وہ پھر اپنی پہلی صورت پر آنے لگتی تھیں۔ جب گرمیوں میں خوب بارش ہوتی تھی اور پھر یکایک دھوپ نکل آتی تھی تو سہ پہر کے وقت ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ پہاڑ بھاگ کر یکایک ہم سے بہت قریب آگئے ہیں۔ ہمیں نئے نئے غار اور نئی نئی چوٹیاں نظر آتی تھیں۔

جب بارش آنے والی ہوتی تھی، تو بادل عام طور پر مشرق سے مغرب کا رخ کیا کرتے اور جتنے زیادہ دن اُن کے قافلے سفر کرتے رہتے تھے اتنی ہی زیادہ بارش ہوتی تھی۔ کافی عرصہ تک میں بوڑھے لوگوں کی ان باتوں پر یقین کرتا رہا کہ یہ بادل گھوڑے ہاتھی اور اونٹ بن کر پہاڑوں پر جاتے ہیں وہاں پیٹ بھر کر چشموں اور جھیلوں سے ٹھنڈا پانی پیتے ہیں اور پھر میدانوں میں بارش ہوتی ہے۔

میں سوچا کرتا تھا کہ یہ بادل واقعی گھوڑے ہاتھی اور اونٹ ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا کہ میں ان پر سواری کر کے دور دور کے پہاڑوں کی سیر کیا کرتا۔ پھر میں چند سال بڑا ہو کر یہ پڑھا کرتا تھا کہ سمندروں سے پانی کے بخارات اُٹھتے ہیں اور پہاڑوں کی بلندیوں پر بادل بن کر برستے ہیں تو مجھے پرانی باتوں پر ہنسی آیا کرتی تھی اور اُس کے ساتھ ہی کبھی کبھی میں اس بات پر اداس ہو جاتا تھا کہ جس قدر زیادہ مجھے اس دنیا کا علم ہوتا جائے گا اُسی قدر اس کے اُن گنت عجائبات میرے دماغ سے اُجھل ہوتے جائیں گے اور وہ گاؤں جسے میں پوری دنیا سمجھا کرتا تھا کرۃ ارض کا ایک چھوٹا سا نقطہ بن کر رہ جائے گا۔

گاؤں کے جنوب مشرق میں جھیل سے آگے بڑے بڑے درختوں کا ایک جھنڈ دکھائی دیتا تھا۔ لوگ اس جھنڈ کے درختوں کو پردیسی درخت کہتے تھے۔ یہ درخت صرف کوئی ایک میل لمبے اور نصف میل چوڑے علاقے پر پھیلے ہوئے تھے اور علاقے میں کسی اور جگہ اس قسم کے درختوں کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ میں نے اپنے پورے ضلع میں اور اُس کے آگے دور دور تک اس درختوں سے ملنا جلتا کوئی درخت نہ دیکھا تھا۔ ان پردیسی درختوں کے متعلق میری طرح

گاؤں کے ہر بچے نے یہ کہانی سنی ہوئی تھی کہ رات کے پچھلے پہر ایک عورت اپنی چکی سے آٹا پیس رہی تھی اچانک اُس نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور صبح کے دھندلکے میں اسے بڑے بڑے درخت شمال مشرق سے جنوب کی طرف بھاگتے ہوئے دکھائی دیے۔ وہ باہر نکل کر دانی دینے لگی۔ لوگوں کو باہر نکل کر دیکھو درخت بھاگ رہے ہیں۔ بہت بڑے بڑے درخت بھاگ رہے ہیں۔ انہیں روکو ورنہ چھوٹے درخت بھی اُن کے پیچھے چل پڑے تو گاؤں اجڑ جائے گا۔ درختوں نے اُس کی چیخ پکار سنی تو جس جس جگہ پہنچے تھے وہیں ٹک گئے۔

اس کے بعد لوگوں نے صبح کی روشنی میں گاؤں کے آس پاس ایک نئی قسم کے درخت دیکھے تو انھوں نے چکی پیسنے والی عورت کی باتوں پر یقین کر لیا کہ وہ درخت پردیس سے بھاگ کر آئے ہیں اور اُس دن سے اُن درختوں کو پردیسی درخت کہا جانے لگا۔ ان درختوں کی عمر کا اندازہ اس بات سے لگایا جاتا تھا کہ جن لوگوں تک یہ کہانی پہنچیں میں اُن کے باپ داداں سے پہنچی تھی وہ بھی بوڑھے ہو چکے تھے۔

علاقے کے ہندو پردیسی درختوں کو دیوتا سمجھ کر اُن کی پوجا کے لیے جایا کرتے تھے کسی کو ان درختوں کی شاخ کاٹنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔ پردیسی درختوں کے درمیان چار سمتوں سے آکر راستے ملتے تھے اور دن کے وقت ایک کشادہ راستے پر مانگے بھی وہاں سے گزرتے تھے لیکن شام کے بعد بہت کم لوگ پردیسی درختوں کے قریب جانے کی ہمت کرتے تھے۔ اور اوپر سے چکر کاٹ کر نکل جاتے تھے۔ "پردیسی درختوں" کے متعلق ایک بات بہت مشہور تھی کہ آج تک اُن کی صحیح گنتی نہیں ہو سکی۔ اگر انہیں دوبارہ گنا جائے تو تعداد ہمیشہ مختلف ہوتی رہے۔ تین بار گنا جائے تو بھی تعداد مختلف ہو جاتی ہے۔

ایک دفعہ ہمارے ماسٹر جی بچوں کو لے کر گئے تھے اور ہر درخت کے نیچے ایک ایک بچہ بٹھا دیا گیا تھا جو تین چار درخت بڑے جھنڈ سے باہر کھڑے تھے، اُن کی علیحدہ گنتی کر لی گئی تھی۔ پھر سکول کے تمام بچوں کو ایک جگہ جمع کر کے اُن کی گنتی کی گئی۔

سنگھ اور سردار منگل سنگھ کی ملکیت ہے ورنہ اگر یہ ٹکڑا تمہاری ملکیت ہوتا تو تم ان منخوس درختوں کا نشان تک نہ چھوڑتے۔

منخوس کے لفظ پر ہندو جوش میں آگئے اور درخت کاٹنے کا مسئلہ آگے نہ بڑھ سکا۔

بچپن میں مجھے گھر کے اندر اور باہر اپنی اہمیت کا احساس دلانے کے کئی سامان موجود تھے۔ مجھ سے بڑی عمر والے مجھے کندھوں پر اٹھایا کرتے تھے اور چھوٹے بچوں اور بچیوں کا میرے گرد و حرم رہتا تھا۔

رات کو سونے سے پہلے میری بہنوں کی طرح برادری کی دوسری لڑکیاں بھی میرے گرد جمع ہو جایا کرتی تھیں اور مجھ سے کہانی سنانے کا مطالبہ کیا کرتی تھیں۔ میں جو کہانی دادی جان سے سنا کرتا تھا وہ معمولی سے رو و بدل کے بعد انہیں سنا دیا کرتا تھا۔ پھر دادی جان آتیں اور مجھے گود میں اٹھا کر اپنے بستر پر لے جاتیں۔ جب مجھے عیند آنے لگتی تو وہ مجھے اپنے بستر پر چھوڑ دیتیں۔ آتی دیر تک باورچی خانہ میں مصروف رہتی تھیں اور میں نیم خوابی کی حالت میں ان کا انتظار کیا کرتا تھا۔ یہ انتظار بڑا سبر آزماتا تھا لیکن میں یہ ظاہر نہیں کرتا تھا کہ میں انتظار کر رہا ہوں شاید میرے کان بہت تیز تھے اور مجھے کچھ بغیر یہ معلوم ہو جایا کرتا تھا کہ وہ وضو کر رہی ہیں۔

پھر اپنے گرو چاچا اور بیٹی ہوتی آتی تھیں اور میں سانس روک کر یہ ظاہر کرتا تھا کہ میں سو رہا ہوں۔ وہ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہتیں۔ ارے! آج میزا بیٹا میرے پیار کے بغیر ہی سو گیا میں کوئی جواب نہ دیتا۔ وہ جھک کر میری پیشانی پر بوسہ دیتیں اور کہتیں۔ ارے یوسف تم سچ سچ سو رہے ہو۔ پہلے مجھے شبہ ہوا تھا کہ تمہاری آنکھیں کھلی ہیں۔ اچھا بیٹا! سو جاؤ۔ میں چراغ کی روشنی میں انہیں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور مجھے نیند آ جاتی۔ صبح دادا جان مسجد سے نماز پڑھ کر آتے تو مجھے اٹھا کر اپنے بستر پر لے جاتے وہ مجھے اپنی گود میں بٹھا کر بار بار یہ دعا مانگا کرتے تھے۔ "یا اللہ! میرے پوتے کو نیکی اور پاکیزگی دے کبھی کبھی وہ میری دادی

ان کا خیال تھا کہ درختوں کی تعداد سو سے زیادہ ہے۔ بچوں کو دوبارہ نمبر دے کر درختوں کی طرف بھیجا گیا تو اتفاق سے ایک برسین لڑکے کو قے لگتی اور ہندو ماسٹر نے شور مچا دیا بھاگو! دیوتا ناراض ہو گئے ہیں! کچھ لڑکے بھاگ آئے۔ اُدھر مسلمان ماسٹر نے کہا۔ چلو! آئندہ ہم تار کول لے کر آئیں گے اور ہر درخت کا چھلکا اُتار کر تار کول سے نمبر لگائیں گے پھر میں دیکھوں گا کہ غلطی کیسے ہوتی ہے؟ گاؤں میں یہ بات مشہور ہوئی تو ہندوؤں نے اعتراض کیا کہ یہ درخت دیوتا ہیں اور دیوتا کا چھلکا اُتار کر تار کول لگا ایاپ ہے۔ ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔

ایک سگھ گیانی نے علاقے کے ہندو اور مسلمان معززین کو جمع کر کے یہ تقریر کی کہ ان درختوں کو نہ کوئی ایسا پھل لگتا ہے جسے انسان یا کوئی پرندہ کھا سکے۔ نہ اس کی کڑی کسی کام آتی ہے اس کو دیوتا سمجھنا پر لے درجے کی بے وقوفی ہے۔ اس لیے انہیں کاٹ کر ان کی جگہ کوئی اور کام کے درخت لگائے جائیں۔

ہندوؤں کے ایک یا اثر رہنما پنڈت و دیارام نے اٹھ کر کہا۔ کوئی مانی کالال ایسا ہے جو ان درختوں کو کاٹنے کی جرأت کر سکے؟

مولوی محمد شفیع امام مسجد اٹھ کر بولا۔ "میں تین دن کے اندر اندر یہ تمام منخوس درخت کٹوا دینے کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ لیکن میری یہ شرط ہے کہ وہ لوگ جو انہیں دیوتا سمجھتے ہیں۔ وہ اس کی کڑی کی تقسیم میں حصہ نہیں لیں گے۔"

اس مرحلہ پر پنڈت دینا ناتھ پہنچ گیا اور اس نے کہا۔ "لوگو! یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ درخت کہیں بہت دور جا کر غائب نہیں ہو گئے اور اس پرتو دھرتی پر ٹھہر گئے تھے۔ جہاں ہمارے باپ دادوں کے باپ دادے ان کی سیوا کے لئے موجود تھے۔ ہمارے لیے یہ درخت دیوتا ہیں اور یہ زمین جو کسی کنہیا کی آواز سن کر انہیں پسند آگئی تھی۔ ان دیوتاؤں کا مندر ہے۔" گیانی کزنار سنگھ نے کہا۔ "یہ تم اس لیے کہہ رہے ہو کہ یہ ساری زمین سردار پورن

سے کہا کرتے تھے ہاجرہ غور سے دیکھو! یوسف کے ماتھے پر مجھے کوئی روشنی نظر آتی ہے۔
اُن کی یہ بات اُس وقت بھی دہرائی جاتی تھی۔ جب کہ میں بڑا ہو چکا تھا اور وہ اس دنیا سے
رحلت فرما گئے تھے۔

بچپن کی جو بات مجھے خاص طور پر یاد آتی ہے وہ یہ ہے کہ سردیوں کے پچھلے پہر گھر
کی عورتیں چرخہ لے کر ایک کشادہ کمرے میں بیٹھ جاتیں اور سوت کاتنے کا مقابلہ شروع ہو جاتا
تھا۔ چرخہ کی آواز میں اُن کے میٹھے اور منہم سے راگ بھی شامل ہوتے تھے۔ میں کبھی بھی یہ نہیں سمجھ
سکا کہ وہ کیا گارہی ہیں۔ بہ صورت چرخے کی آواز کے ساتھ مل کر یہ راگ جو تاثر پیدا کرتے تھے
وہ میرے ذہن سے کبھی محو نہیں ہوا۔

رات کے پچھلے پہر جب تاج دین دھنیار دئی دھلکا شروع کرتا تھا تو سنے والوں
کے کان اُس کے گھر کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ کبھی کبھی اچانک میری آنکھ کھلتی تھی تو مجھے دور
سے اُس پراسرار جوگی کی دلکش لہری سنائی دیتی تھی جو گاؤں میں ایک طرف سے داخل
ہوتا تھا اور دوسری طرف سے گیت گاتا ہوا نکل جاتا تھا۔

کھیٹن دے دن چار فی مائے، کھیٹن دے دن چار
اس جوگی کے بارے میں عجیب و غریب باتیں مشہور تھیں کہ بھونکنے والے گتے
جب اُسے دیکھتے ہیں تو بھونکنا بند کرتے ہیں۔ لڑکے اُس کے متعلق باتیں کیا کرتے تھے کہ اُسے
کسی نے نہیں دیکھا وہ رات کے اندھیرے میں آتا تھا اور اندھیرے میں ہی چلا جاتا تھا۔

ایک دن مجھے بخار تھا۔ چونکہ ملیر کا موسم تھا۔ اس لیے آبا جان گھر میں کوئین کی بہت
سی گولیاں رکھ چھوڑتے اور میرے متعلق یہ تاکید کرتے تھے کہ اگر مجھے بخار ہو جائے تو کسی تاخیر
کے بغیر کوئین کھلا دی جائے۔ بخار کے موسم میں یوں بھی ہر سہتے ایک گولی ضرور کھانی پڑتی تھی۔
ایک دن میں نے بہت ضد کی تو ماں جی نے چچا شیر علی سے کہا، اور وہ میرے پاس آکر بیٹھ گیا
اور کہنے لگا "دیکھو یوسف تم نے کئی بار مجھ سے کہا ہے کہ تم اُس جوگی کو دیکھنا چاہتے ہو، جو

گاتا ہوا آکر کرتا ہے۔

میں نے کہا۔ "ماں میں دیکھنا چاہتا ہوں لیکن کہتے ہیں کہ وہ کسی کو نظر نہیں آتا۔
"دیکھو! یوسف تمہیں وہ نظر بھی آئے گا اور تمہارے ساتھ باتیں بھی کرے گا اور
پھر تم سارے گاؤں کے لڑکوں پر رعب ڈال کر دو گے کہ وہ تم سے مل کر گیا ہے لیکن میری ایک
شرط ہے۔ وہ شرط یہ ہے کہ تم فوری طور پر یہ گولی منہ میں ڈالو اور پانی کا گھونٹ پی لو۔ بالکل
اس طرح ایہ کہتے ہوئے انہوں نے ایک گولی منہ میں ڈالی اور پانی کے گھونٹ کے ساتھ نگل
گئے۔

میں نے کہا "چچا جان! آپ وعدہ کرتے ہیں؟" "ماں بھئی! میں وعدہ کرتا ہوں"
میں نے گولی منہ میں ڈالی اور پانی کے ساتھ نگلتے ہوئے کہا۔
"چچا جان! اگر آپ کہیں تو میں ایک اور گولی بھی کھا لیتا ہوں"
چچا شیر علی نے کہا۔ "اب ایک گلاس دودھ پی لو" میں نے دودھ پی لیا تو چچا نے
کہا "بڑا ایک گلاس اور پی لو اگر پورا نہیں تو آدھا پی لو۔ زیادہ دودھ پینے سے تمہیں بخار بھی
نہیں ہوگا اور جوگی بھی اچھی طرح نظر آئے گا"
"وہ کیوں چچا جان؟"

"بیٹا وہ اس لیے کہ تمہاری آنکھوں میں بخار کا اثر نہیں رہے گا اور نظر تیز ہو جائے
گی"

میں نے ایک گلاس اور پی لیا اور سو گیا۔
شام کے وقت میرا بخار ٹوٹ چکا تھا۔ اس کے بعد میں نے چچا کو خوش کرنے
کے لیے ایک اور گولی کھالی اور دودھ بھی خوب پیا اور پھر میں نے سب سے کہہ دیا کہ آج چچا
جان! میرے پاس رہیں گے۔ ورنہ بخار دوبارہ ہو جائے گا۔
رات کے تیسرے پہر میں مزے سے سو رہا تھا۔ چچا شیر علی میرے سر ہانے کے باپس آئے

ہو جاؤ گے تو تمہیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ میں کہاں رہتا ہوں۔ جو مدد ری جی مجھے آپ کے بھتیجے سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ اب اگر اجازت ہو تو مجھے یہاں سے بھاگنا چاہیے۔" ہاں تم جاؤ!"

وہ کھیڈن دے دن چارنی مائے۔ کھیڈن دے دن چار" گاتا ہوا چل دیا۔ لیکن وہ کتے جو دیر سے بھونک رہے تھے۔ اب خاموش ہو گئے تھے۔

میں تیسری جماعت میں پڑھتا تھا کہ سخت بیمار ہوا۔ ابا جان گھر پر موجود نہیں تھے۔ مقامی حکیموں اور سنیا سیوں نے یہ طے کیا کہ میرا بخار کم کرنے کے لیے میرا خون کم کر دیا جائے اور اس مقصد کے لیے میرے جسم پر جونکیں لگا دیں۔

آنکھوں پر بٹی باندھنے تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ مجھے جونکیں لگائی جائیں گی۔ لیکن جب بٹی باندھ دی گئی تو کسی نے مجھے مضبوطی سے بازو میں جکڑ لیا اور اس کے ساتھ ہی میں نے جونکیں لگانے والوں کی بات چیت سنی تو میرا مدافعتیہ شعور اچانک بیدار ہوا اور میں نے اچانک آنکھوں سے بٹی اتار ڈالی۔ اتنی دیر میں چچا شیر علی اچانک بھاگتا ہوا آیا، اور اس نے کہا بھائی جان آ رہے ہیں اور ڈاکٹر کو ساتھ لائے ہیں۔ ایک جونک میرے گھٹنے سے ذرا اوپر چپٹ چکی تھی اسے چچا نے جلدی سے مڑ کر ایک طرف پھینک دیا۔ اور جونکوں والے کو ایک چپٹر رسید کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں سے بھاگ جاؤ۔ ورنہ جوتے کھاؤ گے۔"

ڈاکٹر نے دو دن ہمارے ہاں قیام کیا۔ اس عرصہ میں میرا بخار جسے ڈاکٹر ٹائیفاڈ کہتے تھے اتر گیا۔ جاتے ہوئے اس نے تاکید کی کہ مجھے تین دن صرف دودھ اور اس کے بعد بہت ملکی غذا دی جائے۔

گاؤں کے شمال مشرق میں ساتیس بڈھے شاہ کا تکیہ تھا۔ وہاں ایک قبر اپنے دائیں بائیں کی دو عام قبروں سے کوئی تین گنا بڑی تھی اور اس کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ وہاں ساتیس

اور کہا، یوسف! اٹھو اور میرے ساتھ چلو۔ میں کچھ پوچھے بغیر اٹھ کر ان کے ساتھ چل دیا۔ گلی میں باہر نکل کر وہ پیل کے درخت کے نیچے ٹک گئے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے دُور سے آواز سنائی دی۔

"کھیڈن دے دن چارنی مائے"

"کھیڈن دے دن چار!"

گاؤں کے کتے بھونک رہے تھے۔ آواز قریب آئی اور کتوں کے جوش و خروش میں اضافہ ہونے لگا۔ پھر چچا شیر علی نے مجھے بازو سے پکڑ کر درخت کے پیچھے چھپاتے ہوئے کہا: "یہاں چپکے سے کھڑے رہو۔" چچا شیر علی خود بھی تنہا کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔

جوگی کے ہاتھ میں بلم تھا جس کے پھل سے نیچے کپڑے کی دھجیاں ٹٹک رہی تھیں۔ جب وہ گاتا ہوا قریب سے گزرا تو شیر علی نے ایک ہاتھ سے اُس کا بازو پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے اُس کی گردن دبوچ لی اور کہا۔

"ٹھہر جاؤ! ڈرو نہیں! میں شیر علی ہوں۔"

"چودھری شیر علی!"

"ہاں یار اگر تم سے آج ہی ملا ضروری نہ ہوتا تو ہم پیغام بھیجاتے۔ بات یہ ہے کہ میرا بھتیجا! تمہیں دیکھنے کے لیے بہت بے چین تھا۔ یوسف آگے آ جاؤ! اور جوگی کو اچھی طرح سے دیکھ لو۔ تم اس کے ساتھ ہاتھ بھی ملا سکتے ہو، باتیں بھی کر سکتے ہو۔ یہ میرا دوست ہے۔" میں نے آگے بڑھ کر جوگی کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا: "اگر چچا جان نے تمہیں تکلیف دی ہے تو مجھے بہت افسوس ہے۔"

"نہیں جی! تمہارے چچا جان میرے دوست ہیں۔"

"تم کہاں رہتے ہو؟"

"یہ میں تمہیں اس وقت نہیں بتاؤں گا۔ لیکن جب تم اپنے چچا کی طرح بڑے

جمال شاہ دفن ہیں۔ جو بڑھے شاہ کے پردادا تھے اور دوسری قبریں سائیں بڑھے شاہ کے باپ اور دادا کی تھیں لوگ دُور دُور سے جمال شاہ کے لیے چڑھاوے لایا کرتے تھے اور انہیں عام طور پر بڑا سائیں کہا جاتا تھا۔

سائیں بڑھے شاہ اور خیریں کے علاوہ ایک اچھا کاشتکار بھی تھا۔ تکیے کے ساتھ اس کی دس کنال زمین میں اتنی سبزی پیدا ہوتی تھی کہ اس پاس کے دیہات کے لوگوں کو شہر جا کر خریدنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ بڑھے شاہ کے کھیت کھیلے اپنے غیر معمولی سائز کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ اُن کے بزرگ بابا جمال شاہ کا عرس جن کے مہینے میں ہوتا تھا جب کہ کرپوں کی بہتات ہوتی تھی۔ اس لیے عقیدت مندوں کو روٹیوں کے ساتھ سرسوں کے تیل میں تلے ہوئے کرپے تقسیم کیے جاتے تھے۔ ایک دفعہ کسی ملنگ نے بھنگ کے نشے میں اپنی روٹی سے ایک بہت بڑا کرپا اٹھا کر بلند کرتے ہوئے نعرہ لگایا

ڈم ڈم کرپلا بڑھے شاہ دامیلہ

اور اس کے بعد یہ نعرہ اس میلے کا اہم گانا بن گیا جو خاص کر بچوں میں بہت

مقبول تھا۔

بڑھے شاہ کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ لوگوں کو بالخصوص عورتوں کو جنوں، بھوتوں اور ہر قسم کے آسیب سے نجات دلا سکتے ہیں اور مریض یا مریضہ کو دیکھتے ہی پہچان لیتے تھے کہ اس پر کس چیز کا سایہ ہے۔ گاؤں کے اندر اس کا ایک مرید پیراں دتہ چوکیدار تھا اور دوسرا اللہ رکھا موچی تھا جو دُور دُور تک اُن کا پرچار کیا کرتا تھا اور سائیں بڑھے شاہ بھی ان کے حال پر مہربان تھا اور جو نذرانے اُن کی ضرورت سے زائد ہوتے تھے۔ وہ اللہ رکھا اور پیراں دتہ کے گھر بھیج دیے جاتے تھے۔ سائیں جی کے طریق علاج کے حتم دیدگواہ ہمیشہ اُن کے عقیدت مند ہوتے تھے۔ آسیب کے مریضوں کو جس کو ٹھٹھی میں لٹایا جاتا تھا۔ اُس کا دروازہ جن یا بدروح نکالتے وقت دوسروں کے لیے بند کر دیا جاتا تھا اور بڑھے شاہ

کے مرید ہی یہ بتا سکتے تھے کہ جن بھوت یا بدروح کیسے جاتی ہے۔

سائیں بڑھے شاہ بانس کا ایک موٹا ڈنڈا اٹھا لیتا جو اندر سے کھوکھلا ہوتا تھا اور کسی نامعلوم زبان کے الفاظ دہرانے کے بعد ڈنڈا اٹھا کر گرجتی ہوئی آواز میں کہا کرتا تھا۔

”او کالے منہ والے میں نے تمہیں پہچان لیا ہے تم کئی باری وعدہ کر چکے ہو۔ کہ آئندہ تم اس علاقے میں کسی کو تنگ نہیں کرو گے۔ اب بھاگ جاؤ، ورنہ جلا کر بھسم کر دوں گا“ اور کوئی بدروح مریض کی زبان سے جواب دیتی۔ ”میں بالکل نہیں جاؤں گا۔ تم مجھے بے آرام کرنے والے کون ہو؟“

بڑھے شاہ جوش میں آ جاتا اور ڈنڈا ہوا میں لہراتا ہوا زیادہ بلند آواز میں کوئی منتر پڑھتا اور پھر غصے سے کانپتا ہوا چلاتا۔ ”ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ یہاں سے فوراً نکل جاؤ۔ ورنہ ہم تمہیں زمین کے پاتال میں پہنچا دیں گے۔ جہاں سے تمہاری چھین بھی سنائی نہیں دیں گی۔ تم تاریکی میں اُن خوفناک سانپوں اور بھوتوں کو بھی نہیں دیکھ سکو گے جو ہر گھڑی باری باری تمہیں کاٹا کریں گے۔“

اور مریض کے منہ سے سہمی ہوئی آواز نکلتی

”بابا جی میری طرف اتنے غصے سے نہ دیکھئے۔ آپ کی سرخ آنکھوں سے خوف آتا ہے میں جا رہا ہوں۔ چھریاں نہیں آؤں گا۔ بالکل نہیں آؤں گا۔ بابا جی مجھے معاف کر دو۔“ اس کے بعد مریض اٹھ کر بیٹھ جاتا اور سائیں بڑھے شاہ سا ہر کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کتا۔

”یار مار ڈالا اس کالے بھوت نے اتنی لڑائی کی ہے کہ میرے جسم میں ہلنے کی طاقت نہیں رہی۔“

عجیب بات یہ تھی کہ جب سائیں بڑھے شاہ غصے میں آ کر جنوں، بھوتوں کو دھکیلا دیا کرتے تھے تو اُن کی آنکھیں سُرخ ہو جیا کرتی تھیں اور چہرہ اتنا خوفناک کہ صبح و شام

اللہ رکھا کی باتوں کی تصدیق کے لیے جایا کرتا تھا۔ اور اتنا کامیاب تھا کہ جب وہ کسی سفر سے واپس آتا تھا تو کوئی نہ کوئی اہم مریض بھی اس کے ساتھ ہوتا تھا۔

اُن کے پاس رہنے والے مریض بھی ڈر جایا کرتے تھے۔



سائیں بڈھے شاہ کے تکیہ سے کچھ فاصلے پر ایک ہندو جوگی جاکلی داس رہتا تھا۔ اُس کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ جنوبی ہندوستان سے آیا تھا اور چند سال قبل ایک سکھ کے کھیت میں دھوئی رما کر بیٹھ گیا تھا۔ اتفاق سے اِس کھیت کا مالک بیمار تھا۔ جاکلی داس نے اُسے اپنی گھڑی سے کوئی دوائی نکال کر کھلا دی اور وہ ٹھیک ہو گیا۔ اور جاکلی داس ایک بہت بڑے سنیاسی کی حیثیت سے مشہور ہو گیا۔ زمیندار نے چند دن اسے اپنی حویلی میں رکھا اور پھر گاؤں کے لوگوں کے تعاون سے اُس کے لیے اسی کھیت میں ایک جھونپڑا تعمیر کر دیا۔ جہاں آکر وہ ٹھہرا تھا۔ اور باقی کھیت بھی اسے دان کر دیا۔ جاکلی داس باتوں میں بڈھے شاہ کے مقابلے میں بہت تیز تھا۔ ایک سال کے اندر اندر اُس نے گاؤں کے لوگوں کے چندے سے کنواں بھی کھدوا لیا تھا۔ کاروباری رقابت کے باوجود گاؤں کی یہ دو شخصیتیں آپس میں میل ملاپ رکھتی تھیں بڈھے شاہ کا پلڑا اس لیے بھاری تھا کہ اس کا کاروبار برسوں سے چل رہا تھا اور عورتوں میں وہ زیادہ مقبول تھا۔



اللہ رکھا موچی بڈھے کے ایک مستقل مرید کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ وہ دُور دُور دورے پر جایا کرتا تھا۔ اور اُس کا طریق وارادت یہ تھا کہ وہ کسی مریض کے بارے میں شبہ پیدا کرتا تھا کہ وہ جن بھوت کے قابو میں ہے اور پھر جب لوگ وہم میں مبتلا ہو جاتے تو انہیں سائیں بڈھے شاہ اور اُن کے بزرگوں کے کارناموں کی حیرت انگیز داستانیں سناتا۔ گاؤں میں دوسرا مرید پیراں دتہ چوکیدار تھا جو بوقت ضرورت ایسے لوگوں کے پاس

باب - ۱۶

پردیسی درختوں کے ساتھ سکول والے گاؤں میں نعمت علی ایک شاندار حکیم کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا۔ وہ کچھ تعلیم یافتہ بھی تھا اور اس کے دیہات میں جب کوئی زیادہ بیمار ہو جاتا تھا تو لوگ علاج کے لیے اسی کی طرف بھاگا کرتے تھے۔

نعمت علی ہمارے گاؤں بھی آیا کرتا تھا اور بڑھے شاہ اور جاکمی داس دونوں تکلیف کے وقت اس سے دوائیاں لیا کرتے تھے۔ ان تینوں میں سے کوئی کسی کا تہ مقابل یا رقیب نہ تھا۔ وہ ہنسی خوشی ملا کرتے تھے اور اگر ان کے دل میں کوئی بات ہوتی تھی تو وہ ظاہر نہیں کرتے تھے لیکن دریا سے بیاس کے پار کسی گاؤں سے ایک نیا طالع آزا حکیم حسین بخش نمودار ہوا اور اُس نے علاقے کے لوگوں کی پرسکون زندگی تہ و بالا کر دی۔

کہتے ہیں کہ حسین بخش پردیسی درختوں سے کچھ دور جنوب کی طرف اپنے ایک شاگرد کے ساتھ ایک گاؤں سے گزر رہا تھا کہ ایک حویلی کے سامنے اُس کی ملاقات گاؤں کے نمبردار سے ہو گئی۔ نمبردار پریشانی کی حالت میں ایک آدمی سے کہہ رہا تھا۔ دیکھو دلپنگہ تم دیر نہ کرو۔ فوراً جاؤ اور حکیم نعمت علی کو یہاں بھیج دو۔ اُسے کہہ دینا کہ تمہاری بھابی کو بہت تکلیف ہے اور فوراً یہاں پہنچے۔ تم یہ گھوڑی اُس کے حوالے کر دینا اور پھر اگلے گاؤں میں سائیں بڑھے شاہ اور جاکمی داس کو بھی کہہ دینا کہ وہ یہاں آجائیں۔ حسین بخش وہیں ٹھٹک کر رہ گیا اور اُس نے اپنے ہوشیار شاگرد کو اشارہ کیا۔

شاگرد نے آگے بڑھ کر نمبردار سے پوچھا۔

”سردار جی حکیم صاحب پوچھتے ہیں کہ آپ کے گھر میں کیا تکلیف ہے؟“

”کون حکیم صاحب؟“ نمبردار نے حسین بخش کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

شاگرد نے جواب دیا ”سردار جی آپ حکیم حسین بخش کو نہیں جانتے؟ ان کی شہرت تو بیاس سے لے کر راوی تک گاؤں گاؤں پہنچ چکی ہے اور ادھر بیاس کے پار جاندھر اور ہوشیار پور کے مریضوں کا ان کے پاس تانتا بندھا رہتا ہے۔ یہ ایک قیمتی بوٹی کی تلاش میں نکلے تھے اور اتفاق سے یہاں پہنچ گئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس میں قدرت کا بھید ہے۔“

نمبردار نے ماتھ باندھ کر کہا۔ ”حکیم جی قیمتی بوٹی بعد میں تلاش کر لینا۔ بھگوان کے لیے پہلے میری بیوی کو بچاؤ۔ اس کے دو بچے پہلے ضائع ہو گئے تھے۔ اگر آپ نے میرے تیسرے بچے کو بچایا تو عمر بھر آپ کی سیوا کروں گا۔ ورنہ میری بیوی مرنے لگی۔“

جب یہ باتیں ہو رہی تھیں تو اللہ رکھا موچی جو پچھلے گاؤں میں جوتے فروخت کرنے کے بعد واپس جا رہا تھا۔ وہاں سے گزرا۔ وہ سائیں بڑھے شاہ کی سفارش کرنا چاہتا تھا لیکن حکیم حسین بخش اور اُس کا شاگرد نمبردار کے ساتھ حویلی کے اندر چلے گئے۔

اللہ رکھا کچھ ترنیدار کے ساتھ ہمدردی کی وجہ سے اور کچھ ایک نئے حکیم کے ساتھ دلچسپی کے باعث وہاں سے تھوڑی دور ایک تیلی دوست کے گھر چلا گیا۔

تیلی نے اُسے کھانے کے لیے روک لیا اور اس کی بیوی نے نمبردار کے گھر کسی نئے حکیم کی آمد کے متعلق سن کر کہا ”بھائی اللہ رکھا کو اُس بیچاری پر بہت ترس آتا ہے لیکن حکیم خواہ کوئی ہو اس کے بچنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ وہ پہلے ہی دو مرتبہ ضائع ہو جانے والے بچوں کے غم میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکی ہے۔“

”پہلے اس دیوتا کو سلام کرو جو میرے گھر میں خوشیاں لے کر آیا ہے۔ میں ایک لڑکے سے ناامید تھا۔ بھگوان نے دودے دیے ہیں“



رہٹ پر حکیم نعمت علی، ساتیں بڑھے شاہ اور جاکلی داس بیٹھے ہوئے تھے اور دہی آواز میں سردار اُدھم سنگھ اور اُس اجنبی حکیم کو گالیاں دے رہے تھے جس کی وجہ سے اُن کی توہین ہو رہی تھی۔

اللہ رکھا جو تیلی کے گھر کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد نمبردار کی خیریت پوچھنے کا ارادہ لے کر نکلا تھا کسی سے کوئی تسلی بخش جواب نہ پا کر پھر تارہٹ پر جان نکلا۔ ساتیں بڑھے شاہ اور اُس کے ساتھیوں کو دیکھتے ہی پوچھا: ”آپ یہاں کیوں بیٹھے ہیں۔ نمبردار اُدھم سنگھ کے گھر کیوں نہیں گئے۔ وہاں آپ کی سخت ضرورت ہے“ جاکلی داس نے کہا: ”نمبردار بے وقوف ہے اور تم اُس سے زیادہ بے وقوف ہو“

”جی میں نے کیا بے وقوفی کی ہے۔ جب وہ ایک نئے حکیم کے سامنے ہاتھ باندھ کر منتیں کر رہا تھا کہ میری بیوی کو بچاؤ تو مجھے خیال آیا تھا کہ میں اپنے ساتیں پریر کو بلانے کا مشورہ دوں لیکن وہ نمبردار کے ساتھ اندر چلے گئے تھے اور مجھے موقع ہی نہیں ملا“

حکیم نعمت علی نے پوچھا: ”لیکن وہ نیا حکیم ہے کون؟“
اللہ رکھا نے جواب دیا: ”جی مجھے پتہ نہیں۔ لیکن میں نے اُس کے شاگرد کو یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ دریا کے آ پار سیلوں سے لوگ اُس سے دوائی لینے آتے ہیں“
ساتیں بڑھے شاہ نے کہا: ”یار ایسے بد معاش آدمی کے شاگرد لوگوں پر اسی طرح سے رعب ڈالتے ہیں“

”لیکن ساتیں جی میں نے گلی میں دو عورتوں کو باتیں کرتے سنا ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ ایک لڑکا پیدا ہو چکا ہے اور دوسرا بھی پیدا ہو رہا ہے لیکن آپ جب یہاں آئے تھے

جس وقت تیلی کے گھر میں یگنگو ہو رہی تھی۔ نمبردار کے گھر میں حکیم حسین بخش ایک تڑپتی ہوئی عورت کی نبض دیکھ رہے تھے اور چند منٹ بعد مر لیٹھنے نے دودھ کے ساتھ اُن کی دوائی کھا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

نمبردار چلایا ”حکیم جی کہیں یہ مرنے نہیں گئی؟“
حسین بخش نے اطمینان سے جواب دیا: ”میری دوائی کھانے کے بعد یہ مرنے نہیں سکتی۔ اگر گاؤں میں کوئی دوائی ہے تو اُسے بلا لیجیے۔ میں باہر درخت کی چھاؤں میں لیٹ جاتا ہوں“

ایک گھنٹہ بعد جب حکیم نعمت علی گھوڑا دوڑاتا ہوا اپنیچا تو اُس نے حویلی کا دروازہ بند پایا۔ جب شور مچایا تو اندر سے نمبردار کی گرجتی ہوئی آواز آئی۔ ”بھئی شوز نہ مچاؤ حکیم صاحب کا حکم ہے کہ کوئی اندر نہ آئے“

”نمبردار جی! میں حکیم نعمت علی ہوں۔ دروازہ کھٹکھٹانے والے نے فریاد کی۔“
”بھئی مجھے معلوم ہے لیکن تم رہٹ پر چلے جاؤ اور وہاں گھوڑا باندھ دو اور اگر ساتیں بڑھے شاہ اور جاکلی داس بھی پہنچ جائیں تو انھیں بھی بٹھا لو“
”نمبردار جی وہ کس لیے آئیں گے؟“

اندر سے گرجتی ہوئی آواز آئی۔ ”وہ اس لیے آئیں گے کہ میں اُٹو کا پٹھا ہوں“
نعمت علی نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا: ”سردار جی خیر تو ہے، بھابی جی کسی ہیں؟“
”بھابی جی کی فکر نہ کرو۔ ایک بچہ پیدا ہو چکا ہے اور دوسرا پیدا ہونے والا ہے۔“
بھگوان کا شکریہ ہے کہ اُس نے میرے گھر ایک فرشتہ بھیج دیا ہے، لیکن تم فکر نہ کرو تم سب کو انعام ملے گا“

کچھ دیر بعد حکیم جی اور اُس کا شاگرد نمبردار کے گھر سے پراٹھے کھا رہے تھے۔ گاؤں کے لوگ مبارک باد دینے آتے تھے تو نمبردار انہیں کتا تھا۔

کام ہے۔ اگر شام کو نہ آسکا تو کل آؤں گا۔“

وہ تینوں وہاں سے چل پڑے اور اللہ رکھا نمبردار کے ساتھ ہو گیا۔

گاؤں سے نکل کر بڑھے شاہ نے ساتھیوں سے کہا۔ ”اُس بیوقوف کو تیلی کے ساتھ کوئی کام نہیں تھا۔ وہ صرف اس نئے حکیم کو اچھی طرح دیکھنے اور اپنی بیوی کے لیے دوا کے پیدا کرنے والی دوائی حاصل کرنے کے لیے مرگ گیا ہے۔“

حکیم نعمت علی نے کہا ”سائیں جی اس گاؤں کے لوگ کافی بے وقوف ہیں۔ اُس چالاک آدمی کا کاروبار خوب چلے گا۔“

جانکی داس نے کہا۔ ”یار مجھے تو خود نمبردار سب سے زیادہ بیوقوف معلوم ہوتا ہے۔“
نعمت علی نے کہا ”نہیں یار وہ بیوقوف ہوتا تو ہمیں پانچ پانچ روپے کیوں دیتا۔ کام تو اُس کا ہو گیا تھا اور اب میرا خیال ہے کہ وہ اللہ رکھا کو بھی کچھ دے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دل کا کھرا ہے اور کسی سے بگاڑ پیدا نہیں کرتا۔“



اللہ رکھا اگلے روز صبح کے وقت سر پر ایک گٹھری اٹھائے اپنے گھر میں داخل ہوا تو بیوی نے اسے دیکھتے ہی سوال کیا۔

”آپ کہاں غائب ہو گئے تھے۔ سائیں بابا نے آپ کا دوبار پتہ کیا ہے۔ ابھی ابھی جانکی داس بھی آپ کے منتظر پرچہ کر گیا ہے۔“
اللہ رکھا نے گٹھری ایک کھاٹ پر رکھتے ہوئے کہا۔

”وہاں ٹھہر کر میں گھاٹے میں نہیں رہا۔ نمبردار نے دو بچوں کی خوشی میں مجھے تین روپے اور دس سیر چاول دیے ہیں لیکن یہ بابت کسی کو نہ بتانا کہ وہ حکیم جس نے اُس کی بیوی کا علاج کیا تھا اور جس کے علاج سے دو بچے پیدا ہوئے ہیں۔ اُس نے بھی مجھے ایک روپیہ دیا تھا۔“
”حکیم جی نے تمہیں دیا تھا؟“

تو آپ کو اندر جا کر دیکھنا تو چاہیے تھا حکیم جی بھلا کوئی ایسی دوا بھی ہے جس سے اٹھرا کامرض ٹھیک ہو جائے اور ایک کی بجائے دو بچے پیدا ہو جائیں؟“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ شاید اس بے وقوف حکیم نے یہ نہیں سوچا کہ اگر اُس کے متعلق پیشہ ہو گیا ہے کہ اس کی دوائی کھانے والی عورت ایک کی بجائے دو بچوں کو جنم دیتی ہے تو بیوقوف عورتیں بھی اُس کی دوائی سے کوسوں دور بھاگیں گی۔“

جانکی داس نے کہا۔ ”یار میں تو چاہتا ہوں کہ دو کی بجائے تین چار پیدا ہو جائیں اور لوگ اسے لاٹھیاں مار مار کر گاؤں سے نکال دیں۔“

”یار دیکھو شاید نمبردار آزمائے۔“ اللہ رکھا نے کہا۔ وہ خاموشی سے گلی کی طرف دیکھنے لگے۔ نمبردار کے ساتھ ایک آدمی گڑکی ٹوکری اٹھائے ہوئے تھا۔ انہوں نے اٹھ کر اسے مبارکباد دی۔ نمبردار نے انہیں گڑکی دو دو بھیلیاں تقسیم کیں اور پھر تینوں کو پانچ پانچ روپے کا ایک ایک نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے مجھ پر بڑی کرپاکی ہے۔ میں ایک بیٹے کے متعلق فکر مند تھا۔ اب بھگوان نے مجھے دو بیٹے دے دیے ہیں۔ میں آپ کی اور بھی خدمت کروں گا۔“

حکیم نعمت علی نے کہا ”نمبردار جی آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ اب ہمیں اجازت دیجیے۔“

نمبردار نے اُن کے ساتھ باری باری مصافحہ کیا۔ جب اللہ رکھا کی باری آئی تو اُس نے کہا۔ ”ارے یار تم اللہ رکھا موچی ہو؟۔ شاید میں نے پہلے ہی تمہیں دیکھا تھا۔“

”جی جوبلی کے دروازے پر جب آپ حکیم صاحب سے باتیں کر رہے تھے تو میں باہر ہی کھڑا تھا۔ اور پھر اس لیے مرگ گیا تھا کہ آپ کے گھر سے کوئی اچھی خبر سن کر جاؤں۔“

”بھئی میں تم پر بہت خوش ہوں۔ شاید تمہارے دکرشن کر لینے سے ہی میری مصیبت دور ہو گئی تھی۔ تم میرے ساتھ آؤ، میں تمہیں کچھ دینا چاہتا ہوں۔“

اللہ رکھا نے بڑھے شاہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”سائیں جی مجھے یہاں تیلی کے ساتھ بھی کچھ

تو اُسے کہہ دینا کہ میں بہت جلد اُن کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ ان چاولوں اور تین روپے کے متعلق بے شک کہہ دینا لیکن یہ کسی سے نہ کہنا کہ حکیم نے مجھے بھی کچھ دیا ہے۔ اللہ رکھا لیشن سنگھ سے ملاقات کر کے تکیہ میں پہنچا تو وہاں ساتیس بڑھے شاہ کے پاس چند اور آدمی بیٹھے ہوتے تھے۔ اُس نے سردار اُدھم سنگھ کے گاؤں میں ایک نئے حکیم کی آمد کا قصہ کچھ اس انداز سے سنایا کہ شام تک حکیم حسین بخش گاؤں کی ہر محفل میں گفتگو کا موضوع بن چکا تھا۔

پانچویں دن لیشن سنگھ نے اللہ رکھا کو اپنی گھوڑی دے کر کہا کہ تم حکیم صاحب کو لے آؤ۔

تین گھنٹے بعد گاؤں کے لوگ حکیم حسین بخش کا استقبال کر رہے تھے۔ اُس نے پہلے اللہ رکھا کے گھر جا کر اُس کی بیوی کی نبض دیکھی اور پھر سردار لیشن سنگھ کی حویلی چلا گیا۔ وہاں اُس نے پہلے سردار جی کی نبض دیکھی اور چند سوالات پوچھ کر اُس کی گھر والی کو دیکھنے چلے گئے۔ پھر رات بسر وہ ان کے مہمان رہے اور صبح چلتے وقت چند دوائیوں کے ساتھ یہ خوش خبری بھی دے گئے کہ آپ کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے پوری امید ہے کہ اگر آپ باقاعدہ دوائی کھاتے رہے۔ تو ایک سال کے اندر اندر آپ کی گود میں ایک خوب صورت بچہ کھیل رہا ہوگا۔ آپ کے لیے چند اور دوائیاں تلاش کرنے کے لیے مجھے لاہور جانا پڑے گا۔ اس لیے دس دن بعد پھر آؤں گا۔



ایک سال کے اندر اندر حسین بخش ایک بہت بڑے حکیم کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا جو لوگ اسے ایک عزیمت سمجھ کر مقابلے کی تدبیریں سوچا کرتے تھے، اُس کا احترام کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ حسین بخش ایسے لوگوں کو تھپکی دے کر کام لینا جانتا تھا۔ ہمارے گاؤں میں اُس کی ایک بڑی کامیابی بھٹی کر ساتیس بڑھے شاہ اُس سے علاج کروایا کرتے تھے۔

”ناں! میں نے ہاتھ باندھ کر اُس سے کہا تھا کہ میری گھر والی کے لیے بھی کوئی دوائی عنایت کر دیں۔ ہماری شادی کو دس سال ہو چکے ہیں اور ابھی تک ہمیں بچے کی خوشی نصیب نہیں ہوئی۔“ حکیم صاحب نے جواب دیا کہ دوائی میں تمہاری بیوی کی نبض دیکھ کر دوں گا۔ میں نے پوچھا کہ حکیم جی نبض دکھانے کے لیے میں اُس کو یہاں لے آؤں گا۔ میں ایک غریب آدمی ہوں لیکن آپ کو خوش ضرور کروں گا۔ جانتی ہو اُس نے کیا جواب دیا تھا۔ اُس نے کہا تھا ”بھئی ہم غریب آدمیوں سے کچھ نہیں لیا کرتے۔ اُسے یہاں لانے کی ضرورت نہیں۔ میں خود کسی دن تمہارے گاؤں آؤں گا۔ پانچ سات دن بعد آؤ اور مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ اگر تمہارے گاؤں میں کسی اور کے اولاد نہ ہوتی ہو یا اٹھرا کا مرض ہو تو اُسے بتا دینا۔ میں نے سردار لیشن سنگھ کا بتایا تھا اور یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اُس کی شادی کو پندرہ سال ہو چکے ہیں اور ابھی تک وہ اولاد کے لیے ترس رہا ہے حکیم صاحب کہتے تھے کہ ایسی حالتوں میں کبھی کبھی ہمیں بیوی دونوں کا علاج کرنا پڑتا ہے اور علاج بھی چند دن کے لیے نہیں چند مہینوں کے لیے ہوتا ہے۔ اگر ان لوگوں نے اطمینان سے علاج کر دیا تو مجھے یقین ہے کہ ایک سال کے اندر اندر اُن کی خواہش پوری ہو جائے گی۔

میں اب بابا ساتیس کے پاس جانے سے پہلے سردار لیشن سنگھ کو خوش خبری سنانے جا رہا ہوں حکیم کہتا تھا کہ بعض دوائیاں بہت قیمتی ہوتی ہیں۔ میں نے اُسے بتایا تھا کہ سردار لیشن سنگھ کے گھر کسی چیز کی کمی نہیں، وہ سردار اُدھم سنگھ سے زیادہ مالدار ہے میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ سردار اُدھم سنگھ اور گاؤں کے دوسرے زمینداروں نے حکیم صاحب کو وہیں ٹھہرا لیا ہے۔ اور چند دن تک گاؤں سے باہر اُس کے لیے ایک مکان بننا شروع ہو جائے گا۔

آج صبح ہوتے ہی سردار اُدھم سنگھ کا سر اور سارے وہاں پہنچے تھے اور انہوں نے میرے سامنے حکیم حسین بخش کو پچاس روپے دیے تھے۔ اُدھم سنگھ کے چچا کے بیٹے دلیپ سنگھ نے حکیم کو ایک گاتے دیے۔ میں ابھی آتا ہوں۔ اگر ساتیس جی کی طرف سے کوئی بلانے آئے

جانکی داس چند مہینے اُس سے دور رہا لیکن ایک دن وہ بڑھے شاہ کے تکیے میں بیٹھا ہوا تھا کہ جانکی داس نے بھی نبض دکھانے کے لیے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ حکیم نعمت علی کو اُس کی وجہ سے کافی نقصان پہنچ چکا تھا لیکن ایک تفصیلی ملاقات کے بعد اُسے یہ اطمینان ہو چکا تھا کہ یہ شخص بنیادی طور پر جاہل اور طب کے متعلق کچھ نہیں جانتا اس لیے وہ اس اطمینان کے ساتھ اُس سے الگ تھک رہتا تھا کہ کسی دن ضرور کوئی ایسی حماقت کرے گا کہ لوگ اُس سے متنفر ہو جائیں گے اور اُس کی یہ امید اگلے سال پوری ہوگئی۔ پہلا واقعہ یہ تھا کہ سردار ادھم سنگھ نمبر دار کا چچا زاد دلیپ سنگھ جس نے اس کے گھر دو لڑکوں کی پیدائش کی خوشی میں حکیم حسین بخش کو گائے کا نذرانہ دیا تھا۔ اچانک بیمار ہو گیا۔ حسین بخش نے تین دن تک چند دوائیں آزمائیں لیکن جب اس کا بخار بڑھ گیا تو رات کے وقت اُس کی فصد کھول دی اور اس وقت تک اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا رہا۔ جب تک کہ اس کے جسم کی پیش دور نہیں ہو چکی تھی اور جب یہ پیش دور ہو گئی تو پتہ چلا کہ دلیپ سنگھ کے دل کی حرکت بھی بند ہو چکی ہے۔ شاگرد ہوشیار تھا وہ خون والی بالٹی اٹھا کر چپکے سے باہر نکل گیا اور حسین بخش دو گھنٹے ہی ظاہر کرتا رہا کہ مریض کو بخار ترنہ میں نیند آگئی ہے۔

عام حالات میں ادھم سنگھ کے گاؤں میں یہ رات اُس کی آخری رات ہوتی لیکن اُس نے یہ احتیاط کی تھی کہ فصد کھولنے سے پہلے دروازہ بند کر لیا تھا۔ ہوشیار شاگرد خون والی بالٹی ریت سے اتنی صاف کر کے لایا تھا کہ وہ چپک رہی تھی۔ جب گھر والوں کو دلیپ سنگھ کی موت کا علم ہوا تو حسین بخش اُن سے زیادہ دھاڑیں مار رہا تھا۔ ادھم سنگھ بھاگا ہوا آیا تو اُس نے اُسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ سردار جی جس کا وقت آچکا ہوا ہے کوئی دوائی نہیں بچا سکتی۔ کاش میں جان دے کر اس خوب صورت نوجوان کو بچا سکتا۔ سردار جی میں نے بہت جتن کیے تھے لیکن انسان تقدیر کے ساتھ نہیں لڑ سکتا۔

یہ میرے خاندان کی بد قسمتی تھی کہ اتنا بڑا واقعہ دب گیا۔ حکیم نعمت علی نے لاش دیکھ کر جو شبہات ظاہر کیے اُن پر کسی نے توجہ نہ دی اور حکیم حسین بخش کی شہرت میں کوئی کمی نہ آئی اُن کے شاگرد عطا محمد نے ایک دن اللہ رکھا کو یہ کہہ دیا کہ اگر ملک الموت سے پانچ منٹ پہلے بھی حکیم حسین بخش کسی کے گھر پہنچ جائیں تو مریض کی جان بچ سکتی ہے۔ اللہ رکھا کو یہ بات پسند آگئی۔ اور جب بھی وہ حکیم کا ذکر کرتا تھا تو یہ فقرہ ضرور دہراتا تھا۔ چنانچہ یہ بات اتنی عام ہو گئی تھی کہ جہاں لوگ موت کے فرشتے کا ذکر کرتے تھے وہاں حسین بخش کا ذکر بھی ضرور آتا تھا۔

ہمارے گاؤں کے مولوی صاحب نے بڑے غصے میں آکر یہ اعلان کیا تھا کہ ایسی بات کہنا کفر ہے اور ساتیں بڑھے شاہ نے بھی اللہ رکھا کی سرزنش کی تھی لیکن ایسی باتوں سے لوگوں کے اعتقاد میں کوئی فرق نہ آیا۔

چچا شیر علی جو تیس سال کی عمر میں دور دور تک اپنی جسمانی قوت کا لوہا منوا چکے تھے۔ ان کی ایک خوب صورت گھوڑی اچانک غائب ہو گئی تھی۔ ہمارے علاقے میں کتے گر چوری کا مال عام طور پر دریا کے پار پہنچا دیا کرتے تھے اور پھر اس کا کہیں پتہ نہیں ملتا تھا۔ چچا شیر علی نے گھوڑی کی تلاش میں دن رات ایک کر دیا اور اُس کا سراغ لگاتے ہوئے دریا تے بیاس کے پار پہنچ گئے۔ وہاں ہمارے خاندان کے کچھ لوگ آباد تھے۔ انہوں نے چچا شیر علی کو اپنے پاس ٹھہرا لیا۔

بیس دن بعد واپس آتے تو میں نے گاؤں سے باہر لڑکوں کے ساتھ کھیلے ہوئے انہیں دور سے دیکھ لیا۔ میں پوری رفتار سے ان کی طرف بھاگا۔ چچا کے ایک ہاتھ میں چھوٹی سی گھوڑی تھی۔ میں اُن سے لپٹ گیا تو انہوں نے میرا بازو دیکھ کر اٹھایا اور مجھے

گیا۔ جو ایک سو دس سال کی عمر میں نظر کمزور ہو جانے کے باعث عام طور پر باہر کی حویلی میں اپنے کمرے سے بہت کم نکلتے تھے۔

دادا جی نے اپنی لاکھی پکڑ کر اٹھتے ہوئے کہا۔

”میرا شیر بھار رہا ہے۔ چلو مجھے گھر لے چلو۔“

میری ایک چچا زاد نے ان کا دوسرا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ گھر کی طرف چل پڑے۔

اتنی دیر میں اللہ رکھا گھر پہنچ کر میری دادی سے فریاد کر رہا تھا۔

”مال جی شیر علی بنجار سے بے ہوش ہو رہا ہے۔ حکیم حسین بخش یہاں آئے ہوئے ہیں

وہ جس کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہیں وہ اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اگر بابا جی اجازت دیں تو میں

انہیں بلاتا ہوں۔ آپ کو ایسا حکیم کو سوں دور جا کر بھی نہیں ملے گا۔“

میری چچی نے اُن کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”شیر علی کو بہت بنجار ہے،

اور اُس کا باپ اُس کا دشمن نہیں ہے، تم حکیم کو بلالو۔“

اتنی دیر میں میرے پردادا بھی وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے کہا۔

”اللہ رکھا تم بہت بے وقوف ہو۔ اگر حکیم گاؤں میں آیا ہوا تھا تو تمہیں اُسے

ساتھ لے کر آنا چاہیے تھا۔“

اللہ رکھا بھاگتا ہوا باہر نکل گیا اور چند منٹ بعد حکیم حسین بخش اپنے شاگرد عطا محمد

کے ساتھ وہاں پہنچ چکا تھا۔ اُس نے چچا کی نبض دیکھتے ہی دوائی کی پڑیا نکال کر دودھ

کے ساتھ کھلائی اور یہ مشورہ دیا کہ مریض کو کمرے کے اندر لٹا دیا جائے۔

حکیم کے مشورہ پر عمل کیا گیا اور چچا کو کمرے کے اندر بستر پر لٹا دیا گیا۔ حکیم

دوبارہ نبض پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا لیکن چچا جان کسی تکلیف سے کراہ رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں

بند تھیں۔ دادی نے چچا کے پاؤں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”حکیم جی اس کے پاؤں جل رہے ہیں۔“

اپنے کندھے پر بیٹھا لیا۔ جب ہم گاؤں میں داخل ہوئے۔ تو جو بھی چچا شیر علی کو دیکھتا تھا اس قسم کے سوالات پوچھتا تھا۔

”شیر علی تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟ تم اتنے کمزور کیوں ہو گئے ہو؟۔“

یا تم تو پہچانے بھی نہیں جاتے۔“

میں ایسے سوالات پر حیران ہوتا تھا۔ کیونکہ مجھے کسی حالت میں بھی چچا شیر علی کمزور

انظر نہیں آ سکتے تھے۔ میں نے اپنے دل میں اُس وقت ایک دھچکا محسوس کیا۔ جب

چچا جی مجھے کندھے سے اتارتے ہی کھلے صحن میں ایک کھاٹ پر لیٹ گئے تھے۔

”چچا جی میں آپ کی ٹانگیں دبا دوں؟“ میں نے پوچھا۔ انہوں نے لیٹتے لیٹے ہاتھ

بڑھا کر میرا بازو پکڑ لیا، اور اپنے ساتھ لٹا لیا۔ دادی اُن کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر چلا

اٹھیں۔

”بیٹا تم تو بنجار میں جل رہے ہو۔“

تھوڑی دیر میں گھر کی خواتین وہاں جمع ہو گئیں۔ میں نے چچا کی کھاٹ سے اٹھ

کر اُچی جان سے پوچھا۔

”چچا کو کیا ہو گیا ہے؟“

”کچھ نہیں بیٹا وہ ٹھیک ہو جائیں گے تم باہر جا کر اپنے دادا سے کہو کہ وہ کسی

کو حکیم کی طرف بھیج دیں۔“

میں نے دادا جی کو باغ میں تلاش کیا اور انہوں نے ایک آدمی حکیم نعمت علی

کی طرف بھگا دیا۔ لیکن بد قسمتی سے اُس وقت حکیم حسین بخش گاؤں میں کسی مریض کو دیکھنے

آیا ہوا تھا، اور چچا کے بیمار ہو کر کسی دنوں کے بعد گھر آنے کی اطلاع گاؤں میں پھیل گئی

تھی۔

اللہ رکھا بھاگتا ہوا پہلے چچا حیدر علی کے پاس پہنچا پھر میرے پردادا کے پاس

دیکھیں۔ آپ کے بیٹے کا بخار اتر گیا ہے۔ تھوڑا سا خون ضائع ہو جانے سے کچھ نہیں ہوتا۔
نعمت علی چلا یا۔

”خدا کے لیے بند کرا دو اور مجھے دیکھنے دوا۔ ماں جی دروازہ کھلواتے۔“

اندر سے دروازہ کھلا، حکیم اور اس کا شاگرد زخمی کلائی پر پٹی باندھ رہے تھے جس پر رستے ہوئے خون کا نشان نظر آ رہا تھا۔ بظاہر ایسا نظر آتا تھا سب کچھ ٹھیک ہو رہا ہے لیکن حکیم نعمت علی نے نبض پر ہاتھ رکھنے کے بعد چچا کی آنکھ کھول کر دیکھی تو چلا اٹھا۔
”بھئی اب سب دعا کرو۔ حسین بخش تم یہ خون نکالنے کے بعد اب کون سی دوائی دوں گے؟“

حکیم حسین بخش نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

”آپ ان لوگوں کو پریشان نہ کریں۔ مجھے معلوم ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اب میں صرف تین پڑیاں دوں گا اور پھر آپ کے سامنے مریض اٹھ کر بیٹھ جائے گا۔“

حکیم نعمت علی چلا یا۔ ”خدا تمہیں غرق کرے، اب تم کون سی دوائی دینا چاہتے ہو؟ تمہیں معلوم ہے کہ شیر علی بابا رحمت اللہ کا پوتا ہے اور عبدالرحیم کا بھائی ہے جو تمہیں بھاگے کا موقع نہیں دے گا۔ تمہیں معلوم نہیں کہ شیر علی کے ایک ایک بال کے لیے تم جیسے دس حکیم قربان کیے جاسکتے ہیں۔ ظالم کے بچے میں دلیپ سنگھ کی لاش دیکھنے لگا تھا کہ تمہارے شاگرد نے مجھے دھکے دے کر باہر نکال دیا تھا۔ اُس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ کسی نے اُس کا خون نچوڑ لیا ہے۔“

پھر حکیم نعمت علی باہر نکلا اور میرے پردا اُسے مخاطب ہوا۔

”بابا جی! آپ کسی رٹ کے کوکیں کہ وہ گھوڑے پر جائے اور لڑا کر کو بلا لائے۔“



یہ رات ہمارے لیے قیامت کی رات تھی۔ حکیم حسین بخش کی پڑیوں کا کوئی اثر نہ

حکیم حسین بخش نے کہا۔ ”ماں جی ان کا سارا جسم جل رہا ہے۔ بیماری کے ساتھ جوانی کے خون کی پیش کے باعث ان کی حالت خراب ہو رہی ہے۔ میں ایک اور دوائی دیتا ہوں۔ اگر اس کا اثر نہ ہوا تو ہمیں کچھ خون کم کرنا پڑے گا۔“

حکیم صاحب کی دوسری پڑیا کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ اور حسین بخش نے چچا حیدر علی دادی جان اور دادا جان کے سوا سب کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ کوئی خوفناک بات ہونے والی ہے اور میں چچا کے پاس رہنا چاہتا تھا لیکن اتنی جان مجھے بازو سے پکڑ کر باہر میرے پردا کے پاس لے گئیں جواب اُسی کھاٹ پر لیٹے ہوئے تھے جس پر تھوڑی دیر پہلے چچا شیر علی لیٹے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے سینے سے چمٹاتے ہوئے کہا۔

”یوسف اللہ سے دعا کرو کہ تمہارا چچا ٹھیک ہو جائے۔ کہو یا اللہ میرے پیارے چچا کو صحت دے۔“

اور میں یہ فقرہ بار بار دہرا رہا تھا۔

میں نماز مغرب کی اذان سن کر مسجد چلا گیا تو وہاں نمازی بھی چچا شیر علی کے لیے دعائیں مانگ رہے تھے۔ میں نماز کے بعد گھر آیا تو حکیم نعمت علی وہاں پہنچ چکا تھا اور دادا جان کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ لیکن اس کے لیے مریض کے کمرے کا دروازہ بند تھا اور اُس نے خود بھی کہہ دیا تھا کہ ایک طبیب کو دوسرے طبیب کے کام میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ لیکن جب اندر سے دادی کی آواز سنائی دی۔

”حکیم جی میرے بچے کا بہت خون نکل چکا ہے۔ خدا کے لیے اس کو بند کر دیکیں شاید اب یہ بند بھی نہیں ہوگا۔ اگر میرے بچے کو کچھ ہو گیا تو تم زندہ اس گھر سے نہیں نکلو گے۔“

حکیم کہہ رہا تھا ”ماں جی آپ جو صلے سے کام لیں اب ذرا مانتے پر ہاتھ رکھ کر

میں خوف زدہ ہو کر پردا داجی کے پاس آ گیا تھا۔ وہ میری سسکیاں سن کر کہہ رہے تھے۔

”یوسف شیر علی تم سے بہت پیار کرتا تھا نا؟“

”جی باباجی“

”اگر تم رونے تو انہیں تکلیف ہوگی نا“

میں نے بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں ضبط کرتے ہوئے کہا: ”باباجی میں اب

نہیں روں گا۔ میں انہیں تکلیف نہیں دوں گا“

صبح کے چار بج چکے تھے جس سوار کو ڈاکٹر کے لیے بھیجا تھا۔ وہ اُس کے ساتھ پہنچ چکا تھا۔ اُس نے ایک ہی نظر میں سب کچھ دیکھ لیا اور خون سے بھرے ہوئے برتن پر نگاہ ڈالتے ہی دادا جان سے کہا: ”

”میاں جی ہم کسی مرض کے لیے دوائی دے سکتے ہیں لیکن قاتلوں کے ساتھ نہیں لڑ سکتے۔ جس نے یہ خون نکالا ہے وہ قاتل ہے۔ مجھے دکھاؤ وہ کون ہے؟“ اور جب قاتل اور اُس کے شاگرد کی تلاش شروع ہوئی تو وہ دونوں کہیں غائب ہو چکے تھے اور پھر میلوں تک ان کا کوئی سراغ نہ ملا تھا۔

لوگ کہتے ہیں کہ جب گھر کا ہر فرد ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا تو انہیں باہر نکلنے کا موقع مل گیا تھا، اور وہ بھاگ کر اُدھم سنگھ کے گاؤں پہنچ گئے تھے اور اُدھم سنگھ نے انہیں فرار ہونے کے لیے ایک گھوڑی دے دی تھی۔ پھر ایک مدت تک کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں غائب ہو گئے ہیں۔

میرے پردا داجی شیر علی کے جنازے میں چلتے ہوئے گر پڑے۔ لیکن ہوش آنے پر وہ دو آدمیوں کا سہارا لے کر قبرستان پہنچ گئے تھے۔

اس علاقے کی تین نسلوں نے اُن کی ہمت اور طاقت کی اُن گزت داستانیں

ہوا تھا۔

حکیم نعمت علی سے دادا جان، دادا جان اور چچا غلام نبی نے اصرار سے کہا کہ وہ کوئی دوائی دیں اور حکیم حسین بخش نے بھی دبی زبان میں کہہ دیا۔

”حکیم جی ہمارا مقصد اس نوجوان کی جان بچانا ہے۔ اگر آپ کے پاس کوئی بہتر دوائی ہو تو آپ فوراً دے دیں“

حکیم نعمت علی نے کہا: ”میں اپنے ساتھ ایک معجون لایا ہوں۔ خدا کرے کہ اُس سے کوئی فائدہ ہو جائے۔“

دادا جان نے کہا: ”حکیم صاحب جلدی سے وہ معجون نکالو میں اپنے ہاتھ سے کھلاتا ہوں“ جب دادا جان انہیں معجون کھلا رہے تھے۔ تو میں چپکے ستر کے پاس پہنچ گیا۔ اور ان کی

آنکھیں کھلی تھیں۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ مجھے پہچان نہیں رہے۔ میں نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

”چچا جان میں یوسف ہوں“

اُنہوں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

”یوسف بیٹا جیتے رہو۔ خدا تمہیں بڑی عمر دے اور بھائی جان تمہاری تمام خوشیاں دیکھیں۔“

میں رو پڑا تو دادا جان مجھے پکڑ کر باہر لے گئیں۔ دادا جان نے چچا جان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”بیٹا شیر علی آنکھیں کھولو۔ تمہاری تکلیف اب کچھ کم ہوئی ہے یا نہیں؟“

چچا جان بے آنکھیں کھولیں۔ اپنا ہاتھ ذرا بلند کیا پھر وہ آنکھیں جن کے اندر میں نے زندگی کی روشنی، توانائی اور اُن گزت شفقتیں دیکھی تھیں۔ کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اُن کا ہاتھ آہستہ

آہستہ نیچے آگیا۔ گھر کے بچے اور بوڑھے کلمہ پڑھ رہے تھے۔

باب - ۱۶

سُنی تھیں۔ وہ ایک سو دس سال کی عمر تک پہنچنے پر بھی سیدھے چلا کرتے تھے۔ لیکن وہ چچا شیر علی کی موت کے بعد تین ماہ سے زیادہ زندہ نہ رہ سکے۔

جب میں اُن کا جنازہ پڑھ کر واپس آ رہا تھا تو دادا جان نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور وہ یہ سمجھا رہے تھے۔

”بیٹا اب دعاؤں کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ قبرستان ایسی جگہ ہے جہاں کسی نہ کسی دل ہر انسان کو اُٹھا کر لایا جاتا ہے۔ کسی کی فریاد کسی کے آنسو کسی کی چیخیں اس دنیا سے جانے والوں کا راستہ نہیں روک سکتیں۔“

دادا جان کی باتوں سے مجھے بہت ڈھارس ہوتی تھی۔ امی، دادی اور میری چچاں میرا دل بہلانے کی کوشش کیا کرتی تھیں۔ دادا جان کی نصیحتیں سن کر میں گھر میں کسی کے سامنے نہیں روتا تھا اور اپنے آنسو اور سسکیاں بھی ضبط کر لیا کرتا تھا لیکن گاؤں سے باہر میں چھپ چھپ کر چچا شیر علی اور پردادا جان کے لیے روتا کرتا تھا۔

گاؤں میں جنوں، مٹیوں اور چڑیلوں کی کئی داستانیں مشہور تھیں لیکن ایک قصہ جسے پورے علاقے میں دلچسپی سے سنا جاتا تھا اور خاصی اہمیت دی جاتی تھی وہ جمعہ شاہ کا تھا۔ جمعہ شاہ کی کہانی جو میں نے متعدد لوگوں کی زبانی سنی تھی۔ یہ بتی کہ وہ ایک جتن تھا۔ اور ایک مولوی صاحب کے پاس تعلیم حاصل کیا کرتا تھا۔ ایک رات مولوی صاحب نے سبق پڑھانے کے بعد اپنے شاگردوں سے کہا: ”اب تم سب چلے جاؤ اور چراغ بجھا دو۔ کمرے کے کونے سے جواب آیا۔“ بہت اچھا جناب! آپ اطمینان سے سو جائیں۔ میں چراغ بجھا دوں گا۔ پھر تھوڑی دیر بعد مولوی صاحب نے نیم خوابی کی حالت میں دیکھا کہ دُور کونے میں بڑے سٹاگر کا بازو بڑھنا شروع ہوا۔ اور اس کے ہاتھ نے چراغ کے قریب پہنچ کر اُسے گل کر دیا۔ مولوی صاحب ایک صاحب کرامت انسان تھے۔ انہوں نے کہا ”تم ایک جتن ہو اور انسان کے بھیس میں مجھے دھوکا دے رہے ہو۔ تمہاری سزا یہ ہے کہ تم ہمیشہ ہماری قید میں رہو گے۔“ جتن بولا۔

”جناب! اگر آپ مجھے ہر سال آٹھ سو روپے کے لیے آزاد کر دیا کریں تو میں خوشی سے آپ کی قید قبول کرتا ہوں۔“

بزرگ نے اُس کی یہ درخواست مستبول کر لی۔ چنانچہ موسم گرما کی بڑی آندھی کو جو

زیادہ خوش ہوا کرتی تھیں اور یہ کہنا کبھی نہیں بھولتی تھیں کہ اس میٹھے انگور کا پودا یوسف نے لگایا تھا۔ تین چار سال کے اندر یہ بیل اتنی پھیل گئی تھی کہ صحن میں دالان کے اس حصے کے سامنے ایک اچھا خاصا سائبان بن چکا تھا اور گھر کی خواتین کو جب مکان کے اندر جس محسوس ہوتا تھا تو بیل کی ٹھنڈی چھاؤں کے نیچے بیٹھ جایا کرتی تھیں۔

ہمارے گاؤں کے ایک باغ میں اچھی قسم کی ناشپاتیاں تھیں جنہیں عبدالمجید باغبان کشمیری ناشپاتیاں کہا کرتا تھا۔

ستمبر میں گاؤں سے پانچ میل دور ایک میلہ لگا کرتا تھا۔ عبدالمجید نے اس میلے میں ناشپاتیاں لے جانے کے لیے چچا غلام نبی سے ایک دن کے لیے اُن کی ایک گھوڑی مانگی تھی۔ چھوٹے قد کی اس گھوڑی سے سواری کی نسبت باربرداری کا کام لیا جاتا تھا۔ اور چچا غلام نبی کسی ضرورت مند کو مایوس نہیں کیا کرتے تھے۔ رات کے وقت مکان کی چھت پر اس میلے کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں۔ کوئی ماریوں اور کوئی بازی گروں کے حیرت انگیز کڑیوں کا ذکر کر رہا تھا۔ کوئی گشتی لڑنے والے پہلوانوں اور کبڈی کے کھلاڑیوں کے متعلق بتا رہا تھا۔ میری عمر کے چار اور لڑکے بھی وہاں موجود تھے۔ جب بڑی عمر کے آدمیوں نے میلہ دیکھنے کا شوق ظاہر کیا تو وہ بھی تیار ہو گئے۔ میں نے کہا میں بھی جاؤں گا۔ فوراً دوسرے کونے سے دادا جان کی آواز آئی۔ ”یوسف! دھڑاؤ“ میں اُن کے پاس چلا گیا ”تم کہاں جانا چاہتے ہو؟“ دادا جان نے اٹھ کر بیٹھنے پر مجھے پوچھا۔

”جی میں اُن کے ساتھ میلہ دیکھنے جاؤں گا۔“

”ذرا قریب آؤ“ میں بلا جھجک اُن کے قریب چلا گیا۔ انہوں نے ایک ہاتھ سے میرا کان پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے چپت رسید کرتے ہوئے کہا ”شرم نہیں آتی تمہیں؟“

مسئل آٹھ پیر یا اس سے زیادہ دیر چلتی تھی۔ اسے ”جمعہ شاہ“ کہا جاتا تھا اور اس چٹن کی رہائی کا دن سمجھا جاتا تھا جو اس ہولوی کی قید میں تھا۔ ویسے آٹھ پیر کی کوئی پابندی نہ تھی۔ جو آدھی بھی زیادہ نقصان کر جاتی۔ لوگ اُسے ”جمعہ شاہ“ ہی کہہ دیتے تھے۔ گاؤں میں ایک کسان چودھری محمد رمضان کی تویہ حالت تھی کہ وہ جونہی مطلع گردا لو دیکھتا دہائی دینا شروع کر دیتا تھا۔

”بھئی! جمعہ شاہ چلا آ رہا ہے۔“

عام طور پر جمعہ شاہ جون کے آخری اور جولائی کے ابتدائی ایام میں آیا کرتا۔ لیکن ایک دفعہ یوں ہوا کہ۔

مئی کے ابتدائی دن تھے اور محمد رمضان ابھی اپنی گندم کاٹ کر فارغ ہوا تھا کہ آدھی لگتی اور محمد رمضان دہائی دیتا پھرتا تھا۔ لوگو! جمعہ شاہ کی آزادی کے لیے کوئی دن مقرر نہیں! اسے صرف میرا کھلیاں اڑانے کا شوق ہے۔“

فروری میں لوگ پردے لگایا کرتے تھے۔ شہر میں میرے ایک چچا کے دوست کے گھر انگور کی بیل بھتی میں اُس کی ایک ٹھنی کٹا کر لے آیا اور مکان کے صحن کے اندر زمین کھود کر کھاؤ ڈالی اور وہاں گاڑ دی اور نہایت بے تابی سے اس کی کونپلیں چھوٹنے کا انتظار کرنے لگا۔ اُمی جان عام طور پر اس کے قریب بیٹھ کر وضو کیا کرتی تھیں جب گرمیاں شروع ہوئیں تو میرے چچا نے بڑھتی ہوئی بیل کو سہارا دینے کے لیے ارد گرد ٹھنیاں گاڑ دیں۔ برسات میں بیل بہت پھیل گئی اور چچا نے اُسے سہارا دینے کے لیے لکڑیوں کا ایک چھپر سا بنوا دیا۔ اگلے سال بیل چھپر کو اتنی تیزی سے ڈھانپ ہی بھتی کہ اس چھپر کے رقبہ میں اضافہ کرنا پڑا۔

جب پھل کا موسم آیا تو بیل پر سیاہ انگوروں کے گچھے لٹک رہے تھے ہمارے علاقے کی آب و ہوا ایسی نہیں کہ وہاں اچھا انگور پیدا ہو سکے۔ لیکن اُمی جان اس انگور کی بہت تعریف کیا کرتی تھیں اور وہ خود کھانے کی بجائے اسے تقسیم کر کے

میں نے جواب دیا "نہیں اب میں واپس نہیں جاؤں گا۔ میں ابھی آتا ہوں" میں یہ کہہ کر مسجد کے اندر چلا گیا۔ میں نے مسجد کے اندر جا کر وضو کیا، نماز پڑھی اور پھر عبدالمجید کے ساتھ ہو لیا۔

ہم میلے والے گاؤں میں وقت سے پہلے ہی پہنچ گئے۔ دکاندار بھی اپنی دکانیں سجا رہے تھے کہ عبدالمجید نے میری کے ایک درخت کے ساتھ گھوڑی باندھی۔ پاس ہی ایک چادر بچھائی اور دو آدمیوں کی مدد سے بورا اُتار کر وہاں ڈھیر کر دیا۔ وہ اس بات پر بہت خوش تھا کہ اسے ابھی جگہ مل گئی ہے۔ مجھے تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی اور میلے سے میری ساری دلچسپیاں ختم ہو چکی تھیں۔ مجھے اسی عید پر دادا جان نے ایک روپیہ دیا تھا اور یہ نصیحت کی تھی کہ اسے سنبھال کر رکھنا اور انتہائی ضرورت کے بغیر اسے خرچ نہ کرنا۔ اتنی جان نے بھی مجھے دادا جان کا روپیہ سنبھال کر رکھنے کی نصیحت کی تھی۔ میں تھوڑی دیر اور صبر ادھر گھومنے کے بعد عبدالمجید کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ جب مجھ پر غند کا غلبہ طاری ہونے لگا تو میں خالی بورے کے اوپر لیٹ گیا۔ جب صبح دھوپ آئی تو میری آنکھ کھلی اور گاؤں کے چند آدمی پاس کھڑے عبدالمجید کو ملا مت کر رہے تھے کہ تم اسے ساتھ کیوں لاتے ہو۔ عبدالمجید قسمیں کھا رہا تھا کہ میں بے قصور ہوں۔ اس سے پوچھ لو کہ مجھے گاؤں سے نکلنے وقت معلوم نہیں ہوا تھا کہ یہ میرے پیچھے آ رہا ہے۔

انہوں نے مجھ سے پوچھا تو میں نے انہیں یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ میں اپنی مرضی سے آیا ہوں۔ لیکن اس بات سے مجھے بہت پریشانی ہوتی کہ ان لوگوں میں سے کوئی بھی میلے پر نہیں آیا تھا جن کی بانیں سن کر میں نے دادا جان سے چپیت کھائی تھی۔

ہمارے گاؤں کے ایک سکھ ہرنس سنگھ نے کہا "میاں یوسف اٹھو۔ میلہ چل پھر کر دیکھا جاتا ہے۔ جب گرمی محسوس کرو تو اس طرف آدموں کی چھاؤں بہت ٹھنڈی ہے۔ وہاں حلوائی کی دکان بھی ہے اور سوڈا واٹر بھی ملتا ہے۔ وہاں تمہیں

چپیت بہت ملے گی لیکن یہ دادا جان کی پہلی چپیت تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میری دنیا میں کوئی انقلاب آ گیا ہے۔

دادا جان نے کہا "جاؤ سو جاؤ"

میں آکر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ جن لوگوں نے مجھے پہلے جانے پر آمادہ کیا تھا ان کی مجلس اُسی وقت برخاست ہو گئی تھی جب میں نے دادا جان سے چپیت کھائی تھی۔ لیکن میں دیر تک غم و غصہ کی حالت میں کھڑا رہا۔ میں اپنی چپیت سے عبدالمجید کے گھر کے صحن کی طرف دیکھ سکتا تھا۔ پچھلے پر مجھے اس گھر میں چند آوازیں سنائی دیں۔ اٹھ کر دیکھا تو عبدالمجید اس کا بھائی اور بیٹا گھوڑے پر بورا لا رہے تھے۔ میں نے جوتا پہنا اور دبے پاؤں نیچے اتر آیا۔ تھوڑی دیر بعد میں ڈیوڑھی کے نیم وادروازے سے گلی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک مجھے گھوڑی کی آہٹ سنائی دی۔ عبدالمجید رہا تھا۔ بیٹا روشن دین۔ اب تم واپس جا کر سو جاؤ۔ ان ناشیاتیوں کے لیے مجھے تمہیں ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں۔

جب عبدالمجید لدی ہوئی گھوڑی کی لگام پکڑے آگے نکل گیا تو میں قدرے توقف کے بعد اس کے پیچھے چل پڑا۔ کوئی ایک گھنٹہ میں خاموشی سے چلتا رہا۔ جب ہم ایک گاؤں کی مسجد کے قریب سے گزر رہے تھے تو میں نے آگے بڑھ کر کہا چچا عبدالمجید ٹھہرو میں نماز پڑھ کر آتا ہوں۔

عبدالمجید نے مڑ کر دیکھا تو سخت پریشان ہوا۔

"تم اس طرف کیا لینے آتے ہو؟"

"میں بھی میلہ دیکھنے جا رہا ہوں"

عبدالمجید نے کہا "خدا کے لیے مسجد میں بیٹھے رہو صبح ہوتے ہی واپس چلے

جانا۔ ورنہ میری شامت آ جائے گی"

تازہ پکڑے بھی ملیں گے۔ گرم گرم پکڑے کھاؤ اور پھر برف ڈال کر خوب سوڈا پیو۔
ساری تھکا وٹ دور ہو جائے گی۔“

میں اٹھ کر وہاں سے آموں کے جھنڈ کی طرف چل دیا۔ دو چھاڑی والے پکڑے بھی بیچ رہے تھے۔ میں نے ایک سے ایک آنے کے پکڑے مانگے اور اُسے ایک روپیہ دے دیا۔ دکاندار نے ایک تیل کی کتری سے پیسے نکال کر گنا شروع کر دیے تو میں نے کہا ”مجھے پیسوں کی بجائے ایک اسی اور باقی درانیاں یا آنے دے دو۔“ دکاندار نے غور سے میری طرف دیکھا اور ایک اٹھنی اور سات آنے میرے ہاتھ پر رکھ دیے۔ میں نے تمام سکتے غور سے دیکھ کر اپنی جیب میں ڈال لیے اور ایک کاغذ میں لپٹے ہوئے گرم گرم پکڑے کھا کر کچھ فاصلے پر ایک شیشم کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ پکڑے بہت لذیذ تھے اور میری ضرورت سے بہت زیادہ تھے۔ ضرورت سے زائد جو بچ گئے تھے وہ میں نے اُسی کاغذ میں لپیٹ لیے۔ کنویں پر جا کر پانی پیا اور واپس جا کر باقی پکڑے عبدالمجید کے آگے رکھ دیے۔ اور اس کے بعد میہ دیکھنے لگ گیا۔ یہاں میرے لیے پریشانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ میرے لیے دھوپ میں مداروں اور بازگروں کے تماشوں میں کوئی دل چسپی نہ تھی۔ چونکہ یہ ناشپاتی کا موسم تھا۔ اس لیے کئی جگہوں پر دیسی ناشپاتیوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ اور لوگ دھڑا دھڑا ایک پیسہ فی سیر خرید رہے تھے۔ میرے لیے سب سے پریشان کن مسئلہ یہ تھا کہ عبدالمجید اپنی اعلیٰ قسم کی ناشپاتیاں جنہیں وہ کشمیری ناشپاتیاں کہتا تھا ایک آنے فی سیر سے کم بیچنے پر تیار نہ تھا اور دوپہر تک اس کے ڈھیر کے حجم میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ خریدار آتے تھے اور جھگڑا کر کے چلے جاتے تھے۔ میں نے کہا ”چچا عبدالمجید خدا کے لیے انہیں بیچو۔ جب میہ ختم ہو جائے گا تو ان کا کیا کرو گے؟“

عبدالمجید نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”میاں جی یہ شہر میں بھی دو تین پیسے سیر بچ جائیں

گی۔ میں انہیں سستی بیچنے کی بجائے واپس لے جاؤں گا اور کل انہیں شہر میں جا کر بیچوں گا۔“ اس جواب سے میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ میں نے پانچ میل چلنے کے بعد ہی یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ کہ مجھے داداجان کی حکم عدولی کی سزا مل رہی ہے اور میں سوچ رہا تھا کہ میں گھر پہنچتے ہی سب کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کروں گا اور داداجان سے معافی مانگوں گا۔ پھر میں یہ یقین لے کر آیا تھا کہ واپسی پر مجھے پیدل چلنے کی بجائے سواری کے لیے گھوڑی مل جائے گی۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ گھوڑی پر پھر ناشپاتیاں لدی ہوئی ہوں گی اور مجھے پیدل چلنا پڑے گا۔ میں نے اپنے گاؤں کے آدمی تلاش کیے اور انہیں سمجھایا کہ مجید چچا غلام نبی کی گھوڑی مار ڈالنے پر تیار ہوا ہے۔ اس کا ارادہ ہے کہ پھر ناشپاتیوں کا بورا اُس پر لادے اور گاؤں لے جائے۔ یہ کتنی بے وقوفی کی بات ہے کہ دوسرے لوگ ایک پیسے سیر بیچ رہے ہیں اور یہ ایک آنہ مانگتا ہے۔ دو پیسے لینے کے لیے بھی تیار نہیں اور چار پانچ آدمی اس کے گرد جمع ہو کر کہہ رہے تھے ”یا تم عجیب پاگل ہو“ اور وہ چلا رہا تھا ”دیکھو جی پاگل میں نہیں ہوں۔ پاگل یہ لوگ ہیں جو دیسی ناشپاتیوں اور کشمیری ناشپاتیوں میں تمیو نہیں کرتے“

ایک سکتہ نے کہا ”بے وقوف یہ گل جاتے گی“

”گل جاتے گی تو میری گل جاتے گی نا تمہیں اس سے کیا؟ یہ بے وقوف لوگ بھی تو مفت نہیں کھائیں گے“

عبدالمجید کو سمجھانے والے اپنا سامنہ لے کر پیچھے ہٹ گئے اور اُس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد پہلی بار یہ نعرہ لگایا ”لے لو کشمیری جنت کا پھل تین پیسے سیر۔ ایک بار کھاؤ گے ساری عمر یاد کرو گے اور پھر دیسی ناشپاتی کو ہاتھ نہیں لگاؤ گے۔ یہ ناشپاتی سیب کی بہن ہے“

کچھ گاہک اس امید پر اس کے گرد جمع ہو گئے کہ شاید یہ اور نیچے آجائے۔

تمہیں اپنے پیچھے بٹھا لوں گا“

ایک منٹ کے بعد ہم دونوں گھوڑی پر سوار ہو چکے تھے۔ ایک سبکھانے پیچھے سے آواز دی ”میاں یوسف کمال کرتے ہو تم بھی۔ اس کی سزا کم از کم یہ تھی کہ یہ بورا سر پر اٹھا کر گاؤں میں پہنچتا“

میں نے جواب دینے کی بجائے گھوڑی کو چھڑی ماری۔

مجید نے کہا یہ گھوڑی بڑی مٹھی ہے۔ اگر میں تھک نہ گیا ہوتا تو پیدل چل کر جلدی گھر پہنچ گیا ہوتا۔“

میں نے جواب دیا ”جب جانور بھوکا ہو اور اس کا رُخ گھر کی طرف ہو پھر رات بھی آرہی ہو تو اس کی رفتار خود بخود تیز ہو جاتی ہے“

اب گھوڑی مجید کی توقع کے خلاف بہت تیز چل رہی تھی لیکن اس کی چال ایسی تھی کہ ایک میل چلنے کے بعد مجید کے جسم میں درد کی ٹیسس اُٹھ رہی تھیں:

”میاں جی۔ ایسا کرو کہ یہاں مجھے اتار دو ورنہ میں نہ جاؤں گا“

میں نے اُسے ایڑ لگائی۔ ایک دو چھڑیاں ماریں اور وہ بھاگنے لگی۔

رات ہو چکی تھی اور میں جس راستے آیا تھا مجھے قطعاً یاد نہیں تھا۔ تاہم گھوڑی کے متعلق مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے سیدھا گھر لے جائے گی۔ ایک جگہ گھوڑی نے ایک چھوٹی سی کھائی کے اوپر سے پھلانگ لگائی اور مجید ایک طرف لڑاھک گیا۔ اُس نے میری کمر میں مضبوطی سے ہاتھ ڈال رکھے تھے اور میں نے بڑی شکل سے اپنے آپ کو گرنے سے بچایا اور پوری قوت سے گھوڑی کی باگ کھینچ کر اُسے روکا۔ مجید نے چند قدم گھسیٹنے کے بعد مجھے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ اور ہاتھ کمر زمین پر گر پڑا۔ ”چچا ٹھیک ہونا؟“ میں نے گھوڑی سے گودتے ہوئے پوچھا۔

”میاں جی میں ٹھیک ہوں۔ خدا کی قسم گاؤں میں چودھری غلام نبی بھی یہ بات

میں نے محسوس کیا کہ سورج بڑی تیزی سے نیچے جا رہا تھا۔

جب عبدالمجید اپنے گاہکوں کے ساتھ سرکھپا رہا تھا تو میں نے ہیری کے پیچھے جا کر اطمینان سے گھوڑی کو لگام دی۔ اس کا رُخ کھول کر گردن سے پھینکا اور اُسے ہیری سے کچھ فاصلے پر باغ کی طرف لے گیا۔ وہاں ایک درخت سے شاخ توڑنی پھر اطمینان سے گھوڑی پر سوار ہو گیا اور اسے ہانکتا ہوا واپس مجید کی طرف لے گیا آٹھ دس قدم کے فاصلے سے میں نے بلند آواز سے کہا ”چچا مجید السلام علیکم میں جا رہا ہوں“

مجید چلایا ”میاں جی، خدا کے لیے ٹھہرو۔ میرا بیڑا غریب نہ کرو“

”چچا! اب رات ہونے والی ہے تم میرے ساتھ جانا چاہتے ہو تو جلدی سے کام ختم کر لو“

گاؤں کے دو آدمی یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ ایک نے کہا ”یوسف تم جاؤ۔ اس بے وقوف کا علاج یہی ہے“

مجید کسی توقف کے بغیر چلایا ”جنت کا پھل ٹوٹ لو۔ دو دو پیسے۔ دو دو

پیسے“

اور ہجوم اس پر ٹوٹ پڑا۔ جب یہ ڈھیر بہت چھوٹا سا ہو چکا تھا تو لے لو۔ لے لو ایک ایک پیسے لے لو“ کی آواز سنائی دی اور مجید کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ پیسے کون دیتا ہے اور ناشپاتی کون اُٹھاتا ہے۔ گاؤں کے لوگ اُس کی مدد کر رہے تھے۔ میں اُس کے قریب آگیا تو اُس نے اپنی چادر اٹھا کر جھاڑتے ہوئے کہا ”یار! میں واقعی بے وقوف ہوں۔ یہ بات پہلے میری سمجھ میں کیوں نہیں آئی کہ لوگ دگنی قیمت تو دے سکتے ہیں۔ چار گنا کبھی نہیں دیتے“

میں نے گھوڑی سے اترتے ہوئے کہا ”چچا یہ بورا گھوڑی کی بیٹھ پر ڈال دو۔ میں

بہادر سنگھ تھا۔ قد وقامت میں وہ عام آدمیوں کے لگ بھگ معلوم ہوتا تھا۔ لیکن ابھی تک چھٹی جماعت میں تھا اور فیل ہونے کی وجہ سے سکول کے معاملات کا کافی تجربہ رکھتا تھا وہ نئے لڑکوں سے بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتا تھا۔

مجھے اپنی عمر کے لحاظ سے بلند قامت لڑکوں میں شمار کیا جاتا تھا، لیکن بہادر سنگھ جو مجھ سے عمر میں پانچ چھ سال بڑا تھا۔ قد میں چار انچ زیادہ تھا۔ اس کے اوپر کے دانت ذرا لمبے تھے اور منہ سے اتنے نمایاں ہو جاتے تھے کہ اُسے اپنے ہاتھ کی انگلی کی مدد سے بار بار اوپر کا ہونٹ نیچے لانا پڑتا تھا۔ اپنے دانتوں کی بدولت وہ ہر حالت میں مسکراتا ہوا نظر آتا تھا۔ اُس نے پرائمری تعلیم کوئی پانچ میل دور بڑی نہر کے کنارے ایک گاؤں میں چل کی تھی۔ اُس کے باپ کی حویلی گاؤں سے کوئی تین فرلانگ باہر تھی۔

سات سال کی عمر تک اُس کی تمام دلچسپیاں اپنے مویشی چرانے اور اُن کی دیکھ بھال کرنے تک محدود تھیں۔ اُس کے گھر میں دو بھینسیں، دو گائیں تھیں۔ جن کے باعث دودھ اور گھی کی کوئی کمی نہ تھی۔ اس کے باوجود جب اُس نے دوسرے گاؤں کے کسی کسان کے گھر کی خوب صورت بکریاں پسند کیں۔ تو اُس کا باپ چار تیرہ فائٹ ڈپٹ کرنے کے بعد اسے ساتھ لے گیا اور وہاں سے بکری کے دو بچے خرید لایا۔ اُس کے گھر میں کتوں کا ایک جڑا بھی تھا۔ جنہیں سارا دن بند رکھا جاتا تھا اور رات کے وقت چھوڑ دیا جاتا تھا۔ یہ کتے اتنے خوشخوار تھے کہ رات کے وقت کوئی اُن کی حویلی کے قریب سے نہیں گزرتا تھا۔

بہادر سنگھ کے گھر میں ایک گھوڑی تھی۔ جس کی ایک سال کی بچھڑی سے اسے بہت پیار تھا۔ جب کبھی وہ حویلی سے باہر نکل جاتی تھی تو بہادر سنگھ کے سوا کوئی اسے نہیں بکڑ سکتا تھا۔ چھ سال کی عمر میں بہادر سنگھ اس بات پر خوش تھا کہ اگلے سال وہ اپنی بچھڑی پر سواری کیا کرے گا۔ لیکن ساتویں سال بیک ایک دن اُس کے باپ نے یہ فیصلہ سنایا۔ "بیٹا بہادر سنگھ میں نے ماٹرجی سے بات کر لی ہے۔ تم کل سکول

نہیں مانے گا کہ جب مجید کی جان پر ہنی ہوتی ہو تو اس کی گھوڑی بھی ہرن کی طرح پھلانگیں مار سکتی ہے"

میں نے کہا "چچا بیٹھ جاؤ۔ اب ہم آہستہ چلیں گے"

"میری تو بر میں اس کے قریب بھی نہیں جاؤں گا۔ خدا کا شکر ہے کہ تم نے وہ ناشاپتیاں بکوا دی تھیں ورنہ وہ کسی گڑھے میں پڑی ہوتیں۔ میاں یوسف خدا کے لیے تم جلد سے جلد گھر پہنچو لیکن وہاں یہ نہ کہہ دینا کہ میں تمہیں اپنے ساتھ لے گیا تھا"

میں جب گھوڑی کو سرپٹ دوڑاتا ہوا گاؤں میں داخل ہوا تو وہاں بچے، بوڑھے، مرد اور عورتیں میرا انتظار کر رہے تھے۔ دادا جان مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں سیدھا اُن کے پاس پہنچا۔ اور اُن کے قریب دو زانو ہو کر سر جھکائے ہوئے کہا: "دادا جان! میرے منہ پر ایک اور چپت مار دیجئے اور مجھے معاف کر دیجئے"

دادا جان نے پیار سے دونوں ہاتھ میرے سر پر رکھ دیے۔ "بیٹا۔ مجھے معلوم ہے کہ میری چپت سے تمہیں بہت تکلیف ہوئی تھی۔ یہ سراسر میری غلطی تھی، ورنہ تم کبھی گھر سے نہ نکلتے۔ اب میں اپنے خاندان کو یہ نصیحت کر کے جاؤں گا کہ کوئی تمہاری دلازاری نہ کرے۔ دیکھو مجھ سے زیادہ تمہاری امی اور دادی کو تکلیف ہوئی ہے۔ اُن کے پاس جاؤ۔ میں نفل پڑھ کر گھر آؤں گا۔ اور اگر تم سو نہ گئے تو ہم بہت سی باتیں کریں گے"

اُس رات میں دیر تک باتیں کرنے کے بعد دادا جان کے ساتھ ہی سو گیا اور اُس کے بعد جب تک وہ زندہ رہے میں اکثر یہ سوچا کرتا تھا کہ اُن کی ایک چپت کھانے کے بعد میں بیک ایک اُن کے دل سے اتنا قریب ہو گیا یا ہمارے درمیان ایک اور رشتہ ستوار ہو گیا جو اُس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

مائی سکول کے ابتدائی دنوں میں مجھے جن لوگوں سے دلچسپی پیدا ہوئی اُن میں سے ایک

”بیٹا جب سکول میں دل لگ جائے گا تو تم گھر آنے کا نام نہیں لیا کرو گے۔
 پنڈت اوم پرکاش بڑا اچھا استاد ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اُس کے دو شاگرد تھانیدار
 تین فوج میں جمہدار اور چار پٹواری بن چکے ہیں۔ دس سے زیادہ کارخانے میں کلرک
 ہیں۔ بیٹا اگر تم حوالدار بن جاؤ گے تو میں اس گاؤں میں اپنے آپ کو بادشاہ سمجھوں گا۔ تم نے
 اپنے استاد کا ہر حکم ماننا ہے اگر وہ کہے کہ کنویں میں چھلانگ لگا دو تو بھی تمہیں یہی سمجھنا
 چاہیے کہ تمہارا اس میں ہی فائدہ ہوگا۔ اُداسی تو مجھے بھی بہت ہوگی۔ لیکن زندگی میں ایسی
 باتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ پرانری کرنے کے بعد تم ہائی سکول جاؤ گے اور اُس کے بعد
 میں نے سنا ہے کہ اُس سے بھی بڑے سکول ہوتے ہیں جنہیں کالج کہا جاتا ہے۔“
 بہادر سنگھ نے عاجز آ کر کہا: ”باپو جی میں تمام عمر پڑھتا ہی رہوں گا؟“

”بیٹا کل دس سال کی تو بات ہے کہ تم دسویں جماعت پاس کر لو گے۔ اس کے بعد
 تمہیں اچھی نوکری مل جائے گی۔ اور اگر تم چار اور جماعتیں پڑھ لو گے تو بڑے صاحب بن
 جاؤ گے۔“

اگلے دن بہادر سنگھ اپنے باپ کے ساتھ سکول گیا تو ایسر اُن کے ساتھ گھی
 کا ایک چھوٹا ساٹین اٹھانے ہوئے تھا۔ پنڈت اوم پرکاش نے بہادر سنگھ کا
 قد و قامت دیکھ کر پریشانی کا اظہار کیا۔ لیکن گھی کاٹین دیکھ کر اُن کا موڈ ٹھیک ہو گیا۔
 بہادر سنگھ کے باپ سورن سنگھ نے پنڈت جی کے پاؤں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
 ”مہاراج بہادر سنگھ میرا بچہ ہے لیکن اسے انسان بنانا آپ کا کام ہے۔
 اور اگر آپ اس کی چمڑی ادھیڑ ڈالیں تو بھی مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔ میں جانتا
 ہوں کہ انسان بڑی مشکل سے بنتے ہیں۔“
 پنڈت جی نے کہا: ”سردار جی آپ فکر نہ کریں اگر یہ میرا کہا مانتا رہا۔ تو کسی دن بہت

میں داخل ہو جاؤ گے۔ پنڈت اوم پرکاش کہتے تھے کہ بہادر سنگھ کے قد کاٹھ کے رٹکے
 کو تعلیم حاصل کر کے تھانے دار بننا چاہیے۔ کل میں تمہیں سکول لے جاؤں گا۔ اور پنڈت جی
 کے سپرد کردوں گا۔ کچھ پڑھ لو گے اور ان کا حکم مانو گے تو کسی دن بڑے آدمی بن جاؤ گے۔
 ورنہ ساری عمر میری طرح ہل چلاتے رہو گے۔“

میں نے یہ بھی سوچا ہے کہ ہمارا گھر گاؤں سے باہر ہے۔ یہاں تمہاری چھوٹی سی
 بہن کے سوا تمہارے ساتھ کھیلنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ سکول میں تم بہت سے بچوں کے
 ساتھ خوش رہا کرو گے۔ میں نے زمینداری کے کام کے لیے ایسر عیسائی سے بات
 کر لی ہے۔ اُس کو فصل میں سے عیس من دانے دینے پڑیں گے۔ اُس کا لڑکا بھی ہمارے
 پاس کام کرے گا۔ اناج کے علاوہ ایک کھیت میں نے اُن کو کاشت کے لیے دینے
 کا وعدہ کیا ہے۔“

بہادر سنگھ نے بدحواس ہو کر کہا: ”باپو میں اپنے گھر رہنا چاہتا ہوں۔ میں
 سکول نہیں جانا چاہتا۔ میری بچھری کا کیا ہوگا؟ میری بکریاں کہاں جائیں گی؟ اور گائے
 کی بچھیا کون سنبھالے گا؟“

”بیٹا جب تم سکول سے چھٹی کے بعد گھر واپس آیا کرو گے تو تمہیں اپنے جانوروں
 سے پیار کے لیے کافی وقت مل جائیگا۔ اور ایسر کا لڑکا بھی کافی ہوشیار ہے۔
 وہ تمہارے جانوروں کی بہت حفاظت کرے گا۔ تمہاری ماں اور بہن بھی تو تمہارے
 جانوروں سے بہت پیار کرتی ہیں۔“ بیٹا میں تمہارے فائدے کی سوچ
 رہا ہوں۔ تم نے کبھی سکول جا کر دیکھا ہے کہ بچے وہاں کتنے خوش
 ہوتے ہیں؟

”پتا جی میں وہاں کبھی نہیں گیا۔ میں بہت ڈرتا ہوں اور سکول سے دور رہنا
 چاہتا ہوں۔ انسان ایک جگہ بند ہو کر کیسے بیٹھ سکتا ہے؟“

”اچھا بہادر سنگھ تم کان پکڑ کر دکھاؤ“

”جی کان پکڑ کر؟“

”ہاں“

بہادر سنگھ نے غور سے پنڈت جی کی طرف دیکھا اور سر نیچے کر لیا اور ہاتھ کی انگلی سے اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کرنے لگا۔

”بے وقوف کس بات پر ہنس رہے ہو! تمہیں معلوم ہے کہ یہاں حکم نہ ماننے کی سزا ملتی ہے۔“

”ہاں جی یہ مجھے پتا جی نے بتایا تھا۔“

”اچھا تو پکڑو کان۔“

بہادر سنگھ نے غور سے پنڈت جی کی طرف دیکھ کر پوچھا ”جناب اسی طرح؟“

”بے وقوف اور کس طرح۔ میری طرف اتنی طرح کیوں دیکھ رہے ہو؟“

جناب میرا مطلب ہے کہ اسی طرح بیٹھے بیٹھے کان پکڑوائیں گے؟ عجیب گدھے ہو تم، تمہارا مطلب ہے میں تمہارے سامنے کھڑا ہو کر ناچوں؟ جلدی کرو۔“

بہادر سنگھ نے اپنی قمیض سے ہاتھ صاف کیے ایک بار پھر پنڈت جی کی طرف دیکھا اور پھر اچانک گھٹنوں کے بل ہو کر پنڈت جی کے دونوں کان پکڑ لیے۔ اُس کی انگلیوں کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ پنڈت جی کرب کی حالت میں چلا اُٹھے۔

”بھتی اس پاگل کو ہٹاؤ۔“

”ایک لڑکے نے بھاگ کر اُس کے باپ کو آواز دی۔ پنڈت جی بے بسی کی حالت میں تھے کہ بہادر سنگھ نے کہا۔ ”ماسٹر جی اگر اجازت ہو تو چھوڑ دوں؟“ پنڈت جی خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ اُس کا باپ بھاگتا ہوا اندر آیا اور چلا یا۔

”بڑا آدمی بن جائے گا۔“

”جناب جس دن یہ آپ کا کہا نہیں مانے گا تو اُس دن اس کی مرمت کیا کر دیں گا۔ کیوں بہادر سنگھ تم یہ وعدہ کرتے ہو کہ پنڈت جی کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دو گے۔“

”جی نہیں بالکل نہیں۔“

”اچھا سردار جی اب آپ جاتیں اور اس لڑکے کے تعلق بے فکر رہیں۔“ سورن سنگھ سکولی کے احاطہ سے باہر نکلا تو اُسے پٹاری دکھائی دیا اور اس کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گیا

پٹواری نے پوچھا۔ ”سردار جی آج آپ ادھر کیسے آگئے ہیں؟“

”پٹواری جی آپ سب کہا کرتے تھے کہ بہادر سنگھ کو سکول بھیج دو۔ آج میں نے آپ

کا کہا مان لیا ہے۔“

پٹواری نے کہا۔ ”بہت اچھا کیا آپ نے یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔“

پھر وہ باتیں کرتے ہوئے پاس ہی بڑے درخت کے نیچے چبوترے پر بیٹھ گئے۔ اُدھر سکول کے اندر بہادر سنگھ کے تعلیمی دور کا پہلا مرحلہ شروع ہو چکا تھا۔

پنڈت آدم پکاش نے پوچھا۔

”بہادر سنگھ تم بتاؤ کہ یہاں کیوں آئے ہو؟“

”جی مجھے باپو جی نے حکم دیا تھا۔“

”بھتی میرا مطلب ہے کہ یہاں تم کیا کرو گے؟“

”جی جو آپ کہیں گے۔“

”اچھا اگر میں یہ کہوں کہ بھاگ کر نہر میں چھلانگ لگا دو تو؟“

”جناب اگر آپ یہ کہیں تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ میں ہر روز نہر میں چھلانگیں

لگایا کرتا ہوں۔“

”بہادر سنگھ یہ کیا کر رہے ہو؟“
”پتا جی انہوں نے مجھے کان سے پکڑنے کا حکم دیا تھا۔“ بہادر سنگھ نے گھبرا کر کان چھوڑ دیئے۔

پنڈت اُدم پر کاش چند ثانے سر کپڑ کر بیٹھا رہا اور پھر وہ سورن سنگھ پر برس پڑا۔
”اس پاگل کو تم کہاں سے لے آئے تھے میرے پاس؟“
پنڈت جی پہلے میری بات سُنئے۔ اگر اُسے آپ نے کان پکڑنے کا حکم دیا تھا تو یہ بالکل بے قصور ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں ہے کہ سکول میں اپنے کان پکڑے جاتے ہیں یا گھر میں بھاگنے والی بکریوں کو یا اپنی بچھیا کو کان سے پکڑ کر روک لیتا ہے اور اس کام میں اتنا ہوشیار ہے کہ جب گائے کان پکڑ لیتا ہے تو بھی اُسے بھاگنے نہیں دیتا۔
”تمہارا مطلب ہے کہ میں گائے یا بچھیا ہوں؟“

”نہیں پنڈت جی اسے کانوں سے غلطی لگ گئی تھی۔ اگر آپ اسے سمجھا دیتے کہ کان کس طرح پکڑے جاتے ہیں تو یہ کبھی اس طرح نہ کرتا۔ یہ پیارا کبھی سکول نہیں آیا۔ آپ جو تے ماریں لیکن اسے معاف کر دیجئے۔ میں بھی آپ سے معافی مانگ لیتا ہوں مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ میرے سکول سے نکلنے ہی اسے کان پکڑنے کا حکم دیں گے اور یہ اپنے کان پکڑنے کے بجائے آپ کے کان پکڑ لے گا۔ پہلے آپ اسے کان پکڑنا سکھادیں۔ پھر اگر اس نے حکم عدلی کی تو میں اس کی ہڈیاں توڑ دوں گا۔“

پنڈت جی نے ایک لڑکے کو آواز دی۔

”او پیارے لال ادھر آ۔ اس بے وقوف کو کان پکڑ کر دکھاؤ۔“
پیارے لال نے جھٹ اپنے کان پکڑ لیے۔ اس کے بعد پنڈت جی نے بہادر سنگھ سے کہا۔

”اب تم اسی طرح ٹانگوں کے نیچے سے ہاتھ گزار کر کان پکڑو اور جب تک میں

چھوڑنے کے لیے نہ کہوں اُس وقت تک پکڑے رکھو۔“
سورن سنگھ نے کہا ”پنڈت جی یہ اگر مڑ بھی جاتے تو آپ کے حکم کے بغیر کان نہیں چھوڑے گا۔“

یہ پہلا تجربہ بہادر سنگھ کے لیے کافی تکلیف دہ تھا۔ لیکن اُس نے آدھ گھنٹہ انتہائی سکون کے ساتھ یہ تکلیف برداشت کی۔ پنڈت جی نے پوچھا
”کیوں نالائق اب پتہ چلا کہ کان کیسے پکڑے جاتے ہیں؟“
بہادر سنگھ نے مڑ جھاتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”جی جناب مجھے پتہ چل گیا ہے۔“

”اچھا چھوڑ دو اور سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔“

بہادر سنگھ نے کان چھوڑ کر بڑی مشکل سے اپنی کمر سیدھی کی تو پنڈت جی نے کہا۔

”چونکہ تم نے جان بوجھ کر شرارت نہیں کی تھی۔ اس لیے میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔ اب جاؤ۔ آج تمہیں چھٹی ہے۔ لیکن گھر جانے سے پہلے وہاں دکان سے قاعدہ تختی اقلیم دولت خرید لو۔“



یہ واقعہ بہادر سنگھ کے گاؤں کے لڑکوں میں ہی نہیں بلکہ اُس کے دیہات کے لڑکوں نے بھی مشہور کرنے میں کافی دل چسپی لی تھی۔ اس کے باوجود مجھے ایسی باتوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ جب بہادر سنگھ سے پوچھا جاتا تھا تو وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنس دیا کرتا تھا۔ اُسے کسی بات کی تردید کرنے کی عادت نہ تھی۔ لیکن ایک واقعہ اُس سال پیش آیا جب میں چھٹی جماعت میں بہادر سنگھ سے جاملتا تھا۔ ماسٹر گلن ناتھ بہت سے معاملات میں بہادر سنگھ کی ضد تھے۔ بہادر سنگھ جس قدر لمبا تھا وہ اسی قدر

”جناب یہاں بید لگ گیا تھا۔“

”کس نے مارا آپ کو بید سے؟“

”جی میرا اپنا بید لگ گیا تھا۔ وہ بد معاش جو بہادر سنگھ ہے ناجی۔ اُس سے

میں بہت تنگ آگیا ہوں۔ اُس کا کوئی بندوبست کریں ورنہ میں خودکشی کر لوں گا۔“

ہیڈ ماسٹر صاحب نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”اس وقت آپ کو خودکشی کی نہیں

بلکہ ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ آپ فوراً ہسپتال جائیں اور اس کی مرہم پٹی کروائیں۔ اگر بہادر

سنگھ نے کوئی شرارت کی ہے تو اُسے اس کی پوری سزا دی جائے گی، لیکن آپ اپنے

زخم کے علاج کی فکر کریں۔“

اس عرصے میں سائنس ماسٹر کمرے میں آگیا اور اُس نے ماسٹر جگن ناتھ کی کلائی

دیکھتے ہوئے ہیڈ ماسٹر صاحب سے کہا۔

”سُراں کو چوٹ کی وجہ سے زیادہ تکلیف ہو رہی ہے، میرا خیال ہے کہ اگر اس پر

سپرٹ لگا دی جائے تو درد کم ہو جائے گا۔“

ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا تو پھر جلدی کیجئے اور سپرٹ لگا کر انہیں ہسپتال لے جائیے۔“

سائنس ماسٹر انہیں لیبارٹری میں لے گیا اور وہاں رُوئی کا پچھا سپرٹ میں کر کے

اُن کی کلائی پر رکھتے ہوئے کہا۔

”ماسٹر جی صرف ایک منٹ تکلیف ہوگی پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

اور ماسٹر جگن ناتھ کی یہ حالت تھی کہ جو غصہ اُسے بہادر سنگھ پر آیا تھا اسی قدر

سائنس ماسٹر پر آ رہا تھا۔ اُس نے پچھا اتارنے کی کوشش کی لیکن سائنس ماسٹر نے اُس

کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیے۔ وہ چلا رہا تھا۔

”خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو میرا دل ڈوب رہا ہے۔“

ایک گھنٹہ بعد ماسٹر جگن ناتھ ہسپتال سے پٹی کروا کر واپس آیا تو اُسے پتہ چلا کہ

چھوٹے نظر آتے تھے۔ جگن ناتھ کے سر کے پیچھے کے بال بہت چھوٹے تھے لیکن اگلے

حصے کے بال اتنے لمبے تھے کہ جب وہ بکھرنے لگے تو ہونٹوں تک ان کا منہ چھپ جاتا

تھا۔ بہادر سنگھ اس بات پر بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کیا کرتا تھا۔ ایک دن آخری

ہفتہ اتوار کی چھٹیاں گزارنے کے بعد بہادر سنگھ سکول آیا تو اُس نے سکول کا کام نہیں

کیا ہوا تھا۔ ویسے بھی بہادر سنگھ کی عادت تھی کہ گھر جا کر سکول کے کام کو بہت کم ہاتھ

لگاتا تھا۔ اس دفعہ کام نہ کرنے والوں کو چار چار بید مارے گئے۔ بہادر سنگھ کی باری

آئی تو ماسٹر جگن ناتھ نے اتنے غصے کی حالت میں بید بلند کیا تو اُس نے اپنا ہاتھ پیچھے

ہٹا لیا بید ڈیسک پر لگا اور اس کے ساتھ ہی سر کی جنبش کے باعث ماسٹر جگن ناتھ

کے بال ماتھے پر بکھ گئے۔ ماسٹر جی نے بید والے ہاتھ سے اپنے سر کے بکھرے ہوئے بال

ٹھیک کئے اور دوبارہ زیادہ زور سے بید مارنے کی کوشش کی لیکن بہادر سنگھ نے

پہلے سے زیادہ پھرتی سے ہاتھ پیچھے کر لیا اور ماسٹر جی آپے سے یاہر ہو گئے۔ اُن کی

تیسری کوشش یہ تھی کہ بہادر سنگھ کا ہاتھ اپنے ہاتھ کے اوپر رکھ لیا اور بید مارنے کی

کوشش کی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگر اب تم نے ہاتھ پیچھے کیا تو چمڑی ادھیڑ دول گا۔

لیکن بہادر سنگھ اس مرتبہ بھی ہاتھ پیچھے کرنے سے نہ رہ سکا۔ بید پھر ڈیسک پر لگا اور ساری

کلاس ہنس پڑی۔ ماسٹر جگن ناتھ نے ہانپتے کانپتے اپنے بال ٹھیک کے پھر مضبوطی سے

بہادر سنگھ کے دانتیں ہاتھ کی کلائی اپنے دانتوں میں پکڑ لی اور اپنی آنکھیں پوری

قوت سے بید مارا۔ بہادر سنگھ نے عین وقت پر اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی کلائی

پر لگا اور انہوں نے درد سے کراہتے ہوئے ”تیرا بیڑا غرق“ کہہ کر اپنی کلائی پکڑ لی۔ ماسٹر

جگن ناتھ غصے کی حالت میں کانپتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے اور سیدھے ہیڈ ماسٹر

صاحب کے کمرے میں پہنچے۔ ہیڈ ماسٹر نے اُن کی کلائی سے رستا ہوا خون دیکھا تو پوچھا

”اُوہو ایسا زخم آپ کو کیسے آیا؟“

ہیڈ ماسٹر صاحب خود کلاس روم میں جا کر اس معاملے کی تحقیقات کر چکے ہیں اور انہوں نے بہادر سنگھ کو کچھ نہیں کہا۔ لڑکوں نے جو کچھ بتایا تھا اُس سے ہیڈ ماسٹر صاحب کو جگن ناتھ کی بجائے بہادر سنگھ سے کچھ ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ تاہم ماسٹر جی کی دلجوئی کے لیے بہادر سنگھ دوسرے سیکشن میں بھیج دیا گیا تھا۔

پاپ - ۱۸

گاؤں کے گرد پھیلدار درختوں کے باغوں کے علاوہ کئی دوسرے درخت پھیلے ہوئے تھے جن پر مختلف اقسام کے پرندوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ بعض پرندے خاص خاص ہوں میں آیا کرتے تھے اور ہر موسم کی تبدیلی کے ساتھ فصل کے کھیتوں اور درختوں میں غائب ہو جاتے تھے۔ اُن کی آمد اور واپسی کے ایام میں اُن کے غول بڑی توجہ سے دیکھے جاتے تھے۔

گاؤں کی آبادی میں ایک عنصر ایسا بھی تھا جس کی آمد و رفت کے ساتھ کبھی کسی کو کوئی دل چسپی نہیں ہوتی۔ یہ عنصر شہد کی بڑی مکھیاں تھیں جنہیں پنجابی زبان میں ڈومنا کہا جاتا ہے۔ شہد کی عام مکھیوں اور ڈومنے میں فرق یہ تھا کہ عام مکھی جب کسی درخت یا جھاڑی کے ساتھ چھتہ لگاتی تھی تو لوگ بہت خوش ہوتے تھے اور کچھ عرصہ بعد جب وہ اطمینان سے شہد اُتار لیتے تھے تو مکھیاں کہیں اور چلی جاتی تھیں۔

گاؤں میں دو چار آدمی ایسے ہوتے تھے جو چھوٹی مکھی کا شہد نکال کر بیچا کرتے تھے لیکن بڑی مکھی ڈومنا کی بات اور تھی۔ اُس سے شہد حاصل کرنا جان جو کھوٹا کام تھا اور جو شہد حاصل کرنا چاہتے تھے ایک مستقل دشمن سے نجات حاصل کرنے کے لیے ان کی آؤ بھگت کرتے تھے اور وہ نصف سے زیادہ شہد بھی لے جاتے تھے اور یہ بلاوجہ نہیں تھا۔ بڑی مکھی کسی درخت کے ساتھ گھر بنا لیتی تھی تو اُس پاس کے سنے والوں کو اپنی سلامتی کے لیے اس بات کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ کہ کوئی بڑی مکھی سے چھیڑ چھاڑ نہ کرے۔ کیونکہ اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنا ایک خطرناک دشمن کو بھرپور

لیکن جب گرمیاں آئیں گی تو یہ مکھیاں بہت خطرناک بن جائیں گی۔ خدا کرے اس سے پہلے پہلے انہیں اپنا گھر تبدیل کرنے کا خیال آجائے۔

چودھری غلام نبی نے کہا۔ ”مولوی جی! ان کے ساتھ کوئی چھپر چھاڑ نہیں کرے گا۔ جن لوگوں کو یہ علم ہو چکا ہے کہ یہاں ڈومنا لگا ہوا ہے۔ وہ دُور سے ہی راستہ چھوڑ دیتے ہیں۔ دیکھتے ساتھ والے کھیت میں کتنی پگڈنڈیاں بنی ہوئی ہیں۔ کل صوبہ سنگھ دہائی دے رہا تھا کہ یہ مکھیاں میرا کھیت برباد کر دیں گی۔ جانکی داس نے اسے سمجھایا تھا کہ شہد کی مکھیوں کو ٹریوں میں چھپرنا پاپ ہے۔ جب گرمیاں آئیں گی تو میں تمہیں ایک چیز دوں گا وہ چھپنے کے نیچے سلگا دینا تم دیکھو گے کہ مکھیاں کونوں دُور چلی جائیں گی۔ مولوی محمد عبداللہ نے کہا۔ ”یار وہ جانکی داس پاگل ہے!“

دھواں سلگانے کے لیے ان جھاڑیوں میں سے اُن کے چھپنے کے نیچے کرن جاسکتا ہے؟“
”مولوی جی! سردیوں میں تو ان مکھیوں سے کوئی خطرہ نہیں اور اس کے بعد یہ خود ہی کسی اُونچے درخت پر چلی جائیں گی۔ ورنہ انہیں کسی نہ کسی طرح اڑا دیا جائے۔ جانکی داس کہتا تھا میں انہیں اڑانے کے کئی طریقے جانتا ہوں، شہد نکالنے سے پہلے انہیں اڑا دینا بے وقوفی ہے۔ سائیں بڑھے شاہ کہتا تھا کہ شہد نکالنے کے لیے میں اپنے ایک مرید کو بلاؤں گا۔“



مارچ کے آخری دن تھے۔ گاؤں سے باہر حدنگاہ تک گندم کے کھیت اہلہا رہے تھے۔ ہوا خوشگوار تھی۔ سائیں بڑھے شاہ اور اللہ رکھا صبح کے وقت گھر سے نکلے تو اللہ رکھا جو تھوڑی دیر پہلے چودھری غلام نبی کی حویلی سے گئے کا تازہ رس پی کر آیا تھا۔ اس کے پیچھے ہولیا۔ جب وہ جانکی داس کے ڈیرے کے قریب سے گزرا تو حسب معمول وہ سر کے بل کھڑا تھا۔ سائیں بڑھے شاہ نے کہا۔ ”کیسا بے وقوف معلوم ہوتا ہے یہ۔“

سائیں جی یہ روز اسی طرح کرتا ہے۔ ابھی جب میں پہلے یہاں سے گزرا تھا تو یہ ایک ٹانگ پر کھڑا تھا۔ ”دوسری ٹانگ کہاں گئی تھی؟“ بڑھے شاہ نے پوچھا۔

جملے کی دعوت دینے کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے گاؤں میں بڑی نسل کی مکھیوں کا ایک طاقت ور قبیلہ مستقل طور پر موجود رہتا تھا۔ جو کبھی اپنے پرانے گھر سے اچانک غائب ہو جاتا اور پھر اچانک دیکھا جاتا کہ کسی دوسری جگہ اس نے ایک نئے چھپنے کی تیاری کے کام کی ابتدا کر لی ہے۔

ایک سال انہیں گاؤں کی مسجد کا مینارہ پسند آگیا۔ اور امام مسجد مولوی عبداللہ بہت فکرمند رہتے تھے کہ یہ مکھیاں اذان سن کر اُن پر حملہ نہ کر دیں۔ چنانچہ وہ اپنا کھیس اپنے پاس رکھتے تھے تاکہ بوقت ضرورت کام آسکے۔ دوسرے سال ڈومنے کو پاپ ہی پاپ کا ایک درخت پسند آگیا، ایک سال اُس نے جاس کے اُس درخت پر قبضہ کر لیا تھا جس کا پھل باقی درختوں سے زیادہ سبز رہتا تھا۔ لوگ یہ بہت سوچا کرتے تھے کہ جب بارشیں شروع ہوں گی اور جان پکنے کا موسم آئے گا تو ڈومنا خود بخود کہیں چلا جائے گا لیکن یہ توقع پوری نہ ہوئی اور اسے یہ جگہ اتنی پسند آئی کہ وہ سردیوں کے آغاز تک وہیں رہا۔ پھر ایک دن اچانک اُسے سوچھی کہ چودھری غلام نبی کے باغیچے کے گرد گھرنے کی بار کے اندر چھپتے لگایا۔

گاؤں سے دو اطراف کو جانے والے راستے اس اڑنے کے قریب آکر گزرتے تھے، اس لیے اس چھپنے کی حفاظت گاؤں کی سلامتی کے لیے اہم سمجھیں گئی۔ ایک دن مولوی محمد عبداللہ وہاں سے گزرے اور انہوں نے چھپتے دیکھ کر کہا۔ ”چودھری غلام نبی! ان مکھیوں سے بچ کر رہنا، بڑی ظالم ہوتی ہیں۔ میں نے ایک میلے میں انہیں تباہی مچاتے دیکھا تھا۔ ابھی تو سردیوں میں تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ اُونچے درخت چھوڑ کر ان جھاڑیوں میں چھپتے لگانے کا مطلب یہ ہے کہ اس سال سردیاں بہت پڑیں گی، بارشیں خوب ہوں گی۔

اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار کو اپنے بچاؤ کے لیے عقل دی ہے

سنہ ایک کانٹے دار جھاڑی جسے چل بھی لگتا ہے۔ جو بچے شوق سے کھاتے ہیں۔

محسوس ہوتی۔

اللہ رکھانے کہا "اگر تم بچاس کے ہونے والے ہو تو مجھ سے بارہ تیرہ سال بڑے ہو گے لیکن یہ عقل کیسے مان سکتی ہے کہ صرف الٹا کھڑا ہونے سے انسان اتنا کچھ حاصل کر لیتا ہے؟

"ساجن! صرف الٹا کھڑا ہونے سے نہیں! اس کے لیے کچھ اور بھی کرنا پڑتا ہے۔ ہم سنیا سی لوگ ہیں اور جنگل کی بوٹیوں سے ہماری دوستی ہے۔ الٹا کھڑا ہونے کے علاوہ ہم کئی اور ورزشیں بھی کرتے ہیں اور ہر ورزش سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُسی صورت میں حاصل کیا جاسکتا ہے جبکہ اُس کے ساتھ کوئی خاص بوٹی استعمال میں لائی جاتے۔"

سائیں بڑھے شاہ نے کہا: "یار کچھ ایسی باتیں ہمیں بھی بتادو۔ آخر ہم تمہارے بڑوسی ہیں۔"

جائکی داس نے کہا: "ساجن! یہ دنیا ایک بازار ہے یہاں نقد سودا ہوتا ہے۔ کچھ لینے کے لیے کچھ دینا پڑتا ہے۔ باتوں سے کام نہیں چلتا۔"

سائیں بڑھے شاہ کو پہلی بار اپنے بڑوسی کی اہمیت کا احساس ہوا۔ اُس نے کہا: "یار! آج تک جو کام تم نے کہا ہے کیا وہ ہم نے نہیں کیا؟"

"ساجن! آپ نے ہم سے کوئی چیز مانگی ہے۔ جو میں نے نہیں دی؟ اگر آج سے ہم ایک دوسرے کے کام آنے میں اپنا فائدہ سمجھ لیں تو پھر جو میرا ہے وہ آپ کا ہے۔ جو آپ کا ہو گا وہ میرا ہو گا۔ جب میں کسی بوٹی کی تلاش میں نکلا کروں گا تو آپ کو ساتھ لے لیا کروں گا۔ اور جب کوئی آپ سے جن اور بھوت نکوانے آیا کرے تو مجھے بلوا لیا کریں۔"

سائیں بڑھے شاہ نے کہا: "بلانے کی کیا ضرورت ہے تم ہر وقت میرے پاس

آسکتے ہو۔ اب میں کچھ گھومنے پھرنے کے بعد چوہدری غلام نبی کے رہٹ پر جاؤں گا۔ تم

"جناب دوسری ٹانگ بھی ساتھ ہی تھی، لیکن وہ اُس نے اُپر اٹھا رکھی تھی۔ سائیں نے کہا۔ وہ میں بھی اٹھا سکتا ہوں۔"

"جناب! سب ٹانگ اٹھا سکتے ہیں اور سر کے بل بھی سب ہی کھڑے ہو سکتے ہیں صرف لوگوں کے سامنے ایسا کرنا بے وقوفی کا طریقہ ہے۔"

جائکی داس وہیں سے چلا آیا "اول اللہ رکھے کے بچے کیا بک رہے ہو؟" سائیں بڑھے شاہ نے کہا: "بھئی جائکی داس غصہ نہ کرنا۔ اللہ رکھے کو یہ معلوم نہیں تھا کہ تم سر کے بل کھڑے ہو کر سن بھی سکتے ہو۔"

میں غلام نبی کے رہٹ پر جا رہا ہوں تم بھی آجاؤ۔ وہاں کھلی جگہ بیٹھ کر خوب باتیں کریں گے تمہیں گئے بھی بہت اچھے ملیں گے۔"

جائکی داس نے بارہاں پر وزن ڈال کر سر آگے کرتے ہوئے کہا۔

"ساجن! اس ورزش سے کان بھی تیز ہوتے ہیں اور آنکھیں بھی روشن ہو جاتی ہیں اور عقل بھی بڑھتی ہے۔" صرف اُن کو کہہ رہے تھے: "سائیں بڑھے شاہ نے طنز کرتے ہوئے کہا

"یہ ہنسنے کی بات نہیں ساجن!"

عمر بھی بڑھتی ہے۔"۔۔۔ یہاں تک کہ جائکی داس پاؤں کے بل کھڑا ہو گیا اور ہاتھ بھاڑتے ہوئے کہا۔

"ساجن! حیران کس بات پر ہو۔ اگلے سال میری عمر بچاس سال ہو جائے گی تو میں یہ لٹیں کٹوا دوں گا۔"

"کسی پہچان والے کو بلا کر دکھا دینا! وہ ان کی لمبائی دیکھ کر تادے گا کہ میری عمر کتنی ہے؟ اس کے باوجود میرا ایک بال سفید نہیں ہوا۔ دانت مضبوط ہیں۔ اگر آزمانا چاہتے ہو تو میرے ساتھ بھاگ کر دیکھ لو۔ کسی درخت پر چڑھ کر آزما دیکھو۔ ورنہ بڑی نہریاں میں میرے ساتھ تیر کر دیکھ لو۔ سردیوں میں صرف راکھ مل لینے سے مجھے کوئی کھڑا پننے کی ضرورت نہیں

بھی وہاں آجاؤ۔ وہاں کھلی جگہ بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کریں گے۔
 "سائیں جی میں بھوجن کرتے ہی وہاں آجاؤں گا۔" جانکی داس نے کہا۔
 وہاں سے چلتے ہوئے اللہ رکھانے کہا۔ "سائیں جی آپ تازہ رس نہیں پئیں گے؟"
 "اگر چوہدری غلام نبی کا بیٹا چل رہا ہو تو میں رس بھی پیوں گا اور یار تھوڑا سا گرم کر دے گا۔"
 "بھی لے آنا!"

"اس وقت میں گئے چوسنا چاہتا ہوں"

تموڑی دیر بعد سائیں بڑھے شاہ ایک کھلی جگہ مٹ کے چھوٹے سے حوض کے قریب بیٹھا ہوا تھا جس کے اندر رہٹ سے نکلنے والے پانی کی دھار گرتی تھی۔ اُس کے نیچے پرانی بچھی ہوئی تھی جو اُسے ہر کپڑے سے زیادہ آرام دہ محسوس ہوتی تھی۔
 غلام نبی نے سائیں کو دیکھتے ہی کہا۔

"آؤ سائیں جی! تشریف لاؤ۔ آج تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ عید کا دن ہے۔ یہ بتائیے کہ آپ کو کیا کھلایا جائے؟"

سائیں نے کہا۔ "چوہدری جی بات یہ ہے کہ آپ کے گھر کی مال بھی دوسروں کی مرغی سے زیادہ لذیذ ہوتی ہے۔ جب میں یہاں سے کوئی چیز کھا کر آتا ہوں تو مدت تک کبھی کے ہاں کھانے کا لطف نہیں آتا۔"
 اپنے گھر کے کھانے کی تعریف سننا چوہدری غلام نبی کی شخصیت کا ایک کمزور پہلو تھا۔

"اچھا یہ بناؤ کہ آج خاص طور پر کیا کھانا پسند کر دے۔ یہاں ہوا بہت اچھی ہے۔ آپ کا اور اللہ رکھا کا کھانا یہیں پکایا جائے اور آپ کے ساتھ کوئی اور ہوا تو اُسے بھی یہیں بلا لیا جائے گا۔"

سائیں نے کہا۔ "آپ کے گھر سے جو کچھ بھی آئے گا۔ وہ بہت اچھا ہوگا۔"
 "سائیں جی! آج آپ کی پسند کی چیز چلے گی۔"
 سائیں بڑھے شاہ نے کچھ سوچ کر جواب دیا:
 "ایک دفعہ میں نے آپ کے گھر سے مولیٰ والے پراٹھے کھاتے تھے۔"
 "سائیں جی وہ مجھے بھی بہت پسند ہیں!"

جس وقت بھوک محسوس کریں اللہ رکھا یا پیراں دتہ کو ہمارے گھر بھیج دیں۔
 اور وہ آپ کے گھر میں بھی یہ پیغام پہنچا دے کہ پراٹھے وہاں پہنچ جائیں گے۔"
 اللہ رکھانے کہا۔ "چوہدری جی! میں نے رات ایک خواب دیکھا تھا جو بہت خوفناک تھا، لیکن بزرگوں نے کہا ہے کہ کسی نیک بخت کو دیکھنے کے بعد پہلی تمام سختی ختم ہو جاتی ہیں۔"

"وہ نیک بخت کون تھا؟ غلام نبی نے پوچھا؟"

"جناب! آپ سے زیادہ نیک بخت اور کون ہو سکتا ہے جن کا چہرہ دیکھتے ہی مولیٰ کے پراٹھوں کی خوش خبری مل گئی؟"

غلام نبی نے کہا۔ "میرا چہرہ آپ دیکھتے یا نہ دیکھتے جو چیز آپ کے نصیب میں لکھی ہے، وہ آپ کو ضرور ملے گی۔"
 "آج موسم کچھ ایسا ہے کہ میرا جی چاہتا ہے کہ بہت سے مہمان آجائیں اور مولیٰ کے پراٹھے کھائے جائیں۔"

"سائیں جی! آج کوئی خاص دن ہے؟"

"خاص تو نہیں! لیکن مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے کوئی خالص بات ہونے والی ہے۔ میں بار بار سوچتا ہوں کہ جانکی داس صبح سویرے سر کے بل کیوں کھڑا تھا؟"
 تھوڑی دیر بعد اللہ رکھا گئے کے رس کا برتن اور ایک پتے پر گرم کر ڈالے

”اچھا ٹھیک ہے۔ آج سے ہماری دوستی کی ہو جائے گی“



بچن سنگھ اور تینا سنگھ گاؤں کے سادہ دل لڑکے تھے۔ جنہوں نے روپیٹ کر اپنی ماؤں سے ایک ایک آنہ حاصل کیا تھا اور اس کے عوض گاؤں کے بچوں فروش پیارے لال سے بڑے غلیل حاصل کئے تھے۔ صبح سے ادھر ادھر نشانہ بازی کی مشق کرتے ہوئے شہد کے چھتے کے قریب جا پہنچے۔

ایک نے دوسرے سے کہا۔ ”دیکھنا بھتی! کہیں اُس طرف غلیل نہ چلا دینا! دوسرے نے کہا۔ ”بھتی میں بے وقوف نہیں ہوں! پتا ہی کہتے تھے۔ انہیں چھڑا جاتے تو یہ جنگل کے شیروں اور چیتوں سے زیادہ خطرناک ہو جاتی ہیں“۔ پہلے نے کہا۔ ”ہمیں سامنے سے چھڑنے کی کیا ضرورت ہے! چلو! ادھر کما د کے کھیت سے نشانہ باندھتے ہیں۔ وہاں سے اگر کسی چالاک مکھی نے ہمیں دیکھ لیا تو بھی پاس ہی بچا ہری سنگھ کی حویلی ہے۔ یہ تدبیر دوسرے نے پسند کی اور دونوں نے کما د کے کھیت کے کنارے سے پودوں کی اوٹ میں چھپ کر غلیل چلا دیے

یہ دونوں کا پہلا نشانہ تھا۔ جو سیدھا چھتے پر جا کر لگا۔ اچانک بے شمار مکھیاں اڑیں اور فضا میں پھیل گئیں۔ نشانہ بازی کرنے والے اُن کی گونج سے خوفزدہ ہو کر حویلی کی طرف بھاگے تو مکھیوں نے اُن پر حملہ کر دیا۔ لیکن انہوں نے ڈیوڑھی کے اندر پہنچتے ہی دروازہ بند کر لیا۔

دوسرے لوگوں کی بد قسمتی تھی کہ اللہ رکھا پڑھوں کا چھابہ اور سی کی دیگچی اٹھائے اُس راستے سے گزر رہا تھا اور مکھیوں کا پہلا بھرپور حملہ اُس پر ہوا۔

رہٹ پر کوئی تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ چند منٹ بعد ان کا کیا حال ہونے والا ہے؟ دو عمر میں ساتیں جی کے گھر کا پتہ پوچھتی ہوئی رہٹ پر پہنچ گئیں اور ان کے پیچھے پیچھے ساتیں جی

ہوتے کما د کی اوٹ سے نمودار ہوا اور غلام نبی نے اُس سے مخاطب ہو کر کہا۔

”اچھا ساتیں جی! میں ذرا کیاری دیکھ آؤں۔ اللہ رکھا تم بھاگ کر ہمارے گھر میں کہہ دو کہ فوراً مولیٰ کے پراٹھے تیار کئے جائیں۔ ساتیں بڑھے شاد اور ان کے دوسرے یہاں کھانا کھاٹیں گے اور کچھ پراٹھے اُن کے گھر بھی جائیں گے جو تم نے جاؤ گے۔ تازہ سستی کی بالٹی بھی یہاں بھیج دی جائے“

غلام نبی بلیچہ اٹھا کر چلا گیا تو اللہ رکھا نے کہا۔ ”ساتیں جی رس کا کٹورا بھر دوں؟“

”نہیں بے وقوف! رس پڑا رہنے دو مولیٰ کے پراٹھے کھانے سے پہلے رس کون پیتا ہے؟“

”اور یہ تازہ گڑ بھی نہیں کھائیں گے۔ بہت اچھا ہے ابھی گرم ہے۔“

”یہ بھی ایک طرف چپا کر رکھ دو، ورنہ جانکی داس آئے گا اور آتے ہی سب کچھ چٹ کر جائے گا“

اللہ رکھا نے کہا ”پھر وہ مولیٰ کے پراٹھے بھی چٹ کر جائے گا“

”نہیں بھتی گتے کے رس کی اور بات ہے! لیکن ہندوؤں کے خوف سے وہ مسلمان کے گھر کا پکا ہوا نہیں کھاتے گا۔“

میں نے دیکھا ہے کہ درپردہ بعض اوقات سیکھتے مسلمانوں کے کھانے میں شریک ہو جاتے ہیں لیکن ہندوؤں نے اس قدر تعصب بھلا رکھا ہے کہ بانکی داس اس بات سے بہت جھجکتا ہے کہ اگر ہندو اُس کے مخالف ہو گئے، تو کبھی بھی اس سے منہ پھیر لیں گے“

”ساتیں جی! چوہدری غلام نبی کے گھر والی بہت اچھا پراٹھا پکاتی ہے میں اُن سے ایک پراٹھا چپا کر جانکی داس کو لادوں گا، اور اُس سے کہوں گا کہ میں چھپ کر کھا لو، وہاں تمہیں کوئی نہیں دیکھے گا اور پھر ساتیں جی دیکھنا وہ آپ سے ہر روز پوچھا کرے گا، ساتیں جی چوہدری جی کے گھر سے پھر پراٹھے نہیں آئیں گے؟“

وہ اٹھے پاؤں پیچھے پٹنے لگا اور پھر چلایا، مار سے گئے! بی بیو! یہاں سے وڑو۔
 ادھر نہیں! میرے ساتھ آؤ۔ عورتیں جنہیں اللہ رکھا کی چیخ پکار نے خوف زدہ کر دیا تھا۔
 کچھ سوچے سمجھے بغیر غلام نبی کے پیچھے بھاگنے لگیں۔ اس نے پرالی کے ڈھیر سے ایک
 گٹھا اٹھاتے ہوئے کہا، بی بیو! یہ ڈومنا ہے، پرالی کے اندر گھس جاؤ اور وہاں بیٹھی
 رہو۔ عورتیں سہم کر پرالی کے اندر بیٹھ گئیں اور غلام نبی نے انہیں پرالی سے اچھی طرح
 ڈھانپ دیا۔ پھر پرالی کے ڈھیر میں چھپ کر اطمینان سے باقی منظر دیکھنے لگا۔
 اللہ رکھا دہائی دے رہا تھا، "جس بھوت کو آپ نے ڈنڈے سے مار کر اُس دن نکالا
 تھا وہ واپس آ گیا ہے۔ وہ مجھ سے انتقام لے رہا ہے۔ ساتیں جی بچاؤ! اُس کے
 نیزے بڑے تیز ہیں۔ ساتیں نے اُسے قریب آنا دیکھ کر زیادہ تیزی سے پیڑے بدلتے
 ہوئے پوری قوت سے ڈنڈا گھمایا لیکن پھر اُس نے ماتے ماتے کہہ کر چنچنیں مارنا شروع
 کر دیں اور وہ خاندانی ڈنڈا جو سب سے موثر ہتھیار تھا اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ ادھر
 اللہ رکھا نے ساتیں جی بچو کہہ کر حوض میں چھلانگ لگا دی۔

جانکی داس پوری قوت سے بھاگا چلا آ رہا تھا۔ "بے وقوف یہ شہد کی مکھیاں ہیں
 کسی نے ان کے چھتے کو چھیڑ دیا ہے جو میرے ڈیرے کے قریب لگا ہوا تھا۔"
 اور اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا اور ماتے ماتے کرتے ہوئے ساتیں بڑھے شاہ
 سے لپٹ گیا۔ بڑھے شاہ نے اپنے آپ کو چھیڑنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے
 مرید سمیت حوض میں چھلانگ لگا دی۔ اب حوض تین آدمیوں کے لیے بہت ناکافی
 تھا۔

وہ جب بھی سانس لینے کے لئے جسم کے اوپر کا حصہ باہر نکالتے تھے تو
 مکھیاں منہ پر ڈنگ مارتی تھیں۔

گئے چوس رہے تھے اور بڑی بے تابی سے پراٹھوں کا انتظار کر رہے تھے۔
 عورتوں کا مسئلہ تھا کہ اُن کی بھینسیں دودھ دینے کے وقت اڑ جاتی تھیں اس
 لیے وہ ساتیں جی سے آٹے کا پیڑا دم کروانے آئی تھیں۔ ساتیں نے بیٹھے بیٹھے آٹے کے
 پیڑے پر تین پھونکیں ماریں اور عورتوں سے کہا، "اب جاؤ بھینسیں اڑی نہیں کریں گی۔
 اور دیکھو! دودھ دوہنے سے کچھ دیر پہلے اُسے کچھ گڑ بھی کھلا دیا کرو" اچانک غلام نبی نمودار
 ہوا۔ اور اُس نے کہا، "ساتیں جی آپ کو بھوک لگ رہی ہے اللہ رکھا تو نہیں آیا میں
 خود گھر جاتا ہوں۔ غلام نبی دال سے چل پڑا لیکن پندرہ بیس قدم اٹھانے کے بعد اچانک
 رک گیا اور مڑ کر ساتیں بڑھے شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ساتیں جی! ایسا لگتا ہے کہ
 آپ کا مرید باؤلا ہو گیا ہے۔"

عورتیں ہند قدم اور جا چکی تھیں، وہیں جک گئیں اور ساتیں اور جانکی داس اٹھ کر
 گدھ کے کھیت کی طرف دیکھنے لگے۔

اللہ رکھا کے دونوں ہاتھوں میں گدھ کے پودے تھے جنہیں اکھاڑ کر وہ اپنے جسم
 کے کبھی دائیں کبھی بائیں طرف مار رہا تھا۔ اُس کی دردناک چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔
 "بچاؤ! بچاؤ! ساتیں جی!"

ساتیں جی نے جلدی سے گنا پھینک کر اپنا خاندانی ڈنڈا اگھایا اور اُس کے
 ایک سرے سے اپنے گرد ایک دائرہ بنالیا اور پھر اس انداز سے گھمرا گیا جیسے لڑائی
 کے لیے تیار ہو۔ اُس کا ڈنڈا تلوار کی طرح ہوا میں لہرا رہا تھا اور وہ بھی دایاں پاؤں
 آگے کر دیتا اور کبھی بائیں پاؤں۔ اُس کا چہرہ اتنا سرخ ہو گیا تھا کہ جانکی داس اُسے
 دیکھ کر گھبرا گیا اور اضطراری حالت میں جلدی سے اُس دائرے کے اندر آ گیا جسے اپنے
 ڈنڈے کی کمرامت سے بڑھے شاہ نے خطرے سے محفوظ کر لیا تھا۔

غلام نبی پر اُس کا اُلٹا اثر تھا۔

کا وقت اب ہے!

اللہ رکھا چلایا۔ "ہاں ساتیں جی! یہ ساری مستی! اُس بھوت کی ہے۔ خدا کے لیے کچھ کیجئے۔"

جب حوض سے پانی کا اچھالنا بند ہوا تو چند مکھیاں حملہ کرنے میں کامیاب ہو گئیں ساتیں بڑھے شاہ چلایا۔ "بھوت کے بچے پانی اچھالتے رہو۔"

"ساتیں جی میں آیا۔ دیوار کے کونے سے اللہ رکھا کی آواز آئی۔"

ساتیں چلایا۔ "اللہ رکھے کے بچے! ادھر آنے سے پہلے کوئی بڑا سا ٹاٹ لیتے آؤ اور حوض کے اوپر ڈال دو۔"

"ساتیں جی! میں ٹاٹ لے آیا ہوں۔" میں نے چوہدری غلام نبی کی آوازیں سن لی تھیں۔

"اب جلدی کرو۔ ہمارے اوپر ڈال دو اور اپنے آپ کو بھی بچاؤ!"

"ساتیں جی! میں دو ٹاٹ لے کر آیا ہوں۔"

چوہدری غلام نبی کی باتیں سننے والوں نے کتنی ٹاٹ جمع کر دیے۔

"اچھا! وہ دونوں ٹاٹ یہیں ڈال دو اور خود بھی یہیں ایک کونے میں دبک جاؤ اور جب تک مکھیاں چلی نہ جائیں ادھر ادھر مت جاؤ۔ سن لیا تم نے!"

"ساتیں جی! ایک ٹاٹ چھوٹا ہے۔ وہ میں اپنے اوپر لے کر آؤں گا۔ ورنہ مکھیاں مجھے آپ تک نہیں پہنچنے دیں گی۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ خطرناک بھوت جو آپ نے نکالے

ہیں۔ یہ ڈومنا بن کر واپس آ گئے ہیں۔"

"لوگ بکو اس کرتے ہیں اور تم بے وقوف ہو۔"

اب جلدی کرو۔ ایک ٹاٹ ہمارے اوپر ڈال دو اور دوسرا بھاگ کر لے آؤ۔"

حوض کے اوپر ٹاٹ ڈالتے ہوئے دو تین مکھیوں نے اللہ رکھا کو کاٹ لیا

اور اُس نے ماتے ماتے کہتے ہوئے کما دیا پناہ لی۔ جب ڈنک کی جلیں ذرا کم ہو گئیں

اپنے ساتھیوں پر جانکی داس کو یہ سبقت حاصل تھی وہ کافی چھریا جسم رکھتا تھا،

اور پیر و مرید دونوں کے نیچے گھٹس جاتا تھا۔ اس پاس کے کھیتوں میں کام کرنے والے لوگ

یہ سمجھ چکے تھے کہ ساتیں اور اُس کے مرید کا آخری وقت آ گیا ہے۔ غلام نبی پرالی میں سر جھپا

کر انہیں آوازیں دے رہا تھا۔ لوگوں ساتیں بڑھے شاہ کو بچاؤ، جانکی داس بھی مرنے والا ہے۔

کوئی ٹاٹ لے آؤ اور ان کے اوپر ڈال دو ورنہ انہیں ڈومنا زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

جانکی داس کو ایک تدبیر سوچھی اور اُس نے دونوں ہاتھوں سے پانی اچھالنا

شروع کر دیا۔ ساتیں اور اللہ رکھا بھی اُس کی تقلید کرنے لگے اور مکھیاں ذرا دُور ہٹ

گئیں۔

پنڈت دینا ناتھ اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر اس خیال سے نکلا تھا کہ اس خوشگوار

موسم میں جانکی داس سے گپ شپ لگاؤں گا۔

چوہدری غلام نبی کے رہٹ کی طرف دینا ناتھ نے گھوڑے کی باگ موڑ لی۔

راستے میں سپہری ہوئی مکھیوں نے اُن پر بھرپور حملہ کر دیا اور انہوں نے گھوڑے کی رفتار

تیز کر دی۔ رہٹ کے قریب پہنچ کر وہ کما د کے کھیتے پاس گھوڑی سے گہڑے۔

پنڈت جی کا دماغ جو پہلے سویا ہوا تھا اب تیزی سے کام کرنے لگا۔ جب

انہوں نے دیکھا کہ اُن کے گہڑے گھوڑے کی باگ ہاتھ سے نکل چکی ہے۔

ابھی تک مکھیاں اوپر انتظار کر رہی ہیں کہ وہ ذرا اُپس اور وہ سب پر حملہ کریں۔

وہ اُٹھ کر آہستہ آہستہ ریٹکتے ہوئے کما د تک پہنچ گئے اور پھر بھاگ کر جان بچائی۔

حوض کے اندر ساتیں جی پانی اچھالتے ہوئے تھک گئے تھے اور انہیں ہر

لمحہ اس بات کا احساس تھا کہ اُن پر وار کرنے والی مکھیوں کی تعداد لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی

ہے۔ جانکی داس نے کہا "ساتیں جی! اگر آپ کے پاس کرامت ہے تو اُس کے دکھانے

”ہاں بھئی سسٹن لیا۔ آپ کی بڑی مہربانی!“
 ”ہمارے گاؤں سے کوئی میرا پتہ چلانے آئے تو انہیں بتادینا کہ میں زندہ
 ہوں۔“

”سائیں جی! آپ نے دو اور ٹاٹ کس لیے مانگے تھے؟“
 ”اوگہ ہے! ہم نے باہر بھی نکلنا ہے یا یہیں سردی میں ٹھہر کر مر جائیں گے۔“
 ”فکر نہ کرو سائیں جی! آپ کو مرنے نہیں دوں گا۔ میں ابھی آتا ہوں۔“
 مکھیوں کی توجہ کسی اور محاذ پر مبذول ہو گئی اور غلام نبی نے کچھ دیر غور سے زمیٹ
 کی طرف دیکھنے کے بعد کہا۔

”بی بیو! یہاں سے نکلو اور سیدھے راستے پر جانے کی بجائے چری اور کما د
 کے کھیتوں میں سے ہوتی ہوئی اپنے گاؤں پہنچ جاؤ۔ ان مکھیوں کا کوئی بھروسہ نہیں،
 کہ کس وقت اس طرف آجائیں۔“
 سائیں بڑھے شاہ کی آواز سنائی دی۔

”چوہدری جی آپ کہاں چھپے ہوئے ہیں؟“
 ”سائیں جی! وہ کالا بھوت حملہ کرنے سے پہلے میرے کان میں کہہ گیا تھا کہ تم
 چپکے سے پرالی کے ڈھیر میں چھپ جاؤ اور مجھے ان لوگوں کا دماغ ٹھیک کرنے دو۔
 جنہوں نے مجھے بہت ستایا ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ اپنے ساتھ ڈومنے کی فوج
 لارہا ہے۔ ورنہ میں آپ کو خبردار ضرور کر دیتا۔“

”لیکن اللہ رکھا کو آپ نے مجھ سے پہلے دیکھا تھا؟“
 ”سائیں جی! میں سچ مچ یہی سمجھا تھا کہ یہ باؤ لاہو گیا ہے۔
 اور کالا بھوت اس سے پہلے میرے کان میں یہ کہہ گیا تھا کہ آج اُس کے دشمنوں
 کی شامت آنے والی ہے۔“

تو اُس نے کمزور آواز میں کہا۔
 ”سائیں جی! یہ ٹاٹ جو میں نے آپ کے اوپر ڈالا ہے۔ کافی مٹا ہے۔ آپ کو
 مکھیوں نے ڈمک تو نہیں مارا؟“
 ”نہیں! تم جاؤ!“

”سائیں جی! اُس نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔
 ”اللہ رکھا مر تو نہیں گیا؟“
 ”نہیں! بے وقوف نظر نہیں آیا۔“

”نہیں میں نے آپ کے ساتھ جانکی داس کو دیکھا تھا۔“

چوہدری جی! پنڈت دینا ناٹھ آپ کے پاس ہیں؟
 ڈومنے نے پنڈت دینا ناٹھ پر بڑا سخت حملہ کیا تھا۔
 وہ کہیں گھوڑی سے گر کر مر گیا ہے۔“

”لوگ اتنے دہشت زدہ ہیں کہ اس کی لاش تلاش کرنے کے لیے بھی اس طرف
 آنے کے لیے تیار نہیں۔“

کما د سے آواز آئی۔ ”سائیں بڑھے شاہ! میں کما د میں چھپا ہوا ہوں۔ اپنے آدمی سے
 کہہ دیں کہ میرے لیے بھی ایک ٹاٹ لیتا آئے جو مٹا بھی ہو اور بڑا بھی!“
 سائیں نے اللہ رکھا کو آواز دی

”اللہ رکھا ٹھہرو! میری بات غور سے سنو! ایک ٹاٹ دینا ناٹھ کے لیے لے آؤ
 اور ایک اپنے اوپر ڈال لو۔ دیکھو ہمارے لئے دو اور ٹاٹ ضرور لانا۔“
 ”پنڈت جی میں ابھی ٹاٹ لاتا ہوں۔ کھیت کے کنارے رکھ دوں گا۔ اس کے
 بغیر باہر جھانک کر دیکھا تو تم مارے جاؤ گے۔ سن لیا پنڈت جی؟“

”باقی لوگ زندہ ہیں یا مر گئے؟“

”ابھی تک وہ زندہ ہیں، لیکن تھوڑی دیر اور یہاں رہنا پڑا تو ہم تینوں مرجائیں گے۔“

”چوہدری جی! ان خوفناک مکھیوں کو یہاں سے ہٹائیے!“

”اس وقت تو وہ یہاں نظر نہیں آتیں لیکن شام تک یہ جگہ محفوظ نہیں۔“

جانکی داس کی آواز آئی۔ ”چوہدری جی! اچھی طرح دیکھ کر بتانا! تاکہ میں تھوڑی

دیر کے لیے باہر نکل آؤں۔“

”تم تھوڑی دیر کے لیے کیوں باہر آنا چاہتے ہو؟“

”چوہدری جی! میرا جسم سن ہو گیا ہے۔ اپنے ڈیرے پہنچ کر علاج معالجہ کر آؤں

گا۔ وہاں میرے لیے کئی من جلائے کی لکڑی جمع ہے۔“

میں ڈیرے پہنچ کر اتنا بڑا الاؤ جلاؤں گا کہ مکھیاں دُور سے دیکھ کر ڈر جائیں

گی۔

اگر آگ زیادہ ہو تو بھوت بھی مچاگ جاتے ہیں۔

مجھے سردی اتارنے کے لیے کئی گھنٹے تک آگ کے سامنے بیٹھنا ہو گا۔“

جانکی داس نے غلام نبی کے جواب کا انتظار کیے بغیر ایک طرف سے تھوڑا سا

ٹاٹ سرکا کر باہر دیکھا اور پھر اچانک حوض سے باہر نکلا تو وہ کسی طرح کانپ رہا تھا۔

وہاں بھی ہوئی پرالی سے کچھ دُور جا کر اُس نے سر ڈھانپ لیا اور چند قدم گگنا ہوا آگے بڑھا۔

اور پھر قدرے تیز رفتاری سے اپنے ڈیرے کی طرف چل دیا۔

سائیں بڈھے شاہ اُسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

”جانکی داس! مکھیاں چلی گئی ہیں؟“

ارے بولتے کیوں نہیں؟“

غلام نبی نے ہنستے ہوتے ٹاٹ اٹھا کر ایک طرف کر دیا اور کہا۔

”جانکی داس اپنے ڈیرے پر پہنچ چکا ہے۔ آپ بھی باہر آ سکتے ہیں۔“

پیر اور مرید دونوں بُری طرح کانپتے ہوئے باہر آئے اور زمین پر لیٹ گئے

چند ثانیے بعد بڈھے شاہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور سکر مند ہو کر بولا۔

”چوہدری جی وہ پھر تو نہیں آجائے گا؟“

غلام نبی کا بُرا حال ہو چکا تھا۔ اس نے کہا

”کالا بھوت! آ بھی جاتے تو اب آپ کی شکل اتنی بدل چکی ہے کہ وہ آپ کو نہیں پہچان

سکے گا۔ میرا مطلب ہے کہ آپ کے ہاں بچے بھی آپ کو دیکھ کر بھاگ جائیں گے اور

ابھی تو آپ کے چہرے پر سوچن آئی شروع ہو گئی ہے اور سائیں جی اپنے مرید کی طرف

دیکھ رہے ہیں۔ آپ کو ڈر نہیں آتا اس سے؟“

سائیں جی نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”وہ مکھیاں پھر آئیں گی؟“

اتنے میں پنڈت دینا ناتھ نے سر نکالا تو اللہ رکھانے کہا۔ ”پنڈت جی! پنڈت جی

اب آ جاؤ! ڈومنا یہاں سے جا چکا ہے۔“ پنڈت دینا ناتھ کما دسے بڑی احتیاط سے

ادھر ادھر دیکھ کر باہر نکلا۔ اس کا چہرہ اس قدر بُری طرح سو جا ہوا تھا کہ اللہ رکھا بھی اسے

دیکھ کر ہنس پڑا۔

پنڈت دینا ناتھ نے چوہدری غلام نبی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”چوہدری جی! یہ ڈومنا نہیں نکلا کوئی آفت بھی جس نے مجھے گھوڑی سے اٹھا

کر پھینک دیا تھا۔ یوں تو بھگوان کا شکر ہے کہ میرے اندر اتنی عقل تھی کہ میں زمین

پر ریگتا ہوا، کما د کے اندر چھپ گیا تھا۔ ورنہ آج میرا بولورام ہو گیا تھا۔“

تیسرے دن سائیں بڑھے شاہ نے ہوش میں آ کر آنکھیں کھولیں وہ اپنی کشاہ بیٹھک کے اندر بستر پر پڑا ہوا تھا اور کمرے کے اندر وہاں اس کے چند تیمار دار نیچے چٹائی پر بیٹھے ہوتے تھے اور چند پیچھے کھڑے تھے۔ بیٹھک کے ایک کونے میں ایک چھوٹی سی کھاٹ پر اللہ رکھا اپنے اوپر رضائی لیے اُونگھ رہا تھا۔ لوگ ان دونوں کو بے ہوشی کی حالت میں رہٹ سے اٹھا کر لاتے تھے۔ اس لیے پیر جی جنہیں خود تیز بخار تھا۔ کچھ دیر حیرت میں ڈوبے رہے پھر اچانک ان کی نظر تیمار داروں میں سے ایک ایسے آدمی پر مرکوز ہو کر رہ گئی جو دوسروں کے لیے اجنبی تھا اور اس نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”لوگو! سچ بتاؤ کہ یہ مرے ہوتے ہیں یا زندہ؟“

”سائیں جی! ایک آدمی نے جواب دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کو ہوش آ گیا ہے۔ پرسوں سے جب کہ آپ کو چوہدری غلام نبی اُٹھ کر یہاں لاتے تھے۔ آپ بے ہوش تھے۔ اللہ رکھا بھی بے ہوش تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ حکیم نے آپ کو دیکھتے ہی نالی بلوایا۔“

”سائیں بڑھے شاہ تم صاف بات کیوں نہیں کرتے“ کہ تم سب مجھ سے چڑکارا حاصل کرنا چاہتے تھے اس لیے کہیں سے اس قاتل کو تلاش کر کے میرے لیے لے

آئے ہو۔ یہ ظالم فصد کھول دیتا ہے تو ہاتھی بھی چند سانس نہیں لے سکتا۔ میرے لئے نالی اس نے اس لیے بلوایا ہو گا کہ میرے مریدوں نے مجھے اگر روپتا ہوا دیکھ لیا تو اس کی شامت آجائے گی۔“

ایک آدمی نے کہا۔

”سائیں جی! نالی نے آپ کے جسم سے صرف شہد کی مکھیوں کے ڈنگ نکالے تھے۔ اور اس کے لیے فصد نہیں کھولا گیا صرف موجد استعمال کیا گیا ہے۔“

اُس کے گاؤں کی عورتیں وہاں پہنچ کر عجیب و غریب داستانیں سن رہی تھیں۔ انہوں نے غلام نبی کے مشورے پر پرائی کے ڈھیر میں چھپنے کے بعد آنکھیں کھول کر بہت کم ادھر اُدھر دیکھا تھا۔ مگر جتنا کم دیکھا تھا اتنی ہی زیادہ اُس کے متعلق داستانیں نکال کر لگا کر بیان کر رہی تھیں۔

مثلاً کالے بھوت کا تذکرہ، مہیب صورت بھوت کے ناقابل یقین کارناموں کی تفصیلات میں تبدیل ہو گیا جس کے آگے پیچھے ڈونے کی فوجیں تھیں۔ اللہ رکھا کو شہد کی مکھیاں ڈنگ مارتی تھیں تو وہ دہائی دیتا تھا۔

”سائیں جی! کالے بھوت کو اپنے ڈنڈے سے مار بھگاتی ہے۔“

پھر کچھ خاتین سائیں بڑھے شاہ کے ہاتھ میں ڈنڈا دیکھ کر اتنی متاثر ہوئیں کہ اُس کے مرید اللہ رکھا اور بدست سادھو جانکی داس کی حرکات ... خصوصاً سر کے بل کھڑا ہونے کے مضحکہ خیز رویہ کا پرچار ہونے لگا۔

خواتین نے کہا ”خدا بھلا کرے۔ چوہدری غلام نبی کا جس نے ہمیں پرالی کے ڈھیر میں چھپا دیا اور ہم بچ گئیں۔“

پنڈت دینا ناتھ کی گھوڑی سوار کے بغیر گھر پہنچی تھی، اس لیے یہ خبر دور دور تک پھیل چکی تھی۔ کہ دینا ناتھ مرچکا ہے۔ شام تک گاؤں کے لوگ اپنے گھروں میں چھپے رہے۔ رات کے وقت دیر تک وہ ڈومنا کے واقعات ایک دوسرے کو سناتے رہے۔ اگلی صبح یہ خبر پھیل گئی کہ ڈومنے نے گاؤں کے شمال میں پھیل کے بہت بڑے درخت کے ایک موٹے سے تنے کے ساتھ اپنا نیا گھر بنا لیا ہے۔

ہمارے ساتیں جی کی جان بچاؤ۔“

بڈھے شاہ نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”اللہ رکھا او اللہ رکھا!“

”جی ساتیں جی!“ اللہ رکھانے کہا۔

”بد معاش تمہیں کب سے اس کے متعلق معلوم تھا؟“

”ساتیں جی! میں نے اپنی بیوی کے علاج کے لیے انہیں پچھلے سال بڑی مشکل سے تلاش کیا تھا۔“

”بد معاش تم میری فصد کھلانے کے لیے اسے بلانے گئے تھے؟“

”نہیں ساتیں جی! اس نے میرے سامنے قسم کھائی تھی کہ میں اب کسی مریض کا خون نہیں نکالتا۔“

ساتیں بڈھے شاہ نے تکیے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

”اللہ کا شکر کرو کہ حسین بخش نے آٹھ پہر یہاں گزارے ہیں اور اس گاؤں کے لوگ بال بال بچ گئے ہیں۔ اب اسے روٹی کھلا کر یہاں سے روانہ کر دو، اور اس بات کا خیال رکھو کہ جاتے جاتے کسی کو کوئی دوائی نہ دے جاتے۔ ایسے حکیم کے پاس ایسی دوائیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ جو فصد کھولنے سے زیادہ خطرناک ہوں۔ ہم پر ایک مصیبت تو ڈوبنے کی آئی تھی اور پھر تم حسین بخش کو لے آئے ہو۔ اس بد معاش کو جلدی سے یہاں سے نکالو ورنہ گاؤں کے لوگ اسے مار ڈالیں گے اور پولیس ہمیں پکڑ لے گی۔ او بد معاش کے بچے بھاگ جاؤ، ورنہ میں غلام نبی کو اطلاع دیتا ہوں۔“

حسین بخش اٹھا اور بھاگتا ہوا کما د میں روپوش ہو گیا پھر یہ کسی کو معلوم نہ ہوا کہ وہ کہاں گیا ہے۔

”یار کیوں جھوٹ بولتے ہو۔ تم اسے نہیں پہچانتے۔ مگر میں اس بد معاش کو خوب سمجھتا ہوں۔ یہ وہ حکیم ہے جو صرف فصد کھولنا جانتا ہے۔ میں اپنی آنکھوں سے اس کا کارنامہ دیکھ چکا ہوں۔ یہ وہی بد معاش ہے جو چوہدری شیر علی کی جان لینے کے بعد کہیں غائب ہو گیا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ مر گیا ہے۔ میں بھی ایسا ہی سمجھتا تھا کہ یہ مر گیا ہوگا اب اگر میرے بڑے دن آتے ہوئے تھے اور یہ ایسے وقت میں وہاں پہنچا تھا جبکہ میں بخار میں بے ہوش ہو چکا تھا۔ اور کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا اور اس کے ہاتھوں موت میرے نصیب میں لکھی جا چکی ہے اور یہ کہہ کر میرا علاج کرنا شروع کر دیا ہے کہ اس بد معاش نے نانی کو شہد کی مکھیوں کے ڈنک نوچنے کے لیے بلایا تھا۔ نانی نے کمرے کے اندر جھانکتے ہوئے دیکھا۔

”ساتیں جی! آپ مجھ سے ناراض کیوں ہوتے ہیں؟ مجھے اللہ رکھانے ڈنک نکالنے کے لیے کہا تھا۔ آپ کے بعد میں نے اللہ رکھا اور جانکی داس کے جسم سے بھی ڈنک نکالے ہیں۔“

صبح پڑت دینا نا تھ کے گھر بھی مجھے بلایا گیا تھا۔

”اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تک حسین بخش کو کسی کی فصد کھولنے کا موقع نہیں ملا۔“

حسین بخش نے کہا۔

”ساتیں جی میں نے فصد کھولنے سے توبہ کرنی ہوتی ہے اور یہاں سے چار کوس دور دوکانداری کرتا ہوں۔“

”لیکن میرے گھر کا راستہ تمہیں کس نے بتا دیا؟“

”جناب! میں نے کسی صورت اس کام کو نہیں کرنا تھا۔ وہ جو آپ کا مرید اللہ رکھا ہے یہ کل میرے پاس پہنچ گیا تھا اور میرے پاؤں پر گر پڑا تھا کہ خدا کے لیے

کہا تھا: ”تمہیں یہ دُعا کرنی چاہیے کہ خدا وہاں تمہیں اگلے جنم میں جنگلی بلا نہ بنائے، ورنہ بٹو بھیل تہا سے لئے اتنا خطرناک ہے کہ اگر تم چوہے کے پل میں بھی چھپ جاؤ تو تمہیں نکال کر کھا جائے گا۔“ دینا ناتھ کو غصہ تو بہت آتا تھا۔ لیکن بیلا سنگھ سے کسی کو بحث کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ میں اس کی وجہ شاید نہیں بتا سکتا لیکن پردیسی درختوں سے مجھے اُس دن اسی بے دل چسپی ہو گئی تھی جب میں نے یہ سنا تھا کہ وہ کسی نامعلوم ملک سے بھاگتے ہوئے آئے تھے۔ اور جب پچھلے پہر چلنے پینے والی عورت نے انہیں دیکھ کر دہائی چانی شروع کی تھی تو وہ جس جگہ تھے وہیں رُک گئے تھے۔

میں اسکول سے پھٹی کے بعد بسا اوقات اپنے ساتھیوں کو پردیسی درختوں کی طرف لے جایا کرتا تھا۔ ہم وہاں آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے۔ چند درختوں کے گرد چبوترے بنے ہوئے تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ چند سادھو یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ پھر ایک رات وہ کسی چیز سے ڈر کر بھاگ گئے۔

میں کسی چیز سے نہیں ڈرتا تھا، لیکن رات کے وقت اگر مجھے بھی کوئی کتا کہ تم کسی پردیسی درخت کو ہاتھ لگاؤ تو شاید میں یہ جرأت نہ کرتا۔ وہاں ہر شام عجیب سی اداسی چھا جاتی تھی۔ میں شہر کے اسکول میں ساتویں جماعت میں تھا۔ ایک دوپہر میرے چچا جان نے مجھے ڈیوڑھی کی طرف سے آواز دی۔ میں باہر نکلا تو اُن کے سامنے بٹو بھیل رو رہا تھا۔

”چودھری صاحب“ وہ کہہ رہا تھا: ”میں تباہ ہو گیا ہوں، اُس ظالم نے ایک کتا جان سے مار دیا ہے۔ دوسرے کو بُری طرح زخمی کیا ہے۔ میں سردار بیلا سنگھ کے پاس گیا تھا۔ وہ اپنا ایک چھوٹا کتا اور ایک بڑا کتا ساتھ لے کر خود میرے ساتھ گئے۔ لیکن چودھری صاحب بڑی مشکل سے سسکیاں ضبط کرتے ہوئے کہا: ”مجھے سردار بیلا سنگھ بھی طعنے دیں گے اُس کے چھوٹے کتے کی طرف ایک ہی چیخ سنائی دی اور وہ یہ کہہ کر گالیاں دے کر چلے گئے کہ اندر کوئی

گاوؤں کے مغرب کی طرف گرم کپڑے کا ایک بہت بڑا کارخانہ ریلوے سٹیشن اور ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں جب حکومت نے مزدوروں کی کمی محسوس کی، تو جنوبی ہندوستان سے کچھ بھیل وہاں بھیج دیے گئے۔ شروع شروع میں انہیں ایک سیاح چار دیواری کے اندر رکھا جاتا تھا اور پھر چند برس بعد اُن میں سے کچھ واپس چلے گئے تھے اور کچھ پنجاب میں ہی ادھر ادھر منتشر ہو گئے تھے۔

بھیلوں کے جس گھرانے کو ہمارے گاؤں کے ایک سکھ زمیندار نے مکان بنانے کے لیے کچھ جگہ دی تھی۔ اس کے سرکردہ آدمی کا نام بٹو تھا۔ بٹو کتوں کے ساتھ شکار کھیلا کرتا تھا۔ اور جب کبھی وہ جنگلی بلا مار کر لاتا تھا۔ تو بھیل خوشی سے ناچتے اور گاتے، ویسے ہر جانور کھا جایا کرتے تھے۔ لیکن جنگلی بٹے کی خاص خوشی منائی جاتی تھی۔ جب علاقے کے بڑے شکاری نکلتے تھے۔ تو بٹو اُن کے ساتھ ہو جایا کرتا تھا۔ خرگوش شکاری لے جاتے تھے اور گیڈریا جنگلی بلا بٹو کو مل جاتا تھا۔ میں بھی کبھی بھی شکار دیکھنے جایا کرتا تھا۔

شکاری عام طور پر پردیسی درختوں کے آس پاس کھلی جگہ میں جمع ہوتے تھے۔ پھر مختلف سمتوں سے ہانکے شکاری کتے شکار گھیر کر لاتے تھے۔ جب کوئی جانور کس د کے کھیت سے نمودار ہوتا تھا۔ تو تازی کتوں کو چھوڑ دیا جاتا، جو تڑی سی دوڑ کے بعد شکار پر پڑتے تھے۔ اور اگر پکڑے جانے والا جانور جنگلی بلا ہوتا تھا تو بٹو خوشی سے ناچتا تھا وہ ہر شکاری اور اس کے باپ دادا کا نام لے لے کر اُسے دعائیں دیتا تھا۔ ہم اُس کی حرکتوں پر ہنسا کرتے تھے۔ اسکول والے ہندوؤں، خاص کر دینا ناتھ برہمن کو اس بات پر اعتراض تھا کہ پردیسی درختوں کی پودہ دھرتی پر باپ کیا جاتا ہے لیکن شکار کرنے اور شکاریوں کو دیکھنے والے اُس کے اعتراضات پر کوئی توجہ نہ دیتے تھے۔

پڑوس کے گاؤں کا سردار بیلا سنگھ جس نے دس پندرہ کتے پال رکھے تھے اور جسے تیز اور ٹیڑھ پکڑنے کا بھی بے حد شوق تھا، دینا ناتھ کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ ایک دن اُس نے

بلو ہچکچایا۔ نہیں! سرکار! میں ابھی پہنچ جاؤں گا اور میرے آدمی آپ کے انتظار میں کھڑے ہوں گے۔
میں نے کھوٹے کو ایڑ لگا دی۔

کچھ دیر بعد بلو ہانپتا ہوا پر دیسی درختوں کے قریب پہنچا تو میں بلے پر فائر کر چکا تھا اور اس کے ساتھی نعرے لگا رہے تھے۔ مار لیا، مار لیا! اور بلو نے وہیں سے ناچنا شروع کر دیا۔ اس بجے کی لاش کا جلوکس نکالا گیا۔ پہلے بلو اور اس کے ساتھی اُسے سردار بیلا سنگھ کے گاؤں میں لے گئے اور پھر اپنے گاؤں میں اسے لے آئے۔
اگلے روز دو مردہ کتوں کی لاشیں ملیں جن میں سے ایک بلو کا تھا اور دوسرا بیلا سنگھ کا! لاشیں کھوکھلے تنے سے نکالی گئیں۔ اسی روز سردار بیلا سنگھ میرے چچا سے گاؤں آکر ملا۔ چچا نے مجھے بلایا تو سردار جی نے ایک پنجرہ مجھے دیتے ہوئے کہا،
”بیٹا! اس میں بیس بیس ہیں اور وہ سب تمہارے لیے ہیں۔“
میں نے حیا کی طرف دیکھا اور اس کا اشارہ پا کر پنجرہ پکڑ لیا اور بھاگتا ہوا ابدر چلا گیا۔



آٹھویں جماعت کے آخری ایام میں اپنے گاؤں کے ساتھیوں کی ایک جماعت کے باعث میری زندگی میں ایک غیر متوقع انقلاب آیا۔ بورڈنگ ہاؤس کی عمارت بن چکی تھی اور اس عمارت میں اب داخل ہونے والے طلباء کی ضرورت تھی۔ وہ لڑکے جن کے گھر دور تھے، ان کے لیے ہاسٹل میں داخلہ لینا ایک مجبوری تھی لیکن ہمارے امریکی پرنسپل نے جو چار کشادہ کمرے بنواتے تھے ان میں سے ایک بھی پوری طرح نہیں بھرا تھا۔ اب استاد صاحبان نے ان لڑکوں پر بھی توجہ دینا شروع کر دی تھی جن کے گاؤں اسکول سے تین میل کے فاصلے کے باہر تھے۔ میرا گاؤں اسکول سے بمشکل ڈیڑھ دو میل تھا۔ اس لیے مجھے اس سے کوئی پریشانی

نہیں تھی۔ اس کا ایک ہی علاج ہے کہ کھوکھلے تنے کو آگ لگا دی جلتے میگز پر دیسی درخت کو میں آگ لگانے کا پاپ نہیں کر سکتا۔ آئندہ میں اس طرف ٹسکار کھیلنے بھی نہیں آؤں گا۔
اگر آپ نے میری مدد نہ کی تو میں مرجاؤں گا۔ سردیاں سر پہ آ رہی ہیں مجھے اگر بلانا ملا تو میں بیمار ہو جاؤں گا۔

چودھری جی! وہ باہر ضرور نکلے گا۔ آپ چھوٹے چودھری کو اجازت دے دیں میں انہیں ساتھ لے جاؤں گا۔ جیسی تم یوسف کو راضی کر لو، اگر یہ تمہاری مدد کرنا چاہے تو میں اسے نہیں روکوں گا۔ بلو نے جلدی سے آگے بڑھ کر میرے پاؤں پکڑ لئے دھکٹنوں کے پل آگے بڑھ کر کہا،
”سرکار! آپ کی تھوڑی سی تکلیف سے میری جان بچ جاتے گی۔“
وہ جنگی بلا بینٹ دینا نا تھ سے بھی موٹا ہے جب وہ بولتا ہے تو اس کی آواز دور دور تک سنائی دیتی ہے۔ میں آپ کو صرف ایک فائر کرنا پڑے گا۔ میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر کہا،
”بلو! میں نے تمہیں کئی بار پاؤں پکڑنے سے منع کیا ہے۔ آئندہ ایسا کیا تو اچھا نہیں ہو گا۔ تم بجے کا خیال رکھو! میں اطلاع دیتے ہی تمہارے ساتھ چل پڑوں گا۔“
بلو نے کہا۔

”جناب وہ جس وقت چلے گا نہیں یہاں اطلاع پہنچ جائے گی۔ میں اپنے دوستی ہاں چھوڑ آیا ہوں۔“

میں صبح کی نماز پڑھ کر مسجد سے باہر نکلا تو بلو راستے میں کھڑا تھا۔
”جناب! چودھری جی وہ نکل آیا ہے۔“ اس نے کہا۔

”میں آپ سے نوکر سے بھی کہہ آیا ہوں کہ وہ آپ کے گھوڑے پر زین ڈال دے۔“
”اچھا بلو تم بھاگو میں آتا ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد میں بندوق اٹھاتے سرپٹ گھوڑا دوڑا رہا تھا۔ راستے میں بلو کو دیکھ کر گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں اور کہا، ”بلو میرے پیچھے بیٹھ جاؤ۔“

اسکول کے صحن میں وارد ہوئے، ہر نام سنگھ ان کا لیڈر بنا ہوا تھا اور پیش پیش تھا۔ وہ کسی کمرے کے اندر جھانکتا اور پھر مڑ کر اپنے ساتھیوں کو اپنے ہاتھ سے اشارہ کرتا اور اگلے کمرے کی طرف چل پڑتا۔ سامنے برآمدے میں چلین پڑی ہوتی تھی اور ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب بڑی دلچسپی سے چلین کی اوٹ سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ ہر نام سنگھ کے پیچھے لڑکوں کی ٹولی میں بوٹر مسیح جو سب لڑکوں سے زیادہ نومند اور مضبوط تھا۔ کوئی ایک من گئے اپنے کانڈھے پر اٹھائے ہوئے تھا۔ ہر نام سنگھ ہمارے کلاس روم کے باہر کررک گیا۔ اس نے باقی لڑکوں کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ بھی دہاں پہنچ گئے پھر انھوں نے بوٹر مسیح کو ہاتھ سے کچھ اشارے کیے۔ بوٹر مسیح جھجکا لیکن ایک لڑکے نے اس کا بازو پکڑ کر اندر دھکیل دیا۔ بوٹر مسیح نے آگے بڑھ کر گتوں کا گٹھا ایک ڈیسک پر دے مارا۔ ساتھ ہی ایک فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا

ماسٹر صاحب نے یہ منظر دیکھا تو اس پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ دیہاتی لڑکوں نے ایسا قہقہہ نہیں سنا تھا۔ بوٹر مسیح بدحواس ہو کر بھاگا اور وہ اس کے آگے بھاگ گئے۔ ان کی رفتار کا یہ عالم تھا کہ آنا فانا لگا ہوں سے اوجھل ہو گئے۔ ہیڈ ماسٹر اور چند دوسرے استاد ان کے پیچھے پیچھے چند قدم گئے پھر انہوں نے میری طرف دیکھا اور کہا۔ ”میں دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ یوسف کے گاؤں کے لڑکے ہیں بھائی! یہ بہت بڑی بات ہے کہ وہ تمہارے لیے اتنی دُور سے تحفہ لے کر آئے تھے اور تم نے ان کی پذیرائی اور تواضع کرنے کی بجائے انہیں بھگا دیا ہے“

”جناب میں نے انہیں نہیں بھگایا“

ہیڈ ماسٹر صاحب طبعاً بہت نیک نفس تھے۔ وہ مسکرائے اور کہا ”اے تم پریشان کیوں ہو رہے ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم نے انہیں نہیں بلایا۔ اب گاؤں میں جا کر ان کے ساتھ لڑائی نہ کرنا۔“

یہ لوگ بہت مخلص ہیں اور تمہارے ہی خواہ ہیں“ میں نے کہا۔ ”سر اگر آپ یہ سمجھتے

نہ تھی۔ بہر صورت ہر طالب علم کو بورڈنگ ہاؤس میں داخلہ لینے کی ترغیب دلانے کا یہ طریقہ نہ نکالا گیا۔ کبھی رات کو اسکول کی کوئی تقریب منعقد کی جاتی یا کوئی خاموش فلم دکھائی جاتی۔ تو لڑکوں کو یہ بتا دیا جاتا تھا کہ اگر وہ چاہیں تو رات بورڈنگ ہاؤس میں ٹھہر سکتے ہیں۔ کبھی کوئی معلم یا استاد چند دن کے لیے اپنے مضمون کی خاص کلاسز لیتا تھا اور لڑکے اسے بھی ایک مشغلہ جان کر اپنے بستروں اور کھانے کے برتنوں سمیت بورڈنگ ہاؤس میں پہنچ جاتے تھے اور اس عارضی قیام کے بعد ان پر بورڈنگ ہاؤس کا خوف کم ہو جاتا تھا۔

ایک دن ہمارے اسکول کی ٹیم نے کسی دوسرے شہر میں میچ کھیلنے کے لیے جانا تھا۔ اور پروگرام کے دل مرتب ہوا تھا کہ ہماری ٹیم کے کھلاڑی میچ کھیلنے کے بعد واپسی پر بورڈنگ ہاؤس میں ٹھہریں گے۔

اگلی شام شہر میں ٹورک فلم (MOVIE) دکھائی جا رہی تھی اور اسے دیکھنے والوں کو بھی بورڈنگ ہاؤس میں ٹھہرنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ میں نے نوکر کو اپنا بستر دے کر بھیج دیا۔ مجھے رخصت کرتے ہوئے امی جان نے کہا۔

”دیکھو یوسف! تمہاری غیر حاضری کے دو دن مجھے بہت طویل محسوس ہوں گے۔ بورڈنگ میں کھانے کے پیسے دے دیا کرنا لیکن تمہارا گانا میں خود تیار کیا کروں گی اور نوکر کے ہاتھ بھیج دیا کروں گی۔“

مجھے رخصت کرتے ہوئے ہمیشہ امی جان کی آنکھیں نم آلود ہو جاتی تھیں۔

گاؤں میں میرے ساتھ کھیلنے والے کسی طالب علم کو یہ معلوم نہ تھا کہ میں دو دن غیر حاضری رہوں گا۔ جب انھیں یہ معلوم ہوا تو انھوں نے کانفرنس بلا لی اور اس کانفرنس میں جو فیصلہ ہوا، اس کی عملی صورت یہ تھی۔

میں سچ کھیلنے سے اگلے روز کلاس روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ حساب کے ماسٹر صاحب بلیک بورڈ پر ایک سوال حل کر رہے تھے کہ گاؤں کے چھ سات لڑکے سہمے سہمے اور شرماتے شرماتے

ہیں کہ یہ کوئی بڑائی نہیں تو میں ان سے رطائی نہیں کروں گا۔ لیکن سرائی گنوں کے گٹھے کا کیا کیا جاتے؟

ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا۔ ”جتنے چوس سکتے ہو اپنے پاس رکھ لو۔ باقی اپنے دوستوں میں تقسیم کر دو۔“

”بہت اچھا سر!“ میں نے کہا۔

چھٹی کے بعد میں نے آٹھ دس بہترین گنے چھانٹ کر الگ کر لیے اور باقی کچھ اپنے استادوں اور کچھ اپنے شہری ہم جماعتوں میں تقسیم کر دیئے۔ کیونکہ دیہاتی لڑکوں کے لیے یہ کوئی قابل قدر چیز نہیں تھا۔

پھر میں نے بہترین آٹھ دس بچے ہوتے گئے اٹھائے اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی کوٹھی کی طرف چل دیا۔ وہ عیسائی مذہب سے تعلق رکھتے تھے ان کا نام شیر الدین تھا۔ جب نوکرنے میری اطلاع دی تو انہوں نے فوراً بلالیا۔ میں نے آگے بڑھ کر گنے پیش کر دیئے۔ ”جناب یہ لیجیے! آپ نے کہا تھا کہ میں یہ گنے اپنے دوستوں میں تقسیم کر دوں۔ یہ ان میں سے بہترین گنے ہیں جنہیں میں نے چھانٹ کر الگ کر لیا تھا۔ اور مجھے کچھ دیر یہ سوچنا پڑا کہ یہاں میرا بہترین دوست کون ہے؟“

ہیڈ ماسٹر صاحب ہم شائے سے گنے نوکرنے پکڑ لئے اور بولے: ”یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ تم مجھے اپنا دوست سمجھتے ہو۔ اب تم اندر جاؤ اور میرے کمرے کی دوسری الماری سے کوئی دلچسپ کتاب پڑھنے کے لیے نکال لو اور مطالعہ کرنے کے بعد لا کر خود ہی وہ کتاب اس الماری میں رکھ دینا اور دوسری لے جانا۔“

ہیڈ ماسٹر صاحب پہلے ہی میرے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے تھے اور دلچسپ اور نصیحت آموز کہانیاں جو مجھے ان کے گھر سے ملتی تھیں۔ میں نے ان سے پورا فائدہ اٹھایا تھا۔

چند دن بعد آبا جان گاڑی سے اترے تو ریوے اسٹیشن پر ان کی ملاقات ماسٹر جگن ناتھ سے ہو گئی۔

آبا جان ہر استاد کا احترام کرتے تھے، اس لیے وہ ماسٹر صاحب کے لیے رُک گئے۔ ماسٹر صاحب نے گفتگو کا آغاز ہی کچھ اس طرح کیا۔

جناب! آپ کا لڑکا ابھی سے چوہدری بن گیا ہے۔ حالت یہ ہے کہ گاؤں میں اُس کے ساتھ کھیلنے والے لڑکوں کی ٹولیاں بے دھڑک اسکول میں آگھستی ہیں ایک دن آوارہ لڑکوں نے کلاس روم میں جا کر اُس کے سامنے گنوں کا ڈھیر لگا دیا تھا۔ آبا جان نے گھر پہنچتے ہی مجھے بلایا اور کہا۔

”یوسف بیٹا! کل تم برڈنگ ہاؤس میں داخل ہو جاؤ گے اور وہاں گاؤں کے کسی لڑکے کو تم سے ملنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ یہ حکم انہوں نے کچھ اس طرح حکماً نہ انداز سے دیا۔ کہ کسی کو بولنے کی ہمت نہ پڑی۔ شام تک کھسک پھسرتی رہی۔ پھر سیدی حمایت میں آوازیں اٹھنے لگیں۔ اور زادی جان بہت غصے میں آگئیں تو آبا جان نے سب کو اطمینان سے سمجھایا کہ میں یہ سب کچھ یوسف کی بہتری کے لیے کر رہا ہوں۔ گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں اُس کا کافی وقت ضائع ہو جاتا ہے اور اگر اُس کا ماحول تبدیل نہ کیا گیا تو ان لڑکوں جیسا ہو جاتے گا جو اس کا وقت ضائع کرنے کے لیے اسکول میں بھی جا گھستے ہیں۔ اب تک میں نے اس حادثے کا کسی سے ذکر نہیں کیا ہوا تھا۔ اس لیے میرے حق میں کوئی آواز نہ اٹھ سکی۔“

اگلی صبح آبا جی میرے ساتھ اسکول تشریف لے گئے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اور دوسرے انتظامیہ کے افراد سے ملے اور پھر مجھے ہوسٹل میں داخل کروا دیا۔ اُس روز مجھے چھٹی کے بعد گھر آنے کی اجازت مل گئی لیکن اگلے دن مجھے اپنے سامان و اسباب کے ساتھ ہوسٹل میں منتقل ہونا پڑا۔

موجود رہنا تمہاری پہلی ذمہ داری ہوگی۔
 تمہیں گھر جانے کی اجازت دینے کا یہ مطلب نہیں کہ تم گاؤں کے راکوں کے ساتھ
 کھیل کود میں مشغول ہو جاؤ اور وقت ضائع کرو۔
 اسکول سے چھٹی ہوتی تو میں ایک منٹ ضائع کیے بغیر ہسٹل گیا۔ وہاں میں
 نے اپنی کتابیں رکھیں اور پھر گاؤں کی طرف بھاگ گیا۔
 امی جان! چھت کے اُپر بوہڑ سے پر بیٹھی ہوتی تھیں میں نے بے پاؤں آگے بڑھ
 کر پیچھے سے دونوں ہاتھ اُن کی آنکھوں پر رکھ دیے۔ انہوں نے پیار سے مسیری
 کلاتیاں مٹھ لیتے ہوئے کہا۔

”مجھے تو شاید رست کی خوشبو آرہی ہے۔“

میں نے ہنستے ہوئے کہا: آپ کو اباجی نے بتایا ہو گا کہ میں آؤں گا۔“

امی جان نے باری باری جیسے ہاتھ چومتے ہوئے کہا۔

”وہ یہ کہتے تھے کہ تم کبھی کبھی مجھے دیکھنے کے لیے آجایا کرو گے لیکن مجھے یقین تھا
 کہ تم آج ضرور آؤ گے۔ میں چھت پر تمہارا راستہ دیکھنا چاہتی تھی۔ اور یہ سوچ رہی تھی کہ
 اُدھر مغرب کی جانب جو چند درخت ہیں وہ کٹا دیے جائیں تاکہ میں تمہیں دُور سے آتا ہوا
 دیکھ سکوں۔“

”امی جان! میں نے جواب دیا: ”اب آپ کو کبھی میرا راستہ دیکھنے کی ضرورت
 پیش نہیں آئے گی۔ جب آپ کے دل میں میری یاد آئے گی تو میں یہاں پہنچ
 جایا کروں گا۔“

امی جان نے دونوں ہاتھوں سے میرے کان پکڑتے ہوئے کہا ”بے وقوف!
 تمہیں معلوم نہیں کہ میرا دل کبھی بھی تمہاری یاد سے خالی نہیں ہوتا۔“
 ”امی جان! میں نے اباجان سے یہاں آنے جانے کی اجازت لے لی ہے۔ اب میں

بورڈنگ ہاؤس کے وسیع اور کشادہ ہال میں چار پائیوں کی دو قطاریں تھیں۔ اباجی
 خود مجھے بورڈنگ ہاؤس میں چھوڑنے کے لیے آئے تھے۔ ہوسٹل پرنٹنڈنٹ صاحب
 نے مجھ سے یہ رعایت کی کہ ہال میں وہ ہمارے ساتھ آئے اور بولے۔ ”اب تم اپنی پسند کی جگہ
 بستر چالو۔“ میں نے بورڈنگ ہاؤس کی شمال کی طرف ایک کھڑکی کے سامنے اشارہ کرتے
 ہوئے کہا۔ ”جناب! وہ چار پائی خالی پڑی ہے اجازت ہو تو میں اپنا بستر وہاں لگا
 دوں؟“ اباجی نے آگے بڑھ کر کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا! مجھے معلوم تھا کہ تم
 وہ جگہ پسند کرو گے جہاں سے پہاڑ نظر آتے ہوں۔ اب دل لگا کر پڑھا کرو۔ اگر تم نے
 اچھے نمبر حاصل کیے اور اچھی پوزیشن لی تو ہو سکتا ہے کہ میں تمہیں ان پہاڑوں کی میر کردا
 دوں۔“

میں نے جواب دیا ”اباجی! میں بہت اچھے نمبروں کا۔ لیکن میں آپ سے ایک
 بات کی اجازت لینا چاہتا ہوں۔“

”کیا بات ہے وہ؟“

”ایا جان! جس دن امی جان مجھے نہ دیکھیں تو وہ بہت بے چین ہو جاتی ہیں۔“
 ”ہاں! مجھے معلوم ہے!“

انہوں نے درشت لہجے میں جواب دیا۔ ”لیکن وہ تمہارے ساتھ بورڈنگ ہاؤس
 میں نہیں آسکتیں۔“

”اباجان! میرا مطلب یہ تھا کہ اگر آپ خفا نہ ہوں تو میں بھاگ کر چند منٹ
 کے لیے انہیں دیکھ آیا کروں۔ وادی جان بھی خوش ہو جایا کریں گی۔“

اباجان نے کہا۔ ”اگر تم بھاگ سکو۔ تو دونوں وقت جاسکتے ہو۔ اس سے
 تمہاری صحت اچھی ہو جائے گی اور ٹانگیں مضبوط ہوں گی۔ میں تمہارے پرنٹنڈنٹ صاحب
 کو یہ کہہ دوں گا لیکن سکول میں بروقت حاضر ہونا اور بورڈنگ ہاؤس میں مطالعہ کے وقت

صبح و شام آپ کے پاس آیا کروں گا۔
 ”نہیں بیٹا! تم تھک جایا کرو گے۔“ امی جان نے کہا۔
 ”امی جان! میں نے جواب دیا۔“ آپ کو دیکھنے کے لیے میں کئی میل بھاگ
 سکتا ہوں۔

اندرام اسکول میں مجھ سے ایک جماعت آگے تھا۔ وہ بورڈنگ ہاؤس میں میرے
 نام سے چڑتا تھا۔ اُس کا رنگ سیاہی مائل تھا، منہ پر چچک کے داغ تھے، ماتھا حد سے
 زیادہ پھوٹا تھا اور آگے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ چوٹی کافی لمبی اور موٹی تھی اور اُسے نمایاں کرنے
 کے لیے باقاعدگی سے سر منڈوایا کرتا تھا۔ ماتھ چھوٹے چھوٹے تھے۔

ہوسٹل پرنٹنڈنٹ پادری آئیزک کے ساتھ اُس کے گھر سے مراسم تھے۔ پادری
 ایک سادہ دل آدمی تھا اور اُسے یہ جاننے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ ہوسٹل کے اندر اُس کی
 نظروں سے بالا بالا کیا ہو رہا ہے؟ اور اندرام اُس کی یہ ضرورت پوری کیا کرتا تھا۔ مثلاً وہ
 اُسے اُن دیکھے خطرات سے آگاہ کرنے کے لیے غیر متعلق واقعات کو اس طرح جوڑ دیا کرتا
 تھا کہ پادری صاحب کی نیند خراب ہو جایا کرتی تھی اور پادری صاحب نیند خراب کرنے
 والے کے شکر گزار ہوا کرتے تھے۔

اُس دن وہ کھانے خاص طور پر دسترخوان پر موجود تھے جو میں بڑے شوق سے کھایا
 کرتا تھا۔ جب میں رخصت ہونے لگا تو امی جان نے کچھ دودھ اور مکھن دے دیا۔ اچانک
 آبا جی کے دل میں کوئی خیال آیا تو انہوں نے کہا: ”یوسف! تم نے آج اپنی گھوڑی کی طرف
 توجہ نہیں دی۔“

”نہیں! آبا جان! میں صرف چٹی کے دل اُسے دیکھا کروں گا۔“
 ”تمہیں معلوم ہے کہ اگر باقاعدہ توجہ نہ دی جائے تو گھوڑی کی حالت خراب ہو جاتی
 ہے۔“

مجھے معلوم ہے لیکن.....! آبا جی نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔
 ”میرا خیال ہے کہ تمہارا چچا عبدالکریم اس گھوڑی پر سواری کر سکتا ہے۔“
 ”ہاں آبا جان!“

”پھر بیٹا! میرا فیصلہ یہ ہے کہ تم صبح کے وقت تو پیدل یہاں آیا کرو گے لیکن شام
 کے وقت عبدالکریم تمہارے ساتھ بیٹھ جایا کرے گا اور تمہیں بورڈنگ ہاؤس تک
 پہنچا کر واپس آجایا کرے گا۔ اور جب فرصت ہو کرے گی تو کبھی کبھی صبح کے وقت
 بھی وہ تمہیں گھوڑی پر پہنچا دیا کرے گا۔ میرا مطلب یہ ہے سواری تم کیا کرو گے اور وہ گھوڑی
 واپس لانے کے لیے تمہارے پیچھے بیٹھ جایا کرے گا۔“

ہوسٹل پرنٹنڈنٹ پادری آئیزک کے ساتھ اُس کے گھر سے مراسم تھے۔ پادری
 ایک سادہ دل آدمی تھا اور اُسے یہ جاننے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ ہوسٹل کے اندر اُس کی
 نظروں سے بالا بالا کیا ہو رہا ہے؟ اور اندرام اُس کی یہ ضرورت پوری کیا کرتا تھا۔ مثلاً وہ
 اُسے اُن دیکھے خطرات سے آگاہ کرنے کے لیے غیر متعلق واقعات کو اس طرح جوڑ دیا کرتا
 تھا کہ پادری صاحب کی نیند خراب ہو جایا کرتی تھی اور پادری صاحب نیند خراب کرنے
 والے کے شکر گزار ہوا کرتے تھے۔

اندرام کی انتہائی کامیابی یہ تھی کہ اُس نے ہوسٹل کے دوڑکوں کو چھ بید لگوا دیے
 تھے اور بہادر سنگھ پر یہ الزام لگا کر اُس کے کان پکڑوا دیے تھے کہ اُس نے اپنی الماری
 میں شراب کی بوتل چھپا رکھی تھی اور وہ ہر روز پیتا تھا۔ بہادر سنگھ نے کوئی تصدیقی پیش
 کیے بغیر کان پکڑ لیے اور جب پادری صاحب نے غصے میں آکر دو تین چھڑیاں ماریں تو
 اُس نے احتجاج کیا۔

”جناب! مجھے یہ تو بتائیے کہ آپ کو غصہ کیوں آتا ہے؟“
 ”اے اُٹو! تم شراب کی بوتلیں لے کر ہوسٹل میں آ جاؤ اور مجھے غصہ نہ آئے تم ہیو۔“
 اور بڑھکیں مارو اور میں پھر بھی خاموش رہوں۔“
 بہادر سنگھ نے عاجزی سے کہا۔ ”مجھے بھگوان کی سوغند امیں نے بالکل نہیں پی،

میں نے کبھی بڑھکیں نہیں ماریں اور میرے پاس ایسی کوئی بوتل نہیں جس میں شراب ہو۔
پادری صاحب نے جھنجھلا کر کہا کیا جکتے ہو تمہاری الماری میں شراب کی بوتل نہیں ہے؟

”جناب! شراب کی بوتل تو ہے لیکن اُس میں اب سرسوں کا تیل ہے اور وہ اُس میں اُس وقت ڈالا گیا تھا۔ جب وہ خالی ہو گئی تھی۔“

پادری صاحب چکر اگئے انہوں نے الماری کھلوا کر خود تلاشی کر لی۔ بوتل نکالی گئی، تو معلوم ہوا کہ اُس میں خالص سرسوں کا تیل ہے، عین اُس موقع پر ہیڈ ماسٹر اور ہیڈر صاحب گشت پر آگئے اور انہیں جیب اس واقعہ کی تفصیلات معلوم ہوئیں تو وہ پادری صاحب کو ساتھ لے کر چلے گئے۔ چند دن بعد معلوم ہوا کہ پادری صاحب کسی اور جگہ تبدیل کر دیے گئے ہیں اور ایک اور استاد جن کا نام سیکرٹری ماسٹر کے برابر تھا بورڈنگ ہاؤس کے نئے پرنسپل کی حیثیت سے انچارج بنا دیے گئے۔ ان کی شرکت ان کے آنے سے پہلے پہنچ چکی تھی اور وہ یہ بھی کہ وہ ایم اے ہیں اور اُن کا نام مسٹر جسٹن ہے۔ وہ کچھ عرصہ اسکول میں کام کریں گے اس کے بعد ملک سے باہر انہیں کوئی بڑی ملازمت مل جائے گی۔ مسٹر جسٹن کی ایک بات جس سے

ہر طالب علم کو دل چسپی تھی۔ وہ یہ تھی کہ ڈسپلن کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ اور اس معاملے میں کسی کی رو رعایت نہیں کرتے تھے۔ مسٹر جسٹن آئے اور انہوں نے بورڈنگ کے لڑکوں کو جمع کیا اور پہلی ملاقات میں یہ الفاظ کہہ دیے کہ میں اچھے لڑکوں سے جیسے اچھا سلوک کرتا ہوں اور بُرے لڑکوں کو کبھی یہ توقع نہیں رکھتی چاہیے کہ وہ سزا سے بچ سکیں گے۔

تیسرے دن مسٹر جسٹن نے پھر طلباء کو جمع ہونے کا حکم دیا۔ اُن کے ہاتھ میں بید تھا، اور لڑکے اُن کے تیور دیکھ کر یہ سمجھ سکتے تھے کہ آج کسی کی شامت آئی ہوئی ہے۔

چند ثانیے بعد انہوں نے کہا۔ ”جب سے میں یہاں آیا ہوں ایک لڑکا میرے پاس تین چار بار آیا ہے۔ پہلے وہ صرف سلام کرتا تھا شاید اس لیے کہ مجھے دو تین بار سلام کیا جاتے،

تو میں بے وقوف بن جاتا ہوں اور پھر اُس نے ایک اور لڑکے کی شکایات لگانا کرنا شروع کر دیں۔ شاید تم سمجھ گئے ہو گے۔ وہ لڑکا کون ہے؟ میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ آگے آکر کھڑا ہو جائے۔“ جب کوئی لڑکا نہ اُٹھا تو مسٹر جسٹن نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔

”اندر رام آگے آ جاؤ!“

اندر رام نے حکم کی تعمیل کی۔

مسٹر جسٹن نے کہا۔ ”یوسف تم بھی آگے آ جاؤ۔“

میں اُٹھ کر چند قدم آگے بڑھا۔

مسٹر جسٹن نے اندر رام کی طرف رخ کر کے کہا۔

”دیکھو! بے وقوف لڑکے تمہارے لیے صحیح جواب دینے کا آخری موقع ہے، ورنہ تمہیں وہ سزا ملے گی جو تمہیں عمر بھر یاد رہے گی۔“

اب بتاؤ۔ کیا تم نے یوسف پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ اپنے گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کے لیے چھٹی ہوتے ہی بھاگ جاتا ہے اور اس لیے بھاگ جاتا ہے کہ گاؤں کے آوارہ لڑکے اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں آتے ہوئے ڈرتے ہیں؟

”جی! میں نے کہا تھا۔“ اندر رام نے کہا۔

”تم نے یہ الزام بھی لگایا تھا کہ یہ علی الصباح گاؤں کی طرف بھاگ جاتا ہے۔“

”جی! میں نے کہا تھا۔“

”یوسف! اب تم جواب دو۔ کہ چھٹی کتنے بچے ہوتے ہیں؟“

”جی! چھٹی چار بچے ہوتے ہیں اور تمہارا گاؤں کتنی دور ہے؟“

”جناب! دو میل سے کم ہے۔“ اور واپس کتنے بچے آ جاتے ہو؟

”جناب! میں مطالعہ شروع ہو جانے سے پہلے آ جاتا ہوں۔“

”تم گھر جا کر کھانا کھاتے ہو۔“

”تو پھر تمہیں کیا شکایت ہے؟“

”سر اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے تو مجھے کوئی شکایت نہیں!“

”یوسف تم اس بے وقوف لڑکے کے منہ پر ایک تھپڑ مارنا پسند کرو گے یا زیادہ؟“

یوسف نے جواب دیا۔ ”نہیں سر! میں اس کے منہ پر تھپڑ مارنا پسند نہیں کرتا!“

”اس کے باوجود تم اس کے منہ پر تھپڑ مارنا پسند نہیں کرتے کہ اس نے تمہارے خلاف شکایتیں کی ہیں؟“

”سر یہ بے وقوف ہے۔ میرے تھپڑ کھا کر عقل مند نہیں ہو جائے گا!“
مسٹر جسٹن نے کہا۔

”دیکھو اندرام! میں اس دفعہ تمہیں معاف کرتا ہوں لیکن آئندہ اگر تم نے کوئی حماقت کی تو اس بید سے تمہاری خوب تواضع کی جائے گی۔ اب تم لوگ جا سکتے ہو۔“

”ہم سٹڈی روم سے باہر نکلے تو اندرام کے خلاف سرگوشیاں ہونے لگیں۔ کئی لڑکے اس بات پر ناراض تھے کہ میں نے اسے تھپڑ کیوں نہیں مارا۔“

”جی ہاں!“ دو مرتبہ گھر جانے کی کوئی خاص وجہ بتا سکتے ہو؟

”جی! اُس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اتنی جان مجھے دیکھ کر خوش ہوتی ہیں۔ اگر میں

ان کے ساتھ کھانا نہ کھاؤں تو وہ بھوکے رہتی ہیں۔“

”تمہارے اور بہن بھائی بھی ہیں۔“

”جی ہاں! میں اس لیے بھی گاؤں جاتا ہوں کہ انہیں دیکھ کر مجھے خوشی حاصل

ہوتی ہے۔“

”تمہیں گھر میں کھانا کھانے اور باتیں کرنے کا اتنا وقت مل جاتا ہے کہ تم کھانا بھی

کھا سکو، اور باتیں بھی کر سکو۔“

”جی! واپس میں اپنی گھوڑی پر آتا ہوں اور میرے ساتھ ایک آدمی ہوتا ہے۔

جو اُسے واپس گاؤں لے جاتا ہے۔“

مسٹر جسٹن نے اندرام کی طرف دیکھا۔

”کیوں اندرام! اب بتاؤ! کیا یوسف نے کوئی بات غلط کہی ہے؟“

”جی نہیں!“

”کوئی ایسی بات ہے جو یوسف نے نہیں بتائی؟“

”جی نہیں؟“

”کوئی ایسی بات ہے جس پر تمہیں کوئی اعتراض ہو؟“

”ہاں مجھے یاد آیا تم نے یہ کہا تھا کہ یوسف اپنے گاؤں سے گئے اور گرڈ منگواتا ہے۔

اور لوگوں میں تقسیم کرتا ہے۔ کیا تمہیں بھی اس نے کبھی گستاخ اور گرڈ دیا؟“

”جی! مجھے اس نے گتے بھی دیے تھے اور گرڈ بھی دیا تھا۔“

”مفت دیا تھا یا تم سے پیسے لیے تھے؟“

اندرام نے کہا۔ ”سر میں نے یہ تو نہیں کہا کہ کسی سے پیسے لیتا ہے۔“

باب - ۱۹

رہے ہیں۔ چودھری غلام نبی کو مولوی صاحب سے کچھ زیادہ ہی اُٹس تھا۔ اُس نے برادری کے دوسرے بزرگوں سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد مولوی صاحب سے درخواست کی کہ اگر یہ نسل واقعی بہت قیمتی ہے تو اسے ہمارے پاس چھوڑ دیجئے۔ یہاں اسے ہمارے لہلہاتے کھیتوں میں کھلے بندوں پھرنے کی آزادی ہوگی اور دو تین مہینے جب یہ آزادی سے گندم کے کھیتوں میں گھومے پھرے گا، تو اس کی شکل تبدیل ہو جائے گی۔ قد و قامت اس کا شاید زیادہ نہ بڑھ سکے لیکن جسامت میں دو گنا ضرور ہو جائے گا۔

مولانا نے خوش ہو کر کہا: "تو غلام نبی اب یہ گھوڑا پورا ایک سال تمہارے پاس رہے گا۔ اور اگر ایک سال یہ آزادی سے سرسبز کھیتوں میں پھرتا رہا تو پھر کوئی سوار اس کے قریب نہیں جاسکے گا۔"

مولانا تو پھر کسی دور دراز سفر پر چلے گئے۔ دیہاتی لوگوں نے یار قندی گھوڑے کو پہلے انگوٹھا — پھر انگوٹھ — اور بالآخر گوٹھ کھنا شروع کر دیا۔ اُس وقت کسی کو معلوم نہ تھا کہ چند ماہ بعد گوٹھ کا لفظ کتنا مشہور ہو جائے گا۔

اگر مجھ سے یہ پوچھا جائے کہ تمہارے دل میں کب سواری کا شوق پیدا ہوا تھا؟ اور تم نے کس سے سواری سیکھی تھی تو میں اس کا صحیح جواب نہ دے سکوں گا۔

گھر کا ہر بڑا — اپنے گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ بٹھالیتا تھا۔

جب میں پرائمری سکول میں پڑھتا تھا، مجھے کسی چھوٹے قد کے ٹوکی پشت پر کودتے ہوئے خوف نہیں محسوس ہوتا تھا۔ جب قبلہ مولوی صاحب کا "یار قندی گھوڑا" جو گاؤں میں گوٹھ کے نام سے مشہور ہوا تھا۔ ہمارے گاؤں میں آیا تو میں ایک اچھا خاصا سوار بن چکا تھا۔ اور میں نے گوٹھ کی تعریف سننے کے بعد اپنے دل میں یہ عہد کیا تھا کہ جب یہ خوب مضبوط اور توانا ہو جائے گا تو سب سے پہلے میں اس پر سواری کروں گا۔

ہمارے ایک رشتہ دار اپنے دور کے ایک مشہور عالم دین تھے۔ انہیں طب کا شوق بھی تھا اور جڑی بوٹیوں کی تلاش میں دور دراز کے مقامات کی سیاحت بھی کیا کرتے تھے۔ بڑے مشہور خطیب تھے اور جہاں جاتے تھے اپنا رنگ جمالیتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ کشمیر کی سیاحت کے بعد واپس آئے وہاں سے کسی عقیدت مند نے انہیں ایک سواری کا جانور جسے وہ "یار قندی گھوڑا" کہہ کر اپنے مریدوں کو مرعوب کر دیا کرتے تھے۔ تحفے کے طور پر دیا۔ طویل مسافت میں جھوکا رہنے کی وجہ سے اُس کی حالت قابلِ رحم ہو چکی تھی۔ قد انا چھوٹا تھا کہ مولانا جب چپ کراؤں پر سوار ہوتے تھے تو اُسے صرف قریب سے دیکھ کر ہی کہا جاسکتا تھا کہ یہ گھوڑے کی نسل سے ہے۔ گردن بہت چھوٹی تھی۔ اُس کے جبرے قد کی نسبت زیادہ مضبوط اور بھاری معلوم ہوتے تھے۔ آنکھوں سے عیاری ٹپکتی تھی۔

مولوی صاحب کے زورِ خطابت کے باعث سننے والوں کو اُن کے ان گنت اوصاف نظر آ جاتے تھے، جب وہ یہ کہتے تھے کہ یہ تنگ اور بڑے پیچ پہاڑی راستوں پر بے دھڑک پڑھ جاتا ہے، تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اُسے کشمیر کے پہاڑوں میں بھاگتے اور کودتے دیکھ

اور جب وہ گندم کے لہلہاتے کھیتوں میں آزادی سے گھومتا پھرتا تو میں خوش ہوا کرتا۔
میں نے اُس کے ساتھ ”دوستانہ مراسم“ پیدا کرنے کے لیے اُسے گڑ کھلانے کی
کوشش بھی کی تھی لیکن وہ کسی کو قریب نہیں آنے دیتا تھا اور غلام نبی کہا کرتا تھا۔
”یاریہ تو بالکل جنگلی ہونا جا رہا ہے“

سردیوں کے دنوں میں گوٹھ رات کے وقت موشیوں کے بارے میں آجاتا تھا
جب موسم بہار آیا تو اُس کی جسامت میں ناقابل یقین اضافہ ہو چکا تھا۔ گردن موٹی ہو جانے
کے باعث اور چھوٹا نظر آتی تھی۔ گوٹھ چلتی ہوا میں دوڑتا تھا تو اُس کے لہراتے ہوتے بال
دُور سے نظر آتے تھے۔ اُس کے گلے میں رستہ ڈال کر کسی جگہ باندھنا ایک مسئلہ تھا اس کے لیے
گاؤں کے مضبوط آدمیوں کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں اور اسے بارے کے ایک کونے
میں شہتوت کے ایک درخت کے نیچے باندھ دیا جاتا تھا۔

ایک دن جب نوکر نے اُسے لگام دینے کی کوشش کی تو اُس نے اگلے سُم اٹھالے
اور نوکر اُس کے نیور دیکھ کر پیچھے ہٹ گیا۔ چہرہ غلام نبی نے مجھے آواز دی اور کہا ”بھئی! یہ
تو لگام دیکھ کر حملہ کرتا ہے۔ اب کیا کیا جاتے؟“

میں نے نوکر سے کہا۔ تم رستا کھونٹے سے کھول کر درخت کی شاخ کے اوپر ڈال دو۔
اور پھر رستے کو اتنا کھینچو کہ گھوڑا ہل چل نہ سکے۔ البتہ اس کی گردن اور اٹھ جائے۔

اب چونکہ گھوڑے کی گردن اتنی اوپر ہو چکی تھی کہ اُس کے لیے اچھلنے کوونے کی
گنجائش نہ تھی۔ اس لیے میں نے اس کا جبراً پڑا اور غلام نبی نے اُس کے منہ میں لگام ٹھونس
دی۔

میں نے کہا۔ ”چچا! جلدی کر دین منگواؤ پھر یہ قابو میں نہیں آئے گا۔“
نوکر بھاگ کر زمین لایا۔ گھوڑا اُسے دیکھ کر تڑپا، اُچھلا، ایک دو بار ہولناکی سی آواز
نکالی لیکن اُس کے بعد بے بس ہو گیا۔

غلام نبی نے اُسے کھولنے سے پہلے احتیاطاً دو آدمی اور بلوائے تھے میں لپک کر
بید کی مضبوط چھڑی جسے میں سرکش گھوڑوں پر استعمال کیا کرتا تھا، لے آیا۔ تڑپتے،
اُچھلتے کودتے گھوڑے کو بارے سے اس طرح نکالا گیا کہ دو مضبوط آدمی اُس کی لگام تھامے
ہوئے تھے اور دو نے اُس کا رستہ پکڑ رکھا تھا جب وہ گیٹ پر پہنچا تو رستہ اس کی گردن سے
لپیٹ کر باندھ دیا گیا۔

ابھی یہ فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ سواری کون کرے گا۔ میں نے آواز دی چچا غلام نبی!
میں آ رہا ہوں اور اس کے ساتھ ہی میں نے دوڑ کر چھلانک لگا دی اور زمین پر بیٹھ کر نوکروں
کے ماتھے سے لگام چھین لی۔

گوٹھ تڑپا، اُچھلا، کبھی وہ اگلی ٹانگوں پر کھڑا ہو جاتا تھا اور کبھی کچھلی ٹانگیں اوپر کر کے
ہوا میں دو تیاں جھارتا تھا۔ گاؤں کے بہت سے لوگ وہاں جمع ہو چکے تھے اور غلام نبی کو
بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔

لیکن گھوڑے کو زیادہ دیر اپنے کرتب دکھانے کا موقع نہ ملا۔ میں نے رکابوں
کے اندر پاؤں جماتے ہی، اُس کی پیٹھ پر یکے بعد دیگرے دو چھریاں رسید کیں۔ وہ اُچھلا، رکا،
اور پھر ایک طرف بھاگ نکلا۔ اب وہ بھاگ رہا تھا اور میں اُسے خوب دوڑا رہا تھا۔ مجھے
پہلی بار اس بات کا احساس ہوا تھا کہ یار قندی نسل کے ناطے سے میں نے جو اُس کی خوبیاں
سنی تھیں وہ بے وجہ نہیں تھیں۔ اُس کا بار بار راستہ پھوڑ کر اُدھر اُدھر بھٹکنے کو جی چاہتا تھا۔
لیکن میں اُس کی گردن پر چھڑی مار کر اُسے خبردار کر دیتا تھا۔ وہ راستہ بھی درست کر لیتا تھا اور
نسبتاً رفتار بھی تیز کر دیتا تھا۔

گاؤں کے کچھ لوگ یہ تماشا دیکھنے کے لیے میرے پیچھے سوار ہو کر نکلے تھے لیکن وہ
بہت پیچھے رہ گئے۔ میں چند منٹ کے بعد بڑی نہر کے کنارے پہنچ کر یہ محسوس کر رہا
تھا کہ اب گوٹھ تھک چکا ہوگا۔ اُسے پڑی پر آرام سے چلنے دوں گا لیکن پڑی پر چڑھتے

اُن کے پاس بھی ایک گھوڑی تھی وہ میری گھوڑی کے ساتھ بہت مانوس ہو گئی۔ ایک دہر وہ رخصت ہوتے تو باہر کھیتوں میں میری گھوڑی چبچگ رہی تھی وہ مہمان کی گھوڑی کے پیچھے چل پڑی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ مجھے گاؤں کے ایک آدمی نے بتایا کہ ایک آدمی گھوڑی پر سوار چارہ تھا اور آپ کی گھوڑی اُس کے پیچھے پیچھے جا رہی تھی میری گھوڑی اپنی نئی دوست کے ساتھ اتنی مانوس ہو چکی تھی کہ اس بات پر مجھے تعجب نہ ہوا۔ اب کئی مہینوں کے بعد گوٹھ کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ گوٹھ میرا اتنا لحاظ مند کرتا تھا کہ اُس پر سوار ہونے کے مراحل خوش اسلوبی سے طے ہو جاتیں۔ میں اُس گاؤں کی طرف چل پڑا جو کوئی سات آٹھ میل دور تھا۔ چونکہ رات سر پر آ رہی تھی اس لیے میں کافی تیز دوڑ رہا تھا۔

میرا رستہ ایک نہر کی پٹری پر کوئی تین چار فرلانگ چلنے کے بعد اُس پل پر پہنچ جاتا تھا۔ جس کے پار جا کر مجھے اس گاؤں کا راستہ ملتا تھا۔ مغرب کے وقت میں کسی وقت کے بغیر اس گاؤں میں پہنچ گیا۔ وہاں ہمارے رشتہ دار اور گاؤں کے دوسرے لوگ دیکھتے ہی جمع ہو گئے اور انہوں نے کہا: "اُس بے وقوف نے نہر کے پل پر آکر تمہاری گھوڑی دیکھی ہے۔ اور یہاں پہنچتے ہی گھوڑی کو دو آدمیوں کے ساتھ واپس بھیج دیا گیا ہے۔ انہوں نے بڑی کوشش کی کہ میں وہاں ٹھہر جاؤں اور تسلی دی کہ گھوڑی پہنچ گئی ہوگی۔

لیکن مجھے گھوڑی سے اتنا پیار تھا کہ مجھے اطمینان نہ ہوا۔ میں نے گوٹھ کی باگ موڑی اور السلام علیکم کہہ کر اُسے ایڑ لگا دی۔ اب رات ہو گئی تھی۔ پل عبور کرنے کے بعد نہر کی پٹری سے جو راستہ اُترتا تھا وہ میں اندھیرے کی وجہ سے نہ دیکھ سکا۔ شاید میں دو تین فرلانگ کی بجائے ایک یا دو میل آگے نکل آیا

دو دن قبل کافی بارش ہو چکی تھی اور راستے میں کافی کیچڑ تھا۔ میں رات کی تاریکی

ہی گوٹھ نے اچانک ایک جست لگائی اور مجھے نہر کے ٹھنڈے پانی میں غوطہ کھانا پڑا۔ اگر میں تیرا کہ نہ ہوتا تو یار قندی حضرت مجھ سے انتقام لے چکے تھے لیکن میں تیزی سے دو چار ہاتھ مارنے کے بعد باہر نکل آیا۔ اب گوٹھ کی باری تھی۔

پانی کافی گہرا تھا اور گوٹھ کے باہر نکلنے کی یہی صورت تھی کہ کنارے پر اُس کے پاؤں کسی جگہ جم جاتیں لیکن ایسی جگہ وہاں نہیں تھی۔ میں اُسے چھڑی سے ڈرا کر پیچھے کر دیتا تھا سرد پانی میں اُس کی تمام شوخیاں بہت جلد ختم ہو چکی تھیں۔ عام حالات میں مجھے یہ خوف ہونا چاہیے تھا کہ اگر میں ایک بار گر پڑا تو مجھے اس پر سوار کون کرائے گا لیکن وہ بُری طرح کانپ رہا تھا۔ دغا باز آنکھوں سے مسکینی اور بے بسی ٹپک رہی تھی۔ میں نے ایک منزلوں جگہ دیکھ کر اُس کی لگام پکڑ کر کھینچی اور وہ کنارے پر چڑھ آیا۔

میں نے اُس کی گردن پر ہاتھ پھیرا اور یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ بلکہ وہ نتھنوں سے ایک ایسی آواز نکال رہا تھا۔ جس میں غصے کی بجائے التجا تھی۔ میں اُس کی لگام پکڑ کر پیدل چل پڑا اور وہ میرے ساتھ آرام سے چلتا رہا۔ پھر میں اُس پر سوار ہونے لگا تو مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ یہ وہ گوٹھ نہیں، بلکہ جانوروں کی ایک انتہائی بے ضرر نسل سے تعلق رکھتا ہے۔

یہاں سے ہماری واقفیت شروع ہوئی گوٹھ مجھے پہچاننے لگا تھا۔ لیکن کبھی کبھی وہ آنکھیں پھیر لیا کرتا تھا اور شاید اس میں اُس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں نے میٹرک پاس کیا تو آیا جان میرے لیے ایک خوب صورت گھوڑی خرید لائے تھے اور میں اس سے اتنا مانوس ہو گیا تھا کہ مجھے سواری کے کسی اور جانور پر توجہ دینے کی ذہنت ہی نہیں تھی۔

سردیوں کے دنوں میں ہمارے ایک رشتہ دار ہمارے یہاں آئے وہ چند دن ٹھہرے

یار! ادھر تو کوئی نہیں۔ اُن میں سے ایک کہہ رہا تھا۔

پھر پیچھے سے آوازیں آنے لگیں۔ "ارے! کوئی پتہ چلا؟"

یہ دو آدمی بالکل قریب آگئے تو میں نے کہا "ٹھہر جاؤ! وہ رُکے۔ تم اس وقت

کہاں بھاگے پھرتے ہو؟" انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے ذرا غصے سے کہا "یہ قوف!

بولتے کیوں نہیں؟ میں پوچھتا ہوں پولیس کہاں ٹھہری ہے۔"

ایک نے کہا۔ "جی پولیس ادھر نہیں آئی ہے؟"

"اگر نہیں آئی تو لوگ بھاگے کیوں پھرتے ہیں؟"

"جی ہمیں کچھ معلوم نہیں، ہم دوسروں کا شور سن کر آئے ہیں۔"

"ہمارے آدمی پیچھے رہ گئے ہیں۔ اگر تم بتاؤ کہ کارخانے کی قباں کس طرف ہیں تو

میں ابھی راستہ تلاش کر کے انہیں ڈھونڈ لوں گا۔"

دیہاتی نے کہا "جناب کارخانے کی قباں اگلے گاؤں سے نکلتے ہی آپ کو نظر آ

جائیں گی۔"

"چلتے۔ میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

اچھا چلو! اور اپنے ساتھیوں سے کہہ دو کہ اگر دوسری طرف سے کوئی آئے

تو وہ یہ کہہ دیں۔ کہ غلام قادر حوالدار، تھانے دار صاحب کا راستہ دیکھنے گیا ہے۔

دوسرے آدمی نے کہا "حوالدار صاحب آپ نکر نہ کریں، اگر اس علاقے میں

پولیس کا کوئی آدمی آیا ہے تو اسے بہت جلد یہ پیغام مل جائے گا۔"

"اب آپ قباں دیکھ کر خود راستہ تلاش کر لیں گے یا ہمارا آدمی آپ

کے ساتھ کچھ دُور تک جائے۔"

"نہیں! مہربانی، اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے یہ کہہ کر گوٹھ کو ایڑ

لگا دی۔

کوئی ایک میل چلنے کے بعد اگلے گاؤں کی دوسری طرف

میں واپس جا کر راستہ تلاش کرنے کی بجائے نیچے اتر پڑا۔ میں کھیتوں میں کچھ سے لت پت

ہو چکا تھا اور تاریکی میں صرف ستاروں سے اپنی سمت متعین کر سکتا تھا۔ مجھے ایک خدشہ

حضور تھا کہ میں کہیں بے خبری کی حالت میں جرائم پیشہ قبیلے کی سبھیوں میں نہ پہنچ جاؤں۔

یہ آٹھ دس گاؤں ایسے تھے جن کے آدمیوں کو علاقے کے تھانے میں حاضری دینی پڑتی تھی۔

اُن کی زمینیں اتنی اچھی نہیں تھیں۔ اس لیے نقب زنی، رستہ گیری اور چھوٹے چھوٹے ڈاکوں

پر وہ لوگ گزارہ کرتے تھے۔ کوئی بڑی واردات ان لوگوں سے منسوب نہ تھی۔ بعض لوگ کہتے

تھے کہ پولیس بلاوجہ انہیں تنگ کرتی ہے۔

اب مجھے اپنے "یار قندی" دوست کے متعلق جو ایک نیا تجربہ ہوا، وہ یہ تھا کہ وہ تاریکی

میں بھاگتا تھا! اچانک ایک جوڑہ میں کود پڑا۔ میں نے یکے بعد دیگرے اُسے دو تین چھڑیاں

ماریں، وہ گروا اور چھلانگ لگا کر باہر نکلا۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ ایک عورت چولے پر

روٹیاں پکا رہی ہے۔ یعنی میں ان جرائم پیشہ لوگوں کی بستی میں نہیں بلکہ کسی کے گھر

جا پہنچا تھا۔ بھائی کون ہے؟ بھائی کون ہے؟ عورت چلائی۔

میں نے جواب دینے کی بجائے گوٹھ کو دو چھڑیاں رسید کیں اور چھوٹی سی گلی سے

نکل کر پھر کسی کھیت میں پہنچ گیا۔ اس کے بعد کئی طرف سے آوازیں آرہی تھیں "اے کون ہے؟"

تم ادھر سے جاؤ دیکھو کون ہے؟ ہم ادھر سے جاتے ہیں۔ اگلے گاؤں کو خبردار کرو۔ ہم

سے پُرچھے بغیر یہاں کون آگیا ہے؟"

پھر کئی عورتیں بول رہی تھیں اور میں نہ سمجھ سکا کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔

اب میری کوشش یہ تھی کہ ان آوازوں سے دُور چلا جاؤں۔ میں زیادہ دُور نہیں

گیا تھا کہ دوسری طرف سے آوازیں آنے لگیں۔

"یار! ادھر سے آوازیں آرہی ہیں کہ کوئی گروہ ادھر سے آیا ہے۔"

میں نے گوٹھ کو روک لیا اور اس کی گردن پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ دو آدمی بھاگتے ہوئے آئے۔

مجھے کارخانے کی بتیاں دکھائی دیں۔ اب مجھے معلوم تھا کہ ان بستیوں کو
سیدھ میں چلتا رہوں تو کارخانے والے شہر سے ————— دو میل
اُس طرف میرا گاؤں واقع ہے۔

باب = ۲۰

گاؤں کے چھوٹے اور بڑے گھرؤں سے باہر نکل کر میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے
ہی، بیک وقت کئی آوازیں آئیں: ”گھوڑی پہنچ گئی ہے۔ گھوڑی پہنچ گئی ہے“ پھر انہوں نے
مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ میں نے گھوڑے سے کود کر انہیں جواب دیا۔
”مجھے گھوڑی کی تلاش میں بہت دُور جانا پڑا تھا۔ اور پھر واپسی پر میں راستہ
بھول گیا۔“

پھر میں نے ایک نوکر سے کہا: ”تم بھاگ کر جاؤ اور ہمارے گھر سے بہت سا گڑ
لے کر آؤ۔“

نوکر گڑ کی بھیلی لے آیا تو میں نے گھوڑے کی لگام اتاری اور گڑ کے چھوٹے چھوٹے
ٹکڑے بنا کر اُسے کھلانا شروع کر دیا۔ غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ میں بے تکلفی سے اپنا ماتھ اُس
کے منہ کے قریب لے گیا اور اُس نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ اُس کے منہ
میں دانت ہیں۔ میں نے تین چوتھائی بھیلی اُسے کھلا کر باڑے میں بھجوا دیا اور باقی ماندہ گڑ
اپنی گھوڑی کو کھلا دیا۔

پھر میں نے نہادھو کو کپڑے تبدیل کیے تو باورچی خانے سے اٹی جان کی آواز آئی۔

یوسف تمہارا کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“

میں نے کہا ”امی جان! میرا خیال تھا کہ آپ سو گئی ہوں گی۔“

”جھوٹا کہیں کا!“ ماں نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”تمہیں معلوم ہے کہ جب تم آئے تھے تو میں تمہاری دادی اور تمہاری چچیاں سب گھر سے

باہر نکل کر تمہارا راستہ دیکھ رہی تھیں اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ تمہاری دادی اماں اس وقت

شکرانے کے نوافل ادا کر رہی ہیں۔“

یوسف نے کہا۔ ”امی جان! مجھے ایک بات اور معلوم ہے کہ جب میں مکان کے

اندروں داخل ہوا تھا۔ تو آپ میرے لیے مرغی بھون رہی تھیں۔“

ماں نے پوچھا۔ ”یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”امی جان! بھوک لگی ہوئی ہوں تو بھونے جانے والے گوشت کی خوشبو بہت

دور سے آ جاتی ہے۔“

ماں نے کہا۔ ”بیٹا! جو ماں سمجھ سکتی ہے وہ کوئی اور نہیں سمجھ سکتا۔ میں نے

عشاء کے وقت شور مچانا شروع کر دیا تھا کہ فوراً ایک مرغی ذبح کر لی جائے اگر میرا

بیٹا دیر سے آیا تو اسے بہت بھوک لگ رہی ہوگی لیکن سب یہی کہتے تھے کہ وہ رات

میں کسی کے گھر سے کھانا کھا کر آئے گا۔ یوسف! یہ عجیب ہے کہ تمہارے متعلق جو کچھ میں

سوچتی ہوں وہی درست ہوتا ہے۔“

”امی جان! آپ کے سوا اور کون ہے جو میرے متعلق ایک ماں کی طرح سوچ سکتا

ہے۔“

ماں نے چراغ کی روشنی میں میری طرف غور سے دیکھا اور پھر میرا سراپنہ سینے

کے ساتھ بھینچتے ہوئے، اپنے ہونٹ میری پیشانی پر ثبت کر دیے۔ پھر وہ بولیں!

”دیکھو یوسف! مجھے نہ ستایا کرو! جب مجھے پتہ چلا کہ تم اپنی گھوڑی کی تلاش میں

چلے گئے ہو تو میرے لیے یہ لمحہ قیامت سے کم نہ تھا۔ تمہیں میرے پیار کی حقیقت اس

وقت سمجھ میں آئے گی۔ جب میں۔۔۔ جب میں، اُن کی آواز بھرا گئی۔ میں نے آنکھیں

اٹھا کر دیکھا تو اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر رہی تھیں۔

”امی جان! مجھے معاف کر دیجئے! مجھ سے غلطی ہوتی ہے۔ مجھے آپ کو بتا کر جانا

چاہیے تھا۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔۔۔ آئندہ کبھی ایسا نہیں ہوگا۔“

ایک منٹ بعد جب امی جان نے کھانا میرے سامنے رکھ دیا تو میں نے سگراتے

ہوئے کہا۔

”امی جان! ایک بات اور بتاؤں۔“

”بتاؤ! بیٹا!“

”امی جان! بات یہ ہے کہ آپ بھی بھوک لگی ہیں۔“

”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”امی جان! جب مجھ سے کوئی ایسی حماقت ہوتی ہے تو آپ کھانا نہیں

کھایا کرتیں۔“

ماں جی میرے ساتھ کھانے پر بیٹھ گئیں۔

ایک ہفتہ بعد قبلہ مولوی صاحب تشریف لائے اور چند دن قیام کرنے کے بعد

گوٹھ کو اپنے ساتھ لے گئے اور قریباً تین مہینے بعد دُور دراز علاقوں میں مصروف رہے اور

راتے میں گھوڑا کسی خوشحال زمیندار کے پاس چھوڑ گئے۔ جو اس کی بے حد تواضع کرتا تھا۔

عجب وہ واپس تشریف لائے تو گوٹھ کو غلام نبی کے پاس چھوڑ گئے۔ لیکن اتنی طویل غیر

حاضری کے بعد ہمارے درمیان اجنبیت کی دیواریں پھر حائل ہو چکی تھیں۔ گوٹھ کافی فربہ

نظر آتا تھا اور چوہدری غلام نبی کے دل میں یہ حسرت ایک مدت سے بھٹی کہ اس میں کچھ

”چچا جان! آپ اُن سب کو بلا لیں۔ میں ابھی اُس پر سواری کرنے کے لیے تیار ہوں۔“
 یہ کوئی تین بجے کا وقت تھا۔ میں گوٹھ پر سوار ہو گیا۔ اُس نے حسب معمول اپنے سارے کرب دکھائے لیکن اُسے کامیابی نہ ہوئی۔

پھر میں نے اُسے ایک دائرے میں دوڑانا شروع کیا اور وہ آرام سے بھاگنے لگا۔

ایک کھیت کے کنارے پھلا ہی کے درختوں کا ایک چھوٹا سا جھنڈ تھا اور گوٹھ کو جس دائرے میں میں بھاگا رہا تھا۔ اُسے ان خاردار جھاڑیوں کے قریب لے جانے کے لیے ذرا بڑھا دینے کی ضرورت تھی۔ دو چکر لگانے کے بعد وہ جھاڑیوں سے قریب ہو گیا۔ البتہ تیسرے چکر میں اُس نے اچانک اپنا رخ بدل لیا اور سیدھا جھاڑیوں میں جا گھسا اور وہ گھسا بھی کچھ اس طرح کہ اُس نے اپنا جسم سیٹ لیا۔ اتنا سیٹ لیا کہ اُسے غلی شاخوں کے نیچے کافی جگہ مل گئی۔ لیکن مجھے اپنا چہرہ بچانے کے لیے دونوں ہاتھوں سے کام لینا پڑا۔ پھلا ہی کے کانٹے سیدھے اور لمبے ہونے کی بجائے چھوٹے اور ٹیڑھے ہوتے ہیں اس لیے وہ جسم پر خراش تو لگا دیتے ہیں اس سے زیادہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

مجھ پر اللہ تعالیٰ کا خاص کرم یہ تھا کہ میں نے ہر وقت اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ کر اپنی آنکھیں بچالی تھیں۔ باقی زخم میرے لیے بے معنی تھے اور اس مصیبت سے نجات حاصل کرتے ہی میں غلام نبی کے ساتھ دل لگا کر قہقہے لگا رہا تھا اور اس مصیبت سے دراصل میں نے نجات اس طرح حاصل کی تھی کہ گوٹھ کی لگام تو اپنے ہاتھ میں رکھی مار کا بول سے اپنے پاؤں نکلے اور پھر ریگتا ہوا۔ جھاڑیوں سے باہر نکل آیا۔ ریگتا گوٹھ کے بس کی بات نہ تھی اور جبکہ اتنی تنگ تھی کہ اس کے لیے کھڑا ہونا بہت مشکل تھا۔ چنانچہ جب وہ چھڑیاں کھانے کے بعد مجھ پر باہر نکلا تو اُس کے جسم کی خراشیں

شستگی پیدا کی جائے۔ وہ اتنا اوس ضرور ہو گیا تھا کہ اُن کے ہاتھ سے چنے اور گڑ کھا لیتا تھا اور اس بات کی بھی اجازت دیتا تھا کہ وہ لگام دے لیں اور زین بھی ڈال لیں۔ لیکن کسی سوار کے لیے اچھل کود سے باز رہنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

ایک مرتبہ غلام نبی کو لے کر وہ کما د کے کھیت میں گھس گیا تھا اور پسندہ بیس منٹ اُسی کھیت میں بھاگتا دوڑتا رہا۔ غلام نبی نے کما د کے پتوں کی کاٹ سے اپنی آنکھیں بچالی تھیں لیکن اس کا چہرہ اور ہاتھ جُری طرح زخمی ہو گئے تھے۔ بہت کم خوش نصیب لوگ ایسے تھے جنہیں وہ اپنی روداد سنایا کرتا تھا۔

ایک دن اُس نے مجھ سے پوچھا۔
 ”یوسف بتاؤ۔۔۔ کہ تم اس پر سواری کرتے وقت کیا پڑھا کرتے ہو؟“
 ”چچا! میں کوئی خاص چیز نہیں پڑھا کرتا تھا۔ البتہ ہر کام شروع کرتے وقت میں اللہ کی اعانت کی دعا کیا کرتا ہوں اور یا حفظ یا حفظ ضرور کہا کرتا ہوں!“

غلام نبی بولا یار! اب اس پر ایسی دعاؤں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔
 ”بات یہ ہے کہ اس میں اُس کا کوئی تصور نہیں۔ گھوڑے کے لیے ایک اچھے سوار کا ہونا ضروری ہے۔ جو اس پر ہاتھ سادہ سواری کرتا ہے۔ اب گوٹھ بیچارے کی قسمتی یہ ہے کہ چار چار مہینے اس پر سواری کوئی نہیں کرتا۔“
 غلام نبی نے کہا۔ ”یار! اب اس کا رعب اتنا ہو گیا ہے کہ سب اس سے ڈرتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ تم بھی اُس سے ڈرتے ہو؟“

”چچا! آپ کو کس نے بتایا کہ میں اُس سے ڈرتا ہوں؟“
 غلام نبی نے کہا۔ ”وہ کسی سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ یوسف مجھ سے ڈرتا ہے۔ البتہ گاؤں کے لوگ ضرور یہ بات کہتے ہیں۔“

پہلے سال کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہ آیا۔ میں نے کالج کے ہوسٹل میں اپنے لیے ایک ٹائم ٹیبل بنالیا تھا اور اس پر بڑی سختی سے عمل کیا کرتا تھا۔ میں انگریزی اور اردو اخبار باقاعدگی سے پڑھا کرتا تھا۔ ہوسٹل میں تین رٹ کے ایسے تھے جو میرے ساتھ علی الصباح سائیکلوں پر دریائے راوی تک جایا کرتے تھے اور وہاں ایک گھنٹہ کشتی رانی کیا کرتے تھے واپس آکر ناشتہ کرتے اور کالج چلے جاتے تھے۔ جب ہمیں پی ٹی کے لیے اٹھنا پڑتا تھا اور ڈار صاحب لانس گارڈن تک دوڑاتے تھے تو یہ سارے کام منسوخ ہو جاتے تھے۔ کالج میں جب کوئی گھنٹہ خالی ہوتا تھا تو میں سیدھا لائبریری پہنچتا تھا اور وہاں کوئی میگزین کتاب یا اخبار پڑھنا شروع کر دیتا تھا۔ گروپ میٹنگ میں میری ملاقات فیسٹ ایئر کے ایک طالب علم منظور احمد سے ہو کر تھی اور ہم بہت جلد بے تکلف دوست بن گئے تھے۔ کالج میں میرا دوسرا سال تھا۔ کرسمس کے دنوں میں گھر پہنچا تو اباجی جو چھٹی پر آتے ہوئے تھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ انھوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا: ”تمہیں شکار کا بہت شوق ہے تو پرسوں صبح میرا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

جب ہم شکار پر روانہ ہوئے تو اباجان کے ایک نوکر کے علاوہ میرا ایک چچا زاد بھائی اور گاؤں کا ایک اور آدمی ہمارے ساتھ چل پڑے۔ ہمارے گاؤں سے کوئی آٹھ میل دور وہ وسیع چھنب تھا۔ جسے ضلع کی سب سے بڑی شکار گاہ سمجھا جاتا تھا۔ ہمارا قیام علاقے کے ایک بہت بڑے زمیندار کے گھر پر تھا۔

اباجان جھیل کے کنارے کسی جگہ بیٹھ جاتے تھے اور وہاں مجھے شکار کھیلنے کی آزادی تھی۔

میں نے پہلے دن جو شکار مارا وہ بیشتر ہماری دعوتوں میں ختم ہو گیا۔

مجھ سے کہیں زیادہ تھیں اور اس پر اُسی قسم کا خوف طاری تھا جو میں نے پہلے تعارف میں ٹھنڈے پانی کی نہر سے بے بسی کی حالت میں نکلنے کے بعد دیکھا تھا۔ میں نے اس کی گردن پر ہاتھ پھیرا تو اسے اطمینان ہوا۔ میں نے آواز دی: ”چچا غلام نبی اب آپ اطمینان سے اس پر سواری کر سکتے ہیں۔“ غلام نبی نے آگے بڑھ کر کہا۔

نہیں بھئی! اس پر سواری کرتے ہوئے آنکھوں کی حفاظت کے لیے لوسہ کے خود بنانے پڑیں گے۔۔۔۔۔ یا سارے علاقے کے کانٹے دار درخت تلف کرنے پڑیں گے۔“

”یار مجھے دے ہی چلتا پھرتا اچھا لگتا ہے۔ سواری کو گولی مارو!“

”چچا! اس کے ساتھ دوستی کرنا ہے تو اس پر روز سواری کیا کرو۔ اور

اسے اپنے ہاتھ سے گڑھ لایا کرو۔“

غلام نبی نے کہا۔ ”دیکھو! بیٹا! یہ نہیں ہو سکتا کہ دوستی تو میری رہے لیکن سواری کی تکلیف تم کو لیا کرو؟“

میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں اسلامیہ کالج لاہور پہنچ گیا۔ یہ عظیم شہر جس کی پرانی عمارتوں کی ایک ایک اینٹ پر مسلمانوں کے ماضی کی داستانیں نقش تھیں مجھے ایک طلسم کدہ معلوم ہوتا تھا۔ قدیم عمارات کو دیکھ کر میں یہ محسوس کیا کرتا تھا کہ میں مسلمانوں کی تاریخ کے مختلف ادوار سے گزر رہا ہوں۔ لاہور میں مسلمانوں کی حالت دیکھ کر میں زیادہ شدت سے اپنے مستقبل کے متعلق سوچا کرتا تھا اور اسلامیہ کالج کے ماحول میں میں جوتے افق دیکھا کرتا تھا وہاں مجھے منزلِ پاکستان آتے دن زیادہ حسین اور زیادہ قریب دکھائی دیتی تھی۔ میرا اٹھنا بیٹھنا ان طلباء کے ساتھ تھا جو علامہ اقبال کا کلام پڑھا کرتے تھے اور قائد اعظم زندہ باد کے نعرے لگایا کرتے تھے۔

ابا جان نے کہا: "تمہارا انعام تمہارے ہاتھ میں ہے۔ مجھے سوچ کر یہ بتاؤ کہ تم یہ بندوق لینا پسند کرو گے یا تمہارے لیے نئی بندوق خرید لی جائے؟" اُس وقت میرے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی، پھر کچھ دیر سوچ کر میں نے جواب دیا۔

"ابا جان! یہ بندوق بہت ہلکی ہے اور مجھے بہت پسند ہے۔ آپ کوئی بڑھیا قسم کی نئی بندوق لے لیں۔"

"بہت اچھا بیٹا! میں واپس جانے سے پہلے یا جب دوبارہ آؤں گا تو یہ بندوق تمہارے نام کروادوں گا" اور میں اتنا خوش تھا کہ مجھے باقی سفر محسوس تک نہ ہوا۔

شام کے قریب ہم عبدالکریم کی حویلی کے سامنے سے گزرے وہ پھاٹک کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ علیک سلیک کے بعد وہ اصرار کر کے چائے پلانے کے لیے اندر لے گیا۔ اُس کی حویلی میں بیٹھک کے علاوہ اُس کے رہائشی مکان کے چار نئے کمرے نیچے اور دو کمرے اوپر تعمیر ہو چکے تھے۔ ابا جی نے مکان کو ایک نظر دیکھتے ہی کہا۔

"بھتی عبدالکریم یہ تو کمال کر دیا آپ نے! یہ گھر تو اچھی خاصی کوٹھی معلوم ہوتا ہے۔"

"جناب! ساری عمر یہی کام کرتا رہا ہوں۔ یہ علاقہ مجھے بہت پسند ہے۔ پہلے تو میرا خیال یہی تھا کہ حویلی کے اندر دو تین کمرے کافی ہوں گے۔ اب میرے بال بچوں کو یہاں کی آب و ہوا اس قدر پسند آئی ہے کہ وہ زیادہ وقت یہیں گزارنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے پہلے ایسی اجاڑ جگہ میں قدم رکھنے سے بہت ڈرتی تھی۔ اب وہ کہتی ہے کہ میں گرمیوں کی چھٹیاں بھی یہیں گزارنا چاہتی ہوں۔ جب وہ دو چار دن یہاں رہ کر جاتی ہے اُس کی صحت بہت اچھی ہو جاتی ہے۔"

اگلے دن ہم علی الصباح شکار کے لیے گئے اور میں دو گھنٹے کے اندر اندر پچیس مرغابیاں شکار کر چکا تھا اور میں نے فوراً واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ پہلے دن کی بچی ہوئی مرغابیوں میں سے آٹھ اپنے ساتھیوں میں بانٹ دیں اور باقی انھیں فوراً ہمارے گھر پہنچانے کی تاکید کر کے روانہ کر دیا اور گھر پرستانے کے بعد ہم مزید شکار کی امید پر دوسرے راستے گاؤں کی طرف چل پڑے۔

دوپہر کے وقت راستے میں ابا جان نے ایک اور دوست کے ہاں کھانا کھایا اور وہاں سے چل پڑے۔ عصر کی نماز ہم نے ایک نہر کے کنارے ادا کی اور آگے چل پڑے۔ اچانک مجھے بڑی مرغابیوں کی ایک قطار اُڑتی ہوئی نظر آئی جب میں بندوق سیدھی کرنے لگا تو ابا جان نے کہا "نہیں بیٹا، وہ بہت دور ہیں۔" میں نے کہا۔ "ابا جان! جب وہ بہت قریب آجائیں گی تو میں فائر کروں گا۔ دیکھتے یہ نیچے آ رہی ہیں۔ شاید راستے میں ہم نے جو چھوٹی سی جھیل دیکھی ہے یہ وہاں اتر جائیں۔"

"بیٹا یہ ملک ہیں اگر تم ان میں سے ایک دو شکار کر لو تو تمہیں انعام ملے گا۔" میں مرغابیوں کے رخ پر تیزی سے بھاگنے لگا۔ مرغابیوں کی آوازیں بتدریج قریب آ رہی تھیں۔ کما د کے کھیت کی اورٹ سے گلنے کے بعد میں نے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے۔ دو مرغابیاں میرے سامنے گریں جنھیں میں نے ذبح کر لیا، لیکن تیسری مرغابی جو کچھ فاصلے پر کما د کے کھیت کے قریب گری تھی۔ ہم تلاش نہ کر سکے۔

ابا جان بہت خوش ہوئے۔ میں نے پوچھا۔

"جی! وہ انعام کیا تھا، جو آپ مجھے دینا چاہتے تھے؟"

نوٹ: ملک بہت بڑی مرغابی کی ایک قسم

نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ ابا جان نے مغرب کی نماز کے لیے جائے نماز مانگی تو عبدالکریم پریشان سا ہو کر اندر چلا گیا۔ اُس کی بیوی ایک سفید چادر نکال لائی اور سلام کرنے کے بعد بولی۔

”بھائی جی! آپ اسی پر نماز پڑھ لیں۔ ابھی ہمارا سامان نہیں آیا۔“
میں نے چادر اُس کے ماتھے سے لیکر بیٹھک کے ایک کونے میں بچھا دی۔
نماز سے فارغ ہو کر جب ہم دوسرے کمرے میں جاتے کے لیے بیٹھے تو امینہ جھجکتی ہوتی کمرے میں داخل ہوئی اور سلام کرنے کے بعد تذبذب کے عالم میں اپنے باپ اور اتنی کی طرف دیکھنے لگی۔ ابا جان نے پوچھا۔

”بیٹی آپ کون سی جماعت میں پڑھتی ہیں؟“
”اُس نے امی جان کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ اگلے سال دسویں جماعت میں ہو جاؤں گی۔“

عبدالکریم بولا۔ میاں جی! میری بیٹی سات بیٹوں کے برابر ہے۔ اس کی کتابیں کہتی ہیں کہ میٹرک میں بہت اچھی پوزیشن لے گی۔“

رشیدہ نے کہا۔ ”سیاں جی! اللہ نظر بد سے بچائے۔ ماشاء اللہ! آپ کا یوسف بھی تو ہزاروں میں ایک ہے۔ اس علاقے کے کسان اور ان پڑھ لوگ بھی اس کی تعریف کرتے ہیں۔ انشاء اللہ آپ کا نام روشن کرے گا۔“

”میں نے امینہ کی طرف پہلے کبھی توجہ نہ دی تھی۔ تاہم بہت دُوبلی پسلی سی لڑکی اب کافی صحت مند اور پرکشش بن چکی تھی۔ ابا جان نے چائے پینے کے بعد کہا۔

”یوسف! باہر سے نوکر کو بلاؤ اور جس تازہ شکار سے تم نے انعام حاصل کیا ہے۔ وہ ان کو پیش کر دو۔ خبیث بڑی مرغابیاں عبدالکریم کو پیش کی گئیں تو انہوں نے کہا۔

”میاں جی! یہ بہت بڑی ہیں۔ ہمارے لیے ایک ہی کافی ہے۔“ دوسری آپ اپنے پاس ہی رکھ لیں۔

ابا جان نے کہا۔ ”میاں صاحب! ہمارے گھر میں کافی شکار پہنچ چکا ہے۔ آپ یہ مزے سے کھا لیں!“

جب ہم رخصت ہو رہے تھے تو امینہ نے اپنی ماں کے کان میں کچھ کہا اور وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی!

”بیٹا! یوسف! امینہ تمہاری امی دادی اور تمہاری چچیوں اور بہنوں کو کسی دن آپ کے گھر جا کر دعوت دے گی۔“

ابا جان نے کہا۔ ”بیٹی! دعوت دینا ہمارا فرض ہے! تمہارا جب جی چاہے ہمارے گھر آجایا کرو۔ پھر کسی اچھے موقع پر انہیں تمہارے گھر آنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“
راستے میں مجھے ابا جان کہہ رہے تھے۔

”بیٹا! عبدالکریم ایک اچھا آدمی ہے۔ کبھی کبھی تھوڑی سی بے وقوفی کر لیتا ہے اور یہ بات ہر مالدار آدمی میں ہوتی ہے۔ وہ لڑکی بہت اچھی ہے لیکن اُس کی ماں ذرا چالاک ہے لیکن جب حادثہ ذرا زیادہ سیدھا ہو تو عورتیں چالاک ہو ہی جاتی کرتی ہیں۔“

اور میں ابا جان کی باتوں پر توجہ دینے کی بجائے بار بار یہی سوچ رہا تھا کہ اگر امی جان وہ بڑی مرغابیاں دیکھتیں تو کتنی خوش ہوتیں۔ جب وہ ایک اپنے لیے کافی سمجھتے تھے تو اباجی نے دوسری دینے پر اصرار کیوں کیا تھا۔ مجھے جس قدر بدوق حاصل کرنے کی خوشی تھی اسی قدر عبدالکریم اور اس کی بیٹی پر غصہ آ رہا تھا۔“

دیں گی میں سکھر چلا جاؤں گا۔ پھر یہ اتفاق تھا کہ جب میں سکھر پہنچا تو پتہ چلا کہ حسین احمد چھٹی لے چکے ہیں اور گھر آنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں اور یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ لکھنؤ صاحب ان کے دوست تھے اور حسین احمد صاحب میری خاطر اپنی چھٹی منسوخ کر دینا چاہتے تھے تو انہوں نے یہ کہا آپ یوسف صاحب کو سیر کر دینے کے لیے اپنی چھٹی منسوخ نہ کروائیں۔ انہیں میں اپنے ساتھ کوٹھ لے جاؤں گا۔ یہاں سے اتفاقات کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں ایک انتہائی معزز خاتون سیم فریڈلہ اور ایک بہت ہی پیاری بچی نسرین اور ان کے عزیزوں سے متعارف ہوا ہوں اور اس وقت میں ان لوگوں کا مہمان ہوں جو میرے لیے قطعاً اجنبی تھے اور ان کے متعلق مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ان اتفاقات کے باعث ایسے لوگوں سے بھی متعارف ہونے والا ہوں جو میری زندگی پر گہرا اثر ڈالیں گے۔

ننھی نسرین جس کے لیے میں نے دیکھتے ہی شہزادی نسرین کا نام پسند کیا تھا۔ جب گھٹو کرنے پر آتی ہے تو بہت کچھ بتا جاتی ہے۔ اُس نے جس معصومیت کے ساتھ اپنے والدین، اپنے بھائی، اپنی بڑی بہن کا ذکر کیا ہے اس کا اثر یہ تھا کہ ان کی تصویریں میرے دل پر نقش ہو گئی ہیں۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں ان مسکرائے، مہنسے اور پیار کرنے والے لوگوں کو مدت سے جانتا ہوں۔ نانی اپنی نواسی یا کسی اور رشتہ دار سے جب نسرین کی بڑی بہن کے متعلق کوئی بات کرتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سوانیت کی جن خوبیوں کا تصور کیا جاتا ہے وہ تمام فہمیدہ میں موجود ہوں گی۔ نسرین جیسی خوب صورت بچیاں خود پسند بھی ہو سکتی ہیں لیکن وہ فہمیدہ سے بے بہناہ پیار کرتی ہے اور بات بات پر اس کا ذکر لے بیٹھتی ہے۔

یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ وہ واپسی کا سفر میرے ساتھ کر رہی ہیں۔ نسرین نے یہ فرض کر لیا ہے کہ میں گھر پہنچنے تک ان کے ساتھ رہوں گا۔ وہ بہت خوش ہے اور

منظور احمد کے چچا ڈھلوزی میں نائب تحصیلدار تھے میری طرح انہیں کانگرہ جانے کا بھی بڑا شوق تھا۔ ایف اے کے امتحان سے چند روز قبل منظور احمد کے چچا کا خط آیا کہ جب چھٹیاں ہوں تو تم چند دن کے لیے یہاں آ جاؤ۔ اس نے جواب میں یہ لکھ دیا کہ میرا ایک دوست بھی کانگرہ دیکھنا چاہتا ہے تو چچا نے لکھا بیٹا تمہارے جتنے دوست آئیں ان کے لیے جگہ کا انتظام ہو سکتا ہے۔ چنانچہ منظور احمد نے کالج کے ایک دوست محمود خان کو اپنی ٹیم میں بھرتی کر لیا۔ امتحان ختم ہوتے ہی ایک دن ہم بس پر سوار ہوتے اور ڈھلوزی جا پہنچے۔ دو دن ڈھلوزی گھوم کر ہم کانگرہ کی طرف چل پڑے۔ منظور احمد کے چچا نے دھرم سالہ میں ہمارے قیام کے لیے ایک دوست کے ہاں انتظام کر دیا تھا اور ان کی ہدایت کے مطابق ہم نے اپنے کھانے اور چائے کا بندوبست ایک دکان نما ہوٹل میں کر لیا تھا۔ کانگرہ کے پہاڑوں کی سیاحت میرے ان خوابوں کی تعبیر تھی جو میں بچپن میں دیکھا کرتا تھا کہ کئی میل پیدل چلنے کے باوجود تھکاوٹ کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ جب میرے ساتھی ٹڈھال ہو کر سو جاتا کرتے تھے تو میں تنہا کسی طرف نکل جایا کرتا تھا۔ پانچویں دن وہاں سے واپس آتے ہوئے میں اپنے ساتھیوں کو اپنے گاؤں لے آیا وہاں وہ ایک رات بٹھڑے اور اگلے روز چلے گئے گھر پہنچتے ہی چچا فتح محمد نے سخت شکایت کے لہجے میں کہا تھا دیکھو یوسف! اگر تمیں فرصت ملی تھی تو لاہور سے کانگرہ جانے کی بجائے چند دن کے لیے سکھر سے ہو آتے۔ تم نے ان سے وعدہ بھی کیا تھا۔

امی جان نے بھی ان کی تائید کی تو میں نے جواب دیا۔ ”چچا جی میں کانگرہ سے ایک لیے سفر کی تیاری کر کے آیا ہوں۔ دیکھیے نا پچھلے دنوں میں زیادہ بیٹھنے کی وجہ سے ناکارہ ہو گیا تھا۔ اب پہاڑوں میں ذرا سخت جان بن کر آیا ہوں۔ وہاں پہاڑ اتنے اونچے تھے کہ میں بادلوں سے اونچا چلا جایا کرتا تھا۔ اب جس وقت امی جان اجازت

نمودار ہو رہے ہیں۔“

آپ نے جس ملت کا پرچم اٹھایا ہے وہ احسان فراموش نہیں۔
آج مجھے بڑی شدت کے ساتھ یہ احساس ہو رہا ہے کہ پاکستان کسی کی پسند یا ناپسند کا مسئلہ نہیں بلکہ موت و حیات کا مسئلہ ہے اور جب قوموں کو موت و حیات کے مسائل درپیش ہوں تو ایک فرد کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ یا اللہ مجھے جہت دے کہ میں اپنی قوم کی عظمت رفتہ کے گیت گاتا ہوا میدان میں آؤں۔ جو انانیت کے دلوں میں ناقابل شکست حوصلے بیدار کروں پھر اگر میں اس یقین کے ساتھ کہیں گڑبڑوں کے میں نے اپنی ساری توانائی جس مقصد کے لیے صرف کی تھی وہ پورا ہو رہا ہے تو میں اس موت کو بھی تیرا انعام سمجھوں گا۔ لیکن اس وقت میرا دل گواہی دیتا ہے کہ میں پاکستان کی جنگ میں بھرپور حصہ لوں گا اور کسی دن ان بہت اچھے، بہت نیک اور بہت پیار کرنے والے لوگوں کے پاس یہ پیغام لے کر آؤں گا کہ ہم نے وہ حصار بنا لیا ہے جس کے اندر ہم اپنی شہزادیوں کے مستقبل کے متعلق اطمینان کا سانس لے سکتے ہیں۔ میری ننھی بہن نسرین اس وقت میں تمہارے لیے یہ دعا کرتا ہوں کہ آج سے کتنی برس بعد بھی جب تم بھاتی جان یوسف کا ذکر کیا کرو تو تمہارا سر فخر سے اونچا ہو جایا کرے۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میں ایک ننھی بہن کے ساتھ سفر کر رہا ہوں اور ماں جی سے راستے میں بہت سی باتیں ہوں گی لیکن مجھے اس بات کا ملال ہے کہ میں جانندھرتک نہیں جاسکوں گا۔ کیوں کہ گھر میں میری اتنی بڑی شدت سے انتظار کر رہی ہوں گی لیکن یہ ممکن ہے کہ ماں جی مجھے حکم دیں تو میں سرتابی نہیں کر سکوں گا۔

میں گھر پہنچ کر بڑی تفصیل سے بعض باتیں لکھوں گا۔ سر دست صرف اس بات کا اعتراف کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں ان بھیڑیوں کا بہت ممنوں ہوں جن کی وجہ سے میرا ان نیک لوگوں سے تعارف ہوا، اور جن کو دیکھ کر مجھے اس ملک میں نئی شدت

کتنی باریہ کہ چکی ہے۔

”بھاتی جان میری آیا آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گی“ اور جب وہ سب یہ کہیں گے کہ آپ چند دن کے لیے یہاں ٹرک جائیں تو آپ انکار نہیں کر سکیں گے اگر آپا مغوم ہو کر رو پڑی تو پھر آپ کے لیے ہمارے گھر سے نکلنا ناممکن ہو جائے گا اور مجھے اس بات سے بہت خوشی ہوگی۔

اس وقت مجھے ایسا احساس ہوتا ہے کہ میں جس قدر زیادہ ایسے نیک اور پاک باز لوگوں کے متعلق سوچتا ہوں اسی قدر حصول پاکستان کے لیے اپنی تڑپ میں اضافہ محسوس کرتا ہوں۔ رات کے مناٹے میں میں ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی لاکھوں بستیوں اور ہزاروں شہروں میں بسنے والے ان مسلمانوں کے متعلق سوچتا ہوں جو اس وقت گہری نیند میں ہیں گے اور میں برہمنی اسبتداد کے اس عفریت کو بھی کروٹیں لیتے دیکھ رہا ہوں جو برطانوی سامراج کا جانشین بننا چاہتا ہے اور میرے دل سے درد بھری جھیز کے ساتھ یہ دعا لکھتی ہے کہ میرے اللہ مجھے یہ جہت دے کہ میں اپنی قوم کو مستقبل کے خطرات کا سامنا کرنے کے لیے بیدار کر سکوں۔ میرے قلم کو یہ طاقت دے کہ اس سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ لوگوں کے دل میں اتر جائے اور میں اپنی آنکھوں سے منتشر افراد کو قافلوں کی صورت اختیار کرتے دیکھوں اور یہ قافلے ایک سیل سہل گیر کی طرح آگے بڑھیں اور برصغیر میں اپنے آخری دفاعی حصار پر پاکستان کا پرچم نصب کر دیں۔ میرے اللہ مجھے وہ عزم و یقین عطا کرے کہ میں بے دھڑک ملت کی اجتماعی سلامتی کے راستے پر چلتا رہوں اور ہر قدم پر میرا یہ یقین پختہ ہوتا جائے کہ صراحتاً مستقیم وہی ہے جو میں نے اختیار کیا ہے۔ میں تیری اعانت کے بھروسے پر تنہا گھر سے نکلوں اور جب مڑ کر دیکھوں تو یہ نظر آئے کہ ان گنت راستوں اور پگڑیوں سے لوگ اسلام زندہ باد، پاکستان زندہ باد، قائد اعظم زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے

کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہوا ہے۔ میرے اللہ میں اپنے لیے اپنی قوم کے بیٹوں اور بیٹیوں کے لیے اور ہر ایسے انسان کے لیے جو اس دنیا میں سر اٹھا کر چلنے کا حق دار ہے۔ ہندو کی غلامی سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔“

تیسرا حصہ

راستے اور فاصلے

باب - ۲۱

۱۹۴۴ء یوسف کی زندگی کا مصروف ترین سال تھا۔ اپنے خاندانی پس منظر کے باعث تحریک پاکستان کے ساتھ اس کی والہانہ شیفٹگی قدرتی بات تھی جب وہ کالج میں داخل ہوا تھا تو اپنی خداداد صلاحیتوں کے باعث اسے یہ یقین تھا کہ وہ کسی دن دنیا کے کامیاب ناول نگاروں کی صف میں کھڑا ہوگا اور اب مستقبل کے متعلق اُس کی تمام خواہشات حصولِ پاکستان تک محدود ہو کر رہ گئیں تھیں اور جو مضامین اور افسانے وہ لکھا کرتا تھا اُن کا اولین مقصد تحریک پاکستان کو تقویت دینا تھا۔ اُس کے بعض ساتھی جو دو تین سال قبل دیہاتی زندگی کے متعلق اس کے دلچسپ مضامین اور افسانے پڑھا کرتے تھے اس بات پر حیران تھے کہ اب مسلمانوں کے ماضی، حال اور مستقبل کے سوا اس کے ذہن میں کوئی چیز آتی ہی نہیں۔ ایک دن اُس کے ایک شفیق استاد نے کہا۔ ”میاں یوسف! میں تمہاری ابتدائی تحریریں پڑھ کر ہی کہا کرتا تھا کہ تم ادب کی دنیا میں نام پیدا کر دو گے۔ تم بڑی خوب صورتی سے دیہاتی زندگی کی عکاسی کیا کرتے تھے۔ تمہارے طنز و مزاح میں بڑی جان بھری تھی۔ اب تم کس منہصے میں بھپنس گئے ہو؟ دیکھو بھائی سیاست کو سیاست دانوں کے لیے چھوڑ دو اور تم صرف اُس کام سے سروکار رکھو جس کے لیے تم پیدا ہوئے ہو۔“

یوسف نے جواب دیا۔

”بیٹا وہ لوگ تمہیں ملے تھے؟“

”وہ کون امی جان؟“

”سچ کو تمہیں لدھیانہ جا کر بھی وہ خاتون یاد نہیں آئی جسے تم لے ماں جی کہا تھا اور تم اُس کس شہزادی کو بھی بھول گئے۔“

”امی جان میں انھیں بھولا نہیں ہوں۔“

”لیکن تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تم اس کا انتظام کر لو گے۔ دو سال تو ہونے والے ہیں اس بات کو تم جلسوں میں جاسکتے ہو لیکن ماں کی خوشی کے لیے تم نے بی اے پاس کرنے کی شرط رکھ دی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے یہ خوشی میرے نصیب میں نہیں غیر تمہاری مرضی اب میں کچھ نہیں کہوں گی۔“

”امی جان مجھے معاف کر دیجیے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ اس قدر بے چین

ہیں۔“

”بیٹا یہ سب تمہارا قصور ہے۔ تم نے سنہری بالوں والی ایک کس شہزادی اور اس کی نانی کا ذکر ہی اس طرح کیا تھا کہ مجھے اسی دن سے ان کو دیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا لدھیانہ والی بیگم احمد صاحبہ نے عطر کی خوشبوشی بھیجی تھی وہ میں نے ایک متبرک سی چیز سمجھ کر اُسی طرح رکھی ہوتی ہے۔ صرف ایک مرتبہ اور وہ بھی عید کے دن میں نے شیشی کھولی تھی اور ایک قطرہ اپنے کُرتے پر مل لیا تھا پھر کئی دن مجھے اپنے کپڑوں سے بھینی بھینی خوشبو آتی رہی اور میں نے اسے ایک قیمتی تحفہ سمجھ کر اپنے بکس میں چھپا رکھا ہے اگر وہ بہن مجھے مل جاتی تو میں ہر عید کے موقع پر کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور بھیجا کرتی۔“

یوسف نے کہا ”امی جان اگر آپ مجھے دو سال پہلے بتا دیتیں کہ آپ انھیں

آنا یاد کرتی ہیں تو میں کسی وقت کے بغیر یہاں بیٹھنے ان کا پتہ معلوم کر لیتا۔“

”کیسے معلوم کر لیتے تم؟“

”جناب! اگر آپ کا یہ مطلب ہے کہ مجھے صرف ادیب بننے پر ہی اکتفا کرنا چاہیے تو آپ کو یہ بات بھی نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ کوئی ادیب اپنے آزاد وطن کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اور پاکستان کے سوائے اپنے لیے اور کسی آزاد وطن کا تصور نہیں کر سکتا یہ کروڑوں مسلمانوں کے ساتھ میری بقا کا بھی اولین مسئلہ ہے۔“

پروفیسر صاحب نے یوسف کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”میاں یوسف! شاید تم سچ کہتے ہو لیکن اس سال تمہیں بہت محنت کرنی چاہیے تاکہ قاتل میں بہت اچھے نمبر لے سکو۔“

اُس کے تاریخی افسانے اور سیاسی مضامین سب پاکستان کے لیے ہوتے تھے۔ وہ اپنے کالج اور کالج سے باہر مسلم لیگ کے اجتماعات میں پرچوش تقریریں کیا کرتا تھا۔ ماں نے کئی بار اس کے سامنے سنہری بالوں والی کس لڑکی کے خاندان کا پتہ کرنے کا مسئلہ چھیڑا تھا لیکن وہ ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیا کرتا تھا کہ امی جان ابھی ان باتوں کا وقت نہیں، آپ مطمئن رہیں میں بی اے کرے گی ہی انہیں تلاش کر لوں گا۔ آپ کو اس وقت تک ان کا ذکر نہیں کرنا چاہیے۔“

ایک دن یوسف منظور احمد اور کالج کے تین لڑکوں کے ساتھ، امرتسر جالندھر لدھیانہ اور انبالہ کے شہروں کا دورہ کرنے کے بعد واپس آیا اور ماں جو اردو اخبار میں اُس کی تقریریں پڑھا کرتی تھی، بڑے اشتیاق سے اس کی کارگزاری سن رہی تھی۔ جب یوسف نے جالندھر کا ذکر چھیڑا تو قدسیہ کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی لیکن یوسف نے جالندھر کے جلسوں کا حال سنانے کے بعد فوراً ہی لدھیانہ کا ذکر شروع کر دیا اور اس نے لدھیانہ میں پروگرام کی تفصیلات سناتے ہوئے کہا۔ ”امی جان ہمارا پروگرام یہ تھا کہ وہاں سے واپس آجائیں گے لیکن وہاں انبالہ کے چند معززین آئے ہوئے تھے اور وہ ہمیں اپنے ساتھ لے گئے اس لیے ہمیں چار کی بجائے چھ دن لگ گئے۔“

”جناب پرنسپل صاحب اپنے کمرے میں بلا تے ہیں۔“
یوسف تھوڑی دیر بعد پرنسپل کے آفس میں داخل ہوا تو اس نے اپنے قریب
ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
”آئیے تشریف رکھیے۔“

یوسف بیٹھ گیا۔
پرنسپل چند ثانیے اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر اس نے سوال کیا۔
”یوسف صاحب آپ ۱۹۴۲ء میں کوڑے کئے تھے؟“
”جی ہاں۔“

”ہاں آپ نے بھیڑیوں سے کسی کی جان بچائی تھی؟“
”جناب میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ میں نے کسی کی جان بچائی تھی۔ بات یہ ہوتی تھی
کہ میں ایک کھڈ کے کنارے کنارے ایک دیوان پہاڑ کی چوٹی کی طرف جا رہا تھا کہ چانک
میں نے دیکھا کہ دو بھیڑیے کھڈ کے دوسرے کنارے میرے ساتھ ساتھ جا رہے تھے خوش قسمتی
سے یہ کھڈ اتنی گہری تھی کہ وہ میری طرف آنہیں سکتے تھے اور میں نے مڑ کر نیچے اترنا شروع
کر دیا پھر کچھ دور جا کر میں نے یہ دیکھا کہ ایک آدمی کھڈ کے اُس کنارے جہاں میں نے بھیڑیے
دیکھے تھے تیزی سے اُپر چڑھ رہا ہے۔ میں نے اُسے خبردار کرنے کے لیے پوری قوت
سے آوازیں دیں۔ میرے ساتھیوں نے جو پیچھے ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے، شور مچایا مگر
اُس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اب اس کو خبردار کرنے کی یہی ایک صورت رہ گئی تھی کہ میں پہاڑ کی
بلندی کی طرف بھاگتا ہوا بلاتا خیر اس جگہ پہنچ جاؤں جہاں چوٹی کے قریب کھڈ کے کنارے
ملتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سخت جدوجہد کے بعد میں اُسے اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب
ہو گیا اور اسے اپنے ساتھ اُس جگہ لے آیا جہاں میرے ساتھی انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے
ورنہ اُس نے بھیڑیا نہیں دیکھا تھا اور نہ مجھے دوبارہ وہ بھیڑیے نظر آتے تھے۔“

”امی جان وہ پٹھے لکھے لوگ ہیں اور میری تحریریں پڑھنے کے قابل سمجھی جاتی ہیں۔
مسئلہ صرف یہ ہے کہ جالندھر اور لدھیانہ میں میری کوئی تحریر پہنچ جلتے۔ اُس کے لیے
اخبارات و رسائل سے کام لیا جاسکتا ہے۔“
”ایسی کوئی بات پہلے تمہارے ذہن میں کیوں نہیں آئی؟“

”امی جان مجھے اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اگر ضرورت ہوتی بھی تو میں یہ سوچتا کہ
جتنی آسانی سے میں ان کا پتہ کر سکتا ہوں اُسی قدر آسانی سے وہ میرا پتہ کر سکتے ہیں۔
مثلاً اگر مجھے یہ معلوم تھا کہ کوڑے میں اُن کے رشتہ داروں سے پتہ کیا جاسکتا ہے تو انہیں
بھی یہ معلوم تھا کہ میں اسلامیہ کالج میں پڑھتا ہوں اور وہ اسلامیہ کالج کے پرنسپل یا
عملہ کے اور کسی آدمی سے میرا پتہ پوچھ سکتے ہیں۔ ہمارے درمیان ایک ایسی چمکیا ہٹ
حائل ہو گئی تھی جس میں وقت کے ساتھ بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔“
”اب تمہیں یہ امید ہے کہ اگر انہیں تمہارے کسی مضمون سے تمہارا پتہ مل گیا تو وہ
فوراً تمہیں خط لکھیں گی۔“

”مجھے یقین ہے امی جان۔“

ایک ہفتہ بعد لاہور کے ایک بااثر روزانہ اخبار میں ملک کی سیاست پر
یوسف کا ایک زوردار مضمون شائع ہوا۔ ایڈیٹر نے مضمون نگار کے تعارف کے لیے
اُس کی تصویر کے ساتھ اپنے نام سے ایک مختصر تعریفی نوٹ بھی لکھا ہوا تھا۔ یہ مضمون
اگلے روز دوسرے شہروں کے اخبارات میں بھی چھپ گیا اور چند دن اس کے خلاف
کانگریسی اخبارات میں لے دے ہوتی رہی۔

گیارہ دن بعد ایک روز یوسف لاہور میں بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا کہ
ایک چڑیا اسی نے آکر پیغام دیا۔

تھے۔ بد قسمتی سے اُن کا ایڈریس ہمارے پاس نہیں تھا اور ہمارے گھر کا ایڈریس جو انہیں لکھ کر دیا گیا وہ بھی سامان کے ساتھ ہی بھول گئے تھے۔ اب پچھلے دنوں پاکستان کے متعلق ان کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس سے میں یہ اندازہ لگا سکتی ہوں کہ سلا میہ کالج میں وہ کافی مشہور ہوں گے اور آپ بھی انہیں جانتے ہوں گے۔ اس لیے میں آپ سے یہ درخواست کرتی ہوں کہ دوسرا لفافہ جو ان کے لیے بھیجا جا رہا ہے وہ انہیں پہنچا دیجئے ورنہ مندرجہ ذیل ایڈریس پر واپس کر دیجئے۔

یوسف نے دوسرا لفافہ نکال کر کھولا اور پڑھنے میں منہمک ہو گیا۔ اُسے سیدھے سادھے الفاظ کے ساتھ ایک کسٹم کی دلکش آواز سنائی دے رہی تھی۔

نسرین نے لکھا تھا بھائی جان! السلام علیکم!

ہمارے گھر میں آیا فہمیدہ کے سوا سب ہی کہتے ہیں کہ آپ مجھے بھول چکے ہوں گے۔ لیکن مجھے کبھی یقین نہیں آتا۔ میں ہر روز یہ دعا مانگ کر کہتی ہوں کہ آپ کسی دن اچانک آجائیں اور مجھے اس بات کی شکایت نہیں کہ میری یہ دعا قبول نہیں ہوئی۔ یہ خط میں اس لیے لکھ رہی ہوں کہ آیا فہمیدہ نے اخبار میں آپ کا مضمون پڑھا اور پھر مجھے یہ حکم دیا کہ میں آپ کو فوراً خط لکھوں۔ انگریزی میں پرنسپل کا نام اور ایڈریس انھوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ بھائی جان یہ بھی تو غضب کیا نا آپ نے کہ اُترتے وقت وہ تھیلا وہیں چھوڑ گئے جس میں آپ نے اپنی کتابیں اور قیمتی مسودہ رکھا ہوا تھا۔ میں اُس وقت بہت شیشائی تھی جب مجھے یہ یاد آیا کہ اپنا ایڈریس بھی میں نے آپ کی مسودے والی نوٹ بک پر لکھ دیا تھا۔ دوسری غلطی یہ ہوتی تھی کہ نانی جان نے آپ کا ایڈریس اس لیے نہیں لکھوایا تھا کہ خط و کتابت کی ابتداء آپ کریں گے۔ بھائی جان میں نے آپ کا تھیلا سنبھال کر رکھ لیا تھا۔ گھر میں آیا فہمیدہ کے سوا کافی عرصہ کسی کو یہ معلوم نہیں ہونے دیا کہ اس میں کیا ہے۔ پھر جب میں نے بار بار آیا فہمیدہ

پرنسپل نے کہا اور تم نے اس شخص کے خاندان کی ایک معزز خاتون اور اُس کی کس نواسی کے ساتھ کوئٹہ سے امرتسر تک کا سفر بھی کیا تھا۔

”جی ہاں۔“

”اور تمہاری کوئی چیز بھی گاڑی میں رہ گئی تھی؟“

”جی ہاں۔“

پرنسپل نے اپنے میز کی دراز کھول کر ایک بڑے سائز کا لفافہ نکالا اور اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”یہ لے جاؤ اور اسے اطمینان سے پڑھو۔ باہر کے لفافے پر میرا نام ہے اور دو صفحات اور اندر جو دوسرا خط ہے۔ تمہیں پہنچانے کی درخواست کی گئی ہے۔“

بیٹا! یہ دونوں خط تمہاری خاطر لکھے گئے ہیں اور اس بڑے لفافے کے اندر موجود ہیں۔ اب یہ تمہارا فرض ہے کہ جن لوگوں نے آئی مدت کے بعد تمہیں خط پہنچانے کا نیا طریقہ نکالا ہے انھیں فوراً جواب لکھو کہ تم یوسف ہوجن کی انہیں تلاش ہے اور تمہارے کالج کے پرنسپل نے کسی تاخیر کے بغیر اُن کا خط تمہارے پاس پہنچا دیا ہے۔“

یوسف کے چہرے پر مسکراہٹیں اور دل میں رنجشیں تھیں۔

وہ پرنسپل کا شکریہ ادا کرنے کے بعد اُٹھا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

یوسف تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا واپس لائبریری میں پہنچا اور وہاں ایک کونے میں بیٹھ کر خطوط پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ پرنسپل کے نام جو خط تھا وہ نسرین کی طرف سے تھا۔ اُس نے کسی حد تک تفصیل کے ساتھ کوئٹہ سے سفر کے دوران اور اُس سے قبل یوسف کے بہادرانہ کارناموں کا ذکر کیا تھا اور آخر میں یہ لکھا تھا کہ آپ کے کالج کے یہ طالب علم جنہوں نے سفر کے دوران کتنی نازک مرحلوں پر ہماری مدد کی تھی۔ امرتسر گاڑی سے اُترتے ہوئے اپنا کچھ نہایت قیمتی سامان ہمارے سامان کے ساتھ چھوڑ گئے

کو سفر کے واقعات سنا سنے تو نانی جان کی طرح انھیں بھی آپ کی ہر بات پسند آنے لگی۔ بھائی جان اب آپ اس بات پر خفا نہ ہوں کہ ایک دن میں نے اور آپا جان نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ آپ کی غیر حاضری میں آپ کا سامان دیکھ لیں یا آپ کی کوئی کتاب پڑھ لیں تو یہ کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ آپا فہمیدہ تو یہاں تک کہتی تھیں کہ تمہارے بھائی جان نے اگر کوئی اچھی چیز لکھی ہے تو انھیں پڑھنے والوں پر خوش ہونا چاہیے۔ بھائی جان اگر آپا کی یہ بات درست ہے تو آپ کو اس بات پر بہت ہی خوش ہونا چاہیے کہ انہوں نے پہلے سال ہی آپ کی لکھی ہوئی کتاب کو تین بار پڑھا تھا اور اب بھی کبھی مجھے بلا کر یہ حکم دیا کرتی ہیں کہ مجھے فلاں واقعہ یا فلاں صفحہ سے آگے پڑھ کر سناؤ اور میرا خیال ہے کہ آپ کی کتاب کے ساتھ میری دل چسپی بھی بڑھتی ہی جاتے گی۔ آپ یہ سن کر بھی خوش ہوں گے کہ امی جان بھی آپ کی کتاب پڑھ چکی ہیں۔ وہ آپ کی امی جان کو سلام کہتی ہیں اور آپ کے لیے بہت دعائیں کرتی ہیں۔ آپا فہمیدہ نے انہیں بھی یقین دلادیا ہے کہ آپ کسی دن بہت بڑے ناول نگار بنیں گے۔

بھائی جان! آپ جواب ضرور لکھیں ورنہ آپ کی ننھی شہزادی آپ سے روٹھ جائے گی۔ ایک دن، ایک مہینہ یا ایک برس کے لیے نہیں ہمیشہ کے لیے روٹھ جائے گی۔ میں نے جالندھر میں اپنے گھر کا اور لدھیانے میں نانی جان کے گھر کا ایڈریس لکھ دیا ہے یہ دونوں پتے کسی ایسی نوٹ بک پر لکھ لیں جس کے گم ہو جانے کا خطرہ نہ ہو، بلکہ میں تو یوں کہوں گی کہ جب آپ کے گھر کا ایڈریس ملے گا تو اسے کئی دیواروں اور کئی کاپیوں پر نقل کر لوں گی۔ بھائی جان اتنی کہتی ہیں کہ اگر آپ کسی دن اچانک اپنی امی جان کے ساتھ جالندھر آ جائیں تو ہماری عید ہو جائے گی۔ چچا عبدالعزیز کا خط آیا ہے کہ شاید وہ عنقریب تبدیل ہو کر لاہور پہنچ جائیں گے اور ہم سب کو یہ خوشی ہے کہ ہمیں ان کی وجہ سے لاہور کی سیر کا موقع مل جایا کرے گا۔

ایک ضروری بات کرنا بھول گئی تھی:

آپا فہمیدہ نے آپ کی لکھی ہوئی کتاب اور تھیلے میں باقی سامان سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ پچھلی عید پر انہوں نے مجھے اور اپنی سہیلیوں کو کچھ تحفے دیے تھے اور بازار سے آپ کے سامان رکھنے کے لیے ایک نیا بکس بھی خرید لائی تھیں۔ یہ بکس انھوں نے اپنے جیب خرچ سے خریدا تھا۔ کیونکہ وہ کہتی تھیں کہ اچھی چیزیں اچھے بکس میں بند ہونی چاہئیں۔ انہیں یہ ڈر بھی تھا بھائی جان کہ کہیں آپ ناراض نہ ہو جائیں لیکن میں نے انھیں مطمئن کر دیا تھا کہ میرے بھائی جان کسی اچھی بات پر ناراض نہیں ہوا کرتے اب میں یہ پوچھتی ہوں کہ آپ کا سامان آپا فہمیدہ کی حفاظت میں رہے یا کسی نوکر کے ہاتھ آپ کے گھر بھیج دیا جائے۔ جی تو چاہتا ہے کہ آپ کو اتنا لمبا خط لکھوں کہ آپ پڑھتے پڑھتے تھک جائیں لیکن صبح سکول بھی تو جانا ہے نا اور آپا جان کا حکم ہے کہ مجھے سیکنڈ نہیں ان کی طرح ہر کلاس میں فسط آنا چاہیے۔ اس لیے باقی باتیں دوسرے خط میں ہوں گی۔

زیادہ آداب
آپ کی نسرین

اس سے آگے خالی صفحہ کا کچھ حصہ چھوڑ کر یہ لکھا ہوا تھا۔

”بھائی جان! عجیب بے وقوف ہوں میں بھی، جب وقت آتا ہے تو ضروری باتیں بھول جاتی ہوں۔ مثلاً میں کئی دن سے یہ سوچ رہی تھی کہ جب میں آپ کو خط لکھوں گی تو میری پہلی درخواست یہ ہوگی کہ آپ اپنی ایک چھوٹی سی تصویر ضرور بھیج دیں۔ اس لیے نہیں کہ مجھے آپ کی شکل یاد نہیں رہی بلکہ اس لیے کہ گھر میں بہت سے لوگوں نے آپ کو نہیں دیکھا اور آپا

دیکھتا رہا ہوں کہ ہمیں پاکستان کی منزل تک پہنچنے کے لیے کئی آلام و مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا اور مجھے اس کتاب کی طرف توجہ دینے کا وقت نہیں ملے گا۔ آپ کی فہمیدہ آپا سے یہ درخواست ہے کہ وہ اس وقت تک یہ مسودہ اپنے پاس رکھیں جب تک کہ میں حصول پاکستان کے لیے اپنی ذمہ داریوں سے فارغ نہیں ہو جاتا۔ اپنا آزاد وطن یہ انسان کی پہلی ضرورت ہے اور ایک ناول نگار عام انسانوں سے مختلف نہیں ہوتا۔ تصویر بھیج دی جاتے گی اور اگر امی جان رضامند ہو گئیں تو ان کی تصویر بھی میرے ساتھ ہوگی۔

تمہارے والدین، فہمیدہ صاحبہ اور دوسرے بہن بھائیوں کو سلام۔ انشاء اللہ میں آپ کو اپنے حالات سے باخبر رکھوں گا لیکن اگر کبھی مجھ سے لکھنے میں کوتاہی ہو جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہونا چاہیے کہ شہزادی نسرین مجھ سے روٹھ جاتے۔ امی جان آپ سب کے لیے دعائیں کرتی ہیں اور آپ کی والدہ کو سلام کہتی ہیں۔ میں گاؤں میں اپنا مستقل پتہ اور لاہور کا موجودہ ایڈریس لکھ رہا ہوں، لیکن خطوط فی الحال آپ کو لاہور کے ایڈریس پر لکھنے چاہئیں۔ امی جان کے حکم پر تعارف کے لیے ان کا نام لکھ رہا ہوں۔ ان کا نام قدسیہ بیگم ہے اور وہ آپ کی امی اور نانی جان کا نام پوچھتی ہیں۔ بہت سی دعاؤں کے ساتھ آپ کا بھائی

یوسف

یوسف نے خط ختم کرنے کے بعد پوچھا۔ "امی جان آپ کچھ اور لکھوانا چاہتی ہیں۔"

"بیٹا! میں بہت کچھ لکھوانا چاہتی ہوں لیکن میں یہ چاہتی ہوں کہ یہ خط کسی تاخیر کے بغیر ان کے پاس پہنچ جائے۔ تصویر بعد میں چلی جاتے گی۔"

فہمیدہ تو آپ کی تصویر دیکھ کر بہت ہی خوش ہوں گی۔ ویسے انہیں جب یہ پتہ لگے گا کہ میں نے اپنے خط میں ان کا ذکر کیا تھا میری پٹائی ضرور ہوگی۔ آپ کی امی اتنا اور گھر کے سب بزرگوں کو ہم سب کی طرف سے سلام۔ آپا کہتی تھیں کہ آپ جیسے مصروف لوگوں کے پاس خط لکھنے کا وقت نہیں لیکن آپ کے متعلق میرا خیال ہے کہ جس قدر میں نے کئی گھنٹے سوچ سوچ کر لکھا ہے اُس سے زیادہ آپ چند منٹ میں لکھ سکتے ہیں۔

اُسی روز وہ پر کے وقت یوسف علیحدہ کمرے میں ماں کے ساتھ بیٹھا نسرین کا خط پڑھ کر رونا تھا اور عصر کی نماز کے بعد وہ جواب لکھ رہا تھا۔ اُس نے پہلے نسرین کی نانی کو لکھتے ہوئے اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا تھا کہ جب میں نے اپنے گھر پہنچ کر امی جان کو نسرین اور آپ کے ساتھ سفر کے حالات بتائے تو وہ بھی اس بات پر بڑی پریشان ہوئیں تھیں کہ میں اپنا تھیلہ جس کے اندر ایک نوٹ بک میں آپ کے ایڈریس لکھے ہوئے تھے گاڑی میں ہی بھول آیا تھا۔ وہ اکثر یہ دعا کیا کرتی تھیں کہ اگر کبھی جالندھر جانے کا موقع ملا تو میں نسرین کی والدہ کو تلاش کروں گی۔ ماں جی میں بہت شرمندہ ہوں کہ میں دوسرے کاموں میں مصروف ہو جانے کی وجہ سے آپ کو تلاش نہ کر سکا۔ ورنہ یہ کوئی مشکل بات نہ تھی۔ نسرین کے نام طویل خط میں اُس نے لکھا تھا۔ ننھی شہزادی تمہیں یقین نہیں آئے گا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ میں تمہیں ایک دن کے لیے بھی نہیں بھولا۔ تم ہمارے گھر میں کافی مشہور ہو چکا ہو اور سب مجھے اس بات پر کوستے ہیں کہ تم نے شہزادی کا ایڈریس گنوا کیوں دیا۔ میں یہ راز شکر گزار ہوں کہ تم نے میرا سامان گم نہیں ہونے دیا۔ ورنہ اگر وہ مسودہ گم ہو جاتا تو مجھے بہت افسوس ہوتا۔ تمہاری آپا فہمیدہ کا بھی میں ممنون ہوں کہ انہوں نے اس کی حفاظت اپنے ذمے لے لی ہے اور میری پہلی تحریر کو اس قدر دل چسپی کے ساتھ تین بار پڑھنے کے لیے بھی میں ان کا شکر گزار ہوں۔ میں یہ

”امی جان میں ابھی جی پی او جاتا ہوں۔ انشاء اللہ یہ خط شام کی ڈاک میں نکل جائیں گے۔“

”اچھا بیٹا جاؤ۔ لیکن سائیکل ذرا احتیاط سے چلانا۔ خط اگر ایک دن بعد بھی پہنچ جائے تو کوئی حرج نہیں۔“

”امی جان میں اطمینان سے جاؤں گا۔ ڈاک میں کافی وقت ہے۔“
یوسف نے اٹھتے ہوئے کہا۔



دو ہفتے بعد یوسف کالج سے گھر آیا تو ماں نے کہا۔

”بیٹا! ان کا خط آیا ہے۔ میں نے تمہاری الماری کے نچلے خانے میں رکھ دیا ہے۔“

”کیس کا خط امی جان؟“

”بھئی جانہ صردالوں کا۔ تم پڑھ سکتے ہو لیکن کہیں گم نہ کر دینا۔ ان لڑکیوں کی اتنی براہ راست مجھے لکھا ہے۔ کوئی پڑھی لکھی خاتون معلوم ہوتی ہیں۔ یوسف جواب لکھتے ہوئے مجھے یہ الجھن ہو گئی کہ میرا خط بہت خراب ہے۔“

”امی جان! یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ ہیڈرائٹنگ تو بعض بڑے مصنفوں کی بھی خراب ہوتی ہے اور آپ کا خط اتنا بُرا بھی نہیں کہ پڑھنا نہ جاسکے۔“

ماں کے خط کے ساتھ نسرین اور فہمیدہ نے تھیں چند سطر لکھی ہیں۔ خط پڑھ کر انھیں جواب لکھ دو تاکہ میں ان کی والدہ کی معرفت بھیج دوں۔ صفیہ یعنی

لڑکیوں کی والدہ نے یہ امید ظاہر کی ہے کہ لدھیانے میں ان کی اتنی بھی ہمارے

متعلق سن کر بڑی خوش ہوں گی اور ان کی طرف سے فوراً جواب آئے گا۔ بیٹا! مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ بیکام ہم سے قریب آگئے ہیں اور میں ان لڑکیوں کو

لاہور میں اگر کسی جگہ دیکھوں تو فوراً پہچان لوں۔ بیٹا میں تصویر کھینچوانے سے ہچکچاتی تھی لیکن اب میں کل ہی تمہارے ساتھ فوٹو گرافر کے پاس جاؤں گی اور اس خط کے جواب کے ساتھ ہی انھیں تصویر بھیج دی جائے گی۔ میں جہان کے متعلق سوچتی ہوں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فہمیدہ کو میں نے بار بار دیکھا ہے۔“

مفتوڑی دیر بعد یوسف اپنے کمرے میں خط پڑھ رہا تھا۔ ایک علیحدہ صفحے پر نسرین کے خط کے ساتھ ایک صاف ستھری ہیڈرائٹنگ کی چند سطور پر نظر پڑتے ہی اُسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ یہ فہمیدہ کی تحریر ہے۔ اُس نے لکھا تھا محترم یوسف صاحب! اللہ آپ کو سلامت رکھتے۔

میں نسرین کے خط کے فوری جواب کے لیے آپ کی بے حد شکر گزار ہوں اور نانی جان کو آپ کا خط ملنے پر جو خوشی ہوگی وہ تو میں بیان ہی نہیں کر سکتی۔ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جو اس دنیا میں آکر دوسروں کو خوشیاں تقسیم کرتے ہیں۔ میں اپنی بہن کی شکر گزار ہوں کہ وہ آپ کا مسودہ جو آپ گاڑی میں بھول آئے تھے اسنبھال کر گھر لے آئی۔ اُس شریر لڑکی نے یقیناً آپ کو یہ لکھا ہو گا کہ میں ہر وقت آپ کا مسودہ پڑھتی رہتی ہوں لیکن میں یقیناً اسے تین بار پڑھ چکی ہوں اور ہر بار مجھے ایسا محسوس ہوا ہے کہ ایک نیک اور بہادر آدمی اس دنیا میں چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے مسکراہٹیں اور قہقہے تقسیم کر رہا ہے۔ یہ میری دلی خواہش ہے کہ آپ جلد از جلد اس کتاب کو مکمل کریں۔ مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ بہت جلد ایک ناول نگار کی حیثیت سے مستقبل کے متعلق بلند ترین توقعات پوری ہوں گی۔ اور دیکھتے آپ کا مسودہ جو نامکمل حالت میں میرے پاس پڑا ہوا ہے اُسے بہر حال آپ نے مکمل کرنا ہے۔ میں اس کی بہت حفاظت کیا کرتی ہوں۔ ویسے بھی اُس کے گم ہو جانے کا کوئی امکان نہیں کیونکہ ایک دوبار اور پڑھنے کے بعد وہ مجھے پوری طرح زبانی یاد ہو جائے گا۔

تیسرے دن یوسف اور اس کی امی کی طرف سے اس خط کے جواب کے ساتھ ایک گروپ فوٹو جس میں اُس کی ماں کرسی پر بیٹھی ہوتی تھی۔ یوسف اُس کے پیچھے اور چھوٹے بہن بھائی دائیں بائیں چٹائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بذریعہ رجسٹر ڈاک بھیجی جا چکی تھی۔ قدسیہ بیگم نے سرین کی امی صفیہ کو اپنے ہاتھ سے ایک طویل خط لکھا تھا جس میں اُس نے اُسے اور اُس کے بچوں کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ میری بہن آپ کو یقین نہیں آئے گا کہ میری آنکھوں کے سامنے ہر وقت آپ کی شکلیں گھومتی رہتی ہیں۔ میں اللہ سے دعا کرتی رہتی ہوں کہ مجھے گھر سے نکلنے کا موقع ملے اور میں سیدھی آپ کے پاس اور پھر آپ کی امی کے پاس جاؤں۔ یوسف نے اپنی تحریر سے نصیدہ کی دل چسپی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا تھا۔ آپ کے خط سے یقیناً میری حوصلہ افزائی ہوتی ہے لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ آپ جیسی ذہین طالبات کا وقت بہت قیمتی ہوتا ہے۔ اگر اس سوسائٹی کی وجہ سے آپ نے کسی مضمون میں اپنی توقعات سے کم نمبر لیے تو میں اپنے آپ کو سنا شروع کر دوں گا اور دیکھیے وہ لوگ کم خوش نصیب نہیں ہوتے جو دوسروں کی چھوٹی چھوٹی باتوں اور معمولی کامیابیوں پر خوش ہو جاتے ہیں۔ یہ بات ہمیشہ میرے ذہن میں رہے گی۔ آپ نے اس وقت میری حوصلہ افزائی کی ہے جب مجھے کوئی نہیں جانتا۔

دوسرا خط جالندھر بھیجنے کے پانچ دن بعد لدھیانہ سے سرین کی نانی کا خط آیا اُس نے یوسف اُس کے والدین اور اُس کے بہن بھائیوں کو بہت دعائیں دی تھیں اور اس بات پر معذرت کی تھی کہ علالت کے باعث میں فوراً خط نہ لکھ سکی۔ بخار تو میرا اُسی دن ٹوٹ گیا تھا جس دن مجھے یہ اطلاع ملی تھی کہ یوسف بیٹا

اور اُس کے گھر کے تمام لوگ بخیریت ہیں لیکن میں یہ پروگرام بناتی رہی کہ ذرا کمزوری دور ہو جائے تو جالندھر جاؤں اور وہاں سے صفیہ بیٹی کو لے کر تمہاری امی سے ملاقات کے لیے لاہور جاؤں۔ بیٹا تم کچھ اس طرح اپنی ماں کا ذکر کیا کرتے تھے کہ ہم سب کے دل میں انہیں دیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ پھر پندرہ دن اور گزر گئے اور جالندھر سے کوئی خط نہ آیا۔ یوسف کے نزدیک یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی لیکن اُس کی ماں اکثر کہا کرتی تھی۔

”بیٹا ان کا خط آج بھی نہیں آیا“

اور ایک دن وہ یہ کہہ رہی تھی۔

”بیٹے! کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ تم ایک اور خط لکھ کر اُن کی خیریت پوچھ لو“

”امی جان خط لوگ روز روز تو نہیں لکھا کرتے۔ اُن کا خط نہ آنے کا مقصد

یہی ہو سکتا ہے کہ وہاں سب بخیریت ہیں“

”بیٹے یہ بھی ٹھیک ہے لیکن کبھی کبھی مجھے یہ خوف محسوس ہونے لگتا ہے کہ

شاید میں انہیں نہ دیکھ سکوں“

”امی جان ایسی باتیں نہ کریں۔ ذرا بارشیں شروع ہو جائیں تو میں خود آپ

کو اُن کے پاس لے جاؤں گا“

ایک دن میاں عبدالرحیم نے دفتر سے گھر واپس آتے ہی کہا۔ ”قدسیہ

آج عبدالکریم مجھے دفتر آکر ملا تھا کہتا تھا لاہور میں جو کوٹھی اُس نے بنانی شروع کی تھی

وہ مکمل ہو گئی ہے۔ اب عنقریب اُس کی بیوی اور بچے یہاں آئیں گے اور نئی کوٹھی

میں ایک بڑی دعوت کا انتظام کیا جائے گا۔ اُس نے مجھ سے یہ وعدہ لیا تھا کہ ہم سب

اس دعوت میں شریک ہوں گے۔ ویسے وہ اپنی کوٹھی دکھانے کے لیے اتنا بے تاب

ہی تو ہے جسے ان لوگوں کے ذکر سے کوئی دل چسپی ہو سکتی ہے لیکن اللہ کے فضل سے وہ اتنا سمجھدار ہے کہ غلط باتوں میں کسی کی پیروی نہیں کر سکتا۔ نہ معلوم میرے دل میں یہ خیال کیوں پیدا ہوا تھا کہ امینہ کا ذکر سن کر تمہارا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ وہ ایک ہوشیار لڑکی ہے۔ اس کی شکل و صورت بھی اچھی ہے اور اس کا باپ کتنا تھا کہ وہ کار چلانا بھی جانتی ہے اور وہ نئی کار جو مجھے یہاں چھوڑ کر گئی ہے اس کے لیے خریدی گئی ہے؟

ایوب جو دوسرے کمرے کے دروازے پر کھڑا یہ گفتگو سن رہا تھا آگے بڑھ کر بولا۔ "ابا جی! وہ بس بھی چلا لیتی ہے نا۔" میاں صاحب اور قدسیہ ہنس پڑے۔

تین دن بعد دوسرے پر روانہ ہوتے ہوئے عبدالرحیم نے قدسیہ بیگم سے کہا۔ "آپ کو یاد رہے گا کہ عبدالکریم نے آئندہ جمعہ کے روز دعوت کی ہے۔" "جی ہاں مجھے یاد ہے۔"

"انشاء اللہ میں دعوت پر پہنچ جاؤں گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں ایک دن پہلے آجاؤں لیکن آپ میرا انتظار نہ کریں۔ کیونکہ دوسرے کا پروگرام طویل بھی ہو سکتا ہے۔ ان کی یہ خواہش ہوگی کہ میری طرح آپ بھی دعوت کھانے سے قبل ان کی کوٹھی دیکھ آئیں اس لیے وہ کسی وقت بھی آپ کو آکر لے جائیں گے۔ اگر امینہ اور اس کی ماں اچانک آپ کو بلانے آجائیں تو ان کی دل شکنی نہیں ہونی چاہیے۔"

"جی آپ فکر نہ کریں۔" قدسیہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

"جمعرات کو یوسف صبح کی ناز سے فارغ ہو کر کچھ دیر سیر کرنے کے بعد ناشتے پر بیٹھا تھا کہ کسی نے باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا اور نوکر نے بھاگ کر اطلاع دی۔ جناب عبدالعزیز صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہیں تو سادہ سے آدمی لیکن کتنے ہیں کوئیں

تھا کہ مجھے دفتر سے اٹھا کر سیدھا واپس لے گیا۔ کوٹھی واقعی بہت اچھی ہے لیکن اُس کا مقصد اپنی نئی کار دکھانا بھی تھا۔ بار بار یہ کہتا تھا کہ امینہ اور اس کی اُمّی خود آکر آپ کو کار پر لے جائیں گی اور دعوت کے بعد آپ کو گھر پہنچا دیا جائے گا۔ مجھے یہاں پہنچانے اور ہمارے گھر کا راستہ دکھانے کے لیے اُس نے ڈرائیور کو بھیج دیا تھا اور دیکھو یوسف تمہارے متعلق اس نے خاص طور پر تاکید کی تھی کہ تمہیں اپنے سب دوستوں کے ساتھ دعوت میں شریک ہونا چاہیے۔ میں اس موسم کی دعوتیں پسند تو نہیں کرتا لیکن اگر میں دوسرے پر چلا گیا تو تم اپنی ماں کے ساتھ چلے جانا۔ باقی بچوں کو لے جانے کی ضرورت نہیں۔"

قدسیہ نے کہا۔ "اگر امینہ آتی تو وہ ہم سب کو لے جانے پر ضد کرے گی۔" "ناتشہ دعوتوں کا اُس کی ماں کو بھی بڑا شوق ہے۔"

"قدسیہ اصل میں بات یہ ہے کہ بچے اپنے والدین سے بُری عادتیں سیکھتے ہیں۔ عبدالکریم اتنا مالدار ہے کہ اُسے ہر قسم کی نمائش سے بالاتر ہونا چاہیے لیکن دولت اُس کا اوجھاپن دُور نہیں کر سکتی۔"

قدسیہ نے اُٹھتے ہوئے کہا "آپ ہاتھ دھولیں میں کھانا لگاتی ہوں۔" کھانا کھانے کے بعد بچے اپنے کمرے میں چلے گئے تو عبدالرحیم نے قدسیہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "میرا خیال تھا کہ تم یہ سُن کر خوشی سے اچھل پڑو گی کہ امینہ خود تمہیں لینے کے لیے آئے گی لیکن تم کچھ پریشان سی نظر آتی ہو۔"

قدسیہ نے جواب دیا۔ "میری پریشانی کی وجہ یہ ہے کہ کبھی کبھی جب آپ اپنے دوستوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں تو آپ کو یہ خیال نہیں رہتا کہ بچے آپ کی باتیں سُن رہے ہیں اور ان پر ان باتوں کا اثر پڑے گا۔"

"دیکھو قدسیہ میں مانتا ہوں کہ یہ بات ٹھیک نہیں ہے لیکن یہاں یوسف

یوسف تھوڑی دیر کے لیے اندر گیا اور پھر واپس آکر عبدالعزیز کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا، ”جناب بسم اللہ کیجئے۔“

عبدالعزیز نے کہا ”یوسف میاں! آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ مہمان کون ہیں؟“

”چچا جان! مجھے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ آپ جن کے قاصد بن کر آئے ہیں وہ کوئی اچھے ہی لوگ ہوں گے۔“

”بھئی بعض باتیں بڑی عجیب ہوتی ہیں۔ ہمارے خاندان میں تم بہت مشہور ہو چکے ہو اور مجھے یہ کبھی خیال تک نہیں آیا تھا کہ اپنے علاقے کے مشہور ڈاکو کو پکڑنے والا یوسف وہی نوجوان ہے جس نے میری ایک کم سن بھتیجی اور اس کی نانی کے ساتھ کوڑے سے امرتسر تک کا سفر کیا تھا۔ اصل میں ہم پولیس والے نیکیوں سے زیادہ برائیوں کا تعاقب کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ نسرین جسے تمہاری وجہ سے گھر میں سب اب شہزادی نسرین کہنے لگ گئے ہیں سے میں نے یہ واقعات اس وقت سنے تھے جب تمہارے ضلع سے میری تبدیلی ہو چکی تھی لیکن تمہارا نام سنتے ہی مجھے یہ سمجھ جانا چاہیے تھا کہ اپنے گاؤں کے قریب ڈاکوؤں کا مقابلہ کرنے والا اور گاؤں سے دور ہمارے خاندان کی ایک بزرگ عورت اور ایک کم سن بچی کی مدد کرنے والا یوسف ایک ہی آدمی ہو سکتا ہے۔ نسرین ایک ذہین بچی ہے اگر میں اس سے تمہارا حلیہ پوچھ لیتا تو بھی مجھے سب کچھ معلوم ہو جاتا، لیکن یہاں بھی مجھے اپنی بھتیجیوں کا ہی شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہیں اتنی سمجھ تھی کہ انہوں نے تمہارے پرنسپل کو خط لکھ کر تمہارے بارے میں معلوم کر لیا۔“

یوسف کے دل میں اگر نشتے کی کوئی خواہش تھی تو وہ دور ہو چکی تھی۔ اس نے چائے کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے کہا ”چچا جان میں یہ بیان نہیں کر سکتا کہ جو مہمان آپ کے گھر میں ہمارا انتظار کر رہے ہیں امی جان ان کو مل کر کتنا خوش ہوں گی۔ آپ

پولیس انسپکٹر ہوں اور یوسف صاحب مجھے اچھی طرح جانتے ہیں“ یوسف نے فوراً اٹھتے ہوئے کہا ”تم ناشتہ بیٹھک میں لے آؤ۔“

”امی جان! ان کے لیے کوئی اچھی چیز بھجوا دیں۔“

یوسف باہر نکلا تو عبدالعزیز اس سے بغلیگر ہو کر ملا اور اس کے ساتھ بیٹھک میں آگیا۔

”چچا جان! تشریف رکھیے اور مجھے پہلے بتائیے کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں اور آپ کا سامان کہاں ہے؟“

عبدالعزیز مسکرایا۔ ”بھائی میرا سامان میرے گھر میں ہے۔ اب تم پوچھو گے کہ وہ گھر کہاں ہے تو مختصر جواب یہ ہے کہ گھر بھی لاہور میں ہے۔ میری یہاں بدلی ہو گئی ہے اور بدلی اس لیے ہو گئی ہے کہ ہمارے ایس پی صاحب جس جگہ تبدیل ہوتے ہیں مجھے اس جگہ تبدیل کر دیتے ہیں۔ اب وہ ریلوے پولیس کے ڈی آئی جی بن گئے ہیں اور میرے حال پر اب بھی مہربان ہیں۔ خیال ہے کہ میری بھی ترقی ہو جائے گی۔ لاہور میں میرے خسر کی جائیداد سے ایک مکان میری بیوی کے حصے میں آیا تھا اس کا کچھ حصہ بن چکا تھا اور کچھ بننے والا ہے۔ دو سال سے وہ خالی پڑا تھا اب ہم اس کو آباد کر رہے ہیں۔“

”چچا جان آپ کو یہ گھر تلاش کرنے میں دقت تو پیش نہیں آئی؟“

”بالکل نہیں، اور اس کی وجہ تمہیں تھوڑی دیر بعد معلوم ہو جائے گی۔ اب تم فوراً تیاری کرو۔ ہمارے گھر میں آپ کا انتظار ہو رہا ہے اور آپ سے زیادہ آپ کی امی کا اور انھیں یہ کہہ دیجئے کہ تا نگہ باہر کھڑا ہے۔“

نوکرنے ناشتہ لاکر تپائی پر رکھ دیا اور یوسف نے کہا۔

”جناب پہلے ناشتہ کر لیجئے میں امی جان سے کہہ آتا ہوں کہ وہ تیار ہو جائیں۔“

راستے میں ان کا ذکر نہ کریں کہ وہ کون ہیں اور پھر اگر آپ تعارف نہ بھی کروائیں تو وہ پہلی نظر میں ہی انہیں دیکھ کر پہچان لیں گی۔“

تھوڑی دیر بعد وہ کشادہ گلی میں ایک تانگے پر سوار ہو رہے تھے۔

عبدالعزیز کو چوان کے ساتھ بیٹھ گیا اور حبیب یوسف اپنی والدہ کو کچھلی سیٹ پر بٹھا کر اس کے ساتھ بیٹھنے لگا تو ایک نئی کار مارن بجاتی ہوئی تانگے کے قریب آکر رُک گئی۔ چلانے والی امینہ تھی۔ اس کی والدہ ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اور ڈرائیور کچھلی سیٹ پر تھا۔

یوسف نے پریشان ہو کر دبی آواز میں کہا: ”انکل ایک مسئلہ پر مجھے آپ کی ضرورت پڑے گی۔“

”کیا مسئلہ ہے یوسف صاحب“

”یہ آپ کو ابھی پتہ چل جائے گا۔“

یوسف نے آگے بڑھ کر رشیدہ کو سلام کیا اور پھر امینہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا:

”آپ کو نئی کوٹھی مبارک ہو۔“

”جناب ہم آپ کو وہاں لے جانے کے لیے آئے ہیں۔ آپ کی دعوت آج بھی ہے۔“

”نہیں جی دعوت کل ہے۔“

”جی کل بھی ہے اور آج بھی۔“

یوسف نے رشیدہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا ”چچی صبح میرے انکل آگئے تھے اور ہم

ان کے ساتھ ان کے بال بچوں کو دیکھنے جا رہے ہیں انشاء اللہ کل ہم آپ کی کوٹھی اچھی

طرح دیکھ لیں گے اور شاید میرے ساتھ میرے کچھ دوست بھی آئیں۔“

امینہ بولی: ”اچھا تو جناب آپ ہمارے ساتھ کاریں بیٹھ جائیے پہلے ہم دانا جائیں

گے۔ جہاں آپ کے انکل آپ کو لے جانا چاہتے ہیں اور پھر آپ ہمارے ساتھ چلیں گے۔“

”دیکھو امینہ! ان کے گھر بہت سے مہمان آئے ہوئے ہیں اور ہمیں کافی

دیر وہاں رکنا پڑے گا اور جس علاقہ میں یہ تانگہ جا سکتا ہے وہاں آپ کی گاڑی نہیں

جا سکے گی۔“

وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ یوسف جلدی سے تانگے میں بیٹھ گیا اور عبدالعزیز نے

کو چوان سے کہا: ”بھئی ہمیں دیر ہو رہی ہے۔“

اور اس کی آواز اتنی گرجدار تھی کہ امینہ سم کر رہ گئی۔

قدسیہ نے بلند آواز میں کہا: ”ہن رشیدہ بڑا نہ ماننا بھائی جان کے ساتھ میرا

جانا بہت ضروری ہے۔“

اور تانگہ پوری رفتار کے ساتھ چل پڑا۔

امینہ نے حیرت سے اپنی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”امی یہ کیسا انکل ہے

یوسف صاحب کا۔“

”چلو بیٹی انکل ایسے ہی ہوتے ہیں جب موقع ملے گا تو پوچھ لیں گے۔“

تانگے پر عبدالعزیز نے یوسف سے کہا: ”یوسف وہ صاحبزادی کون تھیں جو میری

طرف خوشنوا آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔“

”انکل یہ میاں عبدالکریم کی صاحبزادی ہے جسے ارجن سنگھ ڈاکو نے لوٹنے کی کوشش

کی تھی اور ان کا مسئلہ یہ ہے کہ لاہور میں عبدالکریم صاحب نے نئی کوٹھی بنائی ہے جو

وہ ہمیں دکھانا چاہتے ہیں اور یہاں ایک شاندار دعوت کا کئی دن سے دھندل رہا بیٹا

جا رہا ہے۔ ہمیں یہ اطلاع بہت پہلے مل چکی تھی کہ صاحبزادی بذاتِ خود ہمیں لینے

کے لیے آئیں گی۔“

عبدالعزیز نے کہا: ”بیٹا! میری وجہ سے تمہارا پروگرام خراب نہیں ہونا چاہیے تھا۔“

”کوئی پردگرم نہیں تھا۔ ہمارا اُن کے ساتھ اُمی جان سے پوچھ لیجئے۔“
عبدالعزیز نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر کہا ”بہن میرا نام عبدالعزیز ہے اور آپ کے ہونا ر فرزند سے میری دوستی اُس وقت ہوئی تھی جب یہ ایک بہت بڑے ڈاکو کو پکڑ چکے تھے۔“

قدسیہ نے کہا ”بھائی جان! میں آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ یوسف اکثر آپ کا ذکر کیا کرتا ہے۔ یوسف کے آبا جان دورے پر گئے ہوتے ہیں درندہ آپ سے مل کر بہت خوش ہوتے۔ بھائی جان یوسف آج بڑا خوش ہے۔ آپ نے یہ نہیں بتایا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔“
”اچھا! آپ میرے گھر جا رہے ہیں جہاں بہت پیار کرنے والے لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

قدسیہ نے باقی راستہ میں کوئی بات نہ کی۔ اُس کے دل میں جو سوال اٹھ رہے تھے ان کا جواب وہ یوسف کے چہرے پر تلاش کر رہی تھی۔
تھوڑی دیر بعد تا نگہ ایک مکان کے دروازے پر رُکا، یوسف نے ماں کو سہارا دے کر اتارا اور عبدالعزیز نے کہا ”بھابی جی آپ بلا تکلف تشریف لے جائیں۔ وہاں میری بیوی ایک نوکرانی اور اُن مہمانوں کے سوا کوئی نہ ہوگا جو بے چینی سے آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے۔“

”یوسف تم بھی جاؤ۔ مجھے ایک کام ہے میں جلدی واپس آنے کی کوشش کروں گا۔ بہر حال تم نے اور بھابی جان نے شام تک یہیں رہنا ہے۔ کیونکہ رات کی گاڑی پر وہ مہمان جو صرف بھابی جان کی خاطر آئے ہیں واپس چلے جائیں گے۔“
قدسیہ بیگم نے کہا۔ آپ یہ کیوں نہیں بتا دیتے کہ مہمان کون ہیں۔“
”بھابی جان اندر چلیے نا۔“

”آئیے امی جان“ یوسف نے کہا۔
کشادہ صحن کے اندر جامن اور پیپل کے درختوں کی چھاؤں میں تین عورتیں کھڑی تھیں۔

قدسیہ نے پہلی نظر میں ہی مہر لیکن خوش وضع خاتون سے مخاطب ہو کر کہا ”مجھے یقین ہے کہ آپ مسز احمد ہوں گی۔ اگرچہ یہاں دیکھ کر آپ کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک خواب دیکھ رہی ہوں۔“ وہ بے اختیار اس کے ساتھ لپٹ گئی اور پھر وہ دوسری خاتون کی طرف متوجہ ہوئی۔

”آپ نسرين اور فہمیدہ کی ماں کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتیں۔“
اُس نے تیسری خاتون کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

”یہ بھائی عبدالعزیز صاحب کی زیادتی ہے کہ انہوں نے اندر بھیجتے ہوئے مجھے آپ کا نام نہیں بتایا۔ میں نے آپ کو شاید ٹھیک طرح السلام علیکم بھی نہیں کیا۔ بہن صفیہ مجھے اچھی طرح جھنجھوڑ کر بتاؤ کہ یہ سب کچھ ایک خواب نہیں۔ یہ چند دن کی بات ہے کہ میں نے یوسف سے کہا تھا کہ شاید میں آپ لوگوں کو نہیں دیکھ سکوں گی اور آج میں اپنے آپ کو بہت ہی خوش نصیب سمجھتی ہوں۔“
قدسیہ مسکرا رہی تھی اور اُس کے ساتھ ہی اُس کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے۔

صفیہ نے پیار سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”چلیے بہن۔ اندر چلیے۔“

وہ کشادہ کمرے میں بیٹھ گئیں۔

نوکرانی نے شربت سے بھرے ہوتے دو جگ لاکر میز پر رکھ دیے اور صفیہ نے دو گلاس بھر کے قدسیہ اور یوسف کو پیش کر دیئے۔

یوسف نے اُس کے دائیں ہاتھ بیٹھ کر سر جھکا لیا۔

وہ بیگم عبدالعزیز کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوتی اور اس کے قریب سے گزر گئی۔

قدسیہ اٹھی اور جلدی سے آگے بڑھ کر اُس سے لپٹ گئی۔ "فہمیدہ! میری پیاری بیٹی۔ بیٹی تم وہی ہو جسے میں سوتے جاگتے ہر وقت دیکھا کرتی تھی!" پھر وہ اُس کے سرخ و سفید گالوں، بڑی بڑی چمکدار آنکھوں اور پیشانی کو چوم رہی تھیں:

"بیٹی خدا کا شکر ہے کہ میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے اور میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری ہو چکی ہے۔ مجھے اس بات سے خوف آتا تھا کہ میں تمہیں ملے بغیر نہ ہو جاؤں۔ بہت خوف آتا تھا مجھے اس بات سے۔ بیٹھ جاؤ میرے پاس۔"

قدسیہ بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کر رہی تھی

یوسف اٹھا اور کمرے سے برآمدے میں چلا گیا۔ صفیہ نے اس کی طرف دیکھا تو وہ منہ پھیر کر آنسو پونچھنے لگا۔ صفیہ جلدی سے باہر نکلی اور سیارے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی "بیٹا میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جب یوسف سے ملاقات ہوگی تو میں اسے غمگین دیکھوں گی۔"

"خالہ جان! یوسف نے مسکرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "خدا معلوم

امی جان ایسی باتیں کیوں کہہ رہی تھیں۔ انہیں یہ وہم ہو گیا ہے کہ کسی دن ہمارا ساتھ چھوٹ جائے گا اور وہ دنیا جس کے متعلق فہمیدہ نے یہ لکھا تھا کہ میں یہاں خوشیاں تقسیم کرنے آیا ہوں ایک ویرانہ بن جائے گی۔ فہمیدہ کو دیکھ کر وہ یقیناً بہت خوش ہوئیں ہیں لیکن ایسے موقعوں پر وہ خوشی اور غم کی سرحدوں کے درمیان فاصلے قائم نہیں رکھ سکتیں۔ وہ پورے خاندان میں سب سے زیادہ تندرست ہیں اور ان میں قوت برداشت بھی بہت ہے۔ میں جس کی ہر بات پر وہ فخر کرنے

یوسف نے اُٹھ کر کہا: "خالہ جان! آپ تشریف رکھیں" اور وہ گلاس جو اُس کے ہاتھ میں تھا۔ آگے بڑھ کر مسز احمد کو پیش کر دیا۔

اس کے بعد اُس نے صفیہ کو ایک گلاس بھر کر پیش کیا۔ پھر وہ عبدالعزیز کی بیوی کی طرف متوجہ ہوا تو اُس نے کہا "بیٹا! اب تم اپنی امی جان کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ جب تک تم پانی نہیں پیو گے اس وقت تک وہ اپنے منہ کو گلاس نہیں لگاویں گی۔"

یوسف جلدی سے ایک گلاس بھر کر ماں کے پاس بیٹھ گیا۔

صفیہ اپنی امی جان سے کہہ رہی تھی یہ شربت تو میں کئی بار پی چکی ہوں، لیکن آج کچھ زیادہ پی بیٹھا ہو گیا ہے کیوں بہن قدسیہ یوسف کے خالی پانی میں آپ کو مٹھاس محسوس نہیں ہوتی۔"

عبدالعزیز کی بیوی بقیس نے ایک گلاس بھر کر دوسرے کمرے کا رخ کرتے ہوئے مہمانوں کی طرف مڑ کر دیکھا اور کہا "آپا قدسیہ آپ کی ذہانت کا امتحان لینا ہے تو گستاخی لیکن ہمارے گھر میں ایک سچی ایسی ہے جسے یہ جان کر بڑی خوشی ہوگی کہ آپ نے اُسے بھی دیکھتے ہی پہچان لیا ہے۔"

جب وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی تو یوسف نے اُٹھ کر کہا "امی جان آپ اطمینان سے باتیں کریں میں یہاں پاس ہی ایک دوست سے مل کر آتا ہوں۔"

مسز احمد نے کہا "یوسف ادھر آؤ۔"

یوسف اُس کے قریب کھڑا ہو گیا "فرمائیے ماں جی۔"

"میں اب بھی تمہیں کوئی حکم دینے کا حق رکھتی ہوں نا؟"

یوسف نے جواب دیا "ماں کا یہ حق ہمیشہ کے لیے ہوتا ہے۔"

"اچھا میرے پاس بیٹھ جاؤ۔"

”نہیں بیٹا اگر وہ ایک دفعہ فیصلہ کر لیں تو اسے تبدیل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ تمہاری امی جان کو خوش کرنے کے لیے میں فہمیدہ کو کہوں گی کہ انہیں ہر ہفتہ ایک خط ضرور لکھا کرے۔ ہاں تمہارے لیے میں کچھ تصویریں لائی ہوں۔ نسرین کہتی تھی ”امی جان یہ تصویریں بھائی یوسف کی امی کے ہاتھ میں دینا ورنہ وہ کہیں گم کر دیں گے!“ کمرے سے ایک خوشگوار سا قہقہہ سنائی دیا اور یوسف صفیہ کے ساتھ اندر آ گیا۔

فہمیدہ جو لجائی شرماتی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ ابھی تک نصف چہرہ دوپٹے سے چھپاتے بیٹھی تھی۔
قدسیہ نے اُس کے ہاتھ پکڑ کر غور سے دیکھتے ہوئے کہا ”بیٹی! کتنے خوب صورت ہیں تمہارے ہاتھ، اگر میرے پاس اللہ دین کے چراغ کا جن ہوتا تو اسے حکم دیتی کہ میرے سامنے اشرفیوں کا انبار لگا دو جو میری بیٹی فہمیدہ کے قد کے برابر اونچا ہو اور پھر میں بھائی عبدالعزیز سے درخواست کرتی کہ وہ اس علاقے کے تمام غریبوں کو حج کر لیں کیونکہ میں فہمیدہ کے خوب صورت ہاتھوں سے یہ اشرفیاں ان میں تقسیم کر دانا چاہتی ہوں۔“

اس پر سب ہنس پڑے اور ان کے ساتھ فہمیدہ کے دبے دبے خوشگوار قہقہے بھی سنائی دینے لگے۔ منیر احمد نے کہا ”بیٹا یوسف! ہم تو کوئی اور ہی پروگرام لے کر آئے تھے لیکن تمہاری امی جان کو دیکھ کر مجھے کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ ہمارا ارادہ تھا کہ تمہارے ساتھ چلیں گے اور میں ان کے ساتھ اس لیے کانگرڈ ا جانے پر تیار ہو گئی تھی کہ میں وہاں اطمینان سے تمہاری زبان سے وہ دلچسپ واقعات سننا چاہتی تھی جو مجھے عبدالعزیز سے معلوم ہوتے یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جس زمانے میں میں اور میری بیٹیاں یہ دعا کیا کرتی تھیں

کی عادی ہیں اُن کے لیے ایک کمزوری بھی بن چکا ہوں۔ اس لیے کہ وہ مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں یا شاید اس لیے کہ میں اُن سے بہت پیار کرتا ہوں۔ خالد جان مجھے یقین ہے کہ اگر فہمیدہ کوئی ہنسنے والی بات کر دے تو تھوڑی دیر بعد آپ کو اس کمرے میں اُن کے قہقہے سنائی دیں گے۔

خالد جان! نسرین کیوں نہیں آتی آپ کے ساتھ۔“

”بیٹا! بات یہ ہے کہ ہم پرسوں کانگرڈ جا رہے ہیں۔ وہاں ہم چند ہفتے دھرم سالہ ٹھہریں گے۔ ہم صرف تمہاری امی سے ملنے کے لیے لاہور آئے تھے کیونکہ فہمیدہ نے اب کالج میں داخل ہونا ہے۔ اس کے بعد خدا معلوم کب اسے لاہور آنے کا موقع ملے۔ اس لیے ہم اسے ساتھ لے آئے۔ نسرین سے ہم نے وعدہ کیا تھا کہ چھٹیاں ختم ہونے سے چند روز پہلے اُسے ہم اُس کی چچی کے ہاں بھیج دیں گے اور پھر وہ روزانہ آپ کے ہاں آجائے گی اور اگر وہ آپ کی امی کے پاس رہنا پسند کرے تو ہمیں اس بات کی بھی خوشی ہوگی۔ ان سب کو تمہارے ”پر دسی درخت“ دیکھنے کا بہت شوق تھا اور ہمارے پہلے پروگرام میں یہ بات بھی شامل تھی کہ اگر تمہارے گاؤں کا پتہ چل گیا تو ہم آتے جاتے وہاں ایک دو دن ضرور ٹھہریں گے لیکن آپ کے خط سے پتہ چلا کہ آپ کے والد لاہور تبدیل ہو چکے ہیں پھر اتنی جان اچانک جالندھر تشریف لے آئیں۔ اصل مقصد تو ہمیں کانگرڈ کی طرف رخصت ہوتے وقت دیکھنا تھا لیکن پھر اچانک ایک دن ان کا موٹر بدلا اور وہ ہمیں اپنے ساتھ یہاں لے آئیں۔ اب پروگرام یہ ہے کہ میں اور فہمیدہ جالندھر آتر جائیں گے اور اتنی جان اسی گاڑی پر لڑھکیا پہنچ جائیں گی۔“

”خالد جان! انہوں نے ہمارے لیے اتنی تکلیف کی ہے اگر انہیں گھر ہی واپس جانا ہے تو چند دن ہمارے ہاں ٹھہر جائیں۔ میری امی جان خوش ہو جائیں گی۔“

کہ کہیں سے تمہاری اطلاع آجائے تو عبدالعزیز کو تمہارے اور تمہارے خاندان کے متعلق ایک ایک بات معلوم تھی۔ ڈاکوؤں کے ساتھ تصادم کے جو واقعات اخبارات میں شائع ہوئے تھے۔ فہیدہ نے اپنے چچا سے اصرار کر کے ان کے پرانے ریسے منگوا کر ایک اچھی خاصی فائل تیار کر لی تھی۔

”مال جی یہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں تھا۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس نے ایک نیک کام میں میری مدد کی تھی۔“

”کیوں بیٹی صفیہ فہیدہ نے یہی کہا تھا نا کہ جب میں یوسف کی تعریف کروں گی تو وہ بے پروائی سے یہ کہے گا: مال جی یہ کون سی بڑی بات تھی۔“

تھوڑی دیر بعد جو بی بی کا پھانک کھلنے کی آہٹ سنائی دی اور بلقیس نے باہر نکلتے ہوئے کہا، ”شاید وہ آگئے ہیں۔“ مگر وہ اٹھ کر باہر نکلتے ہوئے بولی: ”وہ اس طرف آنے کی بجائے بیٹھک کی طرف چلے گئے ہیں۔“

یوسف نے اٹھتے ہوئے کہا ”یہ اُن کے پاس جاتا ہوں۔“

مسز احمد نے قدسیہ سے مخاطب ہو کر کہا، ”بہن اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو کھانے کے لیے انہیں نہیں بلایا جائے۔“

آپا جی: ”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ وہ فہیدہ کا چچا ہی نہیں میرا بھائی بھی ہے۔ اور اگر وہ میری وجہ سے اتنی دیر گھر سے باہر رہے ہیں تو مجھے بہت افسوس ہونا چاہیے۔“

صفیہ نے کہا ”میں انہیں بلا لاتی ہوں۔“ وہ کمرے سے نکل کر بیٹھک کی طرف چلی گئی: دس منٹ بعد وہ واپس آئی اور اُس نے کہا، ”وہ کہتے ہیں کہ جب کھانا لگ جائے گا تو ہم آجائیں گے۔“ پھر اُس نے آواز دی:

”فہیدہ بیٹی وہ یہ کہتے ہیں کہ تمہاری چچی کی کارورکشاپ سے مرمت ہو کر آجائے گی۔ اب کھانے کے بعد تمہیں دو تین گھنٹے لاہور میں گھومنے کے لیے مل جائیں گے۔“

”امی جان! دوپہر کے کھانے کے بعد سیر تو ایک سزا ہوگی۔“

بلقیس نے کہا، ”بیٹی یہ ضروری تو نہیں کہ تم دھوپ میں ہی سیر کرو۔ ہم چار بجے کے قریب گھر سے نکلیں گے پھر اطمینان سے سیر کریں گے۔ لارنس گارڈن میں تو ہم رات کے دس بجے تک گھوم سکتے ہیں۔ پھر علی الصبح شاہی مسجد قلعہ اور جہانگیر کا مقبرہ دیکھ سکیں گے۔“

مسز احمد نے کہا ”بیٹی رات ہمیں جالندھر پہنچنا ہے۔“

قدسیہ نے کہا، ”دیکھیے آپا جان جالندھر سے آپ کو کتنا گڑبڑ جانا ہے اور ہاں اگر ہماری خاطر تاخیر سے چلی جائیں تو کیا نقصان ہوگا۔ خدا کے لیے مجھے یہ تو یقین آنے دیجئے کہ میں نے خواب نہیں دیکھا۔ اب پردگرم یہ ہے کہ شام کو سیر کرنے کے بعد آپ سب میرے ہاں کھانا کھائیں گے اور رات وہیں رہیں گے۔ علی الصبح پھر ہم سیر کے لیے نکلیں گے اور کسی جگہ ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کریں گے۔ ناشتہ ہم ساتھ لے جائیں گے۔ دوپہر کے کھانے کے وقت ہم گھر پہنچ جائیں گے۔ پھر سب آپ کو اسٹیشن پر جا کر رخصت کریں گے۔ ویسے آپ یوسف کی طرح مجھے بھی حکم دے سکتی ہیں اور ڈانٹ کر یہ کہہ سکتی ہیں: لڑکی تم خاموش رہو اور میں خاموش ہو جاؤں گی۔“

مسز احمد نے گھر کر کہا، ”قدسیہ بیٹی دیکھو کہ میں پھر نہ رو پڑتا۔ میں کوئی ایسا فیصلہ نہیں کروں گی جو تمہیں پسند نہ ہو۔“

قدسیہ مسکرائی۔

مسز احمد نے کہا، ”بیٹی! اسی طرح مسکراتی رہا کرو، تمہارے چہرے پر سلامٹ

بہت اچھی لگتی ہے۔“

قدسیہ نے فمیدہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، ”کیوں فمیدہ بیٹی تمہیں بھی میری مسکراہٹ اچھی لگتی ہے؟“

”جی خالہ جان“

”بیٹی تم اس بات پر ناراض تو نہیں ہو گئی، میں نے تمہاری نانی جان کو پروگرام تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا ہے؟“

فمیدہ نے جواب دینے کی بجائے قدسیہ کی طرف دیکھا اور ایک دائمی مسکراہٹ جو اکثر اس کے ہونٹوں پر دیکھی جاتی تھی اس کے چہرے پر آنکھوں تک پھیل گئی اور اس نے آہستہ سے نفی میں سر ہلا دیا۔

قدسیہ نے کہا، ”بیٹی کیا یہ افسوس کی بات نہیں کہ ہزاروں دعاؤں کے بعد تمہاری نانی، تمہاری امی اور تم ملی ہو اور مجھے اس سے زیادہ کہنے کا حوصلہ نہیں ہوا کہ ایک دن اور ٹھہر جاؤ۔ مجھے ایک ہفتہ نہیں ایک مہینہ اور کہنا چاہیے تھا۔“

وہ ہنس پڑیں۔

صفیہ بولی، ”آخر تم ایک ادیب کی ماں ہو نا؟“

فمیدہ نے کہا، ”خالہ جان جالندھر یا لدھیانہ یہاں سے بہت دور تو نہیں ہے۔“

”بیٹی اب دور نہیں ہیں کل تک تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں نہ ختم ہونے والے فاصلوں میں گم ہو کر رہ جاؤں گی۔“



بیٹھک میں عبدالعزیز یوسف سے کہہ رہا تھا، ”دیکھو بھائی مجھ سے یہ وعدہ کر دو کہ جب تمہیں فرصت ملا کرے گی تو تم سیدھے یہاں آ جا یا کر دو گے ہم میں سے کوئی گھر میں ہو یا نہ ہو تمہارے ٹھہرنے کا انتظام یہاں ضرور ہوا کرے گا۔ میرا چھوٹا بھائی کمال الدین

کالج میں داخل ہوا تھا تو اس وقت اس مکان میں بڑی رونق ہوا کرتی تھی۔ بھابی صفیہ اور ان کی بچیاں بھی یہاں آ جا یا کرتی تھیں۔ فمیدہ اور نسرین کے ساتھ تو ہم میاں بیوی اتنے مانوس تھے کہ کسی نہ کسی بہانے جالندھر چلے جا یا کرتے تھے۔ کمال الدین میڈیکل کالج سے فارغ ہو کر اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ چلا گیا ہے تو ہمیں اس گھر میں پاؤں رکھتے ہوئے گھبراہٹ سی محسوس ہوتی تھی۔

”یوسف نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ”چچا جان! آپ کے بچے کہاں ہیں؟“

”بھائی! اس نے جواب دیا، ”اللہ نے مجھے اس نعمت سے محروم رکھا ہے اور میں تمام اچھے بچوں پر ایک باپ کا پیا تقسیم کرنا نہتا ہوں اور خیال ہے کہ اس میں سے تم بھی ایک بڑا حصہ لے چکے ہو۔ میں کسی بچے کی جن اچھائیوں کا تصور کیا کرتا تھا وہ سب مجھے تم میں نظر آتی ہیں اور وہ بھی نظر آتی ہیں جن کا تصور میں نہیں کیا کرتا تھا۔ مثلاً میں تمہیں گاؤں کے ایک بہادر آدمی، ایک بہترین شہسوار اور ایک نڈر اور ذہین نوجوان کی حیثیت سے جانتا تھا۔ پھر نسرین اور اس کی نانی سے معلوم ہوا کہ تم تیرا بھی ہوا کشتی کھینا بھی جانتے ہو اور فمیدہ کا یہ دعویٰ ہے کہ تم اپنے قلم سے اپنے لیے بڑی سے بڑی کامیابی کے راستے کھول سکتے ہو، اچھا یہ بتاؤ تمہیں کار چلانا بھی آتی ہے؟“

”نہیں چچا جان کار چلانا گاؤں والوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔“

”لاہور گاؤں نہیں ہے یوسف تمہارے جیسا آدمی جسے کشتی تک چلانی آتی ہو وہ تین چار دن میں اچھا خاصا موٹر ڈرائیور بن جائے گا۔“

”چچا جان جب میں موٹر لینے کے قابل ہو جاؤں گا تو چلانا بھی سیکھ لوں گا۔“

”بھئی چلانا سیکھ لو گے تو موٹر بھی آ جائے گی۔ آج کھوڑی دیر تک بلقیس کی کار

یہاں آئے گی اور ڈرائیور کو یہ کہوں گا کہ وہ ایک ہفتہ کے لیے دو تین گھنٹے روزانہ تمہیں دیا کرے۔ بڑا تجربہ کار ہے وہ۔ اور جب اسے یہ بتایا جائے گا کہ اسے ایسے نوجوان کا استاد بنایا جا رہا ہے جس نے ایک انتہائی خوفناک ڈاکو پکڑا تھا۔ جس کے نام سے

بڑے بڑے بد معاش کانپتے تھے تو وہ بہت خوش ہو گا۔“

یوسفؑ کہا ”نہیں چچا جان آپ کو اس سے تکلیف ہوگی۔“

”بیٹا مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی تم جانتے ہو کہ میں اپنے لیے سائیکل پسند کرتا ہوں یہ کار بلقیس کو تین سال قبل اس کے والد نے دی تھی۔ پھر وہ بھی اسے کم ہی استعمال کرتی ہے، بلکہ اُس نے تو یہ کہہ دیا تھا کہ: ”ہم تو ڈرائیور کے اخراجات کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے“ اس پر اُس کے آبا جان نے ڈرائیور کی تنخواہ اپنے ذمہ لے لی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس بات پر خوش ہوں گی کہ آپ نے اُن کے ڈرائیور سے کار چلانا سیکھی ہے۔ بلکہ وہ اُسے انعام بھی دیں گی۔“

یوسفؑ نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”میں نماز کے لیے مسجد تک جا رہا ہوں۔“

عبدالعزیزؑ نے اُنکے ہوتے کہا: ”چلو میں بھی چلتا ہوں۔“

جب وہ باہر نکلے تو برآمدے سے صفیہ کی آواز سنائی دی۔ ”بھائی جان کھانا تیار ہے۔“

عبدالعزیزؑ نے جواب دیا: ”ہم نماز پڑھ کر آتے ہیں۔“

قدسیہؑ نے ایک کمرے میں ظہر کی نماز ادا کی اور پھر دعا کے لیے اٹھ اٹھاتے ہوئے اُس نے دیکھا کہ صفیہؑ اُس کے بائیں ہاتھ کھڑی ہے۔ وہ دعا ختم کر کے اٹھی، چند ثانیے اُس کے پیچھے کھڑی رہی اور پھر ذرا ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گئی یا سے قیام اور رکوع و سجود تک صفیہؑ کی ہر بات انوکھی معلوم ہوتی تھی اور اُس کے دل سے بے اختیار یہ دعائیں نکل رہی تھیں:

”یا اللہ اس سچی کا حسن اور اس کی پاکیزگی اسی طرح قائم رہے۔“

اسے اپنی نعمتوں سے مالا مال کر دے۔ یا اللہ اس کے والدین اس کی اُن گزشت خوشیاں دیکھیں۔ یا اللہ مجھے اتنی زندگی دے کہ میں یوسفؑ اور اس سچی کے لیے جی بھر کر دعائیں کر سکوں۔“

تھوڑی دیر بعد وہ سب دسترخوان پر بیٹھے ہوئے تھے اور صفیہؑ کہہ رہی تھی:

”آپا قدسیہؑ آپ کے آنے کی خوشی میں میں باورچی خانے کی طرف توجہ نہیں دے سکی۔ ویسے ہماری باورچن مہمانوں کی شکل دیکھ کر ہی سمجھ جاتی ہے کہ وہ کس قسم کا نمک مرچ پسند کریں گے۔“

اور قدسیہؑ کہہ رہی تھی: ”پھر تو ہمیں اس کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے ہمیں اچھے مہمانوں میں شامل کر لیا ہے۔“

خادمہؑ نے کہا: ”جی بی بی جی آپ سے اچھا کون ہو سکتا ہے۔“

”واہ بھئی تمہاری بریانی کا تو کوئی جواب نہیں۔ کیا نام ہے تمہارا۔“

خادمہؑ نے شرماتے ہوئے کہا: ”جی میرا نام فضللاؑ ہے۔“

قدسیہؑ نے کہا: ”اگر ہمیں کسی دن خاص لوگوں کو دعوت پر بلانا پڑا تو میں بہن بلقیسؑ سے درخواست کروں گی کہ تمہیں ایک دن ہمارے گھر آنے کی چھٹی مل جائے۔“

بلقیسؑ بولی: ”خدا کا شکر ہے کہ تمہیں فضللاؑ کا کھانا پسند آیا ہے۔ اب آپ کو جب بھی ضرورت پڑے گی یہ آپ کے پاس پہنچ جایا کرے گی۔“

کھانے سے فارغ ہو کر قدسیہؑ نے عبدالعزیزؑ سے مخاطب ہو کر کہا: ”بھائی جان! آپ ڈرائیور سے کہیں کہ مجھے گھر چھوڑ آئے۔ میں نے نوکر کو شام کے کھانے کے لیے کچھ ہدایات دی ہیں۔“

بلقیسؑ بولی: ”بہن کچھ دیر آرام کر لو، بہت گرمی ہے۔ کھانا پکانے کے لیے

گھر سے نکلنے کے کچھ دیر بعد دوسرے سے واپس آگئے ہونگے تو انھوں نے انھیں بہت پریشان کیا ہوگا۔

”یہ کوٹھی والے کون ہیں ہیں۔“

”انھیں بھائی عبدالعزیز جانتے ہیں۔ آؤ فضلاں بی بی۔“

وہ سب قدسیہ کو رخصت کرنے کے لیے باہر نکلے:

”دیکھتے جی باہر بہت گرمی ہے۔ آپ آرام سے بیٹھی رہیں۔“

عبدالعزیز نے کہا: ”آپا جی یہ آپ کو روانہ کرنے سے پہلے آرام نہیں کریں گی اگر ایک دوسرے کے آرام کا اتنا خیال ہے تو وہ باتیں جو عورتیں رخصت ہوتے وقت دروازے سے باہر کیا کرتی ہیں وہ یہاں برآمدے میں ہی کر لیں۔ میں نے ڈرائیور کو سمجھا دیا ہے وہ سیدھا آپ کو آپ کے گھر لے جائے گا۔“

”اچھا جی جاتی ہوں خدا حافظ۔“

قدسیہ یہ کہہ کر تیزی سے پھاٹک کی طرف بڑھی اور بلا توقف کاریں سوار ہو گئی۔

فضلاں بھی بھاگ کر اُس کے ساتھ جا بیٹھی اور ڈرائیور نے گاڑی سٹارٹ کر دی۔

وہ سب چند قدم دور کھڑی ہنستی ہوئی ہاتھ ہلاتی تھیں اور قدسیہ اپنا ہاتھ باہر نکال کر اُن کے اشاروں کا جواب دے رہی تھی۔



کار عین مکان کے سامنے رُکی اور نوکر علی بخش نے دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے کہا: ”بی بی جی آپ کہاں چلی گئیں تھیں۔ میاں جی آپ کے جاتے ہی آگئے تھے۔ وہ کھانا کھا رہے تھے تو عبدالکریم صاحب کا لوکر آگیا اور کہنے لگا کہ بی بی جی سے

میں فضلاں بی بی کو آپ کے ساتھ بھیج دوں گی۔“

”ہن یہ تو بڑی اچھی بات ہوگی۔ شاید فضلاں کی وجہ سے ہمارے نوکر کو کچھ عقل آجائے۔ وہ خواہ کوئی چیز پکائے ذائقہ بالکل ایک ہوتا ہے۔ میں تین بجے یہاں سے چلی جاؤں گی۔“

یوسف یہیں رہے گا اور چار بجے آپ کے ساتھ وہاں آجائے گا۔ وہاں چائے پی کر ہم چڑیا گھر اور لارنس گارڈن جائیں گے۔ باقی لاہور دیکھنے کے لیے ہم صبح نماز پڑھتے ہی نکل جائیں گے۔“

مسز احمد نے کہا: ”بیٹی میں نے چڑیا گھر، لارنس گارڈن اور باقی لاہور دیکھا ہوا ہے۔“

”جی وہ میں نے بھی دیکھا ہوا ہے۔ یوسف نے لاہور پہنچتے ہی مجھے خوب سیر کرائی تھی۔“

عبدالعزیز نے کہا: ”بھئی اصل بات یہ ہے کہ لاہور کے پروگرام کا تعلق فمیدہ سے ہے۔ بچپن میں جب یہ یہاں آکر رہی تھی تو اس کا پہلا مطالبہ یہ ہوا کرتا تھا کہ مجھے چڑیا گھر لے چلو۔ پروگرام آج بھی یہی تھا کہ صبح ہوتے ہی میں اسے چڑیا گھر کھلاؤں لیکن مجھے یوسف صاحب کی تلاش میں جانا پڑا۔“

قدسیہ نے کہا: ”بھائی جان ہمیں یقین ہے کہ آج ہمیں دیکھ کر فمیدہ کو چڑیا گھر جانے سے زیادہ خوشی ہوئی ہوگی۔“

فمیدہ نے مسکراتے ہوئے سر نیچے کر لیا۔

تھوڑی دیر بعد قدسیہ نے اُٹھ کر اپنے سر پر چادر لیتے ہوئے یوسف سے کہا: ”تھوڑی دیر آرام کر لیں تو اطمینان سے انھیں لے کر آجانا۔ مجھے ابھی خیال آیا ہے کہ وہ کوٹھی والے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے اور اگر تمہارے ابا جان ہمارے

قدسیہ اندر آگئی تو یہی شکایت یوسف کے بہن بھائی کر رہے تھے کہ آپ ہمیں بتا کر کیوں نہیں گئیں۔ آبا جان بہت غصے میں تھے۔

لیکن وہ قطعاً پریشان نہ تھی۔ اُس نے بڑے کمرے میں جا کر دیکھا۔ میاں عبدالحکیم بڑے آرام کی نیند سو رہے تھے۔ عصر کی نماز کے بعد وہ کام میں مصروف ہو چکی تھی۔ کچھ دیر بعد کار کا مارن سنائی دیا اُس نے دروازہ کھولا اور کار سے یوسف کے ساتھ صفیر، فمیدہ اور بلقیس اُتریں۔

قدسیہ نے پوچھا۔ ”بیٹا یوسف۔ بھائی عبدالعزیز اور مسز احمد نہیں آئے؟“

”جی عبدالعزیز صاحب کو اپنے دفتر میں کوئی کام تھا اور ماں جی کو تھکاوٹ اور نیند محسوس ہو رہی تھی۔“

بلقیس بولی۔ ”آپا جی انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ فمیدہ کی موجودگی میں وہ میری غیر حاضری محسوس نہیں کریں گی۔“

فمیدہ بولی۔ ”انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ جب ہم سیر سے فارغ ہو جائیں تو یوسف صاحب کو میرے پاس چھوڑ جائیں مجھے ان سے باتیں کرنے کا موقع نہیں ملا۔“

قدسیہ انھیں ہٹھک میں لے گئی اور نوکر کو شربت لاسنے کا حکم دے کر یوسف کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”بیٹا! میرا خدشہ درست ثابت ہوا۔ ہمارے بعد تمہارا آبا جان پہنچ گئے تھے اور عبدالکریم والوں نے نوکر کو موٹر دے کر بھیج دیا تھا۔ اب وہ گہری نیند سو رہے ہیں۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ جیسے سے فارغ ہوتے ہی باہر نکل جاؤں۔“

بلقیس بولی۔ ”بہن آپ فکر مند نہ ہوں۔ اگر آپ کو ایک ارچلے کا خدشہ ہے تو ہم آپ کی پوری مدد کریں گے۔“

قدسیہ نے کہا۔ ”بہن مجھے صرف ایک پریشانی ہے اگر وہ اچانک

کہو کہ میں ان کے لیے کار لے آیا ہوں۔ میاں جی نے پہلے بھی میری بہت مرمت کی تھی۔ اب دوبارہ میری شامت آگئی اور وہ بار بار پوچھتے تھے بے وقوف تم نے اُن سے یہ پوچھا کیوں نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہیں اور اس بد تمیز نوکر نے میرے لیے ایک نئی مصیبت کھڑی کر دی۔ جناب امینہ بی بی کہتی تھیں کہ جب صبح ہم انھیں لینے آتی تھیں تو بیگم صاحبہ اور یوسف صاحب کسی آدمی کے ساتھ تانگے پر جا رہے تھے۔ مجھ سے دوبارہ پوچھا جا رہا تھا کہ اُسے گدھے مجھے بتاؤ کہ وہ آدمی کون تھا۔ میں نے جواب دیا۔ جناب کوئی یوسف صاحب سے ملنے آیا تھا اور اس نے ناشتہ بھی ان کے ساتھ کیا تھا اور وہ بد تمیز نوکر پھر بول اُٹھا۔ ”میاں جی چھوٹی اور بڑی بی بی دونوں یہ کہتی ہیں کہ یوسف صاحب کا انکل تھا اور وہ اُس کے گھر جا رہے تھے۔“

میری پھر شامت آگئی اور مجھ سے پوچھا جا رہا تھا وہ کون تھا جو یوسف کا انکل بن کر آیا تھا۔ تم اتنے بے وقوف ہو کہ یہاں کوئی ہمارا ملنے والا آتے اور تم اسے پہچان بھی نہ سکو۔ مجھے اتوار گدھا بھی کہا انھوں نے۔ یہ نہ کر رہے کہ میاں جی تھکے ہوتے تھے انھیں کھانا کھاتے ہی نیند آگئی اور یہ بھی شکر۔ ہے کہ آپ واپس آگئی ہیں ورنہ میری جان پر مبنی ہوتی تھی۔ ابھی میں اس بات سے ڈر رہا تھا کہ عبدالکریم والے اگر ایک بار پھر یہاں پہنچ گئے تو میرا کیا بنے گا۔“

”اچھا علی بخش تم فوراً قصائی کے پاس جاؤ اور اُس سے کہو کہ ہمارے خاص مہمان آرہے ہیں ہمیں بہت اچھا چار سیر گوشت چاہیے۔ کھانا پکانے کے لیے فیضی بی بی آگئی ہے۔ تم نے آج اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرنا۔ جو چیزیں یہ ملنے لگے بازار سے لا دینا اور تمہیں جلد واپس آکر چائے کے لیے کچھ چیزیں بھی لانی ہیں کیونکہ مہمان چائے یہاں نہیں گئے۔ چائے تم بہت اچھی بناتے ہو، اس لیے میں فضلال کو تکلیف نہیں دوں گی۔“

چند خاص قسم کی مہمان بیٹھی ہوتی ہیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔“
 صغریٰ نے چائے لاکر میاں صاحب کے سامنے رکھ دی اور انھوں نے
 پوچھا۔ ”بیٹے! تم جانتی ہو مہمان کون ہیں۔“
 ”نہیں آبا جان! لیکن وہ بہت ہی اچھے لوگ ہیں۔ ان کی ایک بیٹی تو بالکل
 شہزادی معلوم ہوتی ہے۔“

”اچھا بیٹی! اب یوسف کو بھیج دو۔“
 صغریٰ چلی گئی اور ایک منٹ بعد یوسف کمرے میں داخل ہوا اور السلام علیکم
 کہہ کر ادب سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

میاں صاحب نے کہا۔ ”بیٹا! مجھے تم پر بھی غصہ آ رہا تھا کہ تم گھر میں کسی کو بتا کر
 نہیں گئے اور وہ تمہارا انکل کون تھا جس نے مجھے اور مجھ سے زیادہ عبدالکریم کے
 خاندان کو پریشان کیا ہے۔“

یوسف مسکرایا۔ ”آبا جان! وہ انسپکٹر عبدالعزیز صاحب تھے اور عبدالکریم
 صاحب بھی انہیں اچھی طرح جانتے ہیں مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ اسی خاندان سے
 تعلق رکھتے ہیں جن کی ایک بزرگ خاتون اور ایک بچی کے ساتھ ۱۹۴۲ء کے سیلاب
 کے دنوں میں نے کورسٹر سے امرتسر تک سفر کیا تھا۔ وہ صبح سویرے مجھے تلاش
 کرتے ہوئے آتے اور انھوں نے یہ بتایا کہ وہ معزز خاتون ان کے ہاں میرا انتظار
 کر رہی ہے۔ ہمیں فوراً اُن کے ساتھ جانا پڑا۔ تاکہ پر نکلے تو عبدالکریم کی بیٹی اور بیگم
 سے سامنا ہو گیا۔ وہ ہمیں کوٹھی دکھانے کے لیے لے جانا چاہتی تھیں۔ لیکن ہم نے
 یہی مناسب سمجھا کہ اُن سے معذرت کر لی جائے۔“

”بیٹا! یہ تم نے اچھا کیا۔ جس معزز خاتون کو تم نے ماں کہا تھا اُس کے لیے ہر
 بد و گرام منسوخ کیا جاسکتا تھا۔ لیکن کسی کو بتا کر گئے ہوتے نا۔“

آگئیں تو کل دعوت میں ہماری شرکت سے معذرت قبول کرنے کی بجائے یہ اصرار کریں گی کہ
 آپ بھی دعوت میں شریک ہوں۔“

صفیہ نے کہا۔ ”تو بہن! اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے۔ ہم بڑی خوشی
 سے جائیں گی آپ کے ساتھ۔ یوسف صاحب کہتے ہیں کہ صاحبزادی کو اپنی نئی موٹر کار
 دکھا کر چلانے کا شوق ہے۔ ہم جی بھر کر ان کا یہ شوق پورا کریں گے۔“

”نہیں بہن۔“ قدسیہ نے پریشان سی ہو کر کہا۔ ”میں فہمیدہ کو اُس بے وقوف
 کے ساتھ کبھی بیٹھنے نہ دوں گی۔“

وہ چائے پی رہے تھے کہ دوسرے کمرے سے عبدالرحیم نے نوکر کو آواز
 دی۔

قدسیہ شربت کا گلاس بھر کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میاں صاحب
 کا موڈ کچھ اچھا نہیں تھا، لیکن ٹھنڈے شربت کا گلاس پینے کے بعد انھوں نے
 کہا۔ ”قدسیہ تم سے اتنی غیر ذمہ داری کی توقع نہیں تھی۔ میں ساری زندگی اتنا پریشان نہیں
 ہوا۔ تم نے گھر میں کسی کو تو یہ بتا دیا ہوتا کہ کہاں جا رہی ہو۔“

قدسیہ چند ثانیے خاموشی سے اُس کی طرف دیکھتی رہی پھر وہ مسکرائی اور
 میاں صاحب کے سارے شکوے سکوڑے جاتے رہے۔

اچھا یہی بتا رو کہ وہ یوسف کے انکل صاحب کون تھے جن کے ساتھ تم تانگے
 پر سوار ہو کر نکل گئی تھیں اور وہ جو تمہیں کار پر لینے آتی تھی ایک دوسری کامنہ دیکھتے رہ
 گئیں۔“

”صغریٰ“ قدسیہ نے آواز دی۔ اپنے آبا کے لیے چائے لاؤ۔ آپ اطمینان
 سے چائے پیئیں۔ اُس انکل صاحب کو آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ بیٹھک میں

”اباجان ہم گھر سے کچھ دُور آچکے تھے اور ہمیں معلوم تھا کہ ان کے خاندان کے لوگ ہمارا انتظار کر رہے ہیں“

”عبدالعزیز صاحب تمہارے ساتھ نہیں آتے“

”اباجان! وہ کچھ مصروف تھے۔ انشاء اللہ آپ سے ملا کریں گے“

”بیٹا اپنی ماں سے پوچھو اُن کی خاطر تواضع کا بھی کوئی انتظام ہو رہا ہے کہ نہیں؟“

”اباجان بالکل تک وہ اُمی کے مہمان ہیں اور اُمی جان ان کا کھانا تیار کرنے کے

لیے ان کے پٹر صاحب کی باورچن کو بھی یہاں لے آئی ہیں۔

عبدالرحیم نے اُبٹھ کر اُسی کمرے میں عصر کی نماز ادا کی اور نوکر نے حقہ لاکر

سامنے رکھ دیا۔

قدسیہ جس نے فہیڈہ کا بازو پکڑ رکھا تھا صحن کی طرف سے نمودار ہوئی۔

اور اُس نے دروازے کے سامنے کھڑی ہو کر کہا: ”یوسف کے آبا۔ دیکھتے یہ کون ہے؟“

”انہوں نے جواب دیا: ”کیا یہ انس پٹر عبدالعزیز صاحب کی بیٹی ہے؟“

بیٹی نہیں۔ یہ بھتیجی ہے۔ بہت ہی لاڈلی۔ بہت ہی پیاری بھتیجی۔ اب آپ یہ

بتائیے کہ مجھے ایسے مہمانوں سے نظر پڑا کہ کسی اور طرف ایک منٹ کے لیے بھی توجہ

دینی چاہیے تھی۔“

بالکل نہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے گھر میں ایسے مہمان دیکھنے کے بعد انہیں

کھانے کی دعوت پر اصرار کرنے کی حماقت نہیں کرنی چاہیے تھی۔

”بیٹی اللہ تمہاری عمر دراز کرے۔ تمہیں دیکھ کر میں نے اپنی آنکھوں میں ٹھنڈک

محسوس کی ہے۔ قدسیہ نے کہا: ”مجھے اپنے مہمانوں کے ساتھ سیر کے لیے جانے کی اجازت ہے؟“

”میں نے کب کہا تھا کہ آپ کو اجازت لینے کی ضرورت ہے؟“

”یوسف بھی ہمارے ساتھ جاتے گا۔“

”ماں ہاں ضرور جائے۔“

”شاید ہمیں دیر بھی ہو جائے۔“

”لیکن مہمانوں کے آرام کا خیال تو رکھو گی نا۔ مجھے کچھ میٹھے خربوزے مل گئے تھے

اور میں سوچ رہا تھا کہ آج کوئی مہمان آجائے تو بہت اچھا ہوگا۔“

قدسیہ بولی: ”اب آپ کو یہ پریشانی تو نہیں ہوگی کہ کوٹھی والے آکر آپ کو

تنگ کریں گے۔“

”بھتیجی پریشانی کس بات کی۔ میں انہیں کہہ دوں گا کہ بیگم صاحبہ اپنے مہمانوں

کو چھوڑ کر گھر سے نہیں نکل سکتیں لیکن مہمان اتنے اچھے ہیں کہ وہ بھی ان کی دل شکنی

پسند نہیں کریں گے۔“

”وہ آکر یقیناً اصرار کریں گے کہ ہمارے مہمانوں کو بھی شریک ہونا چاہیے اور آپ

مہمانوں کی طرف سے بھی دعوت قبول کر لیجیے۔

عبدالعزیز صاحب سے ڈاکے کے واقعات سن کر مہمانوں کو ہم سے بہت دل چسپی

ہو گئی ہے۔“

”اچھا آؤ بیٹی“

فہیڈہ قدسیہ کے ساتھ بیٹھک میں چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد وہ کاریں بیٹھ کر

چڑیا گھر کا رخ کر رہے تھے۔

باب - ۲۲

چڑیا گھر پہنچتے ہی یوسف نے سب سے پہلے باہر کی دکانوں سے بھنے ہوئے چنے خریدے پھر ٹکیٹیں لیں اور اپنی والدہ اور مہمانوں کے ساتھ اندر چلا گیا۔ ابھی تک فہمیدہ سے براہ راست اُس کی کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ اُس نے صفیہ سے مخاطب ہو کر کہا: ”خالہ جان! چڑیا گھر کا پروگرام فہمیدہ کے لیے بنایا گیا ہے اس لیے یہاں سے آگے ہماری رہنمائی وہ کریں گی۔ اور ہمیں اُن کی پسند کی چیزیں دیکھنے پر اکتفا کرنا پڑے گا۔“

فہمیدہ نے کہا: ”نہیں جی میں بہت دیر کے بعد یہاں آئی ہوں اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ یہاں کون سے نئے جانور لاتے گئے ہیں۔ اس لیے رہنمائی آپ کو کرنی چاہیے۔“

کوئی بیس منٹ گھومنے کے بعد بلقیس نے کہا: ”بھئی ہماری عمر کی عورتیں تو اس گرمی میں چڑیا گھر نہیں پھرتی ہوتی عجیب لگتی ہوں گی۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم کمپیس چھاؤں میں بیٹھ جائیں اور یوسف صاحب فہمیدہ کو ان کی پسند کے جانور دکھا لائیں۔“

قدسیہ نے کہا: ”ٹھیک ہے بہن میں بھی کچھ تھکاوٹ محسوس کر رہی ہوں۔ یوسف تم جلدی سے چکر لگاؤ ہم اُس طرف چھاؤں میں بیٹھ کر تمہارا انتظار

کریں گی لیکن گرمی بہت ہے فہمیدہ بیٹی کو زیادہ تھکا نہ دینا۔“

وہ چل پڑے تو بلقیس نے کہا: ”آپ جی فہمیدہ اس لحاظ سے بڑی خوش نصیب ہے کہ اسے جو بھی دیکھتا ہے بڑا پیار کرتا ہے لیکن میں ایک بات بتا دوں اس کے متعلق کہ وہ اتنی نازک نہیں ہے۔“

چند جانوروں کے جنگلے دیکھنے کے بعد وہ اپنے ساتھیوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکے تھے اور یوسف پہلی بار بے تکلفی سے اس سے باتیں کر رہا تھا۔

”فہمیدہ صاحبہ اب آپ بتائیے کہ ہم کہاں سے شروع کریں دراصل میرا مقصد جانور دیکھنے سے زیادہ آپ سے باتیں کرنا تھا جو بظاہر مجھے ناممکن نظر آتا تھا صرف یہی نہیں میں آپ کو اس قدر قریب سے دیکھنا بھی تو ناممکن سمجھتا تھا۔“

فہمیدہ نے کہا: ”جی مجھے سب سے پہلے بھیڑیے کے جنگلے کے پاس لے چلیے۔“

”چلیے، وہیں چلتے ہیں۔ لیکن بھیڑیے میں آپ کو کوئی خاص دلچسپی بات نظر نہیں آئے گی۔ بس سمجھ لیجئے کہ وہ ایک طرح کا اینیمیشن کتا ہوتا ہے۔ اس کے چہرے کی درندگی ذرا زیادہ خوفناک ہوتی ہے۔ ایک خصوصیت اس کی یہ ہے کہ وہ جنگلے کے اندر عام طور پر اپنی بھوک کی وجہ سے بھاگتا ہوا نظر آتا ہے۔ آپ یہ بھوکا اور بے رحم جانور دیکھ کر کیا کریں گی۔“

فہمیدہ بولی: ”میں نے یہ جانور دیکھا ضرور ہوگا مگر مجھے یاد نہیں کہ وہ مروار پر آپ کی سرگزشت پڑھنے کے بعد میں اس جانور کو بہت اہمیت دیتی ہوں۔ میں اکثر سوچا کرتی تھی کہ یوسف صاحب کی داستان میں اگر ان بھیڑیوں کا قصہ نہ آتا تو نانی جان اور نسرین سے اُن کی واقفیت نہ ہوتی تاہم وہ اُن کے ساتھ سفر کرتے نہ وہ اپنا مسودہ بھولتے اور نہ میں اسے بار بار پڑھتی۔“

باتیں کرتے کرتے وہ بھیڑیے کے جنگلے کے قریب پہنچ گئے۔ فہمیدہ کہہ ہی

آپ نیل گاؤں اور بارہ سنگھوں کو بھی میرا ہاتھ چاٹتے دیکھیں گی۔ ہاتھی کے ساتھ تو میری بھی خاصی بے تکلفی ہے۔ سواری کریں گی آپ ہاتھی پر؟

فہمیدہ مسکراتی اور یوسف کو ایسا محسوس ہوا کہ نسوانی حسن و قار اطراف عالم سے سمٹ کر اُس کے چہرے پر جمع ہو رہا ہے۔ اگلے جنگلے پر اُس کی دیکھا دیکھی فہمیدہ بھی اپنے ہاتھ سے ہرنوں کو چنے کھلانے کی کوشش کرنے لگی لیکن جب کوئی ہرن دانوں کی طرف ہلکا تو وہ گھبرا کر ہاتھ باہر نکال لیتی نیل گائیں یوسف کو دیکھتے ہی اس کے پاس جمع ہو گئیں اُس نے لفافے سے چنوں کی مٹھی نکالی اور پورا ہاتھ جنگلے کے اندر کر دیا۔ ایک نیل گائے نے چند دانے منہ میں ڈالے تو یوسف نے مٹھی بند کر کے دوسری نیل گائے کے آگے کر دی اور پھر اس نے خالی ہاتھ کھول دیا اور دونوں اُسے چاٹنے لگیں۔

فہمیدہ نے پوچھا ”آپ کو بالکل خوف نہیں آتا کسی جانور سے؟“
”اُن جانوروں سے تو آپ کو بھی خوف نہیں آنا چاہیے۔ آپ کے ہاتھ اللہ نے ایسے بنائے ہیں کہ ان جانوروں میں سے کسی کا دماغ اگر بالکل جواب دے جاتے تو بھی وہ ان ہاتھوں کو نقصان پہنچانے کی جرأت نہیں کرے گا۔“

فہمیدہ نے مسکراتے ہوئے گردن جھکالی اور اپنے ہاتھ چادر کے اندر کرتے ہوئے کہا ”نہیں جناب! میں ان کی دماغی حالتوں کا معائنہ کرنے کے لیے اپنے ہاتھ خطرے میں نہیں ڈالوں گی۔ لیکن چلیے اب وہ ہمارا انتظار کر رہی ہوں گی! آپ کو دیکھنے سے قبل میرے دل میں ہزاروں سوال تھے۔ لاتعداد شکایات تھیں اور دل میں دعا کر رہی تھی کہ آپ سے باتیں کرنے کا موقع مل جائے۔ اب باتیں کرنے کا موقع ملا ہے تو صرف ایک شکایت ذہن میں رہ گئی ہے کہ آپ لا پتہ کیوں ہو گئے تھے؟ ہمارا پتہ اپنے سامان کے ساتھ بھول جانا کوئی معقول بہانہ نہیں ہو گا کیونکہ اگر آپ کو یہ احساس ہوتا کہ میری ننھی بہن اتنی پریشان ہوگی تو آپ فوراً ہمارا پتہ معلوم کر سکتے تھے۔ آپ کو نہ میں ہمارے

تھی۔“ یوسف صاحب! یہ جانور یقیناً خوفناک ہو گا لیکن میں اس سے نفرت نہیں کر سکتی۔“

یوسف نے پوچھا۔ ”فہمیدہ میری تحریر آپ کو واقعی پسند آتی تھی یا آپ میرا دل رکھنے کے لیے باتیں کر رہی ہیں؟“

”یوسف صاحب کاش ان دنوں جب میں رات کی تنہائی میں آپ کی دلچسپ تحریر پڑھا کرتی تھی میرے دے دیے تھے آپ کے کانوں تک پہنچ سکتے۔ آپ کے لگاؤں کے مناظر ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے ہوتے تھے۔ میں گندم کے لہلاتے کھیتوں میں گھبراہٹ کرتی تھی اور آپ کے ساتھ سرپٹ گھوڑے پر سواری کیا کرتی تھی میں آپ کے پُر ایسی درختوں کے درمیان بھی گھوما کرتی تھی۔ ایک دن نسرین نے مجھ سے کہا تھا۔ ”کاش آپا! تم نے بھاتی یوسف کو دیکھ لیا ہوتا۔“ اور میں نے اُسے جواب دیا تھا۔ ”میری بہن میں انہیں تم سے زیادہ دیکھ چکی ہوں۔“ وہ حیران ہو کر پوچھتی تھی ”کہاں؟“ میں نے جواب دیا تھا ”اس کتاب کے اندر، اور جب تم بڑی ہو جاؤ گی اور اس کتاب کو سمجھ سکو گی تو تمہیں یہ محسوس ہو گا کہ یوسف جو اس کتاب کے اندر ہے وہ تمہارے اُس بھاتی سے زیادہ خوب صورت ہے جس کے ساتھ تم نے سفر کیا تھا۔“ وہ ٹہلتے ہوئے کئی جنگلوں کے قریب گئے لیکن اس ماحول میں انہیں اپنے سوا ہر چیز غیر اہم معلوم ہوتی تھی۔ چنوں کا ایک لفافہ انھوں نے بندروں، پہاڑی بکروں بارہ سنگھوں اور نیل گاؤں کو کھلا دیا تھا۔ جب یوسف نے شتر مرغ کے جنگلے کے قریب جا کر دانوں کی ایک مٹھی بھر کر اس کے سامنے کر دی تو فہمیدہ نے گھبرا کر اُسے پیچھے کھینچتے ہوئے کہا۔ ”دیکھتے کہیں کاٹ لے گا۔ آپ اتنے بڑے قد اور بے تحاشا لمبی گردن اور اس قدر چھوٹے سروا لے جانور کا اعتبار کیسے کر سکتے ہیں۔“

یوسف نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ان تمام باتوں کے باوجود یہ جانور میرے دوست ہیں۔“

تین انسان مجھے جانتے ہیں ایک میری امی جان جن کی بدولت چاروں اطراف سے حوصلہ شکنی کے باوجود میری خود اعتمادی قائم رہی ہے اور دوسری آپ اور آپ کی چھوٹی بہن نسرين جن کا شکریہ ادا کرنے کے لیے مجھے موزوں الفاظ نہیں ملتے۔

یوسف صاحب! امی جان بھی آپ کا مسودہ پڑھ چکی ہیں اس لیے انہیں بھی اپنے

مداحوں میں شامل کر سکتے ہیں آپ مجھے گاؤں کا ماحول اور اسکے قدرتی مناظر میرے دل پر نقش ہو چکے ہیں۔ میں آپ کے ”پردیسی درختوں“ کے متعلق اکثر سوچا کرتی ہوں کیا یہ ممکن ہے کہ کسی دن وہاں جا کر انہیں دیکھ سکوں؟

”فہمیدہ آج مجھے کوئی بات ناممکن محسوس نہیں ہوتی۔ مجھے تو یہ بھی بعید از اسکان محسوس نہیں ہوتا کہ واپسی پر آپ ہمارے گاؤں کے ریلوے اسٹیشن پر اتر پڑیں اور پھر چند دن ہمارے ہاں مہمان رہیں۔ امی جان آپ کی آمد کی اطلاع ملنے سے پہلے ہی دہاں پہنچ جائیں گی۔ پچھلے دنوں میں نے ابا جان سے کہا تھا کہ لاہور کی آب و ہوا کا امی جان پر اچھا اثر نہیں پڑ رہا اور یہ فیصلہ ہوا تھا کہ سال میں دو تین بار وہ چند ہفتے گاؤں چلی جایا کریں گی۔“

فہمیدہ نے کہا: ”مجھے بہت سی باتیں گاڑی پر سوار ہونے کے بعد یاد آئیں گی اور آپ بھی شاید ہمیں رخصت کرنے کے بعد یہ محسوس کریں کہ کچھ ضروری باتیں رہ گئی ہیں۔ لیکن ایک بات جس کے بعد کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہی یہ ہے کہ آج سے ہمیں ایک دوسرے کے لیے دعاؤں کی ضرورت ہے اور جس طرح میں اچانک اپنے راستے سے ہٹ کر آپ کے پاس آ گئی ہوں اسی طرح اگر کسی دن آپ ہمارے پاس پہنچ جائیں تو ہمارے گھر میں آپ کو دیکھ کر اس قدر خوشی ہوگی جس طرح مجھے دیکھ کر آپ کی امی کو ہوئی تھی۔“

رشتہ داروں سے رابطہ پیدا کر سکتے تھے۔ آپ کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ میرے چھوٹے چچا میڈیکل کالج سے فارغ ہو کر انگلستان گئے ہیں۔ آپ میڈیکل کالج جا کر ساری معلومات حاصل کر سکتے ہیں وہاں آپ کو کئی ایسے استاد اور طالب علم جانتے جو ہمارے متعلق بتا سکتے تھے۔“

یوسف مسکرایا: اللہ کے بعض انعامات ان راستوں سے آتے ہیں جن کے متعلق ہم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے۔ دیکھتے ہیں گاڑی میں اپنا ایک تھیلہ بھول گیا تھا اور قدرت نے نسرين کے ذمے یہ کام لگایا تھا کہ اس تھیلے سے میرا مسودہ اُس ذہین لڑکی کے پاس پہنچا دے جو اس وقت میرے سامنے کھڑی ہے۔ میں نسرين کو بھولا نہیں تھا، لیکن اسے دوبارہ دیکھنے کا معاملہ میں نے اللہ کو سونپ دیا تھا۔ مجھے یہ بھی اطمینان تھا کہ اپنے دوسرے کاموں سے فارغ ہو کر مجھے نسرين کی نانی اور باقی عزیزوں کو تلاش کرنے میں مشکل پیش نہیں آئے گی۔ لیکن میرے طالب علمی کے دور سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اب دیکھتے تھوڑی سی پریشانی کے بعد مجھے کتنے انعام ملے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذہن میں ڈالا اور آپ نے خط لکھ دیا اور مجھے یہ معلوم ہوا کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو مستقبل کے ایک ایسے ناول نگار سے دل چسپی رکھتے ہیں جس کی چاروں اطراف سے حوصلہ شکنی ہوتی۔“

فہمیدہ نے کہا: ”یوسف صاحب میں صرف دلچسپی ہی نہیں رکھتی بلکہ مجھے یقین ہے کہ ادب کے جس میدان میں آپ قدم رکھنا چاہتے ہیں وہاں آپ کا کوئی حریف نہیں ہوگا۔“

”فہمیدہ تم خوش قسمت ہو کہ تمہاری چھوٹی سی بہن تمہارے متعلق اتنا کچھ جانتی تھی اور تم پر اتنا فخر کرتی تھی کہ میں سراسر ایک اجنبی ہونے کے باوجود اس کی باتوں سے متاثر ہوتے بغیر نہ رہ سکا لیکن میری حالت یہ ہے کہ اب تک اس دنیا میں صرف

تھی کہ لڑکا منگنی کے دو ماہ بعد فوج میں بھرتی ہو گیا تھا۔ اور اس کے بعد مدت سے لاپتہ ہے؟“

امینہ اور دوسری عبرت جھجکتی ہوئی آگے بڑھیں۔ قدسیہ نے رسمی علیک سلیک کے بعد کہا بھتی اب نماز کا وقت ہو چکا ہے۔ ہم پہلے لارنس گارڈن کے کسی گوشے میں نماز پڑھ لیتی ہیں اس کے بعد کسی جگہ آرام سے باتیں کریں گی۔ بیٹی! آپ ہمارے گھر سے ہو کر آتی ہیں؟“

”جی ہاں! جب ہمارے نوکر نے گھر جا کر یہ بتایا کہ آپ کے مہمان اُس انسپکٹر صاحب کے گھر آنے سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے ڈاکوؤں کے خلاف ہماری مدد کی تھی تو اباجی نے اُسی وقت ڈرائیور کو حکم دیا تم ابھی میاں صاحب کے گھر جا کر پتہ کرو کہ انسپکٹر صاحب کس جگہ رہتے ہیں پھر میں خود جا کر اُن کے تمام عزیزوں کو دعوت دوں گا۔“

میں نے کہا۔ ”میں ڈرائیور کے ساتھ جاتی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ جب میں امی جان اور آپ کی طرف سے دعوت دوں گی تو وہ انکار نہیں کریں گے۔ وہ یوں بھی بہت تھکے ہوئے تھے اور امی جان بہت مصروف تھیں۔ اس لیے انھوں نے چراغ بی بی کو میرے ساتھ بھیج دیا۔ یہ اب چند ماہ سے یہاں رہتی ہے اسے آپ کے مہمانوں سے ملنے کا بہت شوق تھا۔“

چراغ بی بی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُن کی طرف دیکھ رہی تھی اور فہمیدہ اُس کی نگاہوں سے اتنی الجھن محسوس ہوتی تھی کہ وہ کبھی کسی طرف دیکھنے لگ جاتی اور کبھی اپنی چادر کھینچ کر ذرا اور نیچے کر لیتی۔ فہمیدہ اس کی ماں چچی اور قدسیہ نے ایک جگہ گھاس پر نماز ادا کی۔ یوسف ان سے کچھ دُور نماز پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ امینہ اور چراغ بی بی ادھر ادھر ٹہلنے لگیں اور

بلقیس نے اُن کی طرف دیکھتے ہی قدسیہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”دیکھو بہن! وہ کتنے اطمینان سے آرہے ہیں۔ آپ کو بلا وجہ فہمیدہ کے کھو جانے کا خوف تھا۔ اب اُٹھئے یہاں سے نکلیں۔ نماز ہم لارنس گارڈن میں پڑھیں گے۔“

تھوڑی دیر کے بعد وہ چڑیا گھر سے نکل رہے تھے کہ انھیں گیٹ سے باہر امینہ کے ساتھ ایک عورت دکھائی دی۔

یوسف نے کہا ”امی جان امینہ یہاں بھی پہنچ گئی؟“
قدسیہ نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”بیٹا! وہ ہمارے گھر گئے ہوں گے اور تمہارے ابا جان نے کہہ دیا ہو گا کہ ہم چڑیا گھر کی طرف گئے ہیں اس لیے وہ اس طرف آگئے ہیں۔ آخر امینہ ہمارے مہمانوں کو کار دکھائے بغیر کیسے رہ سکتی ہے؟“
بلقیس نے کہا۔ ”جی وہ دعوت پر زور دینے کے لیے آئی ہوں گی، مجھے اُن سے بات چیت دیکھنے اور وہ جو ساتھ ہے وہ اُس کی کون ہے؟“

یوسف نے جواب دیا وہ امینہ کے سوتیلے ماموں قائم دین کی لڑکی ہے جو امرتسر میں عبدالکریم صاحب کے اینٹوں کے تین بھٹوں کی نگرانی کرتا تھا اور کوئی تین سال سے ہمارے گاؤں کے پاس عبدالکریم کی زمین کا انتظام سنبھال رہے ہیں۔ اس نے چند ایکڑ زمین اپنے لیے بھی خرید لی ہے۔

قدسیہ بولی۔ بھتی اس کا نام قائم دین ہے؟
یوسف نے ہنس کر کہا۔ ”جی نہیں اس کا نام چراغ بی بی ہے، قائم دین اُس کا باپ ہے۔“

قدسیہ بولی۔ ”ارے میں چراغ بی بی کو پہچان ہی نہیں سکی گاؤں میں تو یہ کئی بار ہمارے گھر آچکی ہے۔ پھر اس کی شادی ہو گئی تو میں نے نہیں دیکھا۔ ایک خبر سنی

”دیکھو چراغ بی بی تم میری وکالت نہ کیا کرو۔ امینہ نے غصے سے اُس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”خاص کر ان لوگوں کے سامنے جو تمہیں پڑھے لکھے نظر آئیں جنہیں دیکھنے سے تمہیں احساس ہو جائے کہ یہ مہربان تم سے زیادہ جانتے ہیں“

چراغ بی بی اگرچہ عمر میں امینہ سے چار سال بڑی تھی تاہم وہ یہ سمجھ کر خاموش رہی کہ عبدالکریم کے سامنے اُس کی حیثیت ایک رشتے دار کی بجائے ایک ملازم کی ہے۔ بلقیس نے کہا: ”بیٹی جہاں تک تمہاری دعوت کا تعلق ہے اُس کے متعلق

تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ انشاء اللہ ہم سب آئیں گے“

”شکریہ چچی جان کل تین موٹریں یوسف صاحب کے مکان پر پہنچ جائیں گی۔ ایک آپ انسپکٹر صاحب کے مکان پر پہنچادیں باقی دو موٹروں پر آپ سب آجائیں“

بلقیس نے کہا بیٹی ہمارا پروگرام تو یہ تھا کہ ہم علی الصبح اٹھیں اور آپ کی دعوت پر جانے سے پہلے آپ کی نئی کار پر شاہی مسجد، قلعہ اور جہانگیر کا مقبرہ دیکھ آئیں، لیکن میرا خیال ہے کہ آپ تھک جائیں گی“

”نہیں جی! مجھے قطعاً تھکاوٹ محسوس نہیں ہوگی۔ بلکہ اس بات کی خوشی ہوگی کہ میں فہمیدہ بہن سے کچھ دیر باتیں کر سکوں گی“

”لیکن بھئی۔ آپ نماز کے وقت اٹھیں گی تو سورج نکلنے سے پہلے ہمارے گھر پہنچ سکیں گی“

”خالہ جان! اُس نے جواب دیا: ”انشاء اللہ میں سورج نکلنے سے پہلے آپ کے پاس پہنچ جاؤں گی۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔ جلد آپ چراغ بی بی۔“

وہ السلام علیکم کہہ کر تیزی سے کار کی طرف مڑی۔

اُن کے روانہ ہوتے ہی یوسف نے کہا: ”چچی جان یہ دکھاوے کی عادت گھر

پھر ان کی پریشانی میں اضافہ کرنے کے لیے دونوں موٹروں کے ڈرائیور نیچے اتر کر ایک جگہ نماز میں مصروف ہو گئے۔ نماز سے فارغ ہو کر عورتوں نے ٹھلنا شروع کر دیا۔ امینہ سخت پریشانی کی حالت میں ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

بلقیس نے ایک لمبا چکر لگانے کے بعد ان کے قریب سے گزرتے ہوئے کہا۔

”بھئی تم سیر نہیں کر دو گی۔؟“

”جی اس وقت“

”بیٹی ابھی تو ہوا کچھ خوشگوار ہوتی ہے! اس عمر میں آپ لوگوں کو سورج نکلنے سے پہلے جاں پہنچنا چاہیے اور دوڑ کر پہاڑی کی چوٹی پر جا کر لمبے لمبے سانس لینے چاہئیں کتنے ہیں کہ آگسٹن سے مارہ خون پیدا ہوتا ہے اور بیمار چہرے سُرخ نظر آنے لگتے ہیں“

قدسیہ نے کہا: ”بہن آپ نے دن کی روشنی میں نہیں دیکھا۔ امینہ کا چہرہ ماشا اللہ بہت سُرخ ہے“

”اری بہن۔ دو منٹ دھوپ میں گھڑی رہنے کے بعد سب کے چہرے سُرخ ہو جاتے ہیں“

”نہیں بہن میرا مطلب یہ ہے کہ امینہ کافی صحت مند لڑکی ہے“

چراغ بی بی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ بہر حال وہ بولی: ”آپا جی! امینہ کا رنگ بھی ٹھیک ہے اور اس کی صحت بھی بہت اچھی ہے لے اللہ نے ہر نعمت دی ہے۔ پانی مانگے تو پھلوں کا رس اور دودھ ملتا ہے“

”دیکھو بہن“ صفیہ نے کہا: ”دودھ اور پھلوں کی طرح خالی پانی بھی ایک نعمت ہے اگر کوئی پانی چھوڑ دے تو بھی وہ بیمار ہو جاتا ہے۔ امینہ ایک سمجھ دار بچی ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ پانی کی جگہ کوئی قیمتی چیز تلاش نہیں کرے گی۔“

تھیں۔ لیکن اپنے دل میں یہ عہد کر چکا ہوں کہ میں اُن کی ہر خواہش پوری کر دوں گا۔ اگر انہوں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ہر وہ لڑکی جو میری زندگی کے کٹھن راستوں میں میرا ساتھ دے سکتی ہے اور میں اسے زندگی کی خوشیاں دے سکتا ہوں تو میں رُوتے زمین کی تمام نعمتیں اس کے قدموں میں ڈھیر کر دوں گا۔ اگر تم اجازت دو تو میں اس وقت بھی تمہاری امی کے کان میں ہر بات کہہ سکتا ہوں کہ میں ایک سیدھا سادھا دیہاتی لڑکا ہوں جس نے کوئی قابلِ فخر کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔ کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کی۔ لیکن اگر میں نصف دنیا کا مالک ہوتا تو اسی وقت اپنے اور تمہارے تمام عزیزوں کو یہاں جمع کرتا اور تمہارے والدین کے سامنے دوزانو ہو کر یہ اعلان کرتا کہ میں فہمیدہ کے لیے سب کچھ چھوڑنے کے لیے تیار ہوں۔ چلتے وہ سب پریشان ہو رہے ہوں گے۔“

فہمیدہ خاموشی سے اُس کے ساتھ چلی پڑی۔ چند قدم چل کر وہ رُک گئی:

”ٹھہریے! میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔“

”پوچھئے۔“ یوسف نے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

فہمیدہ بولی: ”کبھی آپ ان باتوں پر ہنسنا تو نہیں کریں گے؟“

”کون سی باتوں پر؟“

”یہی جو آج آپ ابھی کہہ رہے تھے۔“

یوسف کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن عورتوں مردوں اور بچوں کی ایک ٹولی باتیں کرتی ہوئی نمودار ہوئی تو وہ خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد فہمیدہ نے کہا:

”چلتے ہم اس طرف سے چکر لگا کر چلتے ہیں۔“

وہ ایک دوسرے راستے سے نیچے اترنے لگے تھوڑی دیر بعد یوسف کہنے لگا:

”فہمیدہ بظاہر یہ بات ایک مذاق معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ میں نے تمہیں آج ہی پہلی بار دیکھا اور چند گھنٹے بعد آج ہی میں نے وہ بات کہہ دی ہے جس کے لیے

کے ماحول کا نتیجہ ہے ورنہ امیدہ طبعاً ایک اچھی لڑکی ہے۔“

”چلتے پہاڑی پر جا کر چاند نکلتا دیکھتے ہیں۔ اب ہوا بہت خوشگوار ہو گئی ہے۔“

تھوڑی دیر بعد وہ آہستہ آہستہ پہاڑی پر چڑھ رہے تھے۔ یوسف اور فہمیدہ کی رفتار ذرا تیز تھی اور وہ کچھ دُور آگے نکل گئے تھے۔

بلقیس نے ایک جگہ رُکتے ہوئے کہا: ”بھئی میں تھک گئی ہوں۔ تھوڑی دیر سانس لے لو۔“

وہ ایک جگہ لکڑی کے بیچ پر بیٹھ گئیں۔ یوسف فہمیدہ کے ساتھ چوٹی پر پہنچا اور کچھ دیر چھوٹے سے میدان میں ٹہلنے کے بعد فہمیدہ کو ایک بیچ پر بٹھاتے ہوئے بولا: ”فہمیدہ تھوڑی دیر خاموشی سے اسی سمت دیکھتی رہو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمہارا چہرہ چاند سے زیادہ تابناک ہے۔“

فہمیدہ نے سر جھکاتے ہوئے کہا: ”میرا خیال یہ تھا کہ آپ عام شاعروں جیسی بات نہیں کریں گے۔“

”فہمیدہ میں انتہائی ندامت کے ساتھ اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ آئندہ میں آپ کو کبھی نہیں بتاؤں گا کہ آپ کیسی ہیں۔ دیکھو ایک بچہ چاند کی طرف دیکھ کر خوش بھی ہوتا ہے اور اُچھل اُچھل کر اُسے پکڑنے کی کوشش ہی کرتا ہے پھر کوئی چوٹ لگ جانے کی وجہ سے وہ روتا بھی ہے لیکن تم مجھے ایسے بچے کے کھیل کھیلتے نہیں دیکھو گی۔ آج تمہاری پہلی جھلک دیکھنے کے بعد میں زندگی کے سفر کی وہ منازل اور راستے دیکھ رہا تھا جو میرے تصور میں نہیں تھے۔ کیا تم نے بھی پہلی ملاقات میں میری اُمی جان کے طرزِ عمل سے یہ محسوس نہیں کیا کہ تم ان کی زندگی کے حسین ترین خوابوں کی تعبیر ہو۔ اگر کبھی فرصت ملی تو تمہیں یہ سمجھا سکوں گا کہ وہ اس قدر جذبات میں کیوں آگئیں

مدتوں سوچا جاتا ہے لیکن میں نے تمہاری پہلی جھلک دیکھنے اور پہلی بار تمہاری آواز سننے کے بعد یہ محسوس کیا تھا کہ میں برسوں سے تمہیں جانتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تم نے بھی میری باتیں سن کر یہ محسوس نہیں کیا ہوگا کہ ایک اجنبی تمہارے سامنے گستاخی کر رہا ہے۔

”آپ میرے لیے اجنبی نہیں ہیں۔“

”شکریہ اب چلیے۔“

چند منٹ کے بعد وہ اُس جگہ پہنچ چکے تھے جہاں صفیہ بلقیس اور قدسیہ بیٹھی ہوئی تھیں وہ انھیں دیکھتے ہی اُٹھ کر ساتھ چل پڑیں اور تھوڑی دیر بعد وہ موٹر میں بیٹھ کر روانہ ہو چکے تھے۔ جب وہ گھر پہنچے تو عبدالعزیز اور مسز احمد دُعا موجود تھے۔ معلوم ہوا کہ مسز احمد نے مغرب کی نماز کے بعد اچانک گھر میں آرام کرنے کا ارادہ بدل دیا تھا اور وہ عبدالعزیز کے ساتھ تانگے پر یوسف کے گھر کو روانہ ہو گئی تھیں جو کوئی آدھ گھنٹے پہلے یہاں پہنچے تھے۔ میان عبدالرحیم نے جس گرم جوشی سے عبدالعزیز کا خیر مقدم کیا اور پھر جس طرح انھیں باتوں میں مصروف رکھا اُس سے انھیں نصف گھنٹہ محسوس نہ ہوا۔ لیکن مسز احمد جنہیں بچوں کے ساتھ یہ وقت گزارنا پڑا سخت پریشان تھیں۔

”کیسے بے وقوف ہیں یہ لوگ یہ سیر کا کون سا وقت ہے؟“ وہ بار بار کہہ رہی تھی لیکن جب یوسف نے آکر ماں جی السلام علیکم کیا تو ان کے سارے گلے جاتے رہے اور اُس نے کہا: ”بیٹا میں نے سخت غلطی کی جو تمہارے ساتھ نہیں آئی تھی۔ عبدالعزیز کام کیلئے چلے گئے تھے اور شام تک غائب رہے۔ فضلاء بی بی اور باقی سب یہاں آگئے تھے اور نوکر ایسا تھا کہ اُس کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔“

تھوڑی دیر بعد یوسف اور اُن کے والد میاں عبدالعزیز کے ساتھ خواتین اور

بچے علیحدہ علیحدہ کمروں میں کھانا کھا رہے تھے۔

کھانا ختم کرنے کے بعد عبدالعزیز اگلی دوپہر عبدالکریم کی دعوت میں شرکت کا وعدہ کرنے کے بعد بلقیس کے ساتھ واپس چلا گیا اور صفیہ، فہمیدہ اور اس کی نانی وہیں ٹھہر گئیں۔

عشاء کی نماز کے بعد وہ بالا خانے کی چھت پر لیٹ گئیں اور مسز احمد نے چند منٹ قدسیہ کے ساتھ باتیں کرنے کے بعد کہا: ”بیٹی یوسف کہاں غائب ہو گیا ہے؟“

”جی وہ مسجد سے نماز پڑھ کر آہی رہے ہوں گے۔“

”اچھا تو بیٹی! نوکر سے کہو یہاں اُس کے لیے کُرسی رکھ دے اور اُسے آتے ہی میرے پاس لے آئے۔ میں اُس سے بہت کچھ سننا چاہتی ہوں۔“

فہمیدہ بولی: ”نانی جان۔ میں بھی آپ کی باتیں سن سکتی ہوں۔“

قدسیہ نے اُٹھتے ہوئے کہا: ”بیٹی ہم سب ان کی باتیں سنیں گے۔ میں سب کے لیے کرسیاں بچھتی ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد یوسف اوپر آیا اور مسز احمد کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

”ماں جی آپ کا سردبا دوں۔“

”نہیں بیٹا۔ یہ تمہیں کس نے بتایا کہ میرے سر میں درد ہوتا ہے؟“

”ماں جی۔ سردرو کے لیے تو نہیں دیا جاتا۔ میں نے ایک دن نسرین کو آپ کا سردباتے دیکھا تھا۔“

”ارے بیٹا! تم نسرین نہیں ہو، یہاں بیٹھ جاؤ اور مجھے ڈاکوئل کا سارا قصہ سناؤ۔“

صفیہ نے کہا: ”ماں جی ہم نے وہ لڑکی بھی دیکھی ہے جس کا گھر لوٹنے وہ ڈاکو آئے تھے۔“

اور ان کی گرفتاری کے واقعات بیان کرنا شروع کر دیئے جب وہ سیٹھ دینا ناتھ کا ذکر کر رہا تھا تو وہ بات بات پر قہقہے لگا رہی تھیں۔

مسز احمد کہہ رہی تھی۔ "بیٹا میں بلاوجہ تمہاری زبان سے یہ باتیں سننے کے لیے بے چین نہ تھی اور کوئی اس قدر اطمینان سے باتیں کرتا بھی تو نہیں۔ لیکن ایک بات پر مجھے بار بار افسوس آتا ہے۔"

"ماں جی! وہ بات کیا ہے؟"

"بیٹا وہ بات یہ ہے کہ اس وقت نسرین یہاں نہیں ہے ورنہ وہ خوشی سے دیوانی ہو جاتی۔"

صفیہ نے کہا۔ "اپنی زندگی کے ایسے تمام دلچسپ واقعات آپ کو لکھ چھوڑنے چاہئیں جو مسودہ آپ وہاں چھوڑ آئے تھے اُسے پڑھنے کے بعد میں نے غصہ کس کیا تھا کہ آپ جو باتیں لکھیں گے انھیں ہر عمر کے لوگ پسند کریں گے۔"

"خالہ جان آپ میرے لیے دعا کیا کریں کہ میں اپنے تمام فرائض پورے کر سکوں میں اپنے دل کی گہرائیوں میں دبی ہوئی ان گنت آوازیں لوگوں کے کانوں تک پہنچا سکوں۔"

"ماں جی آپ بھی میرے لیے دعا کریں کہ میں اپنے بزرگوں کی بلند توقعات پوری کر سکوں اور ماں جی وہ کون سی دعا ہے جو آپ نے میرے لیے نہیں کی ہوگی۔ اُن بے شمار دعاؤں میں سے جو آپ صبح و شام دہرایا کرتی ہیں اس چھوٹی سی ایک اور دعا کا اضافہ کر لیجئے کہ میں ان پاکباز لوگوں کو بھلیس نہ پہنچاؤں جو میرے خلوص پر اعتماد کرتے ہیں اور میری اُن باتوں پر بھی یقین کر لیتے ہیں جو آج دوسروں کو مضحکہ خیز نظر آتی ہیں۔"

وہ اٹھا اور فہمیدہ نے جو اُس کی ماں کے ساتھ دائیں ہاتھ سمٹ کر بیٹھی ہوئی تھی ایسا محسوس کیا کہ اس کے قدم قدامت میں اچانک اضافہ ہو گیا ہے۔ تھوڑی دیر

"کہاں دیکھا تم نے اُس کو؟"

"وہیں چڑیا گھر میں۔ امی جان۔"

"اری! چڑیا گھر میں وہ کیا کرتی تھی؟"

"امی جان! وہ یہاں کل کے لیے دعوت دینے آئی تھی۔ جب یہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ ہم چڑیا گھر کی طرف گئے ہیں تو اپنی کار بھگا کر وہاں پہنچ گئی اور یہ وعدہ لے کر گئی تھی کہ ہم سب ان کی دعوت میں شریک ہوں گی اور صبح وہ ہمیں اپنی کاریر لاہور کی سیر کرنے کے لیے بھی آئے گی۔"

مسز احمد نے کچھ سوچ کر کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ مجھے کل اُس کی دعوت میں شریک ہونا پڑے گا۔ اور صبح سیر کے لیے بھی اُس کے ساتھ جانا پڑے گا۔ کیوں بیٹا! یوسف! وہ کار اچھی طرح چلانا جانتی ہے۔"

"ماں جی! خطرے کی کوئی بات نہیں۔ میں اسے کہہ دوں گا کہ اگر چچا عبدالعزیز صاحب کے عزیزوں میں سے کسی کو شیش بھی آگئی تو تمہاری کم از کم سزا یہ ہوگی کہ ڈرائیونگ لائسنس سے محروم ہو جاؤ گی۔"

"اچھا بیٹا۔ اب شروع کرو وہ ڈاکوؤں کا قصہ۔ پہلے یہ بتاؤ کہ یہ واقعہ کب ہوا تھا؟"

"ماں جی۔ گھر پہنچنے سے چند دن بعد۔ میں اس قسم کے کاموں میں مصروف ہو گیا تھا۔ عبدالعزیز صاحب اس سے کچھ عرصہ پہلے کہیں سے تبدیل ہو کر ہمارے ضلع میں آچکے تھے، لیکن مجھے قطعاً یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ نسرین کے چچا ہیں یا آپ سے ان کا کوئی رشتہ ہے۔"

"اچھا بیٹا۔ اب وہ قصہ شروع کرو۔"

یوسف نے پوری تفصیل کے ساتھ ڈاکوؤں کے متعلق قبل از وقت اطلاع ملنے

”اچھا پھر آپ سب امینہ کے ساتھ موٹر میں بیٹھ جائیں میں ایک منٹ میں آتی ہوں۔ لیکن بیٹی امینہ میز پر ایک بات اچھی طرح سن لو تم نے موٹر بہت احتیاط سے چلائی ہے۔“

قدسیہ یہ کہہ کر بیٹھک میں چلی گئی جہاں میاں عبدالرحیم اور یوسف ناشتہ سے فارغ ہو کر باتیں کر رہے تھے اُس نے کہا۔ ”یوسف! تم نے مہمانوں کے ساتھ جانا ہے؟“

”امی جان! یوسف نے احتجاج کیا۔ ”امینہ اپنے ڈرائیور کو ساتھ نہیں لائی اس لیے میں اس کے ساتھ نہیں بیٹھوں گا۔“

”بیٹا وہ ڈرائیور کو اس لیے ساتھ نہیں لائی کہ ہم میں سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ساتھ لے جا سکے۔ اب میں اس بات کا ذمہ لیتی ہوں کہ تمہیں اُس کے ساتھ نہیں بیٹھنا پڑے گا۔ اٹھو تیاری کرو۔ صغریٰ ہمارے ساتھ جائے گی۔“

یوسف اُٹھ کر چلا گیا تو قدسیہ نے اپنے شوہر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”ایسے مہمان بار بار نہیں آتے۔“

”مجھے معلوم ہے کہ وہ عام مہمان نہیں ہیں۔ اگر مجھ سے کوئی کام ہے تو آپ کو کسی تمہید کی ضرورت نہیں۔“

قدسیہ نے کہا۔ ”ایسے موقعوں کے لیے میں نے کپڑوں کے چند جوڑے منجھال کر رکھے ہوئے ہیں ان میں سے ایک آج مسز احمد اور دوسرا صفیہ کو پیش کیا جائے گا لیکن گھر میں کوئی تحفہ ایسا نہیں جو فہمیدہ کو پیش کیا جاسکے۔ فہمیدہ کی ایک چھوٹی سی بہن ہے جسے میں کچھ بھیجنا چاہتی ہوں۔ اس لیے آپ انارکلی کے کسی بہترین دکاندار کے پاس جائیں اور اُس کے پاس جو سب سے اچھا کپڑا ہو اُس کے دو سوٹ خرید لائیں۔ مجھے یقین ہے کہ فہمیدہ کو دیکھنے کے بعد آپ اُس کے لباس کے انتخاب میں غلطی

بعد وہ اپنے بستر پر لیٹی ہوئی دل میں کہہ رہی تھی۔
”یوسف تمہیں کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے تمہیں دیکھنے سے پہلے بھی یقین تھا کہ تم کسی کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتے۔“

○
قدسیہ اپنے مہمانوں کے ساتھ ناشتہ کر رہی تھی کہ باہر موٹر کار کا مارن سنائی دیا۔ اُس نے اپنی کمر بٹنی سے کہا۔ بیٹی جا کر دیکھو اگر امینہ ہے تو اسے یہیں لے آؤ۔ صغریٰ اُٹھ کر سیل پر پہن رہی تھی کہ یوسف کی آواز سنائی دی۔
”آپ سیدھی اندر چلی جائیں۔“

اس کے ساتھ ہی تیز تیز قدموں کی آہٹ سنائی دی اور چند ثانیے بعد امینہ اُن کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے ہلکے بنفشی رنگ کا ریشمی لباس پہن رکھا تھا۔
”دیکھیے میں اپنے دوسرے کے مطابق پہن گئی ہوں اور آپ نے ابھی تک ناشتہ بھی نہیں کیا۔“

صفیہ مسز احمد سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”امی جان یہ امینہ ہے۔“
امینہ نے السلام علیکم کہہ کر فہمیدہ پر جو اپنی تانی کے ساتھ بیٹھی تھی نگاہیں گھاڑ دیں۔ وہ عام گھریلو لباس میں بھی ایک شہزادی معلوم ہوتی تھی۔ قدسیہ نے کہا۔
”بیٹی بیٹھ جاؤ اور کچھ کھا لو ہم ابھی تیار ہو جائیں گی۔“
”شکریہ خالہ۔ میں پورا ناشتہ کر کے آئی ہوں۔“

”اچھا تو تم بیٹھ کر بہن صفیہ کی امی سے باتیں کرو۔ انہیں تم سے ملنے کا بڑا شوق تھا۔ فہمیدہ بیٹی تم اُٹھ کر جلدی سے کپڑے بدل لو۔“
فہمیدہ بولی۔ ”خالہ جان میرے کپڑے ٹھیک نہیں کھانے پر جاتے وقت میں دوسرا جوڑا پہن لوں گی۔“

سازش کر رہے ہوں یا

”اُسے تیز رفتاری سے روکنے کا گرجھے اچھی طرح آتا ہے۔ اسے راستے میں ایک دوبارہ یاد دلانا پڑے گا کہ عبدالعزیز صاحب آپ کے چچا ہیں اور اُس کی ڈرائیونگ کی کسی غلطی سے اگر ان کی لاڈلی بھتیجی کو ہلکی سی خراش آگئی تو یہ خوب صورت موٹر دوبارہ سڑک پر نہیں آسکے گی“

”چلتے“

یوسف نے صفیہ کو ڈرائیور کی سیٹ کے ساتھ بٹھا دیا اور اس کے ساتھ خود بیٹھ گیا اور باقی کچھ سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ جب کار اسٹارٹ ہوئی تو مسز احمد نے کہا۔

”ارے بھئی! یہ سب تم سے خوفزدہ تھے۔ ذرا احتیاط سے چلانا“

”جی آپ بالکل فکر نہ کریں“

”بیٹی۔ مجھے سچ بتادو۔ آج تک تم نے کتنے ایکسیڈنٹ کیے ہیں“

امینہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور اس نے بے خیالی میں کار کی رفتار تیز کر دی۔

مسز احمد چلاتیں۔ ”ارے بیٹا رو کو اسے“

امینہ نے کار کی رفتار کم کر دی اور یوسف نے اُس کی دل جوئی کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”ماں جی! گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ امینہ نے آج تک کوئی ایکسیڈنٹ نہیں کیا ان کا پاؤں ایسے وقت میں ایکسیلیٹر پر آگیا تھا جب ان کا خیال کہیں اور تھا“

صفیہ نے کہا۔ ”ماں جی غلطی کس سے نہیں ہوتی۔ اب دیکھیے ناکس صفائی سے چلا رہی ہیں یہ موٹر“

”ماں بیٹی۔ یہ ٹھیک چلاتی ہے لیکن ہمیں یہ دعا ضرور مانگتے رہنا چاہیے کہ جب

نہیں کریں گے اور کہتے ہیں کہ اُس کی چھوٹی بہن بھی قریباً اسی جیسی ہے۔ عورتیں چار سال کم ہوں گی۔ تخائف انہیں روانہ ہوتے وقت دیے جاتیں گے۔ یوسف نے آپ کو بتایا ہے کہ ہمارے تعلقات کس طرح شروع ہوتے تھے“

”ہاں بھئی۔ ابھی ہم یہی باتیں کر رہے تھے“

قدسیہ کمرے سے نکلی تو خواتین موٹر کے گرد کھڑی تھیں اور یوسف گلی کے موڑ کے قریب اپنی ماں کا انتظار کر رہا تھا۔ امینہ ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھی بے چینی سے باہر جھانک رہی تھی۔

قدسیہ بولی۔ ”بیٹا تم نے ابھی تک بٹھایا نہیں اُن کو“

”امی جان! آپ نے یہ کہا تھا کہ مجھے اُن کے ساتھ نہیں بیٹھنا پڑے گا۔ اب آپ یہ بتائیں کہ بیٹھنے کی ترتیب کیا ہوگی“

”بیٹا تم کچھ سیٹ پر مسز احمد اور صفیہ کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرو گے۔ صغریٰ بھی آپ لوگوں کے ساتھ سمٹ کر بیٹھ جائے گی، اگلی سیٹ پر امینہ کے ساتھ میں اور فہمیدہ بیٹھ جائیں گی“

یوسف نے بدحواس ہو کر کہا ”یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں یہ تو کر سکتا ہوں کہ اپنی سائیکل اٹھالوں اور ایک تانگہ روک کر آپ کو فہمیدہ کے ساتھ بیٹھا دوں لیکن یہ میرے لیے ناقابل برداشت ہوگا کہ آپ اور فہمیدہ کی جانوں کی حفاظت ڈومینٹ کے لیے بھی امینہ کے سپرد کر دی جائے“

فہمیدہ مسکرائی۔ ”میں نانی جان سے کہہ دوں گی کہ امینہ پر کنٹرول رکھنے کے لیے یوسف صاحب کا آگے ہونا۔ اس لیے آپ اور میری امی آگے بیٹھیں گے اور پیچھے نانی جان، آپ کی امی اور صغریٰ کو جگہ مل جائے گی، لیکن آپ جلدی سے بیٹھ جاتیے۔ وہ اس طرح دیکھ رہی ہے جیسے اس کے متعلق کوئی

تک ہم بخیریت واپس نہیں آجاتے ان کے خیال کسی اور طرف نہ نکل جائیں۔“
انہوں نے دریا دیکھا۔ جہانگیر کا مقبرہ دیکھا۔ واپسی پر بادشاہی مسجد دیکھی، لیکن
جب قلعہ دیکھنے کا مسئلہ آیا تو فہمیدہ نے کہا ”اب نانی جان کو گرمی محسوس ہو رہی ہے۔
قلعہ ہم کبھی آئندہ لاہور آکر دیکھیں گے۔ بھتی امینہ موٹر چلانے میں واقعی بہت ماہر
ہیں۔“

صفیہ نے کہا۔ ”یوسف صاحب کے منہ سے تعریف سننے کے بعد شاید کسی اور
سے شاباش لینے کی ضرورت محسوس نہ کرے۔“

امینہ نے کہا۔ ”اگر آج بادل ہوتے تو میں آپ کو بہت سیر کراتی۔“
”تم فکر نہ کرو بیٹی۔ لاہور میں ہم بھی کتے رہیں گے بادل بھی آتے رہیں گے اور خدا
تمہارے باپ کے کاروبار میں برکت دے وہ کاروں کے نئے نئے ماڈل خریدتے
رہیں گے۔ میں تو یہ بھی سوچ رہی ہوں کہ میں جب کبھی بہت ہی اچھے موسم میں یہاں آؤں
گی تو تمہاری کار پر یہاں سے جالندھر، لدھیانہ، دہلی اور آگرہ تک سفر کروں۔“
”جی میں آپ کو راولپنڈی اور پشاور کی سیر بھی کروا لاؤں گی۔“

واپسی پر کار قدسیہ کے گھر رُکی، مہمانوں کی سیس کی ٹھنڈی تولیوں سے تواضع
کی گئی۔ جب وہ دوبارہ روانہ ہونے لگے تو فہمیدہ سفید لباس پہن کر ایک کمرے سے
نکلی اس کے حسن میں بے پناہ اضافہ ہو چکا تھا۔ یوسف نے ایک نظر اس کی طرف
دیکھا اور پھر اس کی آنکھیں خود بخود جھک گئیں۔ قدسیہ بار بار اپنے دل میں یہ الفاظ
دہرا رہی تھی ”یا اللہ اس بچی کو نظر سے بچائیں۔ اس کی مصومیت اسی طرح قائم رکھیں۔“
تھوڑی دیر بعد وہ کار پر سوار ہو کر امینہ کی کوٹھی کا رخ کر رہے تھے۔

صفیہ یوسف سے باتوں میں مصروف ہو گئی تو اچانک امینہ نے کہا۔ ”خالہ
میری بی بی کی بڑی خواہش ہے کہ آپ دو چار دن ہمارے ہاں مہمان رہیں۔“

صفیہ نے مڑ کر مسز احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”امی جان سنا آپ نے امینہ آپ کو تین چار دن اپنی کوٹھی میں مہمان
رکھنا چاہتی ہے۔ چونکہ اس کے ابا جان کی بھائی جان سے پرانی واقفیت ہے
اس لیے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

مسز احمد بولی۔ ”اری بیٹی یہ دعوت کسی اچھے وقت پر ملتی ہو گی اور اس
بیٹی کو بتادو کہ تم کانگرہ جا رہی ہو اور میں بھی تمہارے ساتھ جا رہی ہوں۔ رات میں
نے لدھیانہ واپس جانے کا ارادہ بدل دیا ہے۔“

”سچی نانی جان“ فہمیدہ نے خوشی سے اس کے ساتھ لپٹے ہوئے کہا۔
”اری اتنی اسجان نہ بنو تمہیں معلوم تھا کہ میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گی اور
نسرین کو تو یقین تھا کہ جب گھر جانے کا موقع آئے گا تو میں اچانک تمہارے ساتھ
کانگرہ کی طرف چل پڑوں گی اور اب وہ چڑیل قہقہہ مار کر یہ کہے گی کہ میں نے
ارادہ تبدیل نہیں کیا بلکہ میرا پروگرام پہلے سے یہی تھا۔“

گاڑی ایک کشادہ کوٹھی کے پورچ میں رُکی اور امینہ کی والدہ اور چند خواتین
نے باہر نکل کر بڑے تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا اور انہیں بالائی منزل کے ایک
بڑے کمرے میں لے گئیں یہاں پندرہ بیس لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ امینہ نے
باہر نکل کر ڈرائیور کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا اور کہا۔ ”تم نے ٹھیک گیارہ بجے یہاں
سے میاں عبدالرحیم کے گھر روانہ ہو جانا ہے۔ انھیں، بچوں اور نوکر کو یہاں پہنچانے
کے بعد اگر تم دیکھو کہ انسپکٹر عبدالعزیز صاحب اور ان کی بیگم یہاں نہیں آئے
تو جا کر انھیں بھی لے آنا۔ راستہ دکھانے کے لیے یوسف صاحب کے نوکر کو ساتھ
لے جانا لیکن اچھی طرح دیکھ لینا یہ بات نہ ہو کہ وہ یہاں بیٹھے ہوئے ہوں اور تم
شہر میں بھاگتے پھرو۔ جانے سے پہلے یوسف صاحب سے پوچھ لینا۔ انھیں

جانتے ہونا۔

”جہاں ہوں جی۔ یہ وہی ہیں ناجو اُس دن آپ کی کار پر بیٹھنے کی بجائے تانگے پر کہیں چلے گئے تھے اور بی بی جی اُن کے متعلق تو میں بہت کچھ سن چکا تھا۔“

”کیا سنا تھا تم نے؟“

”یہی کہ بڑے بڑے ڈاکو ان کے نام سے ڈرتے ہیں۔“

”ڈاکوؤں کا قصہ تمہیں فضل دین نے بتایا ہوگا۔“

”ایک قصہ بی بی جی؟ وہ تو جب بھی گاؤں سے آیا کرتا تھا کوئی نئی کہانی سنایا کرتا تھا۔“

تھوڑی دیر بعد مسان آنے شروع ہو گئے۔ اور بالائی منزل کے دو کمرے خواتین سے اور سچلی منزل کے تین کمرے مردوں سے بھر گئے۔ خواتین کے لیے کھانے کا اہتمام بالائی منزل کے ایک کشادہ کمرے میں تھا اور مردوں کے لیے نیچے دو کمروں میں شہر کے کاروباری اور خوشحال لوگوں کی خاصی تعداد وہاں موجود تھی۔ بڑے بڑے سرکاری افسر بھی وہاں موجود تھے اور ان کی بیگمات بھی وہاں آتی ہوتی تھیں۔ کاشمیر کے مشہور بادورچیوں نے تیار کیا تھا اور ہر طرف اس کی تعریف ہو رہی تھی۔ خواتین کی محفل میں سب کی نگاہیں ہنمیدہ پر مرکوز تھیں اور رشتیدہ سے سرگوشی کے انداز میں پوچھا جا رہا تھا: ”وہ کون ہے رشتیدہ؟“

”وہ ایک پولیس افسر کی بھتیجی ہے۔“

”پولیس افسر اسی ملک کا ہے؟“

”ہاں۔ اسی ملک کا ہے۔“

”ارنی بہن اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کوئی انگریز ہوگا۔“

”نہیں جی۔ انگریز نہیں ہے وہ۔“

”بہن میں بھی یہی سمجھاتی تھی کہ انگریز لڑکی ایسی خوب صورت نہیں ہوتی! یہ

اُس کا رنگ دکھتی ہیں چہرے کا نور نہیں دکھتیں۔“

ایک لڑکی نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا: ”امینہ! تم نے اس لڑکی کی ماں دیکھی ہے؟“

”جی اُس کے دائیں طرف اُس کی ماں ہی تو کھڑی ہے۔“

”باپ بھی آیا ہوا ہے اُس کا؟“

”نہیں۔ اُس کا باپ دیکھنے کے لیے تمہیں جالندھر جانا پڑے گا۔“

عورتیں منہس پڑیں اور لڑکی پر نشان ہو کر بولی: ”میں یہ جانا چاہتی تھی کہ اُس کا باپ کیسا ہے۔ اگر اُس کا رنگ بھی اس کی ماں جیسا ہے تو پھر کسی کو تعجب نہیں کرنا چاہیے۔“

قد سید جو اس بحث کو دلچسپی سے سن رہی تھی بولی: ”بیٹی اگر تم ان کی نانی کو دیکھ لو تو پھر تمہیں کوئی حیرت نہیں رہے گی۔“

نوجوان لڑکی نے کہا: ”کہاں ہیں اس کی نانی صاحبہ؟“

”ذرا دائیں طرف دیکھئے۔“

لڑکی نے دائیں طرف دیکھا اور اچانک اُس کی نگاہیں مسز احمد پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ پھر وہ قد سید کی طرف متوجہ ہوئی۔

”جی میں آپ کی شکر گزار ہوں۔ اس لڑکی نے اپنی نانی سے بہت کچھ لیا ہے۔ لیکن آپ سے ان کا کیا رشتہ ہے؟“

”بیٹی اگر میں یہ کہوں کہ اس سچی اس کی نانی اور والدہ سے میری ملاقات کل ہی

ہوتی تھی تو آپ کو یقین آجائے گا؟“

دراز قامت لڑکی مسکرائی: ”جناب! آپ مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتیں۔“

آپ سے اُس بزرگ عورت کی بڑی مشابہت ہے۔“

قدسیہ نے کہا: ”بہن صفیہ ایک بات اور سن لو۔ یہ صاحبزادی بھی یہی کہتی ہیں کہ آپ کی اُمّی مجھ سے بہت ملتی ہیں۔“

”بہن ہم سب ہی کہتے ہیں کہ امی جان کی شکل آپ سے بہت ملتی ہے اور کوٹہ میں بھی پہلی بار یوسف بے ای کو دیکھ کر یہی کہا تھا۔“

”مجھے اُس نے بتایا تھا۔“

کھانے کے اختتام پر تھوڑی دیر باتیں کر کے مہمان یکے بعد دیگرے رخصت ہونے لگے تو رشیدہ نے چراغ بی بی سے کہا: ”چراغ بی بی صفیہ کی امی کو میرے کمرے میں لے جاؤ انہیں آرام کی ضرورت ہے۔ بہن قدسیہ آپ بھی وہیں جا کر آرام کریں۔ میں باقی مہمانوں کو رخصت کر کے آپ کے ساتھ آرام سے باتیں کر دوں گی۔“

چراغ بی بی نے مسز احمد کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور وہاں سے چل پڑی۔

قدسیہ نے دبی زبان میں صفیہ سے کہا: ”بہن بظاہر چراغ بی بی میں کوئی بُرائی نہیں مگر مجھے نہیں معلوم کہ وہ مجھے اچھی کیوں نہیں لگتی۔ ابھی آپ کی امی کے پاس بیٹھے ہوئے بھی وہ مجھے اچھی نہیں لگتی تھی۔ بے وقوفوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُن کی طرف دیکھ رہی تھی۔ یہ شکر ہے کہ اُسے معزز عورتوں کے ساتھ بیٹھنے کا شوق ہے اور ہماری فہمیدہ سے دُور رہی۔ ورنہ جب وہ بے وقوفوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دکھتی ہے تو فہمیدہ بڑی پریشان ہوتی ہے۔ میں تو یہ بھی دُعا کرتی ہوں کہ آپ کی امی جان اس کی نظر بد سے محفوظ رہیں۔ چلئے اُن کے پاس چلتے ہیں۔ فہمیدہ بیٹی سے باتیں کرنے کا بھی اسے بڑا شوق ہے۔ ذرا حوصلہ افزائی ہوئی تو بہت پریشان کرے گی۔“

بنفیس بولی: ”آپا جی آپ چلیں تو سہی اگر دو منٹ کے بعد وہ خاموشی سے باہر

نکل آئے تو میرا نام بنفیس نہیں۔“

”صفیہ نے کہا: ”کیا قدسیہ تھوڑی بہت تعلیم یافتہ ضرور ہوگی وہ آج لباس میں

تونسے فیشن کا بہت خیال رکھا ہے اُس نے۔“

”بہن تعلیم تو شاید اس نے دسویں جماعت میں چھوڑ دی تھی لیکن ہوشیار بہت ہے۔“

چراغ بی بی کمرے میں داخل ہوئی تو مسز احمد اُونکھ رہی تھیں۔

”ماں جی! آپ کی ٹانگیں دبا دوں۔“

”بھئی میں ایک دفعہ کہہ چکی ہوں کہ میرا نیند سے بُرا حال ہو رہا ہے۔“

”ماں جی اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کے سر پر کدو کے تیل کی مالش کر دیتی ہوں۔ ہمارے حکیم طارق علی صاحب کہتے تھے کہ کدو کے خالص تیل کی مالش سے دماغ کھل جاتا ہے۔“

”بھئی بھاڑ میں جائیں تمہارے حکیم طارق علی۔ انہوں نے کیوں لگا دیا تمہیں میرے پیچھے؟“ وہ سب کمرے میں داخل ہوئیں اور قدسیہ نے آگے بڑھ کر کہا: ”خالہ جی۔ یہ طارق کون ہے؟“

”ہوگا اس کا کوئی۔ سر کھالیا ہے اس نے میرا۔“

”خالہ جی۔ اگر طارق علی اس کا کوئی ہے تو اسے طارق کا سر کھانا چاہیے۔ جاؤ بی بی انہیں آرام کی ضرورت ہے۔“

چراغ بی بی اُٹھی اور اپنا دوپٹہ سنبھالتے ہوئے ہوا کے جھونکے کی طرح باہر نکل گئی۔

صفیہ نے کہا: ”بہن میں نے ایک عجیب بات دیکھی ہے۔ لوگوں کا رنگ غصے میں سرخ ہو جاتا ہے لیکن اس کا رنگ بھی زرد تھا اور آنکھیں بھی خوف زدہ گانے کی طرح سفید نظر آتی تھیں۔“

مسز احمد اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔ قدسیہ نے کہا: ”خالہ جان مجھے افسوس ہے کہ اُس نے آپ کی نیند خراب کی۔“

اور امی جان کی وجہ سے مجھے کچھ لحاظ آگیا تھا اور شاید میری وجہ سے آپ کو کچھ زحمت اٹھانی پڑی۔“

”ارے بیٹا کیا بات کرتے ہو۔ میں تو بہت خوش ہوئی ہوں یہاں آکر۔ مجھے یوں ہی خیال آیا تھا کہ تمہارے جیسے نیک نیت لوگوں کو بہت سوچ بچار کے بعد کسی پر اعتماد کرنا چاہیے۔ کیونکہ جو لوگ دل کے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ انہیں ذرا مشکل سے بُرے لوگوں کا اصلی چہرہ نظر آتا ہے۔“

”مال جی۔ میری امی کا چہرہ ایک آئینہ ہے جس میں میں ہر اچھے اور بُرے کی اصلی صورت دیکھ لیتا ہوں۔“

رشیدہ امینہ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی اور اُس نے کہا۔ ”خالہ جی! اُس بے وقوف نے آپ کو پریشان تو نہیں کیا۔ اصل میں غلطی میری تھی کہ میں نے اُسے آپ کا خاص خیال رکھنے کی ہدایت کی تھی۔“

مسز احمد بولی ”نہیں بیٹی پریشان تو وہ میرے روکھے پن کی وجہ سے ہوئی ہوگی۔ وہ باتیں کر کے مجھے خوش کرنا چاہتی تھی لیکن مجھ پر آپ کے لذیذ کھانوں کا یہ اثر تھا کہ میں فوراً سوجانا چاہتی تھی۔ اُس نے میرے سر پر بالش کے لیے کسی حکیم صاحب کے کدو کے تیل کی تعریف کی تھی اور میں نے شاید حکیم صاحب کو کچھ کہہ دیا تھا۔ پھر یہ سب آگئیں اور شاید طعنے کی کسی بات نے اسے ذرا ناراض کر دیا۔ بہر صورت وہ ابھی لڑکی ہے اور میں جانے سے پہلے اس کا شکریہ ادا کروں گی۔“

امینہ بولی۔ ”مال جی اس بے وقوف کو آپ سے معافی مانگنی پڑے گی۔ اس نے یقیناً آپ کو بہت پریشان کیا ہوگا۔“

”نہیں بیٹی۔ ہماری خاطر تمہیں اس کے ساتھ بہت شفقت سے پیش آنا چاہیے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ آپ لوگ باقاعدگی سے نماز نہیں پڑھتے۔ اسے باقاعدگی سے نماز

”اری بیٹی! نیند کہاں آرہی تھی مجھے میں تو اس کی باتوں سے بچنے کے لیے آنکھیں بند کیے ہوئے تھی۔“

صفیہ بولی۔ ”امی جان! آپ بھی اس سے نفرت کرتی ہیں۔“

بیٹی۔ ”میری نفرت کے لیے یہ کافی نہیں کہ قد سید اُسے اچھا نہیں سمجھتی۔“

کچھ دیر وہ باتیں کرتی رہیں پھر یوسف نے دروازے سے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

”امی جان میرا خیال ہے اباجان کچھ دیر اپنے دوستوں کے ساتھ باتوں میں مصروف رہیں گے۔ آپ بھی کچھ دیر آرام کر لیں۔“

”نہیں بیٹا۔ تم ان سے کہو میں گھر جاتی ہوں اور وہ بھی انھیں رخصت کرنے کے بعد جلد پہنچ جاتیں۔“

یوسف مڑنے لگا تو مسز احمد نے آواز دی۔ ”بیٹا! جاؤ نہیں میں نے ایک بات کرنی ہے۔“

یوسف کمرے میں داخل ہوا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”فرمائیے مال جی۔“

”بیٹا میں تمہیں نصیحت کرنے کا حق رکھتی ہوں نا۔“

”مال جی مجھے ہمیشہ آپ کی نصیحتوں کی ضرورت رہنے لگی۔“

”بیٹا میری یہ بات یاد رکھنا کہ زندگی میں تمہارے لیے یہی بات اچھی ہوگی جسے تمہاری ماں اچھا سمجھتی ہو۔ یہ اتنی معصوم ہے کہ اسے دوسروں کی چھوٹی جھوٹی خبریوں پر بھی پیار آتا ہے اگر کسی کو یہ اچھا نہیں سمجھتی تو تمہارے دل میں کبھی یہ خیال نہیں آنا چاہیے کہ وہ تمہارا خیر خواہ ہو سکتا ہے۔“

”مجھے معلوم ہے مال جی اور امی جان کو یہ معلوم ہے کہ کسی کو پسند یا ناپسند کرنے سے پہلے میں ان کے چہرے کی طرف دیکھا کرتا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ اس گھر کے بعض لوگوں کو دیکھ کر آپ خوش نہیں ہوں گی لیکن اباجی کی وجہ سے امی جان کو اور

اپنے سوٹ کیس میں رکھ لو۔ میں اطمینان سے دیکھوں گی اور صفیہ تم کیوں خاموش ہو۔ شکریہ ادا کرو اپنی بہن کا۔“

”خالہ جان۔“ قدسیہ نے کہا۔ ”صفیہ کو شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرے لیے قدرت کا اس سے بڑا انعام اور کیا ہو سکتا ہے کہ انھوں نے دیکھے بغیر میرا تحفہ قبول کر لیا ہے۔“

یوسف چند قدم پیچھے کھڑا ہو کر عبدالعزیز سے باتیں کر رہا تھا۔ گاڑی نے سیٹی دی اور وہ قریب آگئے۔ قدسیہ اور صفیہ دروازے میں آکر کھڑی ہو گئیں گاڑی چل پڑی اور وہ ایک دوسرے کو خدا حافظ کہنے لگے۔

یوسف ڈبے کے سامنے سب سے پیچھے کھڑا تھا بلقیس، عبدالعزیز اور قدسیہ ہاتھ ہلکا کر رخصت ہونے والوں کے الوداعی اشاروں کا جواب دے رہی تھیں۔ فہمیدہ کھلے دروازے میں کھڑی تھی اور یوسف اطمینان سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جب گاڑی ذرا آگے نکل گئی تو اُس نے دل میں خدا حافظ خدا حافظ کہتے ہوئے ایک ہاتھ بلند کر دیا۔

عبدالعزیز، بلقیس، یوسف اور اس کی امی کو کار پر اُن کے گھر تک پہنچا کر گئے اور رخصت ہوتے وقت عبدالعزیز نے کہا۔ ”میں نے ڈرائیور کو کہہ دیا ہے کہ کل سے آپ کو باقاعدہ ڈرائیونگ سکھانا شروع کر دے گا۔ آپ اس کے لیے صبح یا شام کا کوئی وقت مقرر کر لیں یہ آپ کو باقاعدہ ہر روز دو گھنٹے کے لیے ساتھ لے جایا کرے گا۔ میں صبح نماز کے لیے تیار ہو جایا کروں گا اور ڈرائیور کے ساتھ ناشتہ کر کے اس کے ساتھ چل پڑا کروں گا اور اگر یہ کوئی وقت محسوس کرے تو ہم عصر کی نماز کے بعد پروگرام بنالیا کریں گے۔“

ڈرائیور نے کہا ”جناب صبح کے وقت ٹھیک رہے گا۔“

پڑھایا کرو۔ وہ خود بھی خوش رہے گی اور تمہیں بھی خوش رکھا کرے گی۔“

رشیدہ نے کہا خالہ جان۔ ”میں امینہ کے آبا کی طرف سے یہ درخواست لے کر آئی ہوں کہ کانگریس سے واپسی پر آپ کم از کم پورا ہفتہ ہمارے پاس ٹھہریں۔ امینہ آپ کو خوب سیر کراتے گی۔“

”بیٹی میں یہ وعدہ نہیں کرتی کہ اتنے دن ٹھہروں گی لیکن آؤں گی ضرور۔“

میرا مطلب ہے کہ آپ سب آئیں گے۔ صفیہ بھی اور اس کے بچے بھی۔“

”بھتی صفیہ سے تو شاید تم پہلے ہی وعدہ لے چکی ہو لیکن اس کے لیے شاید ایک ہفتہ والی بات ذرا مشکل ہوگی۔“

شام کے وقت قدسیہ، یوسف عبدالعزیز اور اس کی بیوی بلقیس مہمانوں کو ریلوے اسٹیشن پر رخصت کرنے آئے تھے۔ جب وہ سیکنڈ کلاس کے زنانہ ڈبے میں بیٹھ گئیں تو قدسیہ نے اپنے نوکر کے ہاتھ سے ایک گٹھڑی لے کر مسز احمد کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

”یہ چھوٹا سا تحفہ قبول فرمائیے۔ سبز رنگ کے ریشمی رومال میں جو دو سوٹ

ہیں ان میں سے ایک آپ کے لیے اور ایک بہن صفیہ کے لیے ہے۔ دوسرے سفید رومال میں فہمیدہ اور نسreen کے کپڑے ہیں۔ میں نے آپ کے لیے چار کی دوستیاں بھی منگوائی تھیں لیکن جیسا عطر آپ نے کوئٹہ سے مجھے یوسف کے ہاتھ سے دیا تھا ویسا یہاں سے نہیں ملا۔ بہر حال میرے یہ تحائف قبول فرمائیے۔ میں اپنے گھر پر ہی انہیں آپ کے سامان میں رکھوانے کی کوشش کرتی لیکن میں ڈرتی تھی کہ کہیں خالہ جان انکار نہ کر دیں۔ اس امید پر یہاں پہنچ کر آپ کو پیش کر رہی ہوں کہ آپ خالق خدا کے سامنے مجھے شرمندہ نہیں کریں گی۔“

”ارے بیٹی۔ آخر تم نے مجھے ہوا کیوں سمجھ لیا ہے۔ فہمیدہ یہ تحائف سنبھال کر

تمہارے ابا جان کسی دن تمہارے مستقبل کے متعلق کوئی ایسا فیصلہ کر دیں کہ میری روح کی چیخیں آسمان تک پہنچیں لیکن میں زبان بھی نہ بلا سکوں۔

”امی جان آپ کبھی بھی بے بس نہیں ہوں گی اور میں آپ کا کوئی بھی فیصلہ رد نہیں ہونے دوں گا۔ اگر آپ کو ساری دنیا سے بے اطمینانی ہو جائے تو بھی مجھ پر آپ کو اعتماد کرنا چاہیے۔“

”بیٹا مجھے تم پر اعتماد ہے لیکن میں اس بات سے ڈرتی ہوں کہ تمہارے ابا جان کہیں دنیا داری کے چکر میں نہ پڑ جائیں لیکن مجھے ایسی باتیں نہیں کہنی چاہئیں۔“

یوسف مسکرایا۔ ”امی جان جو باتیں آپ کہنا چاہتی ہیں وہ آپ کے چہرے پر لکھی ہوتی ہیں۔ آپ یہی کہنا چاہتی ہیں تاکہ دنیا داری کا چکر ابا جان کو عبد الکرم کی طرف کھینچ لے گا۔ لیکن مجھے اپنی ہمت سے زیادہ آپ کی دعاؤں پر یقین ہے اور آپ کی دعائیں مجھے اس راستے پر کبھی نہیں جانے دیں گی جو آپ کو پسند نہیں، امی جان میں ہوش سنبھالتے ہی اپنے متعلق آپ کی جو دعائیں سنا کرتا تھا، ان میں سے ایک بار بار دہرائی جانے والی دعا معصوم پاکیزہ اور خوب صورت لڑکی کے نقوش میرے ذہن میں ابھار کرتے تھے۔ اُس سے آپ بل چکی ہیں اور میں بھی اُسے دیکھ چکا ہوں۔ آپ کی دعاؤں کا اتنا زیادہ اثر ہے کہ وہ بھولی بھالی لڑکی بھی یہ جانتی ہے کہ میں جو کچھ ہوں اُس کے لیے ہوں۔ مجھے کسی دن صرف اس کے والدین کو یہ کہنا پڑے گا کہ اگر زمانے کے حادثے کے باعث کامیابی کی منزل کی طرف میرا راستہ طویل ہو جائے تو میرا سب سے بڑا سہارا یہ ہو گا کہ وہ میرا انتظار کرے گی۔ دوسری لڑکی امینہ کے بارے میں اگر آپ کو کوئی پریشانی ہے یا ابا جان کو میرے متعلق کوئی غلط فہمی ہے تو وہ بہت جلد دور ہو جائے گی۔ میں کسی دن اس سے براہ راست بات کروں گا آپ اور اُس کی ماں شمس سکیں گی اور اگر ضرورت پڑی تو میں عبد الکرم صاحب سے

”اچھا تو ہم کل نہیں پرسوں سے شروع کریں گے۔“

اگلے دن رات بجے کے قریب یوسف اپنے کمرے میں پڑھ رہا تھا کہ ماں اُس کے کمرے میں داخل ہوئی اور اُس نے ایک پکیٹ یوسف کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ پکیٹ میں نے کھول کر دیکھے بغیر گھر پہنچتے ہی اپنے ٹرنک میں رکھ لیا تھا۔ پھر ان کے یہاں ہوتے ہوئے مجھے ان کی تصویریں دیکھنے کی ضرورت محسوس ہی نہ ہوئی۔ اب جب تم سیر کے لیے نکلے تھے تو میں نے یہ پکیٹ کھولا تھا۔ نسرین اور فہیدہ کی شکلیں بہت ملتی ہیں لیکن فہیدہ اتنی حسین ہے کہ اُس کی کوئی تصویر اُس جیسی نہیں ہو سکتی۔“

یوسف نے بظاہر بے پروائی سے یکے بعد دیگرے تمام تصویریں دیکھیں اور نہیں پکیٹ میں ڈالنے کے بعد مسکرا کہا۔ ”امی جان بات دراصل یہ ہے کہ کمرے کی بے جان آنکھ میں ماتا نہیں آسکتی اور آپ کو فہیدہ اور اس کی نانی کو بھی یہ شاید احساس دلا چکی ہیں کہ اُس کے لیے آپ کی ماتا کسی سے کم نہیں۔ لیکن امی جان آپ اُسے دیکھتے ہی کیوں رو پڑی تھیں؟“

”بیٹا وہ خوشی کے آنسو تھے مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ میں مدتوں سے اُسے تلاش کر رہی تھی۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ اُس کی ماں اور نانی ایک لمحہ کے لیے بھی مجھے اجنبی محسوس نہیں ہوئیں۔ میں اس کی وجہ بیان نہیں کر سکتی لیکن میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ وہ میری ہیں شاید اُس کی یہ وجہ ہو کہ میں نے اُن سب کی نگاہوں میں تمہارے لیے پیار دیکھا تھا اور میں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ تمہیں اُن لوگوں سے پیار ملے گا۔ بیٹا پہلے شاید میں یہ بات تم سے نہ کہتی لیکن مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ میں انہیں دیکھنے سے پہلے ایک بات سے خوفزدہ تھی۔“

”کس بات سے امی جان؟“

”بیٹا! میں اس بات سے خوفزدہ تھی کہ میں اتنی بے بس نہ ہو جاؤں کہ

بات کروں گا۔ میرے لیے یہ مسئلہ قطعاً پیچیدہ نہیں۔
 ماں نے کہا: بیٹا! جب میں تمہاری طرف دیکھتی ہوں تو میری تمام پریشانیاں ختم ہو جاتی ہیں۔

”امی جان پھر میری طرف دیکھتی رہا کریں نا۔“

”ارے بیٹا میں زندہ ہی اس لیے ہوں کہ تمہیں دیکھا کرتی ہوں لیکن ابھی وہ تصویریں تمہیں چھپا کر رکھنی چاہتیں۔ جب وہ گاڑی پر روانہ ہوتے تھے تو مجھے خیال آیا تھا کہ اُن سے یہ کہوں کہ شاید میں یوسف کو بھی کسی دن کانگریڈ سیر کے لیے بھیج دوں۔“
 ”نہیں امی جان۔ ابھی نہیں ابھی میں نے بہت کچھ کرنا ہے۔“

”بیٹا کسی دن تم اُداس نہیں ہو جاؤ گے؟“

”آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ وہ بیٹا کیسے اُداس ہو سکتا ہے جس کے لیے آپ جیسی ماں دعائیں کرتی ہو۔“

ماں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر ہونٹوں سے لگا لیا اور پھر اُس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا: ”اللہ تمہیں ہر میدان میں کامیابی دے اور پھر میں تمہارے ساتھ بہت سیر کیا کروں گی۔ پھر وہ مبارک دن بھی آئے گا جب تمہیدہ ہمارے ساتھ ہوا کرے گی۔“
 ”امی جان۔ یوسف نے کچھ سوچ کر کہا: ”تمہیدہ کو دیکھو بغیر آپ کے دل میں اس کا خیال کیسے پیدا ہوا تھا۔“

”بیٹا۔ جب تم نسرین کا ذکر کر رہے تھے تو میں دل میں کہہ رہی تھی کاش اُس کی کوئی بڑی بہن ہو، پھر جب تمہاری گفتگو سے یہ پتہ چلا کہ ایک بڑی بہن بھی ہے جس کی نسرین اور اس کی نانی دونوں تعریف کرتی تھیں۔ تو میرے دل میں فوراً یہ خیال آیا تھا کہ یہی وہ لڑکی ہو سکتی ہے جسے میں تصویریں دیکھا کرتی تھی اور نسرین کے پہلے خط میں اُس کے ہاتھ کی چند سطریں پڑھنے کے بعد تو مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اللہ نے میری دعائیں سن لی ہیں لیکن بیٹا مجھے

تم سے ایک شکایت ہے کہ تم پڑھاتی میں اپنے ابا جان کی توقعات پوری نہیں کر رہے۔ کیا تم اپنے ابا جان اور ہم سب کی خوشی کے لیے اس سال ذرا زیادہ محنت نہیں کر سکتے۔“

”امی جان بی اُسے کے امتحان کا نتیجہ دیکھنے کے بعد ابا جی کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں رہے گی۔“

”بیٹا اگر تم نے امتحان میں شاندار کامیابی حاصل کی تو میں اور تمہارے ابا جان بلا تاخیر تمہیدہ کے گھر جائیں گے اور مجھے یقین ہے کہ بلیقیس اور اس کے میاں یہ سفارش کریں گے کہ ہماری درخواست قبول کر لی جائے۔“

”لیکن امی جان بی اُسے کے بعد میرے جوار اُدے ہیں انہیں پورا کرنے کے لیے مجھے دو چار سال بہت کام کرنا پڑے گا۔“

”بیٹا میں تمہارا مطلب سمجھتی ہوں لیکن میرا مقصد ان کے والدین کی ضماندی حاصل کرنا ہے۔ پھر ایسی بہو کے انتظار میں دو چار سال ایک دلکش خواب کی طرح گزر جائیں گے اور تم بھی پوری یکسوئی سے اپنا کام کر سکو گے۔ پھر میں اُسے خط لکھا کروں گی۔ عیدوں پر اسے تحائف بھیجا کروں گی اور سوتے جاگتے تم دونوں کے لیے دعائیں کیا کروں گی۔ میرے لیے کتنے خوشی کے دن ہوں گے وہ۔“



دس دن بعد قدسیہ کو ایک لفافہ وصول ہوا جس کے اندر ایک خط صفیہ کی طرف سے تھا اور دوسرا یوسف کے لیے نسرین کی طرف سے۔ صفیہ نے اپنے خط میں اپنی ماں اور تمہیدہ کی طرف سے اُن کی مہمان نوازی اور تحائف کا شکریہ ادا کرنے کے بعد یہ لکھا تھا۔

”بہن آپ یہ سن کر حیران ہوں گی کہ جب گاڑی بٹالہ سے آگے ایک اسٹیشن

دہائی دینے لگی تو درخت جہاں تھے وہیں ٹرک گئے۔

فہمیدہ نے پوچھا۔ ”کیا یہ درست ہے کہ بعض درختوں میں کھڑے ہیں جن میں سانپ رہتے ہیں؟“

لڑکی نے جواب دیا۔ ”جی سانپ ہی نہیں وہاں خوفناک جنگلی بے بھی ڈیرہ جما لیتے ہیں۔ ایک بلا اتنا بڑا تھا کہ اس نے دو کتے جان سے مار ڈالے اور ہمارا ایک قیمتی کتابری طرح زخمی کر دیا تھا۔“

فہمیدہ نے پوچھا۔ ”آپ کا گاؤں یوسف صاحب کے گاؤں سے مغرب کی طرف ہے؟ اور پر دہی درخت وہاں سے جنوب کی طرف ہیں؟“

”جی ہاں معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہمارا علاقہ دیکھ چکی ہیں۔“

”اچھا یہ بتائیے بہن کہ سردار بیلا سنگھ آپ کے کیا لگتے ہیں؟“

لڑکی۔ ”جی وہ میرے پتا ہیں اور میرا نام جیت کر رہے۔“

بڑی عمر کی عورت نے کہا۔ ”بیٹی اگر آپ اتنا کچھ جانتی ہیں تو میاں عبدالرحیم کے خاندان سے آپ کا کوئی رشتہ ہو گا۔ جب آپ ان کے پاس آئیں تو ہمیں ضرور اطلاع دیں۔“

”میں نے یونہی سوال کر دیا۔ آپ ان کے بیٹے یوسف کو اچھی طرح جانتی ہیں۔“

”جی اُسے کون نہیں جانتا۔ اچھے لوگ اس کی پوجا کرتے ہیں اور جو بُرے ہیں وہ اُن کے ساتھ سے بھاگتے ہیں۔“

ان لوگوں سے گفتگو بہت دل چسپ رہی لیکن جلد ہی وہ دوسرے اسٹیشن پر اتر گئیں۔

پر ٹرکی تو فہمیدہ نے ایک کارخانے کی بلند چوٹی دیکھتے ہی کہنا شروع کر دیا کہ اس اسٹیشن سے مشرق کی طرف یوسف صاحب کا گاؤں ہے۔ ہم دائیں ہاتھ گاڑی کی کھڑکیوں سے مشرق کی طرف دیکھنے لگے۔ تین سکھ عورتیں جو اس اسٹیشن سے سوار ہوئیں تھیں ہماری باتوں میں دل چسپی لینے لگیں۔ جب میں نے آپ کے گاؤں کا نام لیا تو ”بہن“ ایک عورت نے کہا۔ ”اگر آپ نے اس گاؤں جانا ہے تو ہمیں اتر جائیں اگلا اسٹیشن تو بہت دُور ہو جائے گا۔“

میں نے کہا۔ ”نہیں جی ہم نے وہاں نہیں جانا صرف یہ جاننا چاہتے تھے کہ وہ گاؤں کس طرف ہے۔“ ایک نوجوان لڑکی جلدی سے ہمارے قریب آگئی اور اُس نے بازو نکال کر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”جی وہ سامنے ہمارے گاؤں کے درخت ہیں اور دوسرا گاؤں جس کا آپ پوچھ رہی ہیں اُس کے پیچھے ذرا دائیں طرف ہے۔ وہاں آپ کسی کو جانتی ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں بیٹی۔ ہم میاں عبدالرحیم ان کے بیٹے یوسف اور اُن کی بیگم صاحبہ کو اچھی طرح جانتے ہیں۔“ یہ سن کر باقی دو عورتیں بھی ہمارے پاس آگئیں اور اُنھوں نے میاں صاحب کے خاندان کے متعلق باتیں شروع کر دیں۔ فہمیدہ نے اچانک نوجوان لڑکی سے پوچھا۔ ”ہم یہاں سے پر دہی درخت دیکھ سکتی ہیں۔“

”جی، ایک بڑے گاؤں کے پیچھے ہیں۔“

فہمیدہ نے پوچھا ”پر دہی درختوں کی خاص بات کیا ہے۔“

لڑکی نے کہا۔ ”جی وہ بہت پرانے ہیں۔ کہیں دُور سے چل کر آئے ہوتے تھے، تھک کر وہاں ٹرک گئے تھے۔“

فہمیدہ بولی۔ ”جی تھک کر نہیں۔ بات یہ تھی کہ بہت سویرے ایک عورت نے آٹا پیسنے والی چکی چلاتے ہوئے باہر دیکھا تو درخت بھاگتے جا رہے تھے۔ وہ

جی چاہتا ہے اور اس وقت تو میرا دل بھٹنے لگتا ہے جب آپا، امی اور نانی جان آپ کے متعلق باتیں کرتی ہیں اور اس طرح ذکر کرتی ہیں۔ جیسے میں یوسف بھائی جان کو بالکل نہیں جانتی۔ خالہ جان میں نے ایسے ہی لکھ دیا ہے کہ آپ میرا دل دکھانے پر ان کی ڈانٹ ڈپٹ کریں ورنہ میں اُن سے بالکل ناراض نہیں ہوں اور کبھی بھی ناراض نہیں ہو سکتی۔ خالہ جان بھائی جان کو بھی تو چھٹیاں ہیں اور کانگریز کا موسم بہت اچھا ہے یا تو آپ اس طرح کریں کہ بھائی جان کے ساتھ یہاں آجائیں یا بھائی جان کو بھیج دیں تاکہ مجھے آکر آپ کے پاس لے جائیں۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ آپ کو دیکھنے کی خوشی مجھے لاہور کی گرمی محسوس نہیں ہونے دے گی۔ بھائی جان سے کہہ دیجئے کہ میں اس یقین کے ساتھ ہر نماز کے بعد دعا کرتی ہوں کہ گاڑی پر سفر کے دوران میرے لیے دعا کرنے کا جو وعدہ انہوں نے کیا تھا وہ انہیں نہیں بھولا ہوگا۔

اور پیاری خالہ جان اب میں بھائی جان کے ساتھ آپ کی صحت اور سلامتی کے لیے بھی دعا کیا کر دوں گی۔ آپا فمیدہ آپ سب کو سلام کہتی ہیں۔

آپ کی بیٹی
نسرین

نسرین کا خط آنے کے بعد کوئی ایک ہفتہ قدر سیہ فرصت کے اوقات میں الگ بیٹھ کر انہیں خطوط لکھا کرتی تھی۔ پہلے تین دن وہ صفیہ اُس کی امی اور نسرین کے نام لکھتی رہی۔ چوتھے روز اُس نے فمیدہ کو لکھا لیکن اُسے اپنی تحریر پسند نہ آئی اُس دن گرمی بہت زیادہ تھی لیکن شام کے وقت اچانک شدید آندھی آئی اور اُس کے بعد موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ صبح کے وقت موسم بہت خوشگوار

ہن پردیسی درختوں کے ذکر سے امی جان کو آپ کے گاؤں سے اتنی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے کہ اگر اگست کے آخری دنوں میں آپ لوگ اپنے گاؤں میں ہوں تو ہم واپسی پر آپ کا گاؤں ضرور دیکھیں گے اگر کوئی پروگرام ہے تو ہمیں اطلاع دیجئے۔ اور کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ کسی دن چپکے سے دھرم سالہ پہنچ جائیں اور ہماری سب کی عید ہو جائے۔

آپ کی بہن صفیہ

نسرین نے لکھا تھا۔

میری پیاری خالہ جان

جب آپا فمیدہ نے آپ کا قیمتی تحفہ مجھے دیا تو رنگ دہی تھا جو میرے آؤ اور اتنی پسند کیا کرتے ہیں اور وہ کسی تمیں کہ آپ اُن بزرگوں میں سے ہیں جو دیکھے بغیر بچوں سے پیار کرنے لگ جاتے ہیں۔ خالہ جان! یہ بھی عجیب بات ہے کہ جب یوسف بھائی نے نانی جان سے کہا تھا کہ آپ کی صورت بالکل میری امی سے ملتی ہے تو میں نے بھی آپ سے پیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ یوسف بھائی جان سے میں سخت ناراض ہوں۔ آپ انہیں اس بات پر تھوڑا سا ضرور ڈانٹیں کہ انہوں نے اپنی ننھی بہن کا پتہ کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ یہ تو آپا فمیدہ کا کمال تھا کہ انہوں نے کسی اخبار میں اُن کا مضمون پڑھا اور مجھ سے پرنسپل صاحب کے نام خط لکھوا دیا۔ جب مجھے یہ خیال آتا تھا کہ بھائی یوسف مجھے بھول گئے ہوں گے تو میں بیان نہیں کر سکتی کہ مجھے کتنا دکھ ہوتا تھا۔ خالہ جی زیادہ دکھ مجھے اس بات کا ہے کہ میرے شیر دل بھائی جان نے اتنے بڑے کارنامے سرانجام دیے اور مجھے خبر بھی نہ تھی اور جب مجھے یہ پتہ چلا کہ چچا جان انہیں اچھی طرح جانتے تھے تو کتنا غصہ آیا تھا مجھے اُن پر۔ خالہ جان آپ کو دیکھنے کو بہت

جاؤں گی“

”اچھا امی جان میں جاتا ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ کوئی بات نہیں

بھولیں گی“



دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد یوسف ایک کتاب اٹھا کر بیٹھک میں لیٹ گیا
ماں کمرے میں داخل ہوئی اور اُس نے چار خالی لفافوں کے ساتھ اپنے لکھے ہوئے
خطوط میز کی ایک دراز میں رکھتے ہوئے کہا: ”بیٹا! آرام کرنے کے بعد یہ چاروں
خط ابھی طرح پڑھ لینا اور پھر اوپر والا خط جو میں نے ابھی ختم کیا ہے بڑی احتیاط
سے پڑھنا کوئی غلطی ہو تو ٹھیک کر دینا۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی فہمیدہ کے سامنے
میرا مذاق اڑائے“

”امی جان۔ آپ یہاں بیٹھ جائیں۔ وہ خط میں آرام کرنے سے پہلے
آپ کے سامنے پڑھوں گا۔ کیونکہ جس فہمیدہ کو میں جانتا ہوں اس کے سامنے
کوئی آپ کا مذاق نہیں اڑا سکتا“

ماں نے دراز کھول کر خط نکالا اور یوسف کو دیتے ہوئے اُس کے پاس
بیٹھ گئی۔ یوسف اٹھ کر خاموشی سے خط پڑھنے لگا۔ قدسیہ نے لکھا تھا کہ
میری بیٹی، آنکھوں کی روشنی سلامت رہو

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جن کی آواز سننے کے لیے کان ترستے ہیں، وہ
یہ ایک خاموش ہو جاتے ہیں۔ خدا معلوم کہ اس میں کیا مصلحت تھی کہ تم مجھے چند
سطریں بھی نہ لکھ سکیں لیکن اس کے باوجود ہر خط تمہاری طرف سے ایک خوشی کا
پیغام محسوس ہوتا تھا۔ کل بہت گرمی تھی۔ میں نے سوچا کہ فہمیدہ نے نہیں لکھا تو
اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ میں بھی نہ لکھوں لیکن جو خط میں نے لکھا تھا وہ

تھا۔ قدسیہ یہ کہہ کر اوپر کمرے میں چلی گئی: ”میں آرام کرنا چاہتی ہوں اس لیے
جب تک میں خود نہ اٹھوں مجھے جگانے کے لیے کوئی نہ آئے“

یوسف جو کسی دوست کے گھر گیا ہوا تھا اپنے بھائی سے یہ سن کر پریشان
ہوا کہ اتنی جان آپ کے گھر سے ملکتے ہی آرام کے لیے اوپر چلی گئیں تھیں اور یہ حکم
دے گئیں تھیں کہ جب تک میں خود نہ نیچے آؤں مجھے بلانے کے لیے کوئی نہ آئے۔
پھر اُس نے بہن سے کہا: ”صغریٰ دبے پاؤں جاؤ دیکھو اتنی جان کی طبیعت تو ٹھیک
ہے نا“

اُس نے واپس آکر جواب دیا: ”بھائی جان! انھوں نے اندر سے دروازے
کی کنڈی لگا رکھی ہے“

”تم نے آہستہ سے آواز نہیں دی؟“

”جی نہیں“

یوسف بھاگتا ہوا اوپر چڑھا اور اُس نے بالائی منزل کے دو کسادہ کمروں
میں سے ایک کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا: ”امی جان۔ اتنی جان“
ماں نے اندر سے کہا: ”بیٹا میں ٹھیک ہوں۔ نوکمرے کہ وہ کھانا تیار
کرے میں ابھی آجاؤں گی“

”امی جان آپ آج بھی کچھ لکھ رہی ہیں“

”ہاں بیٹا، سب سے اہم خط تو میں آج لکھ رہی ہوں۔ بس تھوڑا سا رہ گیا ہے
اس کے بعد وہ چاروں خط جو میں نے لکھے ہیں آکر پڑھ لینا اور لفافوں پر ان کے پتے
لکھ کر آج ہی پوسٹ کر آنا“

”جو تھا خط کس کے نام ہے امی جان“

”تمہیں معلوم ہے کہ وہ کس کے نام ہے۔ اب جاؤ ورنہ بہت سی باتیں لکھنا بھول

یکسر بدل چکی ہے۔ یوسف کو اس بات کا احساس ہے کہ شہر کی ہوا کا مجھ پر اچھا اثر نہیں پڑ رہا۔ وہ اپنے آبا جہان کو بھی قائل کر چکا ہے کہ مجھے وقتاً فوقتاً دو چار دن کے لیے گاؤں جا کر ضرور رہنا چاہیے۔

ہمارا پروگرام یہ ہے کہ اگست کے آخری دو ہفتے اپنے گاؤں میں گزار آئیں۔ اس لیے پندرہ اگست کے بعد جس دن بھی تشریف لائیں یوسف آپ کے استقبال کے لیے اسٹیشن پر موجود ہوگا۔ بیٹی زیادہ مناسب بات یہی ہوگی کہ آپ کی اُمّی بہن بلقیس یا اُن کے میاں کو لکھے کہ آپ کون سی تاریخ کو کانگرہ سے روانہ ہوں گی۔ ہماری کوشش تو یہی ہوگی کہ بلقیس اور بھائی عبدالعزیز بھی ہمارے ساتھ چل پڑیں لیکن اگر انھیں کوئی مصروفیت ہوئی تو بھی مجھے یقین ہے کہ پر دیسی درختوں کے متعلق سننے کے بعد وہ یقیناً ہمارا ساتھ دینے پر تیار ہو جائیں گے۔

بیٹی اس وقت عجیب و غریب باتیں آرہی ہیں میرے ذہن میں ایک فرضی سی کہانی تو یہ ہے کہ پر دیسی درخت پہاڑوں کی طرف سے بھاگ کر اُس طرف آ نکلے تھے اور رات کے پچھلے پہر چکی پیسنے والی عورت کی دُہائی سُن کر وہ اچانک اُن میں رُک گئے تھے۔ لیکن کسی دن جب ہمارے علاقے کے لوگ اپنے بڑوں کی زبانی یہ سُننا کریں گے کہ دو شہزادیاں جن کے چہرے چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن تھے ان درختوں کو دیکھنے آئی تھیں تو ان کی ایک ایک شاخ اور ایک ایک پتے سے نئے پھوٹ نکلے تھے تو کئی لوگ اس بات پر بھی یقین کر لیں گے۔

یوسف آخری الفاظ رُک رُک کر پڑھ رہا تھا اور ہر فقرے کے بعد اپنی ماں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ قدسیہ نے کہا۔ ”بیٹا اس خط کو لفافے میں ڈالنے سے پہلے اچھی طرح پڑھ لو۔ میں نے یقیناً کوئی غلطی کی ہوگی۔“

”نہیں امی جان۔ اس خط کو کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں۔ یہ خط پڑھنے سے پہلے

مجھے پسند نہ آیا اور شاید اس لیے پسند نہ آیا کہ سخت گرمی میں میں کانگرہ کی خوشگوار ہواؤں اور دل کش مناظر کا تصور کر رہی تھی اور ہر تصور کے ساتھ میری نگاہوں کے سامنے تم آ جاتی تھیں۔ میں نے اپنی تحریر پڑھی تو اُن فقرہوں کے سوا جو میں نے تمہارے متعلق لکھے تھے مجھے ہر بات بے ربط نظر آتی تھی، اور میں سوچتی تھی کہ تم ایسا خط پڑھ کر کیا کہو گی۔ چنانچہ میں نے پہلا خط منائع کر دیا پھر شام کو آندھی آئی اور کھل کر بارش ہوئی۔ اب مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ میری بیٹی کی دعاؤں نے کانگرہ کی ہواؤں کا رخ میری طرف پھیر دیا ہے تاکہ میں اطمینان سے اُسے لکھ سکوں چنانچہ میں اُوپر تنہا بیٹھی ہوں اور نیچے یہ کہہ آئی ہوں کہ مجھے آرام کی ضرورت ہے۔ اس لیے کوئی اُوپر نہ آئے۔ میں نے تنہائی کے لیے کمرے کا دروازہ بھی بند کر دیا تھا لیکن بیٹی میں تنہا نہیں ہوں کیونکہ مجھے خط لکھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ تم کسی کو نے میں چھپ کر مجھے دیکھ رہی ہو۔ نہرین کو میں نے لکھ دیا ہے کہ بہن صفی نے اجازت دی تو میں اُس کو یہاں لانے کا کوئی انتظام کروں گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں خود یوسف کے ساتھ چل پڑوں میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی کوئی اور بات نہیں ہو سکتی کہ کانگرہ سے واپسی پر آپ ہمارے گاؤں میں رکیں اور میں آپ کی آمد سے چند دن پہلے گھر پہنچ جاؤں۔ آپ کے ساتھ ملاقات سے پہلے میرے دل میں یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ میں اس سال اچانک کسی دن اپنے گاؤں جاسکوں گی۔ لاہور کے ساتھ آتے دن میری دلچسپیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ لیکن اب یکایک بڑی شدت سے قدرت کی اُن نعمتوں کا احساس ہونے لگا ہے جو میں دماغ چھوڑ کر آتی ہوں۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ جو آسمان جو چاند اور جو ستارے میں اپنے گاؤں میں دیکھا کرتی تھی وہ اس شہر سے بہت مختلف ہیں۔ جس فضا میں میں سانس لیا کرتی تھی وہ

شاید میں کبھی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ آپ اتنا اچھا لکھ سکتی ہیں۔
 ”اچھا بیٹا! اس پر تو میں نے خاص توجہ دی ہے مگر باقی خط ضرور دیکھ
 لو اور انھیں آج ہی روانہ کر دو۔“

باب - ۲۳

جولائی کے دن قدسیہ یوسف اور اُس کے بھائی اور بہنوں کے لیے بڑی خوشی
 کے دن تھے۔

یوسف کی چچا زاد زہرہ بہاول پور میں اپنے سسرال کے گھر سے ایک سالہ بچے کے ساتھ
 آئی ہوئی تھی۔

کانگریس سے باقاعدہ خطوط آیا کرتے تھے اور ہر خط ان کی خوشیوں میں اضافہ
 کیا کرتا تھا۔ فہمیدہ نے جو طویل خط قدسیہ کے خط کے جواب میں لکھا تھا اُسے وہ
 کئی بار پڑھ چکی تھی اور یوسف کو بھی دکھا چکی تھی۔ اس خط میں براہِ راست اُس نے یوسف
 کے ذکر سے اجتناب کیا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ لکھتے وقت بظاہر اُس کی
 ماں سے مخاطب ہے لیکن اُس کے خیالات یوسف پر مرکوز نہیں اور قدسیہ
 جب جواب لکھتی تھی تو اُس کے مبہم سوالات کے جواب میں اُسے یوسف کا تذکرہ
 کرنا پڑتا تھا۔ اگست کی پہلی تاریخ کو ہی گھر میں گاؤں جانے کا پروگرام بننا شروع ہو گیا
 تھا۔ میاں عبدالرحیم نے ان کو اجازت دے دی تھی اور عبدالعزیز صاحب نے
 یوسف کے والد کی طرح عام مصروفیات کی وجہ سے معذوری ظاہر کر دی تھی اور بقیہ
 کو اجازت دے دی تھی کہ وہ یوسف اور اُس کی امی کے ساتھ جاسکتی ہے۔ یوسف بہت
 اچھی طرح کار چلانا سیکھ چکا تھا اور عبدالعزیز نے یوسف سے یہ بھی کہا تھا کہ

زہرہ کی دعوت کی سہ اس لیے آپ کو آنا پڑے گا۔

قدسیہ نے کہا: ”دیکھو رشیدہ رات مجھے نیند نہیں آئی اور اس وقت بھی میری طبیعت خراب ہے۔ تم زہرہ اور باقی تمام بچوں کو ساتھ لے جاؤ اور مجھے گھر میں لیٹنے دو۔“

رشیدہ بولی: ”نہیں وہاں جا کر آپ کی طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔“

”دیکھو رشیدہ ضد نہ کرو۔“

یوسف نے بہت کم اپنی ماں کو یہ کہتے سنا تھا کہ اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ گھبرا کر بولا: ”امی جان! میں ڈاکٹر کو لاتا ہوں۔“

”بیٹا! ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔ کچھ دیر سونے کے بعد میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔ جاؤ تم بھی ان کے ساتھ دعوت میں چلے جاؤ لیکن جلدی واپس آ جانا۔“

”نہیں امی جان۔ میں آپ کے پاس بٹھروں گا اور جب آپ کی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی تو میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔ ابھی کھانے میں کافی دیر ہے۔“

”نہیں بیٹا! نوکر یہاں موجود ہے اور تم رشیم بی بی کو کہو کہ میرے پاس آجائے۔“

رشیدہ بولی: ”چلو بیٹا۔ ہم تمہیں واپس بھیج دیں گے اور باقی اطمینان سے آئیں گے۔ میں چراغ بی بی کو بھی تمہاری امی کی خدمت کے لیے بھیج دوں گی۔“

قدسیہ نے کہا: ”رشیدہ میری فکر نہ کرو۔ رشیم بی بی ہماری پڑوسن ہے۔ چراغ بی بی سے کہو یا آپس ہاتھ دیوار کے قریب جا کر آواز دے۔ وہ فوراً یہاں پہنچ جائے گی۔“

”میں بلاتا ہوں امی جان! یوسف یہ کہہ کر اُٹھا اور بائیں طرف دوسرے مکان کی چھت کے پردے کے اوپر سے جھانکتے ہوئے آواز دی: ”خالہ جی،

خالہ جی۔“

”اب تم ڈرائیور کے بغیر بھی کار اپنے گاؤں تک لے جاسکتے ہو۔“ اور یوسف نے جواب دیا تھا: ”چچا جان! کار اس موسم میں ہمارے گاؤں تک نہیں جاسکتی اس لیے ہم گاڑی یا بس پر جائیں گے۔ اسٹیشن یا لاریوں کے اڈے سے اتر کر ہمیں دو میل ٹانگوں پر جانا پڑے گا۔“

تیرہ اگست کو وہ گاؤں جانے کی تیاریاں مکمل کر چکے تھے۔ اور پندرہ اگست صبح کو انہوں نے بس پر روانہ ہونے کا پروگرام بنایا تھا لیکن چودہ اگست کو انہیں یہ نخط آیا کہ ہم انشاء اللہ یہاں سے بائیس اگست کو روانہ ہوں گے اور جی بھر کر آپ کے علاقے کی سیر کریں گے، ہم اس گاڑی پر آئیں گے جو دن کے وقت آپ کے اسٹیشن پر پہنچتی ہے اور روانہ ہونے سے ایک دن پہلے ہم آپ کو تار بھی دے دیں گے۔ قدسیہ نے اُسی وقت جواب لکھا: ”پیاری بہن! ہم تو آپ کی خاطر چودہ کو وہاں جا رہے تھے۔ اب ہم پانچ چھ دن اور یہاں ٹھہر جائیں گے۔ بائیس اگست کو آپ کا انتظار کیا جائے گا۔ اُس دن اور اُس کے بعد بھی پٹھانکوٹ کی طرف آنے والی دونوں گاڑیاں باقاعدہ دیکھی جائیں گی۔“

اٹھارہ اگست کی صبح امینہ، اُس کی ماں اور چراغ بی بی اُن کے گھر آئیں اور امینہ کی ماں نے قدسیہ سے شکایت کی: ”آپا جان! آپ نے ہمیں زہرہ کے آنے کی اطلاع ہی نہیں دی۔ پرسوں شام اگر بھائی صاحب ہمارے گھر نہ آتے تو ہمیں یہ معلوم ہی نہ ہوتا کہ زہرہ یہاں ہے۔ بہر حال آج دوپہر کا کھانا آپ کو ہمارے ہاں کھانا ہوگا اور ہم انتظام کر کے آتے ہیں۔“

قدسیہ نے کہا: ”بہن! اگر یوسف کے ابا ہمارے گھر پرسوں گئے تھے تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ کل دورے پر چلے گئے ہیں۔“

”جی، مجھے معلوم ہے۔ لیکن آج امینہ کے ابا بھی تو گھر پر نہیں ہیں۔ ہم نے

خاموش پڑی تھی اور اُس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اُسے کوئی تکلیف ہے اس لیے اُسے بڑی آنکھیں ہو رہی تھیں۔

یوسف کمرے میں داخل ہوا اور اُس نے ایک ہاتھ ماں کی پیشانی پر رکھ دیا اور دوسرے ہاتھ سے اُس کی نبض دیکھنے لگا۔ ماں نے آنکھیں کھولیں۔ بیٹا، تم انہیں راستے میں چھوڑ کر واپس آگئے ہو؟

”نہیں امی جان۔ میں بے چین ضرور تھا لیکن انہوں نے مجھے روکنے کی بجائے ہمارا بھی اور خالہ کا بھی کھانا موڑ میں رکھوا دیا تھا۔ نوکر اُور لارہا ہے۔ آپ ہاتھ دھو کر تیار ہو جائیں۔“

ماں نے کہا: ”بیٹا کھانا دوسرے کمرے میں رکھواؤ اور تم وہیں بیٹھ کر کھا لو۔ ریشم بی بی تم بھی اپنے میاں اور بچوں کو بلا کر انہیں کھلا دو۔ میرے لیے ایک بالٹی یہاں رکھ دو اور غسل خانے سے باہر بھی پانی کا انک لٹا رکھوا دو۔“

یوسف نے پریشان ہو کر پوچھا: ”امی جان کیا بات ہے؟“

”کچھ نہیں بیٹا۔ تم جا کر کھانا کھاؤ اور ریشم بی بی کے بچوں کو بھی بلاؤ، وہ بھوکے ہوں گے۔ بھائی حسین علی جب گھر آئے تو نوکر سے کہنا کہ اُن کا کھانا وہیں پہنچا دے۔“

”انہیں میں بلا لیتا ہوں امی جان! لیکن اب کی طبیعت خراب ہو رہی ہے میں پہلے ڈاکٹر کو لے آتا ہوں۔“

”بیٹا میری بات مانو تم کھانا شروع کرو گے تو شاید میں بھی تمہارے ساتھ آکر دو ٹھٹھے کھا لوں۔ اس وقت مجھے تلخی سی محسوس ہو رہی ہے اور جی بھی کچھ متلا رہا ہے۔ ریشم بی بی کہہ رہی تھی کہ ابھی لمبوں کے شربت کے دو ٹھنڈے گلاس پینے سے میری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔“

ایک چوبیس پچیس سال کی عورت پردے کے اُوپر سے اس طرف آگئی اور یوسف نے کہا: ”خالہ جان! آپ امی جان کا خیال رکھیں میں ابھی آتا ہوں۔“

”خدا خیر کرے کیا ہوا آپا جی کو؟ ریشم بی بی نے جلدی سے نجلی چھت عبور کر کے بالائی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

قدسیہ نے کہا: ”ریشم بی بی تمہیں یوسف کی تسلی کے لیے کچھ دیر میرے پاس بیٹھنا پڑے گا۔ ورنہ ہمارے یہ مہمان ناراض ہو جائیں گے۔“

رشدہ نے کہا: ”ماں بہن یہ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی ہم ان کی دعوت کر بیٹھی تھیں اور آپا جی کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔“

یوسف باورِ خواہش اُن کے ساتھ مکان سے نکل گیا اور قدسیہ بستر پر لیٹ گئی اور ریشم بی بی نے اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا: ”آپا میں آپ کے ہاتھ پاؤں دبا دوں۔“

”نہیں بہن! مجھے پانی پلا دو اور نوکر سے کہو کہ وہ نیچے ہی کھانا تیار کر دے۔“

قدسیہ کچھ دیر لیٹے لیٹے باتیں کرتی رہی اور پھر اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔

بالائی منزل کے دو کشادہ کمروں اور یوورچی خانے کے سامنے خالی چھت کے دو حصے تھے۔ وہ حصہ جو ڈیوڑھی اور بیٹھک کے اُوپر تھا کوئی پانچ فٹ اوچی دیوار نے باقی چھت سے علیحدہ کر رکھا تھا۔ اس چھوٹے حصے پر بیت الخلاء اور غسل خانہ تھا۔ بڑے حصے میں کھلا کشادہ جنگلا تھا جس سے روشنی بچے حصے میں جاتی تھی۔

ریشم بی بی ایک خوش طبع عورت تھی اسے ہر وقت ہنساتے دیکھا جاتا تھا۔ اگر مستند قدسیہ کے پاؤں دبانے یا کسی اور کام کا ہوتا یا اگر وہ اُس کے ساتھ باتیں کر سکتی تو اُسے وقت کٹتا محسوس نہ ہوتا لیکن قدسیہ آنکھیں بند کیے

”لیکن مجھے ڈر ہے کہ پانی پیتے ہی مجھے قے آجائے گی۔“
 ”امی جان کچھ نہیں ہوگا۔ میں ابھی حکیم صاحب کے پاس جاتا ہوں۔ اُن سے پوچھ کر صندل یا اُس سے کوئی اور اچھا شربت اور تازہ نیوں لے آتا ہوں۔“
 ”ماں بیٹا جلدی کرو اور برف بھی لے آنا۔“

باب = ۲۲

یوسف اُٹھ کر دوسرے کمرے میں گیا تو قدسیہ اپنے بستر پر نہیں تھی۔ بستر کے ساتھ اُس کے سلیپر غائب پا کر اُسے قدسے اطمینان ہوا۔ وہ دبے پاؤں چھت کے دوسرے حصے کی طرف نکل گئی ہے۔ اُس نے باہر نکل کر جھانکا تو پانی سے بھرا ہوا لٹا بھی اپنی جگہ پر نہیں تھا۔ وہ بستر کے ساتھ کُرسی پر بیٹھ کر ماں کا انتظار کرنے لگا۔ چند منٹ گزر گئے اور وہ اپنے دل میں اضطراب محسوس کرنے لگا۔ ریشم بی بی کمرے میں داخل ہوئی تو اُس نے مضطرب ہو کر کہا ”خالہ جان مجھے معلوم نہیں امی جان کس وقت دوسری چھت پر گئی تھیں لیکن جب میں کھانا کھا کر آیا تھا تو وہ یہاں نہیں تھیں۔ اب انھیں کافی دیر ہو گئی ہے۔ آپ اُس طرف جائیں اور پانی کا ایک اور لٹا دیاں رکھوا دیں۔ شاید انہیں ضرورت ہو۔“

ریشم بی بی پانی کا ایک اور لٹا بھر کر دوسری چھت کی طرف چلی گئی۔ چند منٹ اور گزر گئے اور یوسف کے اضطراب کی شدت میں اضافہ ہونے لگا۔

دیہاتی عورتیں طلوع آفتاب سے بہت پہلے یا شام دھندلکے کے بعد اپنے گھروں سے باہر نکلتی تھیں اور جلد ہی واپس آجایا کرتی تھیں۔ قدسیہ ایک انتہائی صحت مند دیہاتی عورت تھی اور شہر میں آکر بھی اُس کی یہی حالت تھی کہ کسی نے اُس کو دن کے وقت بیت الخلا کی طرف آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ میریا کے

یوسف بھاگتا ہوا نیچے کی طرف گیا تھوڑی دیر بعد اُس نے واپس آکر حکیم صاحب کے تجویز کردہ شربت میں نیوں کا رس اور پانی ملا کر ایک بڑا جگ تیار کیا اور ایک گلاس بھر کر اپنی ماں کو پیش کر دیا۔ قدسیہ نے جلدی سے پینے کے بعد کہا۔ ”بیٹا ایک گلاس اور بھر دو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے اندر آگ لگ رہی ہے۔ دوسرا گلاس پینے کے بعد اُس نے تکیہ پر سر رکھتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا اب تم کھانا کھا لو اور شربت کی بجائے خالی پانی کا ایک جگ برف ڈال کر پتائی پر رکھ دو۔ اگر میں سو جاؤں تو سمجھنا کہ میری تکلیف دور ہو گئی ہے۔ لیکن اگر تم نے کھانا نہ کھایا تو مجھے چین نہیں آئے گا۔“

یوسف نے کہا۔ ”آپ کچھ تو کھالیں۔“

بیٹا اگر میں نے کچھ کھایا تو مجھے قے آجائے گی۔ جاؤ نا۔“

یوسف نے دوسرے کمرے میں جا کر ریشم بی بی اس کے چہرہ سالہ سوتیلے بیٹے نظیر احمد اور اس کی چار سالہ بیٹی خدیجہ کے ساتھ بیٹھ کر تھوڑا سا پلاؤ کھایا اور جلدی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ”خالہ آپ اطمینان سے کھاتیے میں امی کے پاس جاتا ہوں۔“

ریشم بی بی نے کہا۔ ”بیٹا اگر وہ سو جائیں تو انھیں جگانے کی کوشش نہ کرنا۔“

موسم کے سوا اُسے کبھی بخار بھی نہیں ہوا تھا۔ جب یوسف کو اُس کا انتظار ناقابلِ برداشت محسوس ہونے لگا تو اُس نے چھت کے دوسرے حصے کی دیوار کے قریب جا کر آواز دی
"خالہ! خالہ!"

ریشم بی بی نے جواب دیا۔ "بیٹا گھبراؤ نہیں۔ میں ابھی تمہاری امی جان کو لے کر آتی ہوں۔"

یوسف چند قدم پیچھے ہٹ کر چوبارے کے سائے میں کھڑا ہو گیا۔

ریشم بی بی قد سب کو سہارا دیتے چھت کے دوسرے حصے سے نمودار ہوئی۔ قد سب کا چہرہ زرد تھا اور ریشم بی بی کے ساتھ چلتے ہوئے اُس کی ٹانگیں لٹکھڑا رہی تھیں۔ یوسف نے بھاگ کر قد سب کو دوسری طرف سے سہارا دیتے ہوئے کہا۔
"خالہ جان۔ آپ چھوڑ دیں۔ میں انھیں اندر لے جاتا ہوں۔"

"اچھا بیٹا۔ تم انہیں آرام سے لاؤ۔ یہ بانہ سائے میں لیٹنا چاہتی ہیں۔ میں جلدی سے وہاں چار پانی ڈال دیتی ہوں۔"

اور پھر یوسف اُسے ایک کشادہ چار پانی پر لٹاتے ہوئے کہہ رہا تھا "امی جان! کیا ہوا آپ کو؟ آپ نے مجھے ڈاکٹر بلانے سے کیوں منع کیا تھا۔؟"

"بیٹا! ماں نے تکیہ پر سر رکھتے ہوئے کہا۔ "میں ٹھیک ہوں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ریشم بی بی یہ بالٹی اُدھر رکھ دو اور مجھے ٹھنڈا پانی پلاتی رہو۔"

یوسف بولا خالہ وہ جگ برف والے پانی سے بھرا ہے۔

"میں ڈاکٹر کو لاتا ہوں" یوسف جلدی سے اُٹھا اور بھاگتا ہوا نیچے چلا گیا۔ کوئی

بیس منٹ بعد یوسف محلے کے مشہور ڈاکٹر کو لے کر پہنچ گیا۔ اُس نے دو دوائیاں اپنے تھیلے سے نکال کر دیں اور دو کاغذ پر لکھ کر بازار سے منگوانے کے لئے کہا۔ یوسف نے اُس کے ہاتھ سے کاغذ لیتے ہوئے کہا "میں ابھی لے آتا ہوں لیکن امی جان

کی پیاس کا فوراً کوئی علاج کیجئے۔ یہ سخت پیاس کے باوجود پانی اس لیے نہیں پیتیں کہ اُسی وقت تھے نہ آجائے۔"

"بیٹا، تم نوکر سے کہو کہ پانی اُبال کر ٹھنڈا کرے۔ برف پانی میں نہ ڈالے۔ بلکہ پانی والا برتن برف کے اُپر رکھ دے۔ جو دوائی میں منگوارا ہوں وہ پانی میں ڈال کر پلائی جائے گی اور پھر تھے نہیں آئے گی۔ ان کے جسم سے بہت سا پانی صانع ہو چکا ہے۔ ان کا علاج فوراً شروع ہو جانا چاہیے۔"

یوسف بولا۔ "ڈاکٹر صاحب جو اچھی سے اچھی دوائی ہے وہ مجھے لکھ دیں اور اس بات کی پروا نہ کریں کہ اُس کی قیمت کیا ہے؟"

"بیٹا جو اچھی دوائیاں تھیں وہ میں نے لکھ دی ہیں اور میں تمہاری گفتگو سے ان کی بیماری کے متعلق سمجھ گیا تھا۔ اس لیے دوائیاں اپنے ساتھ بھی لے آیا تھا۔" آپ میرے آنے تک یہاں ٹھہریں گے نا۔
"ہاں بیٹا۔ تم جاؤ۔"

یوسف نے نیچے اترتے ہوئے نوکر سے کہا۔ "تم کسی بڑے دیکھے میں پانی اچھی طرح اُبالو اور پھر چھوٹے برتنوں میں ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دو۔ ایک دیکھی حبلی ٹھنڈی کرنے کے لیے نیچے سے بہت ساری برف بھی لے آؤ تاکہ ٹھنڈے پانی میں فوراً دوائی ڈال کر امی جان کو پلائی جاسکے۔"

چند منٹ بعد یوسف واپس آ گیا۔ دیکھی کے پانی کو اُبال آیا تو ریشم بی بی نے اپنے خاوند حسین علی کو بھیج کر کوئی بیس سیز برف کی ایک سیل منگوالی اور دیکھی کی بجائے تین کٹورے بھر کر اُس پر رکھ دیئے۔ ڈاکٹر نے پانی میں ایک دوائی ملا دی اور جب وہ ذرا ٹھنڈا ہوا تو ریشم بی بی نے ایک کٹورا اُٹھا کر اُس کے منہ کو لگاتے ہوئے کہا۔ "بہن پنی لیں۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ انہوں نے اس میں جو دوائی ڈالی ہے اُس کی وجہ

یوسف نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”امی جان ڈاکٹر کہتا تھا کہ آپ کے جسم میں سے پانی کا ختم ہو جانا بہت خطرناک ہے۔ پتہ نہیں آتا جان ابھی تک کیوں نہیں آتے درنہ میں انکل عبدالعزیز کو ساتھ لے کر جاتا اور کسی بڑے ڈاکٹر کو یہاں لے آتا۔“
زہرہ نے کہا۔ ”ابا جان تو سیدھے ان کے گھر پہنچے تھے اور کھانا کھا کر وہیں سو گئے تھے۔“

امینہ نے کہا۔ ”میں جاتی ہوں اور میاں صاحب اور اپنے ابا کو خبر دیتی ہوں۔ ابا جی یہاں کے ہر بڑے ڈاکٹر کو جانتے ہیں۔ چراغ بی بی جب تک خالہ جی ٹھیک نہیں ہوتیں تم نہیں رہو گی۔ یوسف صاحب مجھے اجازت ہے نا۔“
”جی میں آپ کا شکریہ گزار ہوں لیکن جلدی جاتی ہے۔“

وہ تیزی سے زینے سے اترنے لگی اور یوسف نے پہلی بار دیکھا کہ وہ بہت نفیس کپڑے پہنے ہوئے تھی۔

یوسف نے جھٹکے کے قریب جا کر نوکر کو آواز دے کر کہا۔ ”تم بھاگ کر حکیم صاحب کے پاس جاؤ اور انہیں کہو کہ امی جان کو پانی پیتے ہی قے آجاتی ہے۔ ڈاکٹر جو دوائیاں دے کر گیا وہ بھی ان کے اندر نہیں ٹھہرتیں۔ کوئی ایسا عرق بھی دے دیجئے جس سے انہیں قے نہ آئے۔ میں دس روپے کا نوٹ نیچے پھینک رہا ہوں۔ یہ اٹھاؤ اور بھاگ کر جاؤ۔“

قدسیہ نے لیٹے لیٹے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا اور صغریٰ جو سہمی ہوئی ایوب کے ساتھ بستر کے قریب کھڑی تھی بولی۔

”بھائی جان اُمی آپ کو بلا رہی ہیں۔“

یوسف جلدی سے ماں کے سر ہانے کے باتیں طرف بیٹھ گیا۔ قدسیہ نے اپنا ہاتھ اُس کی گردن میں ڈال کر اُسے اپنی طرف کھینچا اور پھر اُس کا سر دونوں ہاتھوں

سے آپ کو اب قے نہیں آتے گی۔“
قدسیہ نے جلد ہی کٹورا خالی کر دیا اور اس کے چہرے پر معمولی سی تازگی آ گئی۔ ڈاکٹر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”یوسف بیٹا! اب میں جاتا ہوں۔ آپ کو جب بھی ضرورت پڑے نوکر کو بھیج دیں۔ اپنی ماں کو تھوڑا تھوڑا پانی پلاتے رہیں۔ اگر انہیں نیند آجائے تو یہاں کوئی شور نہیں ہونا چاہیے۔“

ڈاکٹر چلا گیا تو قدسیہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ یوسف ریشم بی بی کو خاموشی سے بیٹھنے کا اشارہ کر کے نیچے چلا گیا اور وضو کرنے کے بعد بیٹھک میں نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ زہرہ، امینہ اور چراغ بی بی جن کے پیچھے دوہرے پتے آ رہے تھے کار سے اتر کر باتیں کرتی ہوئی ڈبوڑھوں میں داخل ہوئیں اور نچلے کمروں میں جھانکنے کے بعد اوپر چلی گئیں۔ زہرہ ان کے پیچھے اور امیرانہ ٹھاٹھ کا ذکر کرنے کے لیے بے چین تھیں لیکن قدسیہ کی حالت دیکھ کر اس کی زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔ قدسیہ نے آنکھیں کھولے بغیر۔ ”ریشم بی بی مجھے پانی دو۔“ کہا

ریشم بی بی نے اُسے سہارا دے کر اٹھایا اور دوائی ڈالنے پانی کا ایک کٹورا پلا دیا۔

قدسیہ نے تکیے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔ ”میری بہن بہت سے پانی میں دوائی ڈال دو۔ معلوم ہوتا ہے کہ آج ہی مجھے آرام آجائے گا۔ پانی کا ایک کٹورا اور بال بول۔ اس گھر میں سب کو ابلا ہوا پانی پینا چاہیے۔“

یوسف دعائیں کرتا ہوا اوپر آیا اور ماں کو باتیں کرتا دیکھ کر اسے اطمینان محسوس ہوا لیکن قدسیہ اچانک اس طرف جھک گئی جدھر بالٹی رکھی ہوئی تھی اور پھر اسے قے شروع ہو گئی۔ زہرہ نے اُس کے سر کو سہارا دے رکھا تھا جب اُسے ٹا دیا گیا تو اُس نے کہا۔ ”ریشم بی بی مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ اب میں مانگوں تو بھی مجھے پانی نہ دینا۔“

وہ ٹھیک ہیں۔ میں دو اور دوائیاں بھیج دوں گا۔ اگر انہیں نیند آجائے تو یہ سمجھ لیجئے کہ ان کی بیماری دور ہو جائے گی۔ گھر میں سب اُبلایا پانی پئیں اور مریضہ کے پانی میں دوائی کے ساتھ کچھ نمک بھی ڈال دیا کریں۔ جو دوائیاں میں بھیجوں گا وہ تین تین گھنٹے کے بعد دینی ہیں اور یہ جو آپ کے پاس پڑی ہوئی ہیں یہ بھی اسی طرح دینی ہیں جیسے ڈاکٹر صاحب آپ کو سمجھا گئے ہیں لیکن اگر یہ سو جائیں تو انہیں دوائی دینے کے لیے جگانے کی ضرورت نہیں۔ جب ٹیکہ لگانے والے آئیں تو آپ اپنے لیے ان لوگوں کو بھی ٹیکہ لگوا دیں جو یہاں آئے ہوئے ہیں۔ اس موسم میں مریضہ کے پھیل جانے کا بہت خطرہ ہوتا ہے۔“

یوسف نے ذرا جرات سے کام لیتے ہوئے کہا: ”ڈاکٹر صاحب، حکیم صاحب نے پیغام بھیجا ہے کہ پیاز کا پانی نکال کر پلا دیا جائے۔“
بوڑھے ڈاکٹر نے کہا: ”بیٹا! اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے یہ مفید ہو مگر مجھے اس کا کوئی تجربہ نہیں۔“

مقوڑی دیر بعد ڈاکٹر وہاں سے رخصت ہونے لگا تو عبدالکریم نے کہا: ”میاں صاحب! ہم ڈاکٹر صاحب کو پہنچانے کے بعد آپ کی دوائی لے آئیں گے، آپ یہیں بیٹھے رہیں۔“

یوسف انہیں نیچے چھوڑنے آیا تو اس نے عبدالکریم سے کہا: ”میاں صاحب! میں امینہ کا بہت شکریہ گزار ہوں۔ انہوں نے ہمارے لیے بہت تکلیف اٹھائی ہے۔“

امینہ بولی: ”یوسف صاحب! یہ میرا فرض تھا۔“
عبدالکریم نے ڈاکٹر سے مخاطب ہو کر کہا: ”ڈاکٹر صاحب آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم ہسپتال سے ٹیکہ لگوا کر ہی گھر جائیں؟“

میں تھام کر اُس کی پیشانی چومنے لگی۔
”میرے بیٹے“ وہ نجیف آواز میں کہہ رہی تھی۔ ”میں تمہیں مغموم نہیں دیکھ سکتی۔“

”امی جان! اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں مغموم نہیں ہوں۔ جب آپ ٹھیک ہو جائیں گی تو لوگوں کو دُور دُور تک میرے قہقہے سنائی دیں گے۔“
نور کر آیا اور اُس نے ایک تھیلا ریشم بی بی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا: ”حکیم صاحب نے عرق کی چار بوتلیں دی ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ ان میں سے ایک چائے کی پیالی کے برابر نکال کر باری باری پلاتے جائیں اگر اس کے باوجود متلی آئے تو پیاز کا پانی پئیں۔ ایک پیالی پلا دیں اور انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ انشاء اللہ بی بی جی کو پیاز کا پانی پینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ آپ یہ عرق دیتے جائیں جب ختم ہو جائے تو اور منگوالیں۔“
یوسف نے کہا: ”اچھا! تم یاد۔“

زہرہ پیالی لے آئی اور اُس نے ایک بتل سے عرق نکال کر ماں کو پلا دیا۔ چند منٹ بعد قدسیہ نے کہا: ”مجھے اور دو“ زہرہ نے دوسری بتل سے عرق نکال کر پلا دیا اور قدسیہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ چند منٹ بعد میاں عبدالرحیم اور عبدالکریم ایک ڈاکٹر کے ساتھ وہاں پہنچ گئے اور عورتیں ایک طرف ہٹ گئیں۔ ڈاکٹر کے سوالات کے جواب میں یوسف نے اپنی ماں کی بیماری کی ساری تفصیل بیان کر دی۔ ڈاکٹر نے مریضہ کا سر سری معائنہ کرنے کے بعد ہی میاں عبدالرحیم سے یہ کہہ دیا کہ ”یہ مہینے کا کیس ہے۔ آپ کو پانی پلاتے رہنا چاہیے۔ یہ جو عرق ہیں اس کے متعلق میں اطمینان سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر انہیں باقاعدہ کشید کر کے بنایا گیا ہے تو ٹھیک ہیں ورنہ ان سے بھی پرہیز کرنا ہی بہتر ہوگا۔ میں ابھی باقی سب کو ٹیکہ لگوانے کا انتظام کرتا ہوں۔ جو دوائیاں پہلے ڈاکٹر صاحب دے گئے

”ہاں، جی ہاں! احتیاط کا مطلب تو یہی ہے۔“

عبدالکریم نے یوسف سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”یوسف صاحب آپ ایسا کریں کہ اپنے نوکر کو ہمارے ساتھ بھیج دیں تاکہ وہ دوائی لے کر فوراً واپس آجائے کیونکہ اسکے بعد ہسپتال جا کر ہمیں شاید کچھ دیر لگ جائے۔“

یوسف بھاگتا ہوا اوپر گیا۔ اُس نے نوکر سے کہا۔ ”دیکھو بیاں عبدالکریم صاحب، ڈاکٹر صاحب کو گھر پہنچا کر ٹیکے لگوانے کے لیے ہسپتال جاتیں گے تم ان کے ساتھ جاؤ اور فوراً دوائی لے کر تانگے پر واپس آ جاؤ۔“

نوکر نیچے پہنچ کر ڈیوڑھی سے باہر نکل رہا تھا کہ چراغ بی بی نے بھاگتے ہوئے کار کا دروازہ کھولا اور امینہ کے ساتھ بیٹھ گئی۔ عبدالکریم نے کھسیانا ہو کر پھر اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے کہا ”چراغ بی بی! اچھا ہوا تم آگئیں ورنہ ہمیں ٹیکے لگانے والوں کو گھر بلانا پڑتا۔“

کار اسٹارٹ ہوتی تو ایوب بھاگتا ہوا نیچے آیا۔ ”ٹھہریے۔ بھائی جان کہتے ہیں کہ شاید صبح ہوتے ہی انکل عبدالعزیز اور جی جان ہمارے گھر آجائیں۔ اس لیے انہیں یہ اطلاع دینا ضروری ہے کہ ہمارے محلے میں مہینہ پھیل رہا ہے اور امی جان بیمار ہیں۔“

”اچھا بیٹا! عبدالکریم نے جواب دیا۔ ”ہم ضرور ان کو اطلاع دے دیں گے۔“ انہوں نے تھوڑی دیر بعد ادویات کی ایک دکان سے نوکر کو ادویات دے کر واپس بھیج دیا اور کارڈاکٹر کے مکان کی طرف چل پڑی۔

ڈاکٹر نے کہا ”بہت سمجھ دار لڑکا معلوم ہوتا ہے۔ ہر انسان کو ایسا ہی ہونا

چاہیے۔“

عبدالکریم بولا۔ ”جناب امینہ کا خیال تھا کہ اگر ہم فوراً اٹھ کر چل پڑے تو

یوسف ناراض ہو جائے گا۔ حالانکہ ایک پڑھے لکھے آدمی کو ایسی بات پر ناراض نہیں ہونا چاہیے اور میری یہ بیٹی امینہ کسی کو ٹیکے لگتے ہوئے دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ اب آپ اگر اسے یہ مشورہ دیں کہ بیٹھنے سے بچنے کے لیے ایک ہی وقت میں تمہیں دس ٹیکے لگوانے پڑیں گے تو اس کے لیے بھی تیار ہو جائے گی۔“

امینہ بولی۔ ”ابا جی میں آپ کے ساتھ اس لیے جا رہی ہوں کہ ٹیکے لگانے والے کو یوسف صاحب کے گھر لے آؤں کیونکہ ان سب کو ٹیکے لگوانا زیادہ ضروری ہے۔“ عبدالکریم نے جواب دیا۔ ”ٹھیک ہے بیٹی یہ زیادہ بہتر ہو گا کہ ہم ہسپتال سے کسی کمپونڈریا ڈاکٹر کو اپنے گھر لے آئیں اور وہاں سے اپنے ڈرائیور کے ساتھ یوسف کے گھر بھیج دیں۔“

چراغ بی بی بولی ”ہاں جی بلاوجہ خطرہ مول لینا ٹھیک نہیں ہوتا۔ میری نانی کہتی تھی کہ ایک دفعہ ہمارے گاؤں میں مہینہ۔“

امینہ نے تلملا کر کہا ”خدا کے لیے چپ رہو، ورنہ موٹر کہیں ٹکرا جائے گی۔“ چراغ بی بی اپنا فقرہ پورا نہ کر سکی۔

ڈاکٹر بولا ”دیکھو بی بی کار چلانے والے کو کبھی پریشان نہیں کرنا چاہیے۔ بیٹی امینہ تمہارا جذبہ قابلِ داد ہے لیکن تمہیں اپنا ٹیکہ لگوانے میں بھی ذرا تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ میں اپنے گھر پہنچتے ہی ہسپتال کے کسی ذمہ دار آدمی کو ٹیلی فون کر دوں گا اور انشاء اللہ وہ تمہیں ہسپتال پہنچتے ہی فارغ کر دے گا اور کوئی کمپونڈریا تمہارے ساتھ جانے کے لیے بھی تیار ہو گا۔ اس کے بعد پہلے تم اپنے گھر پہنچو اور ٹیکے لگانے والے کو اپنے ڈرائیور کے ساتھ یوسف کے گھر بھیج دو۔“

امینہ نے افسردہ لہجے میں کہا اگر ابا جی کی طرح آپ کا بھی یہی حکم ہے کہ میں صرف صبح

کی اتنی کی خدمت نہ کروں تو میں آپ کے گھر سے ڈرائیور کو فون کر دوں گی کہ وہ تیار ہو کر کوٹھی کے گینٹ پر کھڑا رہے تو پھر عبدالعزیز صاحب کو اطلاع دوں گی۔ ڈاکٹر صاحب آپ ہسپتال والوں کو یہ ضرور کہہ دیں کہ یوسف صاحب کے گھر اور پڑوس میں بہت سے لوگوں کو ٹیکے کی ضرورت پڑے گی۔

”بیٹی تم فک نہ کرو۔“

ایک گھنٹہ بعد کار عبدالکریم کی کوٹھی کے پھاٹک پر رکی اور وہ اتر پڑے۔ میاں عبدالکریم نے حیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر ہسپتال کے ملازم کو دیتے ہوئے کہا ”بھائی یہ لیجئے اور یوسف صاحب کے گھر جتنے آدمی ہوں انہیں ٹیکہ لگا دیجئے، ان کے پڑوسیوں کو بھی ٹیکہ لگانا ضروری ہے۔ شاید وہاں پولیس کے ایک بڑے افسر بھی آئیں۔“

”میاں صاحب یہ سب کام ان پیسوں کے بغیر بھی ہو جاتے گا۔“
”نہیں بھائی یہ پیسے لینے ہی پڑیں گے اور میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اتنی تکلیف اٹھائی ہے۔“

”اچھا میاں جی آپ کا شکریہ۔“

ڈرائیور نے کار سٹارٹ کر دی اور میاں عبدالکریم جیسے تھکاوٹ کے ساتھ ہیٹھ کے ٹیکے کی تکلیف بھی ہو رہی تھی۔ اچانک امینہ پر برس پڑا۔ ”رشیہ کو تم نے گھر آکر یہ کیوں نہیں بتایا تھا کہ یوسف کی امی کو ہینہ ہو گیا ہے۔ کتنے آرام سے یہ خبر سنائی تھی کہ یوسف کی امی کی طبیعت خراب ہے اور جب میں اُس کی تیمارداری کے لیے تیار ہو گیا تھا تو بھی تمہیں یہ خیال نہ آیا۔ ہینہ ایک ایسا مرض ہے جو تیمار داروں کا بھی لحاظ نہیں کرتا۔“

”ابا جی، آپ کیوں پریشان ہیں اب تو آپ نے ٹیکہ بھی لگوا لیا ہے۔“

عبدالکریم نے ذرا نرم ہو کر کہا ”مجھے اس بات پر غصہ آ رہا ہے کہ تم اپنی ماں کو بھی ہمارے ساتھ گھسیٹ رہی تھی لیکن میں اس بات پر خوش ہوں کہ آج تم نے ٹیکہ لگواتے وقت چیخ نہیں ماری۔“

چراغ بی بی بولی: ”میاں جی میں نے بھی چیخ نہیں ماری۔“

امینہ نے کہا: ”لیکن پسینہ تو آگیا تھا تم کو اور آنکھیں بھی بند کر رکھی تھیں تم نے۔ یہ کیوں نہیں کہتی کہ موت کے خوف نے تمہارے اندر چنچیں مارنے کی طاقت نہیں چھوڑی تھی؟“

”مرنے سے کون نہیں ڈرتا۔ آپ کو تو وہاں سے بھاگنے کی اتنی جلدی تھی کہ مجھے بھول ہی گئی تھیں اور اب بھی کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ٹیکے جو اُس بھینگے سے کمپنڈر نے ہم کو لگا دیتے ہیں۔ ہینے کو روک لیں گے۔ ایک دن پہلے قدسیہ بیگم کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ وہ کبھی بیمار بھی ہو سکتی ہیں اور چند گھنٹوں کے اندر اندر وہ اتنی کمزور ہو سکتی ہیں کہ کوئی پہچان بھی نہ سکے۔ خدا کی قسم مجھے تو اُن کی طرف دیکھ کر خوف آتا تھا۔“

امینہ نے کہا ”دیکھو چراغ بی بی۔ کچھ پڑھنا شروع کر دو ورنہ تمہیں ہینہ ہو گیا تو تمہیں دیکھنے والے ڈر کر چنچیں ماریں گے۔ ابا جی دیکھئے اس کا رنگ بدل نہیں رہا؟“
رشیہ نے باہر آکر کہا: ”آپ اندر کیوں نہیں آتے، کیا حال ہے آپا قدسیہ کا؟“

”جی وہ...“ چراغ بی بی کوئی موزوں الفاظ سوچ رہی تھی لیکن امینہ نے غضب ناک ہو کر کہا: ”خدا کے لیے تم چپ رہو۔“ اور چراغ بی بی غصے سے بل کھاتی ہوئی مکان کے ایک کونے میں غائب ہو گئی اور امینہ نے آبدیدہ ہو کر کہا: ”امی جان اُن کی حالت اچھی نہیں آپ دُعا کریں۔“

ہو جاتے گی۔“

قدسیہ نے نحیف سی آواز میں کہا: ”ماں! میرا بستر اندر ہی کر دو اور میرے اوپر کبیل یا رضائی بھی ڈال دو مجھے سروی محسوس ہو رہی ہے۔“

زہرہ نے جلدی سے ایک چار پائی پر صاف بستر بچھایا اور پھر یوسف کی مدد سے اسے سہارا دے کر اندر لٹا دیا اور اُس کے اوپر کبیل ڈال دیا۔ ایوب اور صغریٰ نے گھر میں پڑے کھلنے سے کچھ کھالیا۔ حسین علی ٹیشے کے ایک جگ میں پیاز کا رس نکال کر لے آیا۔ جب زہرہ نے اُس میں سے ایک پیالی بھر کر قدسیہ کو پیش کی تو وہ ہچکچائی اور پھر یکایک آنکھیں بند کر کے دو گھونٹ پی لیں اُس کا جی بُری طرح متلارہا تھا۔

حسین علی نے کہا: ”میاں جی! حکیم صاحب یہ بھی کہتے تھے کہ اگر بیگم صاحبہ کو پیاز کے رس سے متلی آنے لگے تو انہیں الائچی کا عرق چھچھ کے ساتھ آہستہ آہستہ شروع کر دیں پھر ذرا طبیعت بحال ہو جائے تو یہ چند گھونٹ پیاز کا رس اور پی لیں اگر پانچ منٹ بھی وہ اندر ٹھہر گیا تو انہیں قے نہیں آئے گی۔“

جلدی سے الائچی کے عرق کی بوتل سے ایک چمچ بھر کر سامنے کیا تو ماں نے لیٹے لیٹے منہ کھول دیا اور عرق حلق کے اندر اتارنے کے بعد آنکھیں بند کر لیں پانچ منٹ اور گزر گئے تو یوسف نے قریب جا کر کہا: ”امی جان! ایک اور پلا دوں؟“

ماں نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ عشاء کی اذان کی آواز سنائی دی تو ماں نے کہا: ”بیٹا جاؤ نماز پڑھ لو۔“

”نماز میں کافی وقت ہے امی جان! میں چاہتا ہوں کہ آپ ذرا ٹھنیک ہو جائیں الائچی کا عرق اور دوں امی جان!“ اُس نے ماں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

”بیٹا! میرا خیال ہے کہ اب میں پیاز کا رس پی سکتی ہوں۔“

یوسف نے پیالی سے پیاز کے رس کا چمچ بھر کر آگے کیا اور قدسیہ نے

عبدالکریم بولا: ”اُس بیچاری کو ہیشہ ہو گیا ہے۔“

رشدیدہ بولی: ”اللہ اُس پر فضل کرے، جاؤ بیٹی تم بھی نماز پڑھ کر دعا کرو۔“ اور امیدہ زندگی میں پہلی بار انتہائی عجز و انکسار کے ساتھ دعا مانگ رہی تھی۔

”یا اللہ یوسف کی امی کو شفا دے۔ یا اللہ یوسف کو اس قدر پیار کرنے والی ماں کے سامنے سے محروم نہ کیجیو۔“

یوسف نے مغرب کی نماز مسجد میں جا کر پڑھی، دیر تک انتہائی سوز و گداز کے ساتھ ماں کی صحت کے لیے دعا کرتا رہا۔ واپس گھر آتے ہوئے وہ قدم قدم پر رُک کر دعا مانگ رہا تھا۔ یا اللہ جب میں گھر پہنچوں تو مجھے زینے پر چڑھتے ہوئے امی جان کے تھکے سسٹائی دیں اور انہیں دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہو کہ اُن کی بیماری کے متعلق جو میں سارا دن دیکھتا رہا وہ سب ایک خواب تھا لیکن جب وہ ماں کے قریب پہنچا تو اس پر ایک نظر ڈالتے ہی اُس کا دل بٹھ گیا۔ اُس نے زہرہ سے مخاطب ہو کر کہا: ”انہیں پھر قے آئی ہے۔“

”ماں بھائی! جو دوائی نوکر لے کر آیا ہے وہ بھی ان کے اندر نہیں ٹھہری۔“

یوسف نے کہا: ”دوائی اندر نہ ٹھہرنے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بند کر دی جائیں کم از کم ابلا ہو پانی انہیں تھوڑا تھوڑا ضرور پلاتے رہیں۔“

یوسف کے باپ نے کہا: ”بیٹا! حکیم صاحب ابھی دیکھ کر گئے ہیں اور انہوں نے یہ کہا تھا کہ پیاز کا پانی نکال کر پلانے سے قے بند ہو جاتی ہے۔ میں نے حسین علی کو کہہ دیا تھا اور وہ نیچے کوٹھڑے میں پیاز کوٹ کر پانی نکال رہا ہے۔ تم دعا کرو یہ فائدہ مند ثابت ہو۔“

پھر انہوں نے آگے جھک کر قدسیہ سے پوچھا: ”قدسیہ یہ بہتر نہیں ہو گا کہ تمہارا بستر اب اندر کر دیا جائے۔ رات کو شبہم کی مٹی سے تمہاری طبیعت اُغراب

رہے گی۔ میں راستے میں آپ کے ڈاکٹر سے مل کر جاؤں گا اور اگر انھوں نے مشورہ دیا تو میں کسی اور ڈاکٹر صاحب کو بھی اُن کے ساتھ بھیج دوں گا۔ یوسف بیٹا تمہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں تم اپنی اتی کے پاس رہو۔ میں موٹر واپس بھیج دوں گا اور وہ یہیں رہے گی۔ میری ضرورت پڑے تو ڈرائیور بھیج دینا میں فوراً آجاؤں گا۔

آنکھیں بند کر کے منہ کھول دیا۔ پیاز کا رس حلق سے اتارتے ہوئے وہ بُری طرح منہ بند ہی تھی اور دیکھنے والے سب یہ محسوس کر رہے تھے کہ کہیں وہ قے نہ کر دے۔ پانچ منٹ گزر گئے تو یوسف نے کہا۔ ”اباجی اللہ نے ہم میں سے کسی کی دُعا قبول کر لی ہے۔ میں نماز پڑھ آؤں اب چند منٹ تک آپ انھیں صرف الائچی کا عرق پلا دیں۔ اس کے بعد ہم پیاز کے رس کی مقدار آہستہ آہستہ بڑھاتے جائیں گے اور ڈاکٹر کی دوائی ملا کر اُبلا ہوا پانی پلانا بھی شروع کر دیں گے۔“

مسجد میں نماز ختم کرنے کے بعد یوسف دیر تک سر بسجود ہو کر دعا کرتا رہا۔ جب وہ اُٹھا تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ گھر کے قریب پہنچا تو سڑک پر عبدالعزیز کی موٹر کھڑی تھی۔ اُس نے ڈرائیور سے پوچھا۔ ”چچا جان تشریف لائے ہیں؟“

”جی ہاں بیگم صاحبہ جی آتی ہوتی ہیں۔“

یوسف جلدی سے مکان میں داخل ہوا تو اوپر سے عبدالعزیز کسی سے باتیں کرتا ہوا نیچے اتر رہا تھا۔ یوسف ڈیوڑھی میں رُک کر انتظار کرنے لگا۔ عبدالعزیز نے یوسف پر نظر پڑتے ہی پیچھے مڑ کر اُس کے باپ سے کہا۔ ”میاں صاحب آپ جا کر آرام کریں۔ یوسف صاحب آگئے ہیں۔“

یوسف کے والد نے کہا۔ ”اچھا جی۔ آپ کی تکلیف کا بہت شکریہ، یوسف جاؤ انھیں کا تک چھوڑ آؤ۔“

یوسف نے پوچھا۔ ”اباجی! امی جان کو دوبارہ قے تو نہیں آتی؟“

”نہیں لیکن اُن کی طبیعت بہت متلا رہی ہے اور ان پر پھر یہ خوف سوار ہے

کہ پانی پیتے ہی پھر انہیں قے دوبارہ شروع ہو جائے گی۔“

عبدالعزیز نے کہا۔ ”میاں جی! ڈرائیور مجھے پہنچا کر یہاں آجائے گا اور بلقیس ہیں

آبیٹھا۔ بلقیس کے سوا سب کمرے سے نکل گئے۔

”بلقیس“۔ اُس نے کہا۔ ”اپنی کرسی ذرا آگے کرلو۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ آگئیں ورنہ میں ایک حسرت اپنے ساتھ لے جاتی۔ میری بہن مجھے معلوم ہے کہ میرا وقت آچکا ہے۔ میں کبھی اس طرح بیمار نہیں ہوتی لیکن میں محسوس کیا کرتی تھی کہ ایک دن میرا یوسف اچانک میرے پیارے محروم ہو جائے گا۔ ماں کو سب بچے پیارے ہوتے ہیں لیکن یوسف میرے لیے ہر بچے سے مختلف ہے۔ بہن جس دن آپ لوگوں سے پہلی ملاقات ہوئی تھی مجھے اطمینان محسوس ہوا تھا کہ اگر میں اچانک دنیا سے چلی جاؤں تو یہ وہ لوگ ہیں جو میرے بیٹے کو میری کمی محسوس نہیں ہونے دیں گے اور فہیدہ کو دیکھ کر تو میں نے بڑی مشکل سے اپنی چیخیں ضبط کی تھیں۔ بہن میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ اپنے بیٹے کی دائمی رفاقت کے لیے جس بچی کا میں تصور کیا کرتی تھی وہ اچانک کہیں سے نکل کر میرے سامنے آگئی ہے۔ بہن کاش میں اتنی باختیار ہوتی کہ میں اُسی وقت اپنے اور آپ کے خاندان کے تمام لوگوں کو جمع کر سکتی اور ان کے سامنے یہ اعلان کر سکتی کہ یہ میری بہن ہے۔ بہن مجھے یہ اطمینان تھا کہ یوسف کی پسند وہی ہوگی جو میری پسند ہو اور مجھے یہ یقین ہے کہ یوسف عمر بھر کسی لڑکی کا نام نہیں لے گا۔ لیکن یہ صرف خدا جانتا ہے کہ اپنے فیصلوں پر عمل کرنے میں وہ کس قدر باختیار ہوگا۔ میری بہن! جب میں بھائی عبدالعزیز اور تمہاری طرف دیکھتی ہوں تو میرے دل کو یہ اطمینان محسوس ہوتا ہے کہ جب کوئی آزمائش کا وقت آئے گا تو میرا بیٹا یہ محسوس نہیں کرے گا کہ وہ تنہا ہے۔“

بلقیس نے کہا۔ ”آپا آپ کس بات سے خائف ہیں۔ یہ اطمینان میں آپ کو دلا سکتی ہوں کہ فہیدہ کے والدین کی طرف سے یوسف کو کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ اُس کی ماں اور اُس کی نانی اگر اس وقت یہاں موجود ہوں تو میں اُن سے اعلان

باب - ۲۵

عبدالعزیز خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا۔ اوپر سے زہرہ کی آواز آئی۔ ”یوسف بھائی! وہ تیزی سے زینے پر چڑھا اور بھاگتا ہوا ماں کے بستر کے قریب پہنچا تو بلقیس نے کہا۔ ”یوسف انھیں غش آگیا ہے۔ تم ان کا منہ کھولنے میں میری مدد کرو۔“

یوسف نے دیکھا تو اُس کے دانت مضبوطی سے ملے ہوئے تھے اور وہ بے ہوش تھی۔ اُس نے پہلے بھی اس حالت میں لوگوں کو دیکھا ہوا تھا۔ اُس نے باجھوں کے اندر دونوں ہاتھ ڈال کر منہ کھول دیا۔ بلقیس کی ہدایت کے مطابق زہرہ نے عرق کا وزبان کا ایک چمچ بھر کر اس کے منہ میں ڈال دیا۔ قدسیہ نے ہوش میں آکر آنکھیں کھولیں اور اُس نے کہا۔ ”میرا جسم سردی سے سُسن ہو رہا ہے۔ میرے اوپر رضائی ڈال دو۔“ پھر اس نے اچانک ایک طرف جھک کر بالٹی میں تھے کر دی۔

ریشم بی بی نے اُس پر رضائی ڈال دی اور وہ کچھ دیر بے حس و حرکت پڑی رہی۔ پھر اُس نے کہا۔ ”یوسف کے آبا آپ آرام کریں۔ بلقیس بہن آپ کچھ دیر میرے پاس بیٹھیں۔ باقی سب یہاں سے چلے جائیں۔ یوسف بیٹا! تم بھی جا کر لیٹ جاؤ تمہیں پریشان دیکھ کر مجھے زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔“

عبدالرحیم باہر نکل کر ایک چارپائی پر بیٹھ گیا اور یوسف بھی اُس کے پاس

سے خوف آتا ہے کہ اگر میرے بعد قسمت نے اُس کا ساتھ نہ دیا تو اُس کی زندگی کتنی تلخ ہو جائے گی لیکن میری بات کا بُرا نہ ماننا ہمیدہ کا نام سُن کر اُس کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھتا ہے اور ہمیدہ کے بغیر... ”قدسیہ کی آواز بھرا گئی اور اُس کی آنکھوں سے آنسو اُمڈ آتے۔

بلقیس نے کہا: ”بہن اگر تمہیں اس بات سے اطمینان ہو سکتا ہے تو میں اللہ کو حاضر ناظر سمجھ کر یہ وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ صورتِ حال خواہ کچھ ہو میری تمام ہندریاں یوسف اور ہمیدہ کے ساتھ ہوں گی۔“

”اچھا بہن مجھے پانی پلاؤ۔ اب جو پلائی جاو گی میں پیتی جاؤں گی۔ اب مجھے تھے کا خوف نہیں رہا۔ مجھے اس بات کا بھی خوف نہیں رہا کہ میں اچانک اس دنیا سے چلی جاؤں گی۔“

بلقیس نے آواز دی: ”یوسف اندر آؤ۔ انہیں وہ دوائیاں اور پھر چارول عرق باری باری پلاتے جاؤ۔“

یوسف نے جلدی سے ایک پیالی بھر کر اُسے دیتے ہوئے کہا: ”چچی جان میں باہران کی آواز سُن کر یہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ ٹھیک ہو رہی ہیں۔“

بلقیس نے عرق کی پیالی پلانے کے بعد کہا: ”بیٹا! یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے تھا۔ تمہارے متعلق باتیں کرتے ہوئے ان میں جان آجاتی ہے۔“

قدسیہ کچھ دیر آنکھیں بند کر کے پڑی رہی پھر اُس نے خفیف آواز میں کہا: ”یوسف۔“

”جی امی جان۔“

مال نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔ قدسیہ نے آہستہ آہستہ ہاتھ بلند کیا اور یوسف نے گردن نیچی کر کے اُس کا ہاتھ اپنے سر پر

کر دیا دیتی کہ وہ آپ کے بیٹے کو بہت پہلے پسند کر چکی ہیں۔ بہن اللہ تمہیں صحت دے میں صفیہ کے گھر تمہارے ساتھ جاؤں اور پھر تم دیکھو گی کہ وہ کتنی خوشیاں مناتے ہیں۔“

قدسیہ نے کہا: ”بہن میں صرف آپ سے یہ اطمینان چاہتی ہوں کہ اگر یوسف کو کوئی مشکل پیش آجائے یا وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے تو کیا وہ لوگ چند برس اُس کا انتظار کر سکیں گے؟“

”ہاں۔ اور ہمیدہ کے بارے میں تو میں یہ بھی کہہ سکتی ہوں کہ وہ ساری عمر یوسف کا انتظار کر سکے گی۔“

”بہن خدا تمہارا بھلا کرے۔ ہمیدہ کو صرف اتنی دیر انتظار کرنا پڑے گا جب تک کہ یوسف خود مختار نہیں ہو جاتا۔“ قدسیہ نے یہ کہہ کر آنکھیں بند کر لیں۔

بلقیس کچھ دیر کرب کی حالت میں اُس کی طرف دیکھتی رہی پھر وہ بولی: ”بہن! یوسف جیسے بیٹے کی ماں کو کسی بات سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔ آپ کو کس بات سے بے اطمینانی ہے؟“

”اب مجھے کوئی بے اطمینانی نہیں۔“ قدسیہ نے خفیف آواز میں جواب دیا۔

”آپ کو عبد الکیم کی لڑکی سے کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟“

”بہن اُس سے نہیں لیکن اُس کی وجہ سے ایک پریشانی ضرور ہے اور وہ یہ ہے کہ یوسف کے آبا کسی دن اُن لوگوں کی دولت سے اتنے مرعوب نہ ہو جائیں کہ میرے بیٹے کے گلے میں رستا ڈال کر اُن کے حوالے کرنے کی کوشش کریں۔ بہن میں یوسف کی

مال ہوں اور مجھ سے زیادہ اُسے کوئی نہیں جانتا۔ مجھے یقین ہے کہ جب اُس کی عزت نفس پر حملہ کیا جائے گا تو وہ ساری دنیا کے ساتھ لڑنے پر تیار ہو جائے گا۔ بلقیس میں اس بات پر بے حد خوش تھی کہ انہوں نے ایک دوسرے کو تلاش کر لیا ہے لیکن مجھے اس بات

ایک لمبا سانس لیا اور کھلی آنکھوں کے اندر زندگی کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ بجھ گئے۔ زہرہ رونے لگی۔ یوسف نے کہا: ”زہرہ! اس وقت کسی کی آواز گھر سے باہر نہیں جانی چاہیے۔“

بلقیس نے سسکیاں لیتے ہوئے آگے بڑھ کر قدسیہ کی آنکھیں بند کر دیں۔ عبدالرحیم خاموشی سے آنسو بہا رہا تھا۔ ایوب دوسرے کمرے سے اٹھ کر آیا اور یوسف کے ساتھ لیٹ گیا۔ ریشم بی بی کھل کر رونا چاہتی تھی لیکن جب یوسف نے زہرہ کو بھی اس بات کی اجازت نہ دی تو وہ سسکیاں لیتی ہوئی اپنے گھر چلی گئی۔ یوسف غور سے اپنی ماں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ رضائی اور کھیل اُتار کر اُس پر ایک سفید چادر ڈال دی گئی تھی۔ اُس کے سرخ و سفید چہرے پر جو زردی چھا گئی تھی وہ نیلا ہٹ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ جو ہاتھ چادر سے باہر تھا اُس کی انگلیاں آہستہ آہستہ سکڑنے کی وجہ سے متحرک معلوم ہوتی تھیں اور یوسف دیوانہ وار اُس کی نبض ٹٹولتے ہوئے اپنے آپ کو یہ تسلی دے رہا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ ”چچی جان“

اُس نے کہا: ”دیکھئے! ان کی انگلیاں ہل رہی ہیں“

بلقیس نے کہا: ”یوسف بیٹا! ہمت سے کام لو۔ اب جا کر نہالو اور صبح کی نماز کی تیاری کرو۔“

اچانک یوسف کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس دنیا میں اپنی سب سے بڑی جائے پناہ کو بھول گیا ہے۔ اُس نے نیچے جا کر غسل کے بعد کپڑے تبدیل کیے اور جاء نماز لے کر اوپر ماں کی میت کو ایک نظر دیکھنے کے بعد دوسری چھت پر چڑھ گیا۔ اذان ہوئی تو وہ نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ نماز کے اختتام پر وہ دیر تک سر بسجود پڑا رہا۔ ”میرے اللہ! مجھے صبر اور حوصلہ دے۔ میرے اللہ! میری ماں کی وہ دعائیں قبول فرما جو اُس نے آخری وقت تک میرے لیے کی ہیں۔ یا اللہ! قیامت کے دن

رکھ لیا۔ قدسیہ کچھ دیر کمزور ہاتھ اُس کے سر پر پھیرتی رہی۔ پھر اُس نے دونوں ہاتھوں سے اُس کا سر پکڑ کر اپنے سینے سے بھینچ دیا۔

”یوسف! وہ ڈوبتی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی: ”اللہ تمہاری حفاظت کرے۔ تم اپنے خاندان میں خوشیاں تقسیم کرنے کے لیے زندہ رہو اور وہ لوگ بھی تمہاری خوشیوں میں شریک ہوں جو تم سے پیار کرتے ہیں۔ بیٹا! تم تھک گئے ہو گے۔ جاؤ سو جاؤ۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔“

یوسف کے سر پر ماں کی انگلیوں کی گردش اچانک تھم گئی اور وہ گھبراہٹ کے عالم میں سر اٹھا کر دیکھنے لگا۔ قدسیہ کی آنکھیں بند تھیں۔ یوسف نے ایک ہاتھ اس کی پیشانی پر اور دوسرا نبض پر رکھتے ہوئے بلقیس سے مخاطب ہو کر کہا: ”چچی جان اُمّی جان کا جسم ٹھنڈا ہو رہا ہے نبض بھی بہت کمزور ہے۔“

بلقیس نے جلدی سے اپنی انگلی قدسیہ کے منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”بیٹا! انہیں غش آگیا ہے۔ تم آرام سے ان کا منہ کھولو میں پانی اور دوائی ڈالتی ہوں۔ اس مرتبہ ہمیں دوائی والا پانی زیادہ مقدار میں دینا پڑے گا۔“

یوسف نے اپنے دونوں انگوٹھوں سے زور دے کر منہ کھولا اور قدسیہ نے معمولی جدوجہد کے بعد دوائی اُس کے بعد دو چھج عرق اور ایک پیالی پانی حلق سے اُتار لیا لیکن فوراً تپنے آگئی۔

بلقیس نے آواز دی۔ زہرہ تولیہ لاؤ۔ جلدی کرو۔“

ریشم بی بی بھی اندر آگئی اور یوسف نے کہا: ”خالہ! آپ فوراً یہ بستر اور اُمّی کے کپڑے بدل دیں۔ میں باہر جاتا ہوں۔“

دس منٹ بعد وہ اُس کا باپ اور باقی بیمار دار بستر کے گرد کھڑے تھے۔ قدسیہ کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ اکھڑے اکھڑے سانس لے رہی تھی پھر اُس نے

”چچا جان ہم سب ٹیکہ لگوا چکے ہیں۔ میاں عبدالکریم نے ہسپتال سے آدمی بھیج دیا تھا۔“

”اچھا میں تھوڑی دیر کے لیے جاتا ہوں۔ ڈیڑھ گھنٹے تک آ جاؤں گا اور یقیناً بھی میرے ساتھ ہی جائے گی۔“

”لیکن چچا جان! ٹیکہ کی آپ کو بھی ضرورت ہے۔“

”بیٹا تمہیں ہمارے متعلق اس قدر پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ ہم سیفے اور ٹائیفائیڈ کا ہر سال باقاعدہ ٹیکہ لگوا لیا کرتے ہیں اب احتیاطاً ایک اور لگوالیں گے۔ میں تمہیں ایک بات بتانا بھول گیا تھا۔ میاں عبدالکریم کا نوکر صبح سویرے آپ کے گھر کا حال پرچھنے آیا تھا۔ یہاں پہنچ کر تمہاری امی کی وفات کا سنتے ہی وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ میرا خیال ہے وہ آپ کا پرانا واقف ہے۔“

”جی! وہی ہوگا جو گاؤں میں عبدالکریم کے ساتھ تھا اور جس نے ڈاکو ارجن سنگھ کو باندھنے کے لیے رستوں کے علاوہ ایک پلنگ کی آدمی نوادہ خرچ کر دی تھی۔“

”ہاں میں بھی سوچ رہا تھا کہ میں نے اسے کیس دیکھا ہے اور بیٹا تمہارے دل پر

یہ بوجھ نہیں رہنا چاہیے کہ اب گاؤں جانے کے پروگرام کا کیا بنے گا۔ میں انہیں تاروے رہا ہوں کہ بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر آپ گاؤں نہیں جاسکیں گے میں مقامی پولیس کو بھی فون کر دوں گا کہ انہیں اطلاع کر دی جائے اور مزید احتیاط کے لیے میں ایک آدمی کی ڈیوٹی لگا دوں گا کہ وہ آپ کے ریلوے اسٹیشن پر پہرہ دیتا رہے۔“

یوسف نے کہا: ”جس آدمی کو آپ بھیجنا چاہتے ہیں اُس کے ساتھ میں عبدالکریم کا نوکر بھیج دیتا ہوں۔ وہ بہت قابل اعتماد ہے اور وہ یہ سن کر بہت خوش ہوگا کہ مجھے انسپکٹر صاحب نے کسی ڈیوٹی کے قابل سمجھا ہے۔“

”یہ تو اور زیادہ اچھی بات ہوگی۔“

مجھے ان کی روح کے سامنے شرمسار نہ کرنا۔ یا اللہ مجھے اپنی دنیا میں زندہ رہنے کے وہ سلیقے عطا کر کہ میری ماں کی روح مجھ سے خوش ہو۔ یا اللہ! میری امی، میرے دادا اور میرے چچا کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ یا اللہ! میرے والد اور میرے بہن اور بھائی کو صبر بہت اور حوصلہ دے۔ آمین۔“

اور پھر جب اُس نے سر اٹھایا تو اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ مشرق کے افق پر طلوع آفتاب کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ وہ چھت پر کھڑا تھا۔ مشرق کی طرف پھیلی ہوئی بدلیاں آہستہ آہستہ سرخ ہو رہی تھیں۔ آسمان پر وہی پرندے اُڑ رہے تھے جنہیں وہ ہر روز دیکھا کرتا تھا۔ درختوں کا رنگ وہی تھا لیکن اس کے باوجود وہ محسوس کرتا تھا کہ دنیا میں کوئی خلا پیدا ہو چکا ہے جسے صرف محسوس کیا جاسکتا ہے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ زینے پر کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ عبدالعزیز اُپر آ رہا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر یوسف سے لمبٹ گیا۔ یوسف نے چند سسکیاں لینے کے بعد کہا: ”چچا جان آپ نے اور چچی جان نے بہت تکلیف اٹھائی ہے۔“

عبدالعزیز نے کہا: ”بیٹا اگر ہم دس گنا یا سو گنا زیادہ تکلیف اٹھا کر تمہاری امی کی جان بچا سکتے تو یہ ہماری خوش قسمتی ہوتی۔ بہر حال اب تم نے حوصلے سے کام لینا ہے۔ قبر کے لیے آدمی بھیج دیتے گئے ہیں۔ مکان اور گلی کی صفائی کے لیے محکمہ صفائی کی ٹیم اور سیفے کے ٹیکے لگانے کے لیے ڈاکٹر تھوڑی دیر تک یہاں پہنچ جائے گا۔ آپ سب کو ٹیکہ لگوا دیں اور میں نے سنا ہے کہ آپ کی مہمان کے بچے کو بھی کوئی تکلیف ہے اس کے متعلق بھی ڈاکٹر سے پوچھ لیں اور یوسف صاحب خود بھی ٹیکہ لگوانا ہے آپ کو۔“

بیگم قدسیہ کے جنازے میں شریک ہونے والے لوگ گیارہ بجے کے قریب قبرستان سے واپس آچکے تھے۔ یوسف قبر کے قریب کھڑا تھا۔ جنازہ گھر سے نکلتے وقت اُس نے جنوب مغرب کی طرف جو بادل دیکھے تھے وہ اب پورے آسمان پر چھا رہے تھے۔ جنوب سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آنے لگے۔ پھر بادل گر جا اور بارش ہونے لگا۔ یوسف وہاں سے آہستہ آہستہ چل دیا۔ وہ گھر جا رہا تھا لیکن اُسے پہنچنے کی کوئی جلدی نہ تھی۔ میز بارش میں اُس کا سر جھکا ہوا تھا۔ نصف راستہ طے کرنے کے بعد اُس کے عین سامنے آکر ایک کار نے مارن دیا۔ اُس نے چونک کر دیکھا تو عبدالعزیز کا چلا رہا تھا اور ڈرائیور پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ عبدالعزیز نے کچھ کہے بغیر دروازہ کھول دیا اور یوسف اُس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

کار سے اتر کر وہ مکان کی ڈرائیو میں داخل ہوئے تو عبدالعزیز نے کہا: "بیٹا تمہیں اتنی دیر بارش میں پیدل نہیں ہونا چاہیے تھا۔ تینے کے ٹیکے کے بعد تو ویسے بھی بخار ہو جاتا ہے تم جلدی سے کپڑے پہن لو اور نوکر سے کہو کہ میرا اور تمہارا کھانا بیٹھک میں لے آئے۔"

یوسف کپڑے بدل کر آیا اور کھانے کی میز پر عبدالعزیز کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا: "چچا جی! میری ماموں زاد کے بچے کی طبیعت کافی خراب تھی لیکن چند بار پیاز کا رس پلانے سے کافی فرق پڑا ہے۔"

نوکر نے کھانا سامنے رکھتے ہوئے کہا: "میاں صاحب کھانا آپ بہت زیادہ لے آتے ہیں۔ ہم نے پڑوسیوں میں کافی بانٹا ہے اس کے باوجود نصف سے زیادہ بچا ہوا ہے۔"

عبدالعزیز نے بے پروائی سے کہا: "بھئی جونج گیا ہے وہ بھی فوراً بانٹ دو۔"

یوسف نے پوچھا: "چچا جی! آپ نے دھرم سالہ اطلاع بھیج دی ہے؟" "ہاں بیٹا اور مجھے امید ہے کہ آج شام بھائی ناصر الدین پولیس اسٹیشن سے مجھے ٹیلی فون کریں گے۔ ایس۔ آئی کو میں نے بہت تاکید کی ہے شاید صفیہ اور بچے بھی بات کرنے کے لیے اُس کے ساتھ آجائیں۔"

"چچا جی۔ میری طرف سے آپ اُن سب کو یہی کہیں کہ مجھے اُن کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔"

عبدالکریم کا نوکر فضل دین جھجکتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور کچھ فاصلے پر رک گیا۔ یوسف نے اٹھ کر کہا: "آؤ فضل دین۔"

فضل دین آگے بڑھ کر سسکیاں لیتا ہوا اُس سے پوچھا: "یوسف صاحب! میں یہیں تھا لیکن کسی نے یہ نہ بتایا کہ مال جی کی حالت اتنی خراب ہے وہ سب یہی کہتے تھے کہ صبح سب کو ٹیکہ لگوانا ضروری ہے۔"

یوسف نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا: "بھئی کسی کو کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ وہ اتنی جلدی دنیا سے رخصت ہو جائیں گی اور پھر ایسے حالات میں ٹیکہ لگوانا تو بہت ضروری تھا۔ انہوں نے اچھا کیا تمہیں گلہ نہیں کرنا چاہیے۔"

"جی ایسی زندگی کا کیا فائدہ کہ مال جی کے جنازے میں بھی شریک نہ ہو سکا۔"

"بیٹھ جاؤ فضل دین کھانا کھاؤ۔ زندگی کا یہ فائدہ ہے کہ تم مرنے والوں کے لیے دعائیں کر سکتے ہو۔"

عبدالعزیز نے کہا: "بھئی کھاؤ۔ تم خاموش کیوں بیٹھ گئے۔"

"جی مجھے بھوک نہیں۔"

یوسف نے کہا: "فضل دین بھوک ہم میں سے کسی کو بھی نہیں تم اگر اپنی بھوک کے لیے نہیں تو ہماری خوشی کے لیے تھوڑا سا کھا لو۔"

لوگ ایک برادری کی طرح رہتے ہیں۔ یوسف صاحب اگر شور میں آپ کو نیند نہ آئے تو آپ میرے گھر جا کر لیٹ جائیں۔“

یوسف نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ”نہیں جی میرا خیال ہے کہ مجھے بستر پر لیٹتے ہی نیند آ جائے گی۔“

یوسف اُپر جا کر ایک چار پائی پر گر پڑا اور چند منٹ بعد وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ جب اُس کی آنکھ کھلی تو باہر آفتاب کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ اُس نے جلدی سے وضو کیا اور مسجد کی طرف چل دیا۔ نماز کے بعد عبدالعزیز اُس کے ساتھ مسجد سے باہر نکلا اور اُس نے کہا۔ ”بیٹا یہ تمہاری زندگی کا ایک بہت بڑا امتحان تھا۔ لیکن جب میں تمہیں نماز پڑھتا دیکھتا ہوں تو مجھے یہ اطمینان محسوس ہوتا ہے کہ تم صبر اور حوصلہ عطا کرنے والے کی بارگاہ میں ہاتھ پھیلا نا جانتے ہو۔ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ دعا مانگتے وقت تمہارے چہرے پر عزم و یقین کی روشنی آ جاتی ہے۔“

یوسف نے بڑی مشکل سے اپنی سرسکیاں ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ”اُس دُنیا میں خدا کے عاجز بندوں کا سرمایہ یہی تو ہے چچا جان۔“

”اچھا تم اپنی چچی کو اندر سے بھیج دو اُس کے پاس جب بھی وقت ہوا کرے گا وہ یہاں آ جایا کرے گی۔“

”بہت اچھا چچا جان جب کانگریس میں آپ کی ٹیلی فون پر بات ہو تو انہیں کہیے کہ ہم سب ٹھیک ہیں۔“

”ہاں بیٹا۔ وہاں تو ابھی تھوڑی دیر بعد شاید بات ہو جائے ورنہ صبح ہو جائے گی۔ ویسے ایک دو دن تک ہمارے ہاں بھی ٹیلی فون لگ جائے گا۔“

○
رات کے وقت یوسف اپنے باپ کے قریب چوبارے کی چھت پر

یوسف نے ایک پلیٹ میں سالن اور چاول ڈال کر اُس کے سامنے کر دیا، لیکن اُس نے کھانا شروع کرنے کی بجائے کہا۔ ”جی انہوں نے مجھے یہ پیغام دے کر بھیجا تھا کہ رات کا کھانا اُن کے گھر سے آئے گا۔ وہ خود اس لیے نہیں آ سکے کہ ٹیکے کی وجہ سے انہیں بخار ہو گیا تھا۔“

یوسف نے کہا۔ ”بھئی فضل دین تم جلدی اُن کو واپس جا کر کہو کہ کھانا تو گھر میں اتنا دافر پڑا ہے کہ آج ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس لیے کل دیکھا جائے گا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ انہوں نے ٹیکے لگوا لیے ورنہ بخار کی شدت یہ ظاہر کرتی ہے کہ انہیں بیماری کا خطرہ تھا۔“

فضل دین نے کہا۔ ”یوسف صاحب اگر آپ اجازت دیں تو میاں صاحب سے کل کے کھانے کا پوچھ لوں۔“

”ہاں وہ اندر کمرے میں لیٹے ہوتے ہیں۔ زیادہ باتیں نہ کرنا اُن کی طبیعت ٹھیک نہیں۔“

باقی دن تعزیت کے لیے آنے والوں کا نانا آتا بندھا رہا۔ گلی کے پاس پڑوسی نے اُن کی سہولت کے لیے اپنے کشادہ مکان کی پچلی منزل خالی کرادی تھی اور مہمانوں کو بٹھانے کے لیے آس پاس سے کرسیاں بھی جمع کر کے وہاں رکھوا دی تھیں۔ عبدالعزیز نے اُٹھ کر کہا۔ ”یوسف تم اُپر جا کر سو جاؤ، تمہارے لیے چند گھنٹے آرام کرنا بہت ضروری ہے۔ میں تعزیت کے لیے آنے والوں کے لیے موجود رہوں گا۔ خواتین کا مسئلہ آپ کی پڑوسن ریشم بی بی اور بلقیس سنبھال لیں گی۔“

”چچا جان آپ کو بھی تو آرام کی ضرورت ہے۔ میری مدد کے لیے حسین علی موجود ہو گا۔“

حسین علی نے کہا۔ ”جناب مہمانوں کی آپ بالکل فکر نہ کریں۔ اس محلے کے

لیٹا ہوا تھا۔

”ابا جی! آپ کی طبیعت اب ٹھیک ہے نا!“ اُس نے کہا۔

”ماں بیٹا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں اب تو بخار وغیرہ معلوم نہیں ہوتا۔“

”ابا جی! وہ ٹیکے کا اثر تھا۔ صبح تک آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ دو چار روز تک آپ سب کو ٹائیفائیڈ کے ٹیکے بھی لگوا دیئے جائیں۔“

باپ نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا: ”اچھا بیٹا۔ اب سو جاؤ۔“

یوسف دیر تک آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ تارے اُسی طرح چمک رہے تھے۔ کہکشاں میں اُن گنت جھرمٹ اُسی طرح نظر آتے تھے جنہیں وہ اپنی ماں کے پاس لیٹ کر دیکھا کرتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کتنی ماؤں نے کتنے بچوں کو ان تاروں کی چھاؤں میں لوریاں دی ہوں گی۔ کتنے بچوں نے ماں کی گود سے اچھل کر چاند اور تاروں پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی ہوگی۔ موت ہماری زندگی کی کتنی اُٹل حقیقت ہے اور ہم ہیں کہ اس حقیقت کو آخر وقت تک جھٹلاتے رہتے ہیں۔ یا اللہ مجھے اپنی قدرست کی حقیقتوں کو سمجھنے کا شعور اور انہیں تسلیم کرنے کی عقل عطا کر۔ یا اللہ مجھے سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے کے سیدھے راستے پر چلا۔ یا اللہ مجھے اپنا فرماں بردار بندہ بننے کی توفیق عطا فرما۔ یا اللہ وہ نیک دعائیں قبول فرما، جو میری ماں ہمیشہ میرے لیے کیا کرتی تھی۔ یا اللہ میرا دامن اتنی نیکیوں سے بھر دے کہ قیامت کے دن اُمّی جان مجھے دیکھیں تو انہیں تسکین محسوس ہو۔ وہ دُعا کرتے کرتے سو گیا اور پھر وہ خواب کی حالت میں اپنی ماں کی انگلی تھا مے سر سبز کھیتوں میں دوڑ رہا تھا۔

رشتے دار پہنچنے شروع ہو گئے تھے۔ نوبت کے قریب عبدالکریم کے نوکر ریڑھے پر کھلنے کی دنگیں لے کر پہنچ گئے اور تھوڑی دیر بعد وہ بھی بال بچوں سمیت پہنچ گیا۔ عبدالکریم نے فاتحہ خوانی کے بعد اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا: ”میاں جی! مجھ سے یہ غلطی ہوتی تھی کہ ڈاکٹر کے مشورے سے میں نے گھر جانے سے پہلے پیٹھ کا ٹیکہ لگوا لیا تھا۔ مجھے اتنا شدید بخار ہوا کہ میں اگلے روز شام تک بستر سے نہ اٹھ سکا اور یہ کچھتا وا مجھے عمر بھر رہنے لگا کہ میں جنازے میں شریک نہ ہو سکا۔“

میاں عبدالرحیم نے بے پروائی سے کہا: ”بھائی صاحب جب کسی بیماری کا خطرہ ہو تو ہر آدمی کا پہلا فرض یہ ہوتا ہے کہ اُسے پھیلنے سے روکا جائے۔“

”امینہ کا بھی بُرا حال تھا۔ اُس کی ماں صبح آنے کے لیے تیار ہوئی تھی لیکن اچانک ٹیکہ لگانے والا ہمارے گھر پہنچ گیا اور اُس نے رشیدہ کے علاوہ میرے سب نوکروں اور بڑوسیوں کو بھی ٹیکے لگا دیئے۔“

میاں جی آپ کے گھر سے کچھ فاصلے پر ہی مجھے یہ حملہ سنسان محسوس ہونے لگا تھا۔“

”ماں بھئی مجھے بھی اس گھر میں اب وحشت محسوس ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ چھٹی لے کر گاؤں چلا جاؤں۔“

”میاں صاحب! اگر آپ کہیں تو ہم بھی گاؤں جائیں گے۔“

عبدالعزیز مقامی تھانے دار کی وساطت سے یوسف کے گاؤں قدسیہ کی وفات

کی اطلاع بھجوا چکا تھا۔ اس لیے دوسرے روز صبح ہوتے ہی اس کے چچا، چچیاں اور دوسرے

اُس کے سامنے جتنا زیادہ کام ہو اتنا زیادہ دُہ خوش رہتی ہے۔“
یوسف نے کہا۔ ”ابا جی! چچی جان کے ہوتے ہوئے ہمیں چراغ بی بی کو تکلیف نہیں دینی چاہیے۔ کل اسے بخار تھا اور شاید اب بھی اس کی طبیعت اچھی نہیں۔“

عبدالکریم نے بلند آواز میں کہا۔ ”امینہ! امینہ چراغ بی بی کو ادھر بھیج دو۔“
چراغ بی بی جھجکتی ہوئی سامنے آکھڑی ہوئی۔
”کیوں چراغ بی بی تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“
”جی میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”چند دن میاں عبدالرحیم صاحب کے گھر کا انتظام سنبھالنے میں تمہیں تکلیف تو نہیں ہوگی؟“
”کیسی تکلیف جی۔“

”تم یہ تو نہیں سمجھو گی کہ تم سے نوکروں جیسے کام لیے جا رہے ہیں۔“
”جناب میں نے ان کا گاؤں بھی دیکھا ہے اور ان کا گھر بھی دیکھا ہے اور یہ دُہ لوگ ہیں جن کے کمروں میں جھاڑو دینے پر بھی میں فخر کروں گی۔“

عبدالکریم نے میاں عبدالرحیم سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”ہم نے اسے یہاں رہنے اور کام کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ یہ اس کی اپنی خواہش تھی۔ اچھا ہم چلتے ہیں۔ دیکھو چراغ بی بی میاں صاحب تمہیں یہ نہیں بتائیں گے کہ تمہیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔ تمہیں اپنی عقل سے کام لینا ہوگا۔“

جب وہ رخصت ہو رہے تھے تو امینہ نے پہلی بار ذرا جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا یوسف صاحب! میں بڑی دیر سے کچھ کہنا چاہتی ہوں لیکن میرے پاس الفاظ نہیں ہیں صرف آنسو ہیں اور میں اس بات سے بھی ڈرتی ہوں کہ آپ رونے والوں کو

باب - ۲۶

کھانا کھانے کے بعد چند مہمانوں کے سوا باقی رخصت ہو چکے تھے۔ امینہ اور اُس کی ماں یوسف کی چچی کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں۔ امینہ کی آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت رو چکی ہے۔ چراغ بی بی بھی حُزن و ملال کی تصویر سنی بیٹھی تھی۔ دوسرے کمرے میں عبدالکریم عبدالرحیم کے کمرہ رہا تھا۔ ”میاں جی! اب ہمیں اجازت دیجئے آپ کے ہاں مہمان بہت آئیں گے اور بچوں کی دیکھ بھال کے لیے بھی آپ کو تکلیف ہوگی۔ اس لیے ہم چراغ بی بی کو یہیں چھوڑ جائیں گے۔“
”لیکن میں تو اب گاؤں جانے کی سوچ رہا تھا۔“

”میاں صاحب چراغ بی بی کی دواں بھی آپ کو ضرورت ہوگی۔ جو کام ایک ماں کرتی ہے وہ سنبھالنا آسان نہیں اور میری تو یہ کوشش ہوگی کہ امینہ اور اُس کی ماں بھی زیادہ وقت آپ کے ہاں گزارہ کریں یا آپ کے بال بچوں کو اپنے گھر لے جایا کریں۔ گاؤں جا کر ان کی کوشش ہی یہی ہوگی کہ وہ زیادہ وقت آپ کے ہاں گزارا کریں۔“

”اچھا آپ کی بڑی بڑی مہربانی۔ لیکن یہاں کام بہت زیادہ ہوگا۔ چراغ بی بی تنگ تو نہیں آجائے گی۔“
”بھائی جی! میری بیوی کہا کرتی ہے کہ چراغ بی بی لوہے کی بنی ہوئی ہے۔“

”بیٹی اگر وہ ہو جائے تو وہ واپس آ جائے گی تم کیوں فکر کرتی ہو۔ میں اُسے کہہ دوں گا کہ تم اگر کسی وقت یوسف کو غصے میں آنا دیکھو تو فوراً واپس آ جاؤ۔“

”ابا جی وہ بیوقوف کبھی یہ نہیں سمجھے گی کہ یوسف صاحب کو کسی بات پر غصہ آ رہا ہے یا نہیں۔ آپ کو اُسے واپس بلانے کی کوئی اور ترکیب سوچنی پڑے گی۔“

رشیہ بولی ”میاں جی! بیٹی امینہ ٹھیک کہتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ یوسف ایک بہادر آدمی ہے اور ایک بہادر آدمی کو ایک بے بس عورت پر غصہ نہیں آتے گا۔ لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی وجہ سے یوسف ہم سب سے نفرت کرنے لگے۔“

عبدالکریم بولا ”لیکن تم تو ہمیشہ اُس کی تعریف کیا کرتی ہو۔“

”جی میں تو اس کی رنجونی کے لیے تعریف کیا کرتی تھی۔“

امینہ بولی ”ابا جی یہ غلطی مجھ سے کبھی نہیں ہوئی میں اُسے ایک مصیبت سمجھتی ہوں لیکن اس بات پر خوش نہیں ہوں کہ آپ نے اُسے دوسروں کے گلے میں ڈال دیا ہے۔“

”کیسی مصیبت بیٹی؟ میں اس کے باپ کو کہوں گا کہ وہ کسی دن جا کر اس کو لے آئے۔“

”ابا جی کسی دن کیوں، اس کے باپ کو ابھی بلا کر کیوں نہیں کہتے کہ وہ اسے یوسف کے گاؤں جانے سے روک دے۔“

”بیٹی اگر میں نے اب کچھ کہا تو بڑی بد مزگی ہوگی۔ ہمیں کچھ دن صبر کرنا پڑے گا۔“

پسند نہیں کرتے۔“

یوسف نے جواب دیا ”امینہ میں ان لوگوں کو بہت قابلِ قدر سمجھتا ہوں جو مشکل یا آزمائش کے وقت عرف اللہ کی بارگاہ میں سر جھکا کر آنسو بہاتے ہیں۔ میں ہر اس انسان کو پسند کرتا ہوں جو دوسروں کے لیے نیک جذبات رکھتا ہے۔ میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔“

— ○ —

امینہ آنسو پر پھپھکتی ہوئی اپنے والدین کے ساتھ موٹر میں سوار ہو گئی۔ تھوڑی دُور جا کر اُس نے کہا۔ ”ابا جی میں حیران ہوں کہ آپ کو ایک نئی مصیبت ان کے گلے میں ڈالنے کا کیسے خیال آیا؟“

”بیٹی کون سی مصیبت؟“ عبدالکریم نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”ابا جی! آپ چراغ بی بی کو مصیبت نہیں سمجھتے۔“

عبدالکریم بولا ”بیٹی تم بلا وجہ اس غریب سے نفرت کرتی ہو۔ ان دنوں وہ غریب بہت پریشان ہے جب سے اس کا خاوند فوج میں بھرتی ہو کر گیا ہے اُس نے کوئی اطلاع نہیں بھیجی۔ میں نے سوچا تھا کہ اس بیچاری کا دل بل جائے گا۔“

امینہ نے ذرا بلند آواز میں کہا۔ ”ابا جی وہ بے چاری نہیں ہے۔ اگر اس کا خاوند بے وقوف ہے اور اس نے جان بوجھ کر کوئی اطلاع نہیں بھیجی یا لاپتہ ہو گیا ہے تو اس کی سزا یوسف صاحب کو نہیں ملنی چاہیے۔“

عبدالکریم نے کہا۔ ”بیٹی تم بلا وجہ پریشان ہو رہی ہو۔ میں نے یوسف کے سامنے بات کی تھی اور وہ ناراض نہیں تھا۔“

”ابا جی اُس نے کہا تو تھا کہ چراغ بی بی کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں اور اگر وہ یوری طرح ناراض نہیں تھا تو ہو جائے گا۔ بہت جلد ہو جائے گا۔“

آپ کو اپنے پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی کرنی پڑے گی۔ آپ کا سامان ہوٹل میں رکھوا کر ہم آپ کو گھر لے جائیں گے۔ وہاں فاتحہ خوانی کے بعد آپ کو قبرستان بھی لے جائیں گے۔ اس کے بعد آپ کا کھانا ہمارے گھر ہوگا۔“

”احمد خان نے جواب دیا بھائی مجھے منظور ہے۔“

اتوار کے دن عبدالعزیز اور بلقیس سے مشورہ کرنے کے بعد میاں عبدالرحیم نے فیصلہ کیا کہ ہم کل یہاں سے بس پر روانہ ہو جائیں گے۔ عبدالعزیز اور بلقیس مصر تھے کہ آپ ہماری کار لے جائیں لیکن یوسف نے کہا ”چچا جان آپ جانتے ہیں کہ آپ کی کار ہمیں شہر میں کسی جگہ چھوڑنی پڑے گی اور اس کی حفاظت ایک مستلزم بن جائے گی۔ بکنی سڑک پر سے اتر کر ہم تانگوں پر جائیں تو بھی ہمیں کچھ راستہ پیدل چلنا پڑے گا۔ جب آپ ہمارے گاؤں آئیں تو میں آپ کے لیے گھر تک راستہ درست کرادوں گا۔“

عبدالعزیز نے رخصت کرتے ہوئے کہا ”اچھا بیٹا انشاء اللہ کل ہم تمہیں بسوں کے اڈے پر رخصت کریں گے۔“

یوسف نے کہا ”اچھا جان آپ تکلیف کیوں کرتے ہیں۔“

”بیٹا اگر تکلیف ہوتی تو ہم کبھی نہ آتے۔“

”انشاء اللہ ہم عین وقت پر پہنچ جائیں گے۔“

اگر مجھے کوئی کام پڑ گیا تو بلقیس ضرور آئے گی۔

یوسف نے علی بخش کو تاکید کی کہ تم ہماری غیر حاضری میں ہماری ڈاک منظور احمد کے سپرد کر دیا کرنا۔ ان کے پڑوسی حسین علی اور ریشمی بی نے یہ ذمہ لیا تھا کہ اگر کوئی مہمان آپ کی غیر حاضری کے دوران آیا تو اس کی خاطر تواضع کی جائے گی اور یہ سمجھا دیا جائے گا کہ آپ

منظور احمد چھٹیوں میں سرگودھا کے قریب اپنے گاؤں گیا ہوا تھا۔ یوسف نے ماں کے کفن و دفن سے فارغ ہو کر سرگودھا کے ایک ہم جماعت کو تار دیا تھا کہ وہ منظور کو اس کے گاؤں میں اطلاع بھیج دے۔ چنانچہ منظور اگلی صبح لاہور پہنچ چکا تھا اور اس نے خط و کتابت کا کام سنبھال لیا تھا۔ چار دن بعد وہ گاؤں جانے کا پروگرام بنا رہے تھے کہ سندھ سے یوسف کو احمد خان کا تار آگیا کہ وہ اگلی صبح لاہور پہنچیں گے۔ چنانچہ یہ پروگرام دو دن کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ اگلی صبح گاڑی پہنچی تو احمد خان کے استقبال کے لیے یوسف اور منظور کھڑے تھے۔ احمد خان نے گاڑی سے اترتے ہی یوسف کو پیار سے گلے لگایا اور کہا بھائی شہر بڑی دیر سے تمہارے گاؤں کا پروگرام بنایا تھا۔

پچھلے سال میں اپنے بیٹے کو ڈیرہ دون پبلک سکول داخل کروانے جا رہا تھا اور میں نے تمہیں کالج اور گاؤں دونوں جگہ خط لکھے تھے کہ اگر تم لاہور سے میرے ساتھ سفر میں شامل ہو جاؤ تو ہم دونوں جان محمد کو داخل کروانے کے بعد سوری کی سیر کریں گے لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ پھر جب میں واپس گھر پہنچا تو گاؤں سے تمہارے چچا کا خط ملا کہ یوسف کے والد کی تبدیلی لاہور ہو گئی ہے اور وہ سب لاہور چلے گئے ہیں۔ میں کسی دن اچانک تمہیں یہاں تلاش کرنے کا پروگرام بنایا کرتا تھا لیکن معلوم نہ تھا کہ ہماری ملاقات ان حالات میں ہوگی۔ اللہ تمہیں صبر و ہمت دے۔ اب میں پہلے تمہارے گھر جا کر فاتحہ پڑھوں گا۔ پھر ماں جی کی قبر پر جاؤں گا۔ اس کے بعد تمہیں اگر کوئی سروریت نہ ہوتی تو ہم نیڈوز ہوٹل آجائیں گے اور شام تک باتیں کریں گے۔ رات کی گاڑی میں میں واپس چلا جاؤں گا اور یہ وعدہ لے کر جاؤں گا کہ آئندہ جب تمہیں چھٹیاں ملیں گی تم میرے پاس آیا کرو گے۔“

”تمہارے آبا جی کیسے ہیں؟“

”جی وہ بالکل ٹھیک ہیں اور آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

کا گاؤں جانا ایک مجبوری تھی۔

اگلے دن وہ آٹھ بجے کے قریب بس پر بیٹھے ہوئے تھے اور ڈرائیور مارن دے رہا تھا۔ اچانک بلقیس کی کار نمودار ہوئی اور عین بس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ڈرائیور نے جلدی سے اتر کر بس ڈرائیور سے کچھ کہا اور پھر یوسف سے مخاطب ہو کر کہا: یوسف صاحب! اسکیپر صاحب نہیں آسکے انھیں کوئی کام تھا لیکن بیگم صاحبہ آتی ہیں۔

آپ ان سے بات کر لیں یوسف بس سے اتر آؤ اور آگے بڑھ کر بلقیس کو سلام کرنے کے بعد بولا کہ چچی جان خدا کا شکر ہے کہ آپ بخیریت ہیں۔ میں بہت پریشان تھا چچا جان بالکل ٹھیک ہیں نا! بیٹا وہ ٹھیک ہیں کوئی ضروری کام انھیں بڑ گیا تھا میں اسی لیے بھاگی آئی ہوں کہ ٹیلی فون پر رات کو پیغام آ گیا تھا اور وہ یہ ہے کہ وہ لوگ منگل کے روز دھرم سالہ سے روانہ ہوں گے اور اسی روز گاڑی تمہارے گاؤں کے اسٹیشن سے گزرے گی۔ تمہیں صبح مجھے یہ بتانے کا اچانک اس لیے خیال آیا کہ شاید ایک مختصر سی ملاقات میں تم ان سے دعائیں لینا عظیم سمجھو۔ یوسف نے آبدیدہ ہو کر کہا شکر یہ چچی جان مجھے دعاؤں کی بہت ضرورت ہے۔

بلقیس نے کہا بیٹا افسوس اس بات کا ہے کہ ان کے پاس ٹیلی فون نہیں ہے ورنہ میں صفیہ، فہمیدہ اور نسرين سے بہت باتیں کرتی۔

بہت اچھا چچی جان میں منگل اور اس کے بعد ہر روز اس سے آنے والی گاڑی دیکھا کروں گا۔ بلقیس مسکرائی۔ بیٹا اگر وہ منگل کو نہ آئے تو جمعرات کو آجائیں گے۔ لیکن انہیں یہ معلوم نہیں ہو گا کہ تم اسٹیشن پر ان کا انتظار کر رہے ہو۔



چوتھے روز سہ پہر کے وقت یوسف ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ٹھہل رہا تھا۔ کارخانے کا گھڑیال جو دور دور سے دکھائی دیتا تھا۔ سواتین بج رہا تھا۔ ساڑھے

تین کے قریب شمال کی طرف سگنل ڈاؤن ہوا تو چند منٹ بعد دوسرے گاڑی کی سیٹی سنائی دی۔ پھر انجن دھواں اڑاتا ہوا ابل کھاتی ہوئی ریلوے لائن کے کناروں پر گھٹنے دھرتوں کی اوٹ سے نمودار ہوا اور تھوڑی دیر میں گاڑی اسٹیشن پر آڑکی۔ یوسف نے اس اسٹیشن پر سیکڑوں بار گاڑیوں کو آتے جاتے دیکھا تھا۔ لیکن آج وہ پہلی بار اپنے دل میں ایک ٹھکر سی محسوس کر رہا تھا۔ وہ انٹر کلاس کے ڈبے کی طرف بڑھا۔ نسرین جو کھڑکی کے باہر جھانک رہی تھی چلانے لگی۔ بھائی جان! بھائی جان! ہم ادھر ہیں۔ امی جان، آپا فہمیدہ "نسرین فقرہ پورا کرنے کی بجائے سواروں کو راستے سے ہٹاتی ہوئی گاڑی سے اتری اور یوسف کا ہاتھ پکڑ کر چلانے لگی۔

"امی جان، فہمیدہ، نانی جان، اباجی باہر دیکھتے یہ بھائی جان یوسف ہیں۔ میں نے آپ کو دور سے پہچان لیا تھا۔ بھائی جان۔ وہ سب اندر ہیں۔ اندر دیکھتے امی اور فہمیدہ آپ کو دیکھ رہی ہیں اور اباجان اور نانی جان بھی اندر ہیں۔ بھائی جان آپ کو معلوم تھا کہ ہم اس گاڑی پر آ رہے ہیں۔ شاید آپ کو خواب آیا یا میری دعا قبول ہو گئی ہے یوسف کی آنکھوں کے سامنے آنسوؤں کے پردے حائل ہو رہے تھے۔

صفیہ نے نسرین کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا بیٹا یوسف یہ اتفاق ہے یا کہیں سے تمہیں اطلاع مل گئی تھی۔ جب ہم لاہور سے واپس آ رہے تھے تو چچی بلقیس اچانک پہنچ گئی تھیں اور انھوں نے آپ کا پروگرام بتا دیا تھا۔

نسرین بولی "دیکھا آپا جان چچی بلقیس کتنی اچھی ہیں"

"صفیہ نے پوچھا بیٹا گاڑی یہاں کتنی دیر ٹھہرے گی۔"

"خالی جان گاڑی دس منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہرے گی لیکن میں ماں جی کی

دعائیں لینے کے لیے میسرے اسٹیشن پر اتر جاؤں گا۔"

صفیہ نے کہا بیٹا یہ تو ہم سب کے دل کی بات کہہ رہے ہو۔ یہاں سے گزرتے

ہوتے میرا دل بری طرح ٹوٹ رہا تھا۔ ہمارا ارادہ صبح کی گاڑی پر آنے کا تھا لیکن ہمیں گھر سے نکلنے دیر ہو گئی۔ مجھے گاڑی نہ ملنے کا افسوس تھا لیکن اب اللہ کا شکر کرتی ہوں کہ تم مل گئے۔

نسرین بولی امی جان آپ بلاوجہ ناراض ہو رہی تھیں کہ میں نے اٹھنے میں دیر کر دی۔ اگر میں وقت پر تیار ہو جاتی تو بھائی جان کیسے ملتے؟
یوسف مسکرایا: شہزادی صاحبہ میں نے صبح کی گاڑی بھی لکھی تھی اور اگر آپ کل آتیں تو بھی میں دونوں گاڑیاں دیکھتا۔

صفیہ نے پوچھا: بیٹا کل کیوں دیکھتے دونوں گاڑیاں؟
"خالد جان میں سوچ سکتا تھا کہ کوئی وجہ ہو گئی ہوگی اور آپ ٹرک گئے ہوں گے۔"
نصیر نے شرارتے ہوتے پوچھا: اور اگر ہم کل بھی نہ آتے تو؟
"جی اس صورت میں میرے لیے غیر معمولی بات ہو جاتی اور میں یہاں تیسرے دن گاڑیاں دیکھنے کی بجائے سیدھا کانگرہ پہنچتا۔ اور وہاں سے پولیس اسٹیشن جا کر آپ کا پتہ کرتا۔"

"بھائی جان آپ واقعی کانگرہ پہنچتے؟" نسرین نے پوچھا۔
"میں ضرور پہنچتا۔"

نسرین ماں کی طرف متوجہ ہوتی: "امی جان کیا ہم دو دن کانگرہ میں نہیں ٹرک سکتے تھے؟"

ایک وجہ یہ آدمی جس کی عمر چالیس برس سے اوپر معلوم ہوتی تھی۔ گاڑی سے اُترا اور اس نے بے تکلفی سے یوسف کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"یوسف صاحب، میرا نام نصیر الدین ہے۔"

نصیر بولی: "یہ میرے ابا جی ہیں۔"

نصیر الدین کا دلنگ سرخ و سپید تھا اس کے سر اور چھوٹی چھوٹی داڑھی کے بالوں کی رنگت بھوری تھی اور بڑی بڑی چمکدار آنکھوں میں جوانی کی سی دل کشی تھی۔
یوسف اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے نصیرہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"اگر آپ نہ بتاتیں تو بھی میں غلطی نہ کرتا کہ یہ آپ کے ابا جان ہیں؟"

نصیر الدین بولا: "بھئی یوسف صاحب اب تو میں آپ کی تصویر بھی دیکھ چکا لیکن اس سے پہلے نسرین تمہارے متعلق اتنی باتیں کر چکی تھیں کہ کسی جگہ تمہارے ملنے کی توقع ہوتی تو شاید میں بھی تمہیں پہلی نظر میں پہچان لیتا۔"

نصیرہ نے کہا: "امی جان گاڑی پر چلیں نانی جان اس طرف آکر کھڑکی سے دیکھ رہی ہیں سخت غصے کے عالم میں ہیں۔"

یوسف جلدی سے گاڑی پر چڑھا اور اس نے بیگم فریدہ احمد کے قریب جا کر کہا: "جی السلام علیکم کہتے ہوئے سر جھکا دیا۔ فریدہ نے جلدی سے اٹھ کر دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیے اور بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹا میں دوسری طرف بیٹھی تمہارے گاؤں کی سمت دیکھ رہی تھی اور یہ معلوم نہیں تھا کہ تم پلیٹ فارم پر کھڑے ان سے باتیں کر رہے ہو۔"

نسرین نے آگے بڑھ کر کہا: "نانی جان! بھائی جان نے سب سے پہلے آپ کو سلام کرنا تھا، اب میں آپ کو ایک اچھی خبر سناتی ہوں کہ بھائی آپ سے باتیں کرنے اور آپ کی دعائیں لینے کے لیے ٹھہرے ہیں اور ہمارے ساتھ سفر کریں گے اور کسی اگلے اسٹیشن سے واپس آجائیں گے۔"

صفیہ نے کہا: "امی جان اگلے اسٹیشن کا مطلب یہ نہیں کہ یہ یہاں سے دوسرے یا تیسرے اسٹیشن پر اتر جائیں گے بلکہ میرا خیال ہے کہ یہ کم از کم امرتسر تک تو ہمارا ساتھ دیں گے اور وہاں بھی ہمیں باتیں کرنے کا کافی وقت مل جائے گا۔"

جا کر دیکھنے لگا۔

فریدہ احمد نے اٹھتے ہوئے کہا "ارے میں بھی دیکھ لوں وہ کیا بلا ہے؟"
"ماں جی آپ آرام سے بیٹھی رہیں اب گاڑی چلنے والی ہے" یہ کہتے ہوئے
یوسف نے دوسری طرف پہنچ کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور پائیدان پر پاؤں رکھتے ہوئے
اپنا ہاتھ بلند کر کے اشارہ کیا۔ بتو نے اپنے ہاتھ سے اس کے اشارے کا جواب دیا
اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ گاڑی نے سیٹی بجائی اس کے پتے حرکت میں آئے وہ
کچھ دیر اپنا ہاتھ ہوا میں لہراتا رہا اور پھر اس نے گھوڑے کی باگ پھیر لی اور اسے
سرپٹ چھوڑ دیا۔ گھوڑی دیر میں وہ مکئی کے کھیتوں میں غائب ہو چکا تھا۔

بیگم فریدہ احمد نے آواز دی "بیٹا اب میرے پاس آکر بیٹھ جاؤ اور جب تک میں
تمام باتیں نہ پوچھ لوں تمہیں کسی طرف متوجہ ہونے کی اجازت نہیں۔"

نسرین نے کہا "مامی جان اگر اجازت ہو تو ہم سب آپ کے پاس آجائیں" گھوڑی
دیر میں وہ سب آئے سامنے دو سیٹوں پر بیٹھ گئے باقی ڈبر خالی تھا۔

صفیہ نے کہا "امی جان، اگر اجازت ہو تو میں پہلے ایک ضروری بات پوچھ لوں؟"
"ہاں بیٹی پوچھ لو تمہیں اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے؟"

"بیٹا یوسف، میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ گھر میں تمہیں کوئی پریشانی تو نہیں تھی؟"
"خالہ جی! امی جان نے مجھے یہ معلوم نہیں ہونے دیا تھا کہ پریشانی کیا ہوتی ہے۔ ایسی تمام

باتیں انہوں نے اپنے سرے رکھی تھیں اور اب مجھے معمولی بات بھی پریشان کر دیتی ہے؟"
یوسف کی آنکھیں نم ناک ہو رہی تھیں اور ان سب کے چہروں پر اداسی چھائی ہوئی
تھی۔

صفیہ نے معصوم آواز میں کہا "آج آپ نے دونوں گاڑیاں دیکھیں فرض کیجئے اگر
ام اس گاڑی پر بھی نہ آتے تو پھر آپ کیا سوچتے؟"

فریدہ احمد نے کہا "بیٹی یہ فیصلہ میں کر دوں گی کہ یوسف کہاں اترے گا اگر یہ
امر تتر تک ہمارا ساتھ دے سکتا ہے تو جلد ہر تک ہمارا ساتھ کیوں نہیں دے سکتا؟
بیٹا یوسف تم مجھے یہ بتاؤ کہ اگر گھوڑی بانوں سے میری تسلی نہ ہو اور تمہیں ایک
دن گھر سے غیر حاضر ہونا پڑے تو وہاں کوئی پریشانی تو نہیں ہوگی؟"

"نہیں ماں جی میں گھر میں یہ کہہ آیا تھا کہ میں ایک بزرگ سے دعا کروانے جا رہا
ہوں اور ممکن ہے کہ وہ مجھے فوراً واپس آنے کی اجازت نہ دیں۔ ماں جی جب آپ ہمارے
گاؤں کی طرف دیکھ رہی تھیں تو آپ نے چند قدم دُور شیشم کے پاس ایک آدمی کو گھوڑے
کی باگ تھامے نہیں دیکھا تھا؟
دیکھا تو تھا میں نے۔"

"نسرین، صفیہ خالہ جان اب آپ سب دیکھ لیں وہ میرا خاص آدمی ہے جس
کے متعلق آپ پڑھ چکی ہیں۔"

نسرین، صفیہ اور ان کی ماں دوسری طرف کی کھڑکی سے باہر جھانکنے لگیں۔
نسرین نے پوچھا "بھائی جان وہ کون ہے؟"

یوسف نے کہا "میرا خیال ہے کہ صفیہ نے اسے پہچان لیا ہوگا؟"
صفیہ نے مڑ کر دیکھا اور ہلکی سی مسکراہٹ کے بعد منہ پھیر کر بولی "اگر آپ کی
تحریر میں اس آدمی کا ذکر ہے تو اسے بتو ہونا چاہیے صرف اتنا فرق ہے کہ لباس سے
پھیل معلوم نہیں ہوتا۔"

یوسف نے کہا "اب ہر بات میں ہماری پسند اس کی پسند بنتی جا رہی ہے؟"
نسرین نے پوچھا "بھائی جان، اب جنگلی بٹے کھانے چھوڑ دیے ہیں اس نے؟"
"ہاں لیکن کچھ دیر سے اب بھی بہت پسند ہیں۔"

بھیل کے ذکر سے نصیر الدین کو بھی کچھ دل چسپی پیدا ہوئی اور وہ دوسری طرف

”پھر میں بار بار یہ دعائیں کرتا کہ آپ سب بخیریت ہوں کیونکہ امی جان کی وفات سے میں نے یہ سستی لیا ہے کہ پریشانیوں جس قدر زیادہ ہوں اسی قدر زیادہ دعاؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔“

نسرین نے پوچھا ”بھائی جان“ بنو گھر جا کر کیا بتائے گا؟

”وہ میرے چچا کو یہ بتائے گا کہ میں نے شہر میں گھومنے اور اپنے دوستوں سے ملنے کے بعد اچانک کسی بزرگ کے پاس جانے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کے علاوہ جو کہنے والی باتیں ہیں وہ میں بڑی چچی کو سمجھا آیا ہوں۔“

”غیر نے کہا“ بیٹا گھر میں اگر کوئی پریشانی تھی تو تم کھل کر بات کر سکتے ہو۔“
”کوئی خاص پریشانی نہیں تھی لیکن اب تک پوری طرح سمجھ نہیں سکا اور بعض باتوں سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ کل عبدالکریم والے بھی دماں پہنچ گئے تھے۔ وہ ٹھہرے تو اپنے گھر میں ہیں لیکن تیور یہ بتا رہے ہیں کہ ان کا زیادہ وقت ہمارے ہی گھر میں گزرا کرے گا اور وہاں وہ مہمانداری کے فرائض بھی سنبھال لیں گے اور تو اور وہ چراغ بی بی بھی ان کے ساتھ آتی ہے۔“

بیگم فریدہ احمد نے کہا ”خدا اسے غارت کرے، وہ کیا لینے آتی ہے۔“

”ماں جی، اصل میں بات یہ ہے کہ ہمارے گھر میں سب عورتیں اس سے ہمدردی کرتی ہیں۔ پہلے تو اس پر اس وجہ سے ترس آتا تھا کہ اس کا خاندان جو شادی سے تھوڑی دیر بعد فوج میں بھرتی ہو کر کہیں چلا گیا تھا، لاپتہ ہو چکا ہے۔ اب اس افواہ کی تصدیق ہو چکی ہے وہ جنگ میں کام آچکا ہے اور ان حالات میں میں بھی اسے قابلِ رحم سمجھتا ہوں لیکن جب ان میں سے کوئی میرے ساتھ بات کرے تو مجھے بڑی الجھن ہوتی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امی جان کی وفات کے بعد بعض لوگوں کے متعلق میرے دل میں اچانک سختی آگئی ہے۔ ماں جی، میرے لیے یہ بھی دعا کریں کہ میرے دل میں کوئی غلط

کی سختی پیدا نہ ہو جائے۔“

بیگم فریدہ احمد نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”بیٹا، میں ہر سانس کے ساتھ تمہارے لیے دعا کرتی ہوں اور مجھے یہ یقین ہے کہ جو بات بھی تمہارے دل میں پیدا ہوگی وہ غلط نہیں ہوگی۔“

نصیر الدین نے کہا ”یوسف صاحب، آپ اطمینان کے ساتھ ہمارے ساتھ سفر کریں کہ جس جگہ ہم رہتے ہیں وہ آپ کا دوسرا گھر ہے۔“ یہ عجیب بات ہے کہ جس دن میں نے نسرین لڑکیاں جی سے کوٹہ سے واپس آکر آپ کا ذکر سنا تھا تو میں نے محسوس کیا تھا کہ جب میں آپ کو دیکھوں گا تو آپ اجنبی نظر نہیں آئیں گے۔“

نصیر الدین نے کہا ”یہ عجیب بات ہے کہ بعض لوگوں کے ساتھ ہم زندگیاں گزار دیتے ہیں اور مانوس نہیں ہوتے اور بعضوں کے ساتھ ایک مختصر سی ملاقات میں ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم انہیں برسوں سے جانتے ہیں۔“

”ارے بھائی مجھے بھی اپنے بیٹے سے بات کرنے درگے یا نہیں۔“ فریدہ احمد نے بیزار سی ہو کر کہا۔

”اتمی جان، بیٹا اس وقت تک آپ کی باتیں سننا رہے گا جب تک آپ شک نہیں جائیں گی۔“

یوسف نے بٹالہ اسٹیشن پر اتر کر وضو کیا تو نسرین نے گاڑی سے اتر کر اسے جا نماز پیش کر دیا۔ یوسف ایک طرف ہٹ کر جا نماز پڑھا کہ نصیر الدین گاڑی سے اتر کر وضو کرنے میں مصروف ہو گئے۔ یوسف نے نماز ختم کی تو وہ جا نماز پڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ کچھ دیر یوسف کے ساتھ پیٹ فارم پر ٹھہرا، گاڑی نے سیٹی بجائی تو وہ گاڑی پر سوار ہو گئے۔

جائیدہ تک سفر کا وقت ایک خواب کی طرح گزر گیا۔ جائیدہ اسٹیشن سے

”بھائی جان! اس نے شکایت کے لمحے میں کہا ”آپ بہت سوتے ہیں۔ نانی جان نماز کے وقت آپ کو دیکھ گئی تھیں اور پھر انہوں نے سختی سے یہ حکم دے دیا تھا کہ کوئی آپ کو جگانے کے لیے اُپر نہ جائے۔ ناشتہ کرنے سے پہلے اور ناشتہ ختم کرنے کے بعد وہ خود دو دفعہ اُپر آئی تھیں اور پھر انہوں نے بڑی سختی سے امی جان کو یہ حکم دیا تھا کہ جب تک آپ خود نہ اُٹھیں آپ کو کوئی نہ جگائے۔ اس کے بعد وہ سو گئی تھیں اور ہم باری باری آپ کو دیکھتے رہے۔ دو دفعہ امی جان، تین بار آپا فمیدہ اور چوتھی مرتبہ میں واپس جا رہی تھی۔“

فمیدہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی ”السلام علیکم“ کہا۔ یوسف نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا ”میں نے آپ کو یقیناً پریشان کیا ہو گا لیکن مجھے مدت کے بعد نیند آئی ہے۔ میں کئی دادیاں، کئی پہاڑ، کئی دریا دیکھ چکا اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ ایک طویل سفر میں امی جان میرے ساتھ تھیں۔“

فمیدہ نے کہا ”بھوک کا نیند کے ساتھ گمراہی ہے۔ نسرین اپنے بھائی کو غسل خانہ دکھا دو۔ میں امی جان کو یہ خوشخبری دیتی ہوں کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں۔“

تھوڑی دیر بعد یوسف نیچے ایک کمرے میں صفیہ، نسرین اور فمیدہ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ فمیدہ نے ناشتہ لاکر ایک میز پر رکھ دیا۔

فریدہ احمد نے کہا ”بیٹا... جلد ہی سے ناشتہ کرو“

یوسف میز کے ساتھ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ نسرین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

نانی جان، آپ بھی بیٹھ جائیں نا بھائی جان کے ساتھ۔“

”چھڑیل! مجھے دوبارہ ناشتہ کراؤ گی۔“

نانی جان آپ خود ہی تو کہا کرتی ہیں کہ مہمان کو تنہا نہیں بٹھاتے۔

”بے وقوف! میرا مہمان نہیں ہے، بیٹا ہے، اگر تم اسے مہمان سمجھتی ہو تو تھوڑی

اُتر کر انہوں نے دو تانگے لیے۔ ایک پر خواتین سوار ہو گئیں اور دوسرے پر یوسف اور نصیر الدین بیٹھنے لگے تو نسرین صفیہ سے یہ کہہ کر اُتر گئی ”امی جان مجھے بھائی جان سے ایک ضروری بات کہنی یاد آئی ہے“ پھر وہ بھاگ کر دوسرے تانگے کے قریب پہنچی اور یوسف سے مخاطب ہو کر بولی ”بھائی جان، آپ آگے بیٹھ جائیں تاکہ آپ یہاں سے ہمارے گھرنک کا سامرا راستہ اچھی طرح دیکھ سکیں۔“

نصیر الدین نے کہا ”میری بیٹی ٹھیک کہتی ہے۔“

یوسف آگے چلا گیا اور نسرین اپنے باپ کے ساتھ بیٹھ گئی۔ تمام راستہ وہ شور مچاتی رہی۔ ”بھائی جان! اب ہم فلاں موڑ پر ہیں... یہ وہ جگہ ہے... یہ سڑک ہمارے سکول کی طرف جاتی ہے، آگے سے ہم اپنے گھر کی طرف مڑیں گے۔“ لیکن یوسف کو کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ اس کی حالت ایک ایسے مسافر کی سی تھی جسے منزل پر پہنچ کر نیند نے آیا ہو۔ مکان میں داخل ہوتے وقت بھی اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ دروازہ کس سمت کھلتا ہے؟ نوکروں کو مہمانوں کے آنے کی اطلاع تھی اور انہوں نے کھانا تیار کر رکھا تھا۔ صفیہ نے مکان میں داخل ہوتے ہی نوکر سے پوچھا ”دہرہ درن سے کوئی اطلاع آئی ہے؟“

”جی ہاں، میجر صاحب کا نوں آیا تھا کہ۔۔۔ جمیل بی اور ذکیہ بی بی کل پہنچیں گے۔“

یوسف نے عشاء کی ناز ادا کی اور کھانا کھائے ہی الائی نزل کے ایک کمرے میں جا کر سو گیا۔

ایک مدت کے بعد وہ خواب میں دلکش پہاڑ اور حسین دادیاں دیکھ رہا تھا، جب اس کی آنکھ کھلی تو روشندان سے دھوپ اندر آرہی تھی، اُس نے کر دٹ بدلی تو اُسے نسرین دروازے سے باہر نکلتی ہوئی دکھائی دی، نسرین اُس نے آواز دی۔

”نانی جان، مید تو اب بھی لگے گا جو لوگ ہمیں جانتے ہیں وہ ہمارے بھائی کو دیکھ
بغیر یہاں سے کیسے جانے دیں گے۔“

دیر فہمیدہ کی طرح صبر کر لیا ہوتا۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ وہ فاقہ کرے گی۔“

نانی جان میں نے آپ کو کہا ہے لیکن اسے امی کے اشارے اور آپ کی اجازت
کی ضرورت ہے۔“

”دیکھو فہمیدہ... کسی نے تمہیں منع کیا تھا؟“

”نہیں نانی جان۔“

فہمیدہ جھجکتی ہوئی یوسف کے سامنے بیٹھ گئی، اور پھر ناشتے کے دوران وہ ایک

دوسرے کو دیکھ کر آنکھیں نیچی کر لیتے تھے۔

یوسف نے فہمیدہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا ”خالہ جان، آج مجھ سے اپنے دادا جان

اور امی جان کی حکم عدولی ہے۔ میں نے کسی حالت میں بھی نماز قضا نہیں ہونے دی تھی،

لیکن آج میں بہت سو یا، آپ مجھے بگاڑتیں تو اچھا ہوتا۔“

”بیٹا... یہ نیند بلا وجہ نہیں تھی۔ ایسی حالت میں قضا بھی تو پڑھی جاسکتی ہے بیٹا

اب تم کچھ دیر آرام کر لو۔“

اتنی دیر میں نسرین کے ابو دہرہ دونوں آنے والے بچوں کو اسٹیشن سے لیکر

پہنچ جاتیں گے۔ پھر کھانے کے دوران اور کھانے کے بعد بھی بہت سی باتیں کرنی پڑیں گی۔“

فریدہ احمد نے کہا ”ماں بیٹا، وہ تو پہلوں تمہارے ساتھ نہیں کرنا چاہیں گے۔ وہ

اسٹیشن پر تمہارے آنے کی اطلاع سن کر بے چین ہو جائیں گے۔“

فہمیدہ نے کہا ”امی جان، صبح جب نسرین کو یہ پتہ چلا کہ اس کے ابا جان شہر میں

اپنے کام سے فارغ ہوتے ہی سیدھے اسٹیشن پر چلے جائیں گے تو وہ بڑی پریشان

تھی کہ اسے پہلے کیوں نہیں بتایا اور وہ ان کے ساتھ کیوں نہ جاسکی۔“

”بیٹی نسرین تو گھر آتے ہی پڑوسیوں کو اپنے بہادر بھائی کی خبر دینا چاہتی تھی۔

اگر میں اسے منع نہ کرتی تو آج ہمارے گھر میدہ لگا ہوتا۔“

”امی جان! میں نے کب انہیں آرام کیا ہے میں تو صرف نانی جان سے

چند جھڑکیاں سننا چاہتی تھی۔ دیکھا نہیں آپ نے کہ آپا فہمیدہ بھی تو یہی کہتی ہیں کہ

نانی جان کو جب غصہ آتا ہے تو بڑی پیاری لگتی ہیں۔“

فہمیدہ نے مسکراتے ہوئے کہا ”بے وقوف لڑکی، نانی جان ہنستی ہوئی زیادہ

اچھی لگتی ہیں۔“

فریدہ نے کہا ”تم دونوں بہت شری ہو۔“

یوسف نے کہا ”ماں جی، پیار نہیں آتا آپ کو ان کی شرارتوں پر۔“

”بہت پیار آتا ہے بیٹا، اسی لیے تو انہیں دیکھ کر اپنے گھر کی تمام ذمہ داریاں بھول

جاتی ہوں۔“



دو پہر کے وقت یوسف افراد خانہ کے علاوہ نسرین کی چچی ذکیہ اور ان کی بیٹی

حمیرا کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا۔ ذکیہ کے خاوند میجر محمد بشیر فوج میں ڈاکٹر تھے اور گھنے

میں عمر کے لحاظ سے وہ تیسرے نمبر پر تھے، نصیر الدین سب سے بڑے تھے، ان سے

چھوٹے عبدالعزیز تھے اور سب سے چھوٹے ڈاکٹر کمال الدین تھے۔

میجر محمد بشیر کا بیٹا رفیق احمد تھا جس کی شکل و صورت بہت حد تک اپنی بہنوں سے ملتی تھی ذکیہ کی

صحت مند اور خوش شکل عورت تھیں لیکن رنگ قد سے سانولا تھا۔ حمیرا کے نقوش اپنی ماں کی

طرح تھیں تھے لیکن رنگ قدرے کھلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ عمر میں نسرین سے بڑی اور

فہمیدہ سے چھوٹی معلوم ہوتی تھی۔ گھر میں کسی کو ذکیہ اور اس کی بیٹی سے یوسف کا لمبا چوڑا

تعارف کروانے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ نسرین ان کے متعلق جو باتیں سنا یا کرتی تھی وہ دور دور پہنچ چکی تھیں۔

نصیر الدین نے ریوے اسٹیشن پر ہی انھیں یوسف کی والدہ کی وفات کی خبر سنا دی تھی۔ اور گھر میں اس کی تعزیت کے بعد وہ جلد ہی بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔

کھانے کے دوران حمیرا نے کہا ”بھائی جان، آپ کو جنگلی جانوروں کے شکار کا شوق ہے تو دہرہ دون ضرور آئیے۔ اباجی کو بھی شکار کا بہت شوق ہے وہ اکثر اپنے دوست ناصر علی صاحب کے ساتھ شکار پر جایا کرتے ہیں وہ کوئی بڑے زمیندار ہیں۔ ان کی ایک کوشی دہرہ دون میں ہے اور دوسری مسوری میں، پچھلے سال ہم نے گرمیوں کی چھٹیاں مسوری میں گزاری تھیں اور انہوں نے وہاں اب بھی اسی کوشی کا ایک حصہ ہمیں دے دیا تھا۔ اب ان کی طرف سے ہمیں اس سال کی دعوت ہے کہ ہم جب بھی مسوری بھڑنا چاہیں تو ان کی کوشی کے ایک حصہ پر قبضہ جاسکتے ہیں۔ اباجان نے ان کے ساتھ ایک شیر اور ایک چیتے کے علاوہ کئی جانور مارے ہیں۔“

رفیق احمد نے کہا ”اں بھائی جان میں نے ناصر علی کے گھر میں کئی بارہ سنگھوں اور ہرنوں کی کھالیں دیکھی ہیں۔ اگر میں آپ کی طرح بدوق چلا سکتا تو ان کے ساتھ شکار پر جاتا اور شیر مار کر اس کی کھال یہاں لاتا، اں بھائی جان اور میں نے وہاں بہت بڑے اڑدے کی کھال بھی دیکھی ہے۔“

یوسف نے کہا ”بھئی اگر موقع ملا تو وہاں ضرور جاؤ گا۔ مجھے بڑے جانوروں کے شکار کا بے حد شوق ہے لیکن میں مردہ جانوروں کی کھالیں گھر میں لٹکانا پسند نہیں کرتا۔“

ذکیہ نے کہا ”باجی صفیہ مجھے یوسف کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی ہے اور میں آپ کی موجودگی میں ان سے وعدہ لینا چاہتی ہوں کہ یہ ہمارے ہاں ضرور آئیں گے۔“

صفیہ نے کہا ”اں دہرہ دون کا علاقہ اور اس کے آگے مسوری کے پہاڑ اتنے

خوب صورت ہیں کہ یوسف آپ کی دعوت کو رد نہیں کرے گا۔ اور آپ نے اسے یہ بھی تو نہیں بتایا کہ وہاں دہرہ دون میں اس کی ملاقات سجاد کے ساتھ بھی ہوگی، یوسف بیٹا، سجاد حمیرا کا بھائی ہے اور ملٹری کالج میں پڑھتا ہے اور شکار کا اسے بھی کچھ شوق ہے تم اسے بہت کچھ سکھا سکو گے۔“

ذکیہ نے کہا ”باجی میں آپ کو بتا ہی نہیں سکتی کہ سجاد کو انھیں دیکھنے کا کتنا اشتیاق ہے۔ رفیق کی باتیں سن کر وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ یوسف صاحب کوئی طلسماتی انسان ہیں۔ بڑی خوشی ہوگی بیٹا یوسف تمہارے آنے سے، کیا اچھا ہو کہ تم بی لے کے امتحان سے فارغ ہوتے ہی وہاں آ جاؤ۔“

”چچی جان، مجھے اپنے پروگرام کا کوئی علم نہیں، اگر وقت ملا تو میں ضرور آؤں گا۔“

نسرین نے کہا ”چچی جان، ہمیں آپ نے دعوت ہی نہیں دی، کم از کم نانی بھان کو ہی دعوت دی ہوتی پھر میں تو ان کے ساتھ آ جاتی نا۔“

”چڑیل، اپنے گھر آنے کے لیے بھی کوئی کسی کو دعوت دیا کرتا ہے، وہ تو میں باجی صفیہ کو فون کروں گی اور آپ سب گاڑی پر سوار ہو جائیے پھر وہاں ہمیں پوری چھٹیاں سیر کے سوا اور کوئی کام نہیں ہوگا۔“

شام کے وقت یوسف سیر کے لیے جانے لگا تو نسرین نے حمیرا کو آواز دی ”حمیرا باجی میں بھائی جان کے ساتھ سیر کے لیے جا رہی ہوں تم بھی چلو گی نا، حمیرا جواب دیتے بغیر اپنی چادر سنبھالتے ہوئے ان کے ساتھ ہو گئی۔“

مکان سے باہر نکلتے ہی نسرین نے کہا ”بھائی جان ہم اسٹیشن کی طرف جائیں گے یہ اس لیے ضروری ہے کہ آپ راستہ اچھی طرح دیکھ لیں، رات کو تو تلنگے پر آپ کو راستے کا پتہ ہی نہیں چلا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے“ یوسف نے کہا ”لیکن اگر اسٹیشن کی طرف ہی جانا ہے تو تم فیہر

اور رفیق کو بھی لے آئیں۔“

”ہاں بھائی جان، میں انھیں ابھی لاتی ہوں، دیکھئے نامیں شور تو نہیں مچاؤں گی صرف ان کے کان میں کہوں گی کہ سیر کے لیے آپ کا انتظار ہو رہا ہے وہ اس وقت سیر کے لیے نہیں جایا کرتیں لیکن آپ کی خاطر وہ فوراً چل پڑیں گی۔“

یوسف نے کہا ”نسرین تم بہت اچھی لڑکی ہو، اگر انھیں کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے تو ضرور لے آؤ۔“

نسرین بھاگتی ہوئی گئی اور تھوڑی دیر بعد فہمیدہ اپنی یاد رہنمائی ہوتی اس کے ساتھ آ رہی تھی۔

یوسف نے کہا ”نسرین میرا مطلب ہے، شہزادی نسرین یہ تو آپ کو وہم نہیں ہونا چاہیے کہ میں آپ کے گھر کا راستہ بھول جاؤں گا۔ رات کو آتے وقت تو میں نے غور سے نہیں دیکھا تھا مگر جاتے ہوئے غور سے دیکھ کر جاؤں گا۔ اس لیے بھول جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ ہم ان سنان رٹھکوں پر لمبی سیر کریں، جہاں بھیڑ نہ ہو اور جو تمہاری آپا کو خاص طور پر پسند ہوں۔“

نسرین نے کہا ”پہلے آپا جان، آپ ہماری رہنمائی کریں، بھائی جان میں نے وہ فلم دیکھی تھی وہ کیا ہوتا ہے جو افریقہ میں سیاحوں کی رہنمائی کرتا ہے۔“

یوسف ہنسنا، شہزادی صاحبہ، ایسے سفاری کتے ہیں اور رٹھکوں پر سیر کرنے والوں کی رہنمائی نہیں کرتا بلکہ خطرناک جنگلوں میں شیروں، ہاتھیوں، گینڈوں اور گھجھوں کا شکار کرنے والوں کی رہنمائی کرتا ہے۔“

یوسف فہمیدہ کی طرف متوجہ ہوا، میں آپ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جب موقع ملتا ہے تو کوئی بات یاد نہیں رہتی۔“

”ایسی باتیں آپ لکھ چھوڑا کریں شاید کسی دن آپ کے کام آئیں۔ عجیب بات ہے

کہ میری بھی یہی حالت ہے۔ میرا خیال تھا کہ میں گھر جاتے ہی آپ کے مسودے کا ذکر چھیڑوں گی لیکن کل سے مجھے خیال ہی نہیں آیا۔ آپ کی تحریر کے بارے میں ان گنت باتیں مجھے آپ کے جانے کے بعد یاد آئیں گی۔“

حمیرا نے نسرین سے مخاطب ہو کر کہا ”نسرین سیر کرنے والی نظر کریں تو دوسرے دن کی ہیں ہم جب بھی وہاں جاتے ہیں تم بہت یاد آ کر کرتی ہو۔“

نسرین نے اپنی رفتار ذرا تیز کرتے ہوئے کہا ”مسوری یقیناً بہت خوب صورت ہو گا لیکن کانگڑا کے مناظر دنیا میں کیس اور نہیں ہو سکتے۔“

انھیں آگے جاتا دیکھ کر فہمیدہ اور یوسف نے اپنی رفتار کم کر دی۔

یوسف نے کہا ”فہمیدہ مجھے معلوم نہیں کہ ایک بات میں کتنی بار کہنا چاہوں گا اور کتنی بار مجھے بھول جائے گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں اس کے لیے مجھے موزوں الفاظ نہ مل سکیں۔ بات بڑی مختصر ہے اور وہ یہ ہے کہ جب آپ میری آنکھوں سے اُدھل جاتی ہیں تو میں آپ کا تصور نہیں کر سکتا۔ میرا مطلب ہے کہ دنیا میں ان گنت صورتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے نقوش ایک دفعہ دیکھنے سے ہمارے ذہن میں ثبت ہو جاتے ہیں لیکن تصور میں تمہاری جو صورتیں میرے سامنے آتی ہیں وہ ہر اک بدلتی رہتی ہیں مجھے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ تمہیں دیکھنے پہچاننے اور تمہارے نقوش اپنے دل میں بٹھانے کے لیے مجھے صبح کی روشنی میں چند لمحات، چند دن اور چند مہینے کافی نہیں بلکہ مدتوں دیکھنے کی ضرورت ہے اس قدر انہماک کے ساتھ کہ میں آنکھ بھی نہ جھپک سکوں لیکن شاید تم نہیں سمجھ سکو گی۔“

فہمیدہ نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا میں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ میں کیا سمجھ سکتی ہوں اور کیا نہیں سمجھ سکتی۔ آج میرے متعلق ایک مسئلہ آپ کے سامنے لایا جاتے گا اور ہمارے گھر میں آپ کی رائے آخری سمجھی جائے گی۔ اس لیے

مستکے پر میرا مشورہ لیا جائے گا اگر یہ ابھی بتا دیں مسئلہ کیا ہے تو میں شاید کچھ سوچ سکوں اور مجھے یقین ہے کہ نسرین اور حمیرا بھی کوئی اچھی رائے دے سکیں گی۔“
فہمیدہ نے کہا ”مسئلہ یہ ہے کہ مجھے نانا جان اور نانی جان کی خواہش کے مطابق میڈیکل اسکول میں داخلہ لینا چاہیے یا آرٹس کے لیے جالندھر یا لاہور میں پڑھنا چاہیے۔
چچا عبدالعزیز اور چچی بلقیس کا اصرار ہے کہ میں لاہور میں داخلہ لے لوں اور ان کے پاس رہوں وہ شاید اچانک کسی دن مجھے لینے بھی آجائیں۔“
یوسف نے کہا ”میں اس مسئلہ میں کوئی رائے دینے سے پہلے شہزادی نسرین تمہاری رائے لینا چاہتا ہوں۔“

”بھائی جان، افسوس تو یہی ہے کہ شہزادی کا حکم نہیں چلتا ورنہ میں یہ فرمان جاری کرتی کہ میری آپا جان کو ڈاکٹر بننے کی بجائے اپنے وقت کی سب سے بڑی ادیب بننا چاہیے اور آرٹس کے لیے ان کا لاہور جانا بہتر ہوگا۔ اگرچہ میں بہت تنہائی محسوس کیا کروں گی ان کی تو یہ عادت ہے کہ یہ آپریشن کرنا تو درکنار یہ تو کسی کو ٹیکہ لگتے دیکھ کر بھی آنکھیں بند کر لیتی ہیں۔“
”ایسی بات تو میں ان کے متعلق نہیں مانتا، ضرورت کے وقت یہ مسکراتے ہوئے بڑے سے بڑا آپریشن کر دیا کریں گی لیکن مسئلہ یہ ہے ان کے طبعی رجحان کا اور وہ تم نے کہہ ہی دیا ہے کہ یہ ایک ادیب کا ذہن لے کر پیدا ہوتی ہیں۔ پھر اگر یہ لاہور جائیں تو ہماری یہ مشکل بھی تو بہت جلد حل ہو جائے گی کہ تم ان کے ساتھ آنے کی۔“

نسرین بولی ”بھائی جان، اگر آپ نے یہ کہہ دیا امی جان انھیں بھی روک لیں گی۔“
یوسف فہمیدہ کی طرف متوجہ ہوا ”فہمیدہ آپ ان لڑکیوں میں سے ہیں جو اپنے متعلق بہترین فیصلے کرنے اور اسے منوانے کا حق لے کر پیدا ہوتی ہیں۔ اگر ڈاکٹری کی طرف رجحان ہو تو یہ ایک مقدس پیشہ ہے لیکن اس صورت میں جبکہ آپ طبعاً ادب کی طرف راغب ہیں تو آپ کے لیے لاہور جانا بہتر ہوگا۔“

آخری کچھ جاتے گی کہ گھر میں امی اور ابا جان وہی پسند کیا کرتے ہیں جو میں پسند کیا کرتی ہوں۔ اور یوسف صاحب میں بھی ایک بات کہنا چاہتی ہوں وہ یہ ہے کہ میں نے بھی آپ کو دن کی روشنی میں اتنا نہیں دیکھا جتنا میں آپ کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کل نہ جائیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی مجبوری نہ ہو تو جب تک چچی جان یہاں ہیں آپ بھی یہیں ٹھہریں، شاید مجھے آپ کی کتاب کے متعلق کچھ کہنے کا موقع مل جائے۔“
یوسف نے کہا ”میرا واپس جانا بہت ضروری ہے مگر تمہاری تھوڑی سی خوشی کے لیے میں رُک جاؤں گا۔“

”تھوڑی نہیں بہت زیادہ۔“
”نسرین“ اس نے آواز دی۔ ”آؤ تمہیں ایک خوشخبری سناؤں۔“
نسرین حمیرا کا ہاتھ پکڑ کر بھاگتی ہوئی ان سے آئی اور فہمیدہ نے کہا خوشخبری یہ ہے کہ تمہارے بھائی جان کل نہیں جائیں گے میں نے انہیں کہا تھا کہ جب تک چچی جان اور حمیرا یہاں ہیں آپ یہیں رہیں لیکن فی الحال یہ زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے۔ اس کے بعد یہ وعدہ تم لے لینا کہ جب بھی انہیں موقع ملے گا یہ جالندھر کا راستہ نہیں بھولیں گے۔“
حمیرا نے کہا بھائی جان، میں بھی آپ سے دہرہ دون آنے کا وعدہ لینا چاہتی ہوں۔ عثمان بھائی جان آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔“

یوسف نے کہا ”اس وقت میں یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ کبھی اس طرف جانا ہوا تو میں سیدھا آپ کے گھر آؤں گا لیکن ملک کے حالات اتنے غیر یقینی ہیں کہ یقین کے ساتھ کوئی پروگرام نہیں بنایا جاسکتا۔“

نسرین ”آپا حمیرا آپ مطمئن رہیں آئندہ جب کبھی ہم دہرہ دون جانے کا پروگرام بنایا تو انشاء اللہ بھائی جان ہمارے ساتھ ہوں گے۔“
یوسف نے فہمیدہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا ”آپ نے کہا تھا کہ گھر جا کر ایک اہم

فہمیدہ نے کہا "اب گھر پہنچتے ہی اس مسئلے پر بات ہوگی اور چچا عبدالعزیز یہ سن کر خوش ہوں گے کہ آپ نے مجھے لاہور بھیجنے کا مشورہ دیا ہے۔"

"لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں ماں جی کو خفا کرنا چاہتا ہوں۔"

فہمیدہ نے کہا "آپ کے مشورے کا سب سے بڑا فائدہ تو مجھے ہی ہوگا کہ نانی جان فوراً مان جائیں گی۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں فوراً واپس چلنا چاہیے۔"

یوسف نے کہا "لیکن حمیرا نے کوئی رائے نہیں دی۔"

حمیرا بولی "بھائی جان، میرا دوش بھی آپ کے ساتھ ہے۔ میرے ابا جان کی تو یہی خواہش ہے کہ فہمیدہ آپا ڈاکٹر بنیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہیے کہ اگر یہ کامیاب ادیب بن سکتی ہیں تو انہیں زبردستی ڈاکٹر بنادیا جائے۔"

"میری تو حالت یہ ہے کہ مجھے آپا فہمیدہ ہر حالت میں اچھی لگیں گی خواہ یہ ڈاکٹر ہوں یا پروفیسر یا کچھ اور۔"

یوسف نے پوچھا "آپ یہ چاہیں گی کہ آپ کی کتابیں آپا لکھا کریں؟"

"کیوں نہیں دنیا میں ہر اچھی چیز میری آپا کے لیے ہونی چاہیے۔" لیکن لوگ کہتے

ہیں کہ کتابیں لکھنے والوں کو کبھی کبھی بھوکا بھی رہنا پڑتا ہے۔"

"دیکھیں بھائی جان، آپ منحوس باتیں نہ کریں۔" اُس نے برہم ہو کر کہا۔

فہمیدہ نے کہا "آپ کو کبھی اپنے مسودے کا خیال نہیں آیا۔"

"خیال بہت آتا ہے اور کسی دن اچانک اس کو مکمل کرنے کے لیے بیٹھ جاؤں گا۔"

فہمیدہ نے کہا "کبھی آپ کو یہ خیال آیا ہے کہ یہاں آکر مسودہ نامکمل ہے۔"

میرا مطلب ہے کہ اس سے آگے بھی لکھا جائے اور یوسف کی سرگزشت کے باقی واقعات بھی اس میں شامل کئے جائیں۔"

یوسف نے کہا: "دیکھئے، یہ سرگزشت دو حصوں میں تقسیم ہوتی چلی جائے گی، دوسرا

حصہ جو میرے نزدیک بہت اہم ہے اور جسے پڑھنے والے بھی بہت اہمیت دیں گے وہاں سے شروع ہوتا ہے۔ جب امرتسر کے اسٹیشن سے ماں جی اور نسرین سے میرا راستہ جدا ہو گیا تھا اور میں اپنا ہینڈ بیگ جس میں مسودہ بند تھا، جالندھر جانوالی گاڑی پر چھوڑ آیا تھا مجھے اپنے مسودے سے زیادہ اس بات کا ملال تھا کہ اس پر

نسرین نے اپنا ایڈریس بھی لکھا ہوا تھا۔ اب اس حصے کو مکمل کرنے کے لیے میں آپ سے کئی سوالات پوچھوں گا اور یہی وجہ ہے کہ میں کل ٹرک گیا ہوں۔ اصل مسودہ آپ کے پاس رہے گا اور میں جو کچھ لکھا کر دوں گا، اس کی ایک نقل بالاقساط آپ کو ملتی رہے گی۔"

فہمیدہ نے کہا "دیکھئے جو آپ کا اصل مسودہ تھا وہ میرے پاس محفوظ ہے اور

میں نے جو اس کی ایک نقل رکھتی ہے وہ آپ کے پیردر دی جائے گی تاکہ آپ کو تسلسل قائم رکھنے میں آسانی رہے۔ اس سرگزشت کا جو حصہ جالندھر سے تعلق رکھتا ہے اُس

کے متعلق آپ کو زیادہ سوال پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ آپ جانتے ہیں

کہ نسرین کو کوئی بات نہیں بھولتی اور میرا خیال ہے کہ اگر یہ ابھی سے وہ واقعات سُنانا

شروع کر دے جو امرتسر سے جدا ہونے کے بعد پیش آئے تھے تو آپ کو کئی سوالات کا

جواب مل جائے گا، اور آپ کی تحریر نے جو مجھ پر اثر کیا تھا اُس کے متعلق بھی نسرین

سے زیادہ آپ کو کوئی نہیں بتا سکتا۔"

نسرین نے کہا "بھائی جان! آپ کو اپنی پریشانی کا سارا حال سُناؤں گی،

لیکن یہ غلط ہے کہ میں کوئی بات آپا جان سے بہتر کر سکتی ہوں۔"

یوسف نے کہا "بھئی یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تم دونوں ایک دوسرے سے

کتنا پیار کرتی ہو۔ یہ بات تو میں فہمیدہ کو دیکھے بغیر سمجھ گیا تھا۔ اب تم یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ

کب معلوم ہوا تھا کہ میں اپنا ہینڈ بیگ بھول گیا ہوں۔"

"اُسی وقت بھائی جان جب گاڑی چل پڑی تھی۔ مجھے پہلے ہی اس بات کا احساس

تھا کہ مجھ سے کوئی حماقت ضرور ہوگئی ہے اور میں نے نانی جان سے بھی کہہ دیا تھا۔“ اور پھر نسرین بولتی چلی جا رہی تھی۔ دس منٹ بعد وہ گھر پہنچے تک کے واقعات سنا چکی تھی۔

یوسف نے آہستہ سے کہا ”فہیدہ یہ سیر فرامی نہ کریں، اس وقت شہزادی نسرین بولنے کے موڈ میں ہے۔“
فہیدہ نے کہا۔ ”ہم آگے سے دائیں ہاتھ مڑ جائیں تو شہزادی صاحبہ کو نصف گھنٹہ اور بولنے کا موقع مل جائے گا۔“

نسرین بدستور بولتی رہی اور گھر کے قریب پہنچ کر وہ اُن دنوں کا ذکر کر رہی تھی جب فہیدہ یوسف کا مسودہ پڑھا کرتی تھی۔ گھر کے پاس ہی ایک مسجد میں عشاء کی اذان ہو رہی تھی۔ یوسف نے فہیدہ سے مخاطب ہو کر کہا ”میں نماز پڑھ کر آتا ہوں۔ آپ پرے لیے ایک دستہ کاغذ لکھوائیں میں رات کو لکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں بی رائے کرنے سے پہلے اس کتاب کا ایک حصہ مکمل کر لوں گا۔“

حمیرا نے پوچھا ”بھائی جان ایک سیکینڈ پوری کتاب کیوں نہیں؟“
”بھئی یہ کتاب ایک دیہاتی لڑکے کی سرگزشت ہے جس نے کئی کٹھن مراحل طے کرنے کے بعد ایک ناول نگار بننا ہے، پھر یہ بعض ایسے لوگوں کی سرگزشت بھی ہوگی جو ان کٹھن مراحل میں اُس کے ہمسفر ہوں گے۔ اس لیے لکھنے سے پہلے سرگزشت کا مکمل ہونا ضروری ہے۔ اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس میں کتنا وقت لگے گا اور اس کے شائع ہونے تک میں کتنی اور کتابیں لکھ چکا ہوں گا۔“

حمیرا نے کہا۔ ”بھائی جان میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا شاید نسرین سمجھتی ہو۔“
نسرین بولی ”چلو گھر چلو۔ وہاں آجا جان تمہیں سمجھا دیں گی۔“



رات کھانا کھانے کے بعد یوسف اپنے کمرے میں گیا تو وہاں میز پر کاغذات اور روشنائی کی شیشی پڑی ہوئی تھی۔ یوسف کرسی پر بیٹھ گیا تو نسرین چمڑے کا ایک چھوٹا سا کبس اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی اور اُسے میز پر رکھ دیا۔ یوسف نسرین سے کچھ پوچھنے والا تھا کہ فہیدہ اور اس کی ماں کمرے میں آگئیں اور وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
فہیدہ نے کہا ”بیٹا بیٹھے رہو۔ امی جان یہ سن کر بہت خوش ہوئی ہیں کہ تم کچھ لکھنے لگے ہو۔“

”خالہ جان آپ تشریف رکھیں یوسف نے کہا۔“
فہیدہ نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا ”بیٹا میں تمہارا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی۔“

”خالہ جان میرا وقت ضائع نہیں ہوگا بلکہ لکھنے کے لیے میرا موڈ بن جائے گا۔“
فہیدہ آپ بھی بیٹھ جائیں۔“

فہیدہ بولی ”نہیں۔ میں صرف آپ کو یہ بتانے آئی ہوں کہ اس کبس میں آپ کا مسودہ اور ایک نیا قلم بھی ہے جو میں نے اس خیال سے خرید کر اس کبس میں رکھ دیا تھا کہ کسی دن آپ یہ مسودہ تلاش کرتے ہوئے ہمارے گھر آئیں گے اور میں یہ قلم آپ کو اس درخواست کے ساتھ پیش کر دوں گی کہ اسے جلد ہی مکمل کیجئے۔“

یوسف مسکرایا۔ ”لوگ مصنفوں کو اُس وقت قلم پیش کرتے ہیں جب وہ بہت مشہور ہو جاتے ہیں۔ اس لیے میں اس قلم کو بہت بڑا انعام سمجھتا ہوں اور آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ نسرین میں تمہارا شکر گزار بھی ہوں کہ تمہاری وجہ سے مجھے کوئی کتاب شائع ہونے سے پہلے ہی اتنے بڑے قدردان مل گئے ہیں۔“

فہیدہ نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ”قدردان بھی اور دعائیں کرنے والے بھی۔ اب تم اپنا کام کرو۔“

”بیٹا اصل بات یہ ہے کہ میں نے صرف چند صفحات پڑھے ہیں اور میں اسے پوری
یکسوئی سے پڑھتا چاہتا ہوں۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ فہمیدہ کسی معمولی بات سے متاثر نہیں
ہوا کرتی لیکن تمہارا انداز تحریر مجھے بالکل انوکھا معلوم ہوتا ہے۔“
یوسف نے کہا: ”نسرین، ذرا ادھر آنا میں پھر ایک بار تمہارا شکریہ ادا کروں۔“
”کس بات پر؟ بھائی جان!“ اس نے بھاگتے ہوئے قریب آکر کہا۔
”وہ بات یہ ہے تمہاری وجہ سے میں بہت شفقت اور پیار کرنے والوں سے
متعارف ہوا ہوں۔“

نصیر الدین کچھ دیر غور سے یوسف کی طرف دیکھتا رہا، پھر اس نے کہا: ”بیٹا، کیا
یہ نہیں ہو سکتا کہ تم چند دن اور یہاں رُک جاؤ اور کچھ اور لکھ لو۔“
یوسف نے جواب دیا: ”جناب میں پھر آؤں گا اور آپ مجھ سے تنگ نہ آگئے
تو بار بار آتا رہوں گا، لیکن اس وقت مجھے جانا چاہیے، میں گاؤں میں دو دن ٹھہر کر لاہور
چلا جاؤں گا۔“

نصیر الدین نے کہا: ”انشاء اللہ لاہور میں بھی ملاقات ہوتی رہے گی۔ فہمیدہ کے متعلق
پہلے تو یہی سوچا گیا تھا کہ وہ کالج کی تعلیم کی ابتداء لاہور سے کرے لیکن چونکہ اس کا طبی رجحان
ڈاکٹری کی بجائے ادب کی طرف ہے اس لیے ایف اے تک یہیں پڑھے گی اور اس
کے بعد لاہور چلی جائے گی وہاں اس کا چچا اور چچی اس سے بہت پیار کرتے ہیں۔ اگر فہمیدہ
ڈاکٹر بننے کا شوق ظاہر کرتی تو ہمیں اسی سال لاہور بھیجنا پڑتا۔“
”وہ مجھ سے بھی بہت پیار کرتے ہیں۔“ نسرین نے کہا۔

”لیکن ان کے پیار کا یہ مطلب نہیں کہ میں تمہیں بھی لاہور بھیج دوں گا۔“
”ابا جان، میں آپ کو چھوڑ کر لاہور کیسے جا سکتی ہوں اور نانی جان سے بھی میں
دور نہیں ہونا چاہتی۔“

وہ کمرے سے باہر نکل گئیں۔
یوسف نے کبس کھول کر پہلے فہمیدہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی خوب صورت جلد نکالی،
شروع اور آخر کے چند صفحات پڑھے پھر نیا قلم نکالا سیاہی بھری اور بسم اللہ کہہ کر
لکھنے میں مصروف ہو گیا جب صبح کی اذان سنائی دی تو اس نے قلم رکھ دیا اٹھ کر وضو
کیا اور نماز پڑھی اور میز پر بکھرے ہوئے کاغذ اکٹھے کیے بغیر سو گیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی
تو بیگم فریدہ احمد بستر کے قریب بیٹھی ہوئی تھیں وہ ہڑٹا کر اٹھا اور بولا: ”ماں جی میں لکھنے
لکھتے سو گیا تھا اور شاید بہت دیر سو یا رہا۔“

”بیٹا! لکھتے لکھتے نہیں ساز پڑھ کر سوئے تھے اور میرا خیال ہے کہ ابھی
تمہاری سسیز پوری نہیں ہوئی اور ایک دلچسپ بات جو میں تمہیں
بتانا چاہتی ہوں وہ یہ ہے کہ نصیر الدین تمہارے نئے لکھے ہوئے صفحات پڑھنے کے بعد
اس بکس سے تمہارے سوئے کی نقل نکال کر لے گیا تھا۔“

یوسف نے میز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”لیکن وہ کاغذ جو میں نے لکھے تھے؟“
”میرا خیال ہے وہ فہمیدہ کے پاس ہیں۔“

تم نے رات بھر جو کچھ لکھا تھا وہ سب سے پہلے فہمیدہ نے پڑھا تھا پھر صفیہ
نے۔ پھر اُس سے نصیر الدین چھین کر لے گیا تھا اور اب میرا خیال ہے کہ ظہیر ذکیہ اور حمیرا کو
پٹھ کر سنا رہا ہے۔

چند منٹ بعد یوسف ناشتہ کرتا تھا کہ نصیر الدین مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا
”بھئی یوسف! اگر تم اس بات پر خوش ہو سکتے ہو کہ میری عمر کا آدمی تمہارے
قارئین کی جماعت میں شامل ہو چکا ہے اور تمہیں ہر سطر پر داد دینا چاہتا ہے تو تم جی بھر کر
خوش ہو سکتے ہو۔“

یوسف نے مسکراتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا اور پھر اپنی مناک آنکھوں کو چھپانے
کی کوشش کرتے ہوئے کہا: ”میرے لیے یہ بہت بڑا انعام ہے کہ آپ نے وہ پڑھ لیا ہے۔“

بہت بڑا خلا پیدا ہونا تھا اور اس خلا کو پُر کرنے کے لیے آپ سب کو نمودار ہونا تھا۔ نصیر الدین صاحب میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ قدرت کو یہ معلوم تھا کہ کسی دن اچانک میں بہت بُری طرح گھاتل ہو جاؤں گا اور میرے زخم مندمل کرنے کے لیے آپ آگے بڑھیں گے۔“

نصیر الدین نے اسے گلے لگا لیا۔ گاڑی نے سیٹی بجائی اور نصیر الدین نے اسس کی پیشانی پر ہسودیتے ہوئے کہا: ”بیٹا، خدا حافظ، میں ہمیشہ تمہارے لیے دعائیں کیا کروں گا اور دعا کے ساتھ ہم ایک دوسرے کے لیے اور کبھی تو کچھ نہیں سکتے۔“

گاڑی حرکت میں آچکی تھی اور یوسف جلدی سے خدا حافظ کہہ کر گاڑی پر سوار ہو گیا۔ نصیر الدین بے حس و حرکت پلیٹ فارم پر کھڑا تھا، کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا اور جب گاڑی دور نکل گئی تو وہ آہستہ آہستہ اسٹیشن سے چل پڑا۔

نانی نے کہا: ”اجی میرے ساتھ مکہ نہ کرو مجھے معلوم ہے جب تمہارا لاہور جانے کا وقت آئے گا تو تم نانی کو پوچھو گی بھی نہیں۔ نصیر الدین بیٹا کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ صفیہ کے بجائے نسرین ڈاکٹر بن جائے اور تم میڈیکل کیلئے اسے میرے پاس لے دیا نہ بھیج دو۔“

صفیہ نے کہا: ”امی جان، بیٹی کو ابھی سے پریشان نہ کریں جب وقت آئے گا دیکھا جائے گا۔“

نسرین نے کہا: ”امی جان میں پریشان نہیں ہوا کرتی۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم جان بھر کی طرح لاہور میں بھی اکٹھے ہو جائیں اور نانی جان واپس ہمیں ملنے کے لیے آیا کریں۔ نانی جان میں سچ کہتی ہوں مجھے بڑا مزہ آتا ہے آپ کا انتظار کرنے میں۔“



اگلے دن نصیر الدین یوسف کو ریلوے اسٹیشن پر خدا حافظ کہہ رہا تھا۔ گاڑی واپس ہونے سے چند منٹ پہلے اس نے پلیٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے کہا: ”یوسف رات میں سوچ رہا تھا کہ میں بھی تمہارے گاؤں تک ہواؤں لیکن پھر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ جب تمہارے آبا جان لاہور آجائیں گے تو ہم پہلے وہاں آئیں گے اور اس کے بعد کسی اچھے موقع پر تمہارے گاؤں جانے کا کوئی پروگرام بنائیں گے۔ ایک بات جو میں اس وقت کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب بھی تمہیں کوئی الجھن یا پریشانی ہو تو تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ میرے گھر میں تم کبھی اجنبی نہیں سمجھے جاؤ گے۔“

یوسف نے جواب دیا: ”جناب میں شکر کے الفاظ سے آپ کے خلوص کی توہین نہیں کرنا چاہتا۔ یہ میری زندگی کا ایک عجیب اتفاق ہے کہ آپ مجھے اس وقت ملے ہیں جب مجھے آپ کی ضرورت تھی بلکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ کوئٹہ سے میرا، نسرین اور اُس کی نانی جان کے ساتھ سفر کرنا اور پھر جب ام ترسے میرا راستہ جدا ہو رہا تھا تو اپنے مسودے کو وہاں بھول آنے میں ہی ایک راز تھا کہ کسی دن میری زندگی میں ایک

باب - ۲۷

جائزہ دھرنے والی سی پر یوسف تین دن گھر رہا اور اپنے والد سے اجازت لے کر لاہور چلا گیا۔ وہاں مکان پر نوکر موجود تھا، تاہم اسے وہاں رہتے ہوئے وحشت محسوس ہوتی تھی۔ تین دن اپنے مکان میں رہنے کے بعد وہ اپنے دوست منظور احمد کو جو چار طلباء کے ساتھ کان کے قریب ایک مکان میں رہتا تھا اپنے ساتھ لے آیا۔ جب اُس کے والد اپنی چھٹی ختم کرنے کے بعد واپس آئے تو منظور پھر اپنے مکان میں چلا گیا تاہم اُن کے تعلقات اتنے گہرے نہ ہو سکے تھے کہ وہ چھٹی کا دل عام طور پر یوسف کے گھر ساتھ گزارا کرتے تھے۔ کبھی کبھی کالج کے اور ساتھی بھی ان کے ساتھ آجایا کرتے تھے۔ یوسف کی وجہ سے منظور کو کبھی کبھی رانی سے دل چسپی ہو گئی تھی اور چھٹی کے دن وہ عام طور پر طلوع آفتاب سے پہلے کشتی رانی کے لیے دریا پر پہنچ جاتے تھے۔ کبھی کبھی دو اور لڑکے محمد حفیظ اور عبد المجید بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتے۔ کشتی رانی کے بعد وہ یوسف کے گھر آکر ناشتہ کرتے، کچھ دیر باس ہی ایک باغ میں جا کر مطالعہ کرنا شروع کر دیتے۔ وہاں چند لڑکے اور جمع ہو جاتے تو خرمیک پاکستان اور جنگ کی صورت حال کے متعلق باتیں شروع ہو جاتیں۔ اُن کے لیے دو پہر کا کھانا یوسف کے گھر تیار ہوتا تھا اور یوسف کے والد اُس کے دوستوں کی مہمان نوازی میں ایک راحت محسوس کیا کرتے تھے۔ یوسف نے اپنے کسی ساتھی کو

یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ اپنی زندگی کا ایک عظیم ترین المیہ دیکھ چکا ہے تاہم منظور کبھی کبھی اُس کے ساتھ دل کی بات کر لیا کرتا تھا۔ دوسرے لڑکوں سے وہ زیادہ جانتا تھا۔ فروری کے دنوں میں یوسف نے زیادہ سنجیدگی کے ساتھ پڑھائی شروع کر دی لیکن ایک دن اسے غیر متوقع واقعہ پیش آیا اُس کی چچی اور چچا گاؤں سے آئے اور اگلے دن اس کی ماموں زاد بہن سعیدہ بھی بہاول پور سے وہاں پہنچ گئی۔ ان کے درمیان ایک دن کوئی کھسر بھسر ہوتی رہی اور پھر سب یوسف کے کمرے میں آ گئیں۔ چچی نے بھگتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو یوسف اگر تم ناراض نہ ہو تو میں تم سے ایک بات کرنا چاہتی ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ بھائی جان عام طور پر بات کے وقت اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہم وہ دن واپس نہیں لا سکتے جو انہوں نے آپا قدسیہ کے ساتھ گزارے تھے مجھے وہ زمانہ ایک خواب معلوم ہوتا ہے اور صرف میں ہی نہیں بلکہ سارا گاؤں بھی محسوس کرتا ہے۔ گاؤں میں ہم نے یہ مسئلہ چھیڑا تھا کہ بھائی جان دوسری شادی کر لیں لیکن تمہاری وجہ سے وہ ایسی بات سُننے کے لیے تیار نہیں!“

یوسف نے جواب دیا۔ ”چچی جان آپ کو یہ کیسے خیال آیا کہ میں اباجی کو اس طرح مغموم دیکھنا پسند کرتا ہوں۔“

”بیٹا تم پسند نہیں کرتے لیکن تمہارے اباجی کا یہ خیال ہے کہ تمہاری دل آزاری ہوگی۔“

”آپا سعیدہ کیا آپ بھی یہی سمجھتی ہیں!“

”بھائی میں کچھ نہیں سمجھتی مجھے چچی کے خطوط آتے تھے اور میں یہ سوچ کر یہاں پہنچ گئی ہوں کہ تم مجھ سے بہتر سوچ سکو گے۔“

یوسف نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں ابھی اباجی سے بات کرتا ہوں۔“

ایک منٹ بعد وہ دوسرے کمرے میں اپنے والد سے کہہ رہا تھا۔ ”اباجی! میں یہ محسوس کرتا ہوں

”بھائی چراغ بی بی ایک ہی تو ہے“

”کیوں آپا سعیدہ تم بھی اُسے پسند کر آئی ہو“

”دیکھو بھائی میری طرف اس طرح نہ دیکھو مجھے یہ خط ملا تھا کہ تمہارے آبا جان اُسے قبول کرنے پر رضامند نظر آتے ہیں اور اس خط میں یہ بھی تاکید کی گئی تھی کہ میں یہاں آنے سے پہلے اُسے اچھی طرح دیکھ آؤں، مجھے معلوم نہیں کہ ایسی عورتوں کو اچھی طرح کیسے دیکھا جاتا ہے۔ مجھے صرف یہ معلوم تھا کہ گاؤں سے لاہور آنے کے بعد بھی کافی عرصہ وہ تمہارے گھر آیا کرتی تھی اور انہوں نے تمہارے بہت سے کام اپنے ذمے لے لیے تھے۔ پھر وہ بیکایک یہاں سے غائب ہو گئیں۔ میں نے پتہ کیا تو یہ راز کھلا کہ وہ اپنے گاؤں اس امید سے گئیں تھیں کہ ہم وہاں پیغام لے کر جاتیں گے۔ میں چراغ بی بی کی ماں کو دیکھ کر کچھ پریشان ہوئی تھی لیکن اس کے باپ کے متعلق میرا خیال ہے کہ وہ بہت اچھا ہے۔“

یوسف نے کہا ”آپا جی! آپ کسی کو دل کا اچھا یا دل کا بُرا نہ کہا کریں۔ کیونکہ آپ کی سوچ ہمیشہ حقیقت کے اُکڑ ہوتی ہے۔ بہر حال اگر آپ سب کو چراغ بی بی پسند ہے اور آبا جان بھی اُسے ناپسند نہیں کرتے تو میں بھی اپنے دل پر سچتر رکھ لوں گا، لیکن میرے امتحان کے دن قریب آرہے ہیں اس لیے آپ جس مقصد کے لیے آئی ہیں اُسے جلد از جلد پورا کر لیجئے۔“

دو ہفتے بعد یوسف کے دو چچا اور ان کے والد کے چچا اپنی بیگمات کے ساتھ لاہور پہنچ گئے۔

بیگمات گھر میں ٹھہر گئیں اور یہ لوگ عبدالکریم اور اس کی بیوی کے ساتھ امرتسر روانہ ہو گئے۔ سفر کے لیے دو کابریں عبدالکریم نے تیار کیں اور ایک کار لے کر عبدالعزیز پہنچ گئے۔ بلقیس کا بڑی شدت سے انتظار تھا اور یوسف کی یہ خواہش تھی کہ وہ عبدالعزیز صاحب

کو یہ تنہائی کی زندگی آپ کے لیے بہت تکلیف دہ ہوگی۔ میں اکثر یہ سوچا کرتا تھا کہ آپ کو کسی اچھے گھرانے کی خاتون سے شادی کر لینی چاہیے لیکن مجھے یہ بات کہنے کی جرأت نہیں پڑتی تھی۔ اب آپا سعیدہ اور چچی جان کے خیالات معلوم کرنے کے بعد مجھے اس بات پر بے حد ذمہ داری محسوس ہوئی ہے کہ میں نے ایک فرمانبردار بیٹے کا فرض ادا نہیں کیا۔ باپ نے اٹھ کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگا ”یہ باتیں شروع نہیں ہونی تھیں تو میں نے گاؤں میں ہی کہہ دیا تھا کہ مجھے اپنے سے کسی بڑے خاندان کی عورت کی ضرورت نہیں، ایک ایسی نیک طبیعت خاتون کی ضرورت ہے جو میرے بچوں کی خدمت کر سکے۔“

”ابا جی! اس بات کا فیصلہ آپ سے ہی ترکون کر سکتا ہے جو کوئی بھی اس گھر میں آئے گی ہم اپنی ماں سمجھ کر اس کی عزت کریں گے۔“

”بیٹا اگر تم اپنے دل پر کوئی بوجھ محسوس کیے بغیر یہ بات کر رہے ہو تو اپنی چچی سے پوچھ لو وہ میرے لیے کیا پسند کرتی ہے۔“

”ابا جی میں ابھی پوچھتا ہوں۔“

یوسف واپس اپنی چچی اور سعیدہ کے پاس آ بیٹھا اور اُس نے کہا ”چچی جان اگر آپ مجھے اپنی پسند کی خاتون بتا دیتیں تو میں اسی وقت آبا جان سے فیصلہ کر لیتا۔“

”بیٹا مجھ سے زیادہ یہ تمہاری بہنوں کی پسند کا مسئلہ ہے۔ زہرہ نے اُسے پسند کیا تھا تمہاری بہن بھی اُسے جانتی ہے، اُس کی تائید کرتی ہے۔“

”چچی جان کہاں گئی تھی اُسے دیکھنے کے لیے وہ کون ہے جسے میں نہیں جانتا اور آپ جانتی ہیں۔“

”بیٹا وہ چراغ بی بی ہے اور تم اُسے اچھی طرح جانتے ہو۔“

”کیوں زہرہ یہ وہی چراغ بی بی ہے جسے ہم سب جانتے ہیں۔“

ساتھ چائے میں شریک ہو گیا۔ چائے ختم ہوئی تو عبد الرحیم
مہمانوں کے ساتھ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد یوسف کو بازو سے پکڑ کر اپنے
کمرے میں لے گئے اور انہوں نے پوچھا: "بیٹا! تم کہہ اس غائب
ہو گئے تھے؟"

"جی میں نماز کے لئے مسجد چلا گیا تھا۔"

"بیٹا، تم اب تک اپنی ماں سے نہیں ملے؟"

"ابا جان! صحن عورتوں سے بھر ہوا ہے۔"

"تم زہرہ سے کہو اسے اندر لے آئے۔"

یوسف نے زہرہ کو آواز دی، وہ اندر آئی تو میاں عبد الرحیم نے کہا "بیٹی عبد الکیم
کی بیوی یا بیٹی کو کہو تمہاری ماں کو یہاں لے آئے۔ زہرہ واپس چلی گئی، تھوڑی دیر بعد رشید
اور امینہ چراغ بی بی کو بازوؤں کا سہارا دیتے اندر داخل ہوئیں، زہرہ اور اس کی چچی اس
کے پیچھے تھیں۔ یوسف اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور میاں عبد الرحیم نے کہا "چراغ بی بی تمہیں سب
سے پہلے میرے اس بیٹے سے ملنا چاہیے تھا، جس پر میں فخر کیا کرتا ہوں۔" چراغ بی بی نے
آگے بڑھ کر دونوں ہاتھوں سے اس کا سر پکڑ لیا اور اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا
"جی یوسف پر سارا خاندان فخر کرتا ہے اور میں بھی اسے بیٹا کہتے ہوئے فخر محسوس کرتی ہوں۔"
یوسف کا چہرہ حیا اور عفت سے اچانک سُرخ ہو گیا اور اس نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے
ہوئے کہا "آپ بیٹھ جائیں۔"

جب وہ بیٹھ گئی تو اس کی ماں بھی اندر آ گئی۔ یوسف اپنی آستین سے پیشانی پونچھتا
ہوا دہان سے کھسکا اور صحن کے ایک کونے میں نکلے کے پانی سے اپنی پیشانی رگڑ رگڑ کر
دھونے لگا اور پھر وضو کرنے کے بعد ڈیوڑھی سے سائیکل اٹھا کر باہر نکل گیا۔

کے ساتھ جائے لیکن عبدالعزیز نے آتے ہی کہا "بھئی یوسف بقیس آج سفر کے موڈ میں نہیں
تھی اور ان کا موڈ اس لیے بدل گیا تھا، جب میں نے یہ بتایا تھا کہ تم گھر کے انتظامات کے
لیے یہیں رہو گے۔"

"چچا جان، آپ نے انہیں بتادیا ہوتا کہ میرا گھر میں رہنا ضروری تھا اور یہ بات بھی
تو کچھ عجیب تھی نا کہ میں...."

"بیٹا میں تمہارا مطلب سمجھ گیا ہوں اور شاید اسی احساس نے تمہاری چچی کو دہاں
جائے سے روک دیا ہے۔ بہر حال ہمیں اللہ سے بہتری کی دعا کرنی چاہیے۔ میں تمہاری اور
تمہاری چچی کی فائیدگی کے لیے تمہارے والد کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

لگے روز یوسف ظاہری مسکراہٹوں کے باوجود بے حد اداس معلوم ہوتا تھا وہ سارا
دن گھر سے باہر نہ نکلا۔ شام کے وقت امرتسر جانے والی بارات واپس آ گئی۔ یوسف مکان
کے دروازے سے باہر ان کے استقبال کے لیے کھڑا تھا۔ عبد الکیم کی بیوی دلہن کو کار
سے نکال کر مکان کی طرف بڑھی۔ چراغ بی بی سمی سمیٹائی اندر داخل ہوئی۔ یوسف نے آگے
بڑھ کر اپنے والد کو سلام کیا اور انہوں نے ہاتھ لاکر اسے لگا لیا اور پھر اسے لے کر
دوسرے مہمانوں کے ساتھ بیٹھک میں چلے گئے۔

صحن کے اندر خواتین چراغ بی بی کو بلینگ پر بیٹھا کر سلامیاں دے رہی تھیں اور
دلہن کے لباس میں وہ اس چراغ بی بی سے بہت مختلف معلوم ہو رہی تھی جسے وہ دیکھا کرتی
تھیں۔ اس اجوم میں یوسف کے رشتہ داروں کے علاوہ امینہ بھی موجود تھی۔ چراغ بی بی
کی ماں جو دو گھنٹے قبل وہاں پہنچ گئی تھی اپنی بیٹی کے قریب
کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔

یوسف کچھ دیر اپنے رشتہ داروں اور مہمانوں سے باتیں کرنے کے
بعد نصف عصر کے لئے مسجد میں چلا گیا۔ جب وہ واپس آیا تو مہمانوں کے

محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے حال اور مستقبل کے متعلق سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ اچانک اسے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اس نے مڑ کر دیکھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا "کون ہے؟" "جی، میں فضل دین ہوں" اس نے والے نے بہت بھراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ آپ کو گھر سے نکلے بہت دیر ہو گئی تھی اور وہاں سب پریشان تھے۔ امینہ کو اچانک کوئی خیال آیا اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر کار پر اس طرف نکل آئیں۔

یوسف نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "وہ یہاں آئی ہیں؟" "جی ہاں، وہ باہر سڑک پر کھڑی ہیں اور وہ آپ کی ناراضگی کے ڈر سے یہاں نہیں آئیں۔ اب میں آپ کی سائیکل لے آتا ہوں اور آپ امینہ بی بی کے ساتھ جلدی گھر پہنچ جائیں۔ جب جی میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ امینہ بی بی اتنی نرم دل بھی ہو سکتی ہیں لیکن آج معلوم کیا ہوا کہ وہ رورہی تھیں اور اپنے ماں باپ کے متعلق بھی یہ کہہ رہی تھیں کہ انھوں نے آپ پر ظلم کیا ہے۔ وہ یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ اس نے چراغ بی بی کی بڑی بے عزتی کی ہے۔" یوسف نے کہا "اے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"جناب یہ بات آپ سمجھا سکتے ہیں کیونکہ سب سے زیادہ وہ آپ کا کہاٹنے گی۔" فضل دین نے چند قدم دوڑ جا کر سائیکل پکڑ لیا اور یوسف اس کے ساتھ چل دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ سڑک پر امینہ کو اپنی کار کے ساتھ کھڑی دیکھ رہے تھے۔

یوسف نے آگے بڑھ کر کہا "دیکھتے آپ کو اس وقت نہیں آنا چاہیے تھا یہ اچھا کیا آپ آگے نہیں آئیں ورنہ قبرستان اور خاص کر اس موسم میں محفوظ جگہ نہیں۔ یہاں سانپ ہوتے ہیں، بہت زہریلے سانپ۔"

امینہ یولی "میں سانپوں کے خوف سے یہاں نہیں رُکی، صرف اس بات سے ڈرتی تھی کہ کہیں آپ دیکھتے ہی مجھ پر برس نہ پڑیں۔"

"کتنی غلط فہمی ہے آپ کو میرے متعلق، آپ کو یہ بھی خیال نہیں آیا کہ میں کسی کی

یوسف کے والد مغرب کی نماز کیلئے گھر سے نکلے تو امینہ چراغ بی بی کو ہاتھ سے پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گئی اور اُس نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا "آپا چراغ بی بی، یہ تم سے کس بے وقوف نے کہا تھا کہ تمہارے لیے اُس کا ہاتھ چومنا بھی ضروری ہے؟ خدا کا شکر کہ وہ اُس نے غصہ ضبط کر لیا تھا ورنہ یوسف کا چہرہ دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ وہ اچانک تمہارا گالا گھونٹ ڈالے گا، تم نے اُس کے ہاتھ نہیں دیکھے۔ اگر وہ اچانک تمہاری گردن پر پہنچ جاتے تو کوئی تمہاری جان نہیں بچا سکتا تھا۔ تمہیں اڑیاں اٹھا کر اُس کی پیشانی تک پہنچتے ہوئے شرم آنی چاہیے تھی؟ چراغ بی بی غصے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُس کی طرف دیکھ رہی تھی، اُس کی ماں نے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے آواز دی بیٹی تم کیا مشورہ کر رہی ہو؟" امینہ نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا "جی، مجھے آپا جی سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔" امینہ یہ کہہ کر باہر نکل گئی۔ ماں نے بیٹی سے کہا "بیٹی، کیا بات ہے تمہارا چہرہ اتر ا ہوا ہے؟" اس نے آنسو بہاتے ہوئے کہا "امی، امینہ مجھ سے حلیتی ہے، وہ رب مجھ سے جلتے ہیں۔"

"کیا کہا تمہیں اس نے؟"

"امی وہ نہیں چاہتی کہ میں یوسف کی ماں کہلاؤں۔"

اس کی ماں عالم بی بی نے کہا "بیٹی، مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ وہ لوگ تمہارا سکہ برداشت نہیں کریں گے لیکن پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"



یوسف نماز مغرب کے بعد اپنی ماں کی قبر پر کھڑا تھا، قبرستان کے سکوت میں بیٹھ کر پہلی بار وہ پوری کیسوی کے ساتھ اپنے ماضی کے متعلق کچھ سوچ رہا تھا اُسے ایسا

دل آزاری نہیں کر سکتا۔

”جی اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں یہاں تک آنے کی جرأت بھی نہ کرتی، اب اگر آپ کو میرے ساتھ چلنے پر کوئی اعتراض نہ ہو تو جلدی کیجئے وہاں لوگ بے حد پریشان ہیں۔ فضل دین آپ کی سائیکل لے آئے گا۔“

یوسف کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ کار پر بیٹھ گیا۔ کافی دیر دونوں خاموش رہے، پھر امینہ نے کہا ”جب میں کار اسٹارٹ کر چکی تھی تو میں نے بیگ بلقیس صاحبہ کو آتے دیکھا تھا، میں نے کار روکی تھی لیکن ان کا ڈرائیور آگے نکل گیا تھا پھر بھی میرا خیال تھا کہ بیگ بلقیس نے مجھے یقیناً دیکھ لیا ہوگا اگر وہ رک جائیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ میرے ساتھ ہی آپ کی تلاش میں آجائیں۔ میں اس بات سے بہت ڈرتی تھی کہ آپ مجھے دیکھ کر خفا ہو جائیں گے۔“

”آپ جن حالات میں گھر سے باہر نکلے تھے۔ میں ان کے باعث پریشان ہو گئی تھی اور پھر آپ کی تلاش میں نکل پڑی تھی۔ مجھے خیال آیا تھا کہ شاید آپ اپنی امی جان کی قبر پر گئے ہوں گے اور عجیب بات ہے کہ میرا خیال درست نکلا۔“

”امینہ میں اس بات پر خفا نہیں ہوں اور میں چراغ بی بی کو بھی قابلِ معافی سمجھتا ہوں۔ اگر میں تھوڑی دیر تک ٹھنڈے دل سے سوچتا تو شاید گھر والوں کو پریشانی نہ ہوتی، مجھے اب خیال آ رہا ہے کہ چراغ بی بی نے میری ماں کو جان کنی کی حالت میں بھی پیار کرتے دیکھا تھا۔ شاید اس نے پہلے بھی امی کو میرا ہاتھ چومنے دیکھا ہو اور اس بات کو ایک ماں کی حیثیت سے اپنے فرائض میں شامل کر لیا ہو۔ اس لیے میں نہیں چاہتا کہ اس مسئلے کو آئندہ زیر بحث لایا جائے۔ میں اسے خوش رکھنے کی کوشش کر دوں گا یہ اور بات ہے کہ مجھے اپنی کوشش میں کامیابی نہ ہو۔“

”یوسف صاحب، امینہ نے کچھ سوچ کر کہا۔ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو صرف

دوسروں کی اچھائیوں پر نگاہ رکھتے ہیں لیکن دنیا کا ہر انسان آپ جیسا نہیں۔ چراغ بی بی کے متعلق تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس سے بے وقوفی ہوتی تھی لیکن آپ نے اس کی ماں کو غور سے نہیں دیکھا مجھے اس کی وجہ معلوم نہیں مگر میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اس سے خوف کھاتی ہوں یہاں تک کہ مجھے اس کے پیار سے خوف آتا ہے۔ آپ بڑا نرم انسان ہیں تو میں یہ کہوں گی کہ آپ کو اس سے بہت محتاط رہنا چاہیے۔“

”میں اسے بھی خوش رکھنے کی کوشش کر دوں گا اور تمہیں ان مسائل کے متعلق پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے معلوم ہے کہ دنیا میں پہاڑ سا بوجھ اٹھانے کے لیے پہاڑ بننا پڑتا ہے میں پہاڑ تو نہیں لیکن میں چھوٹی موٹی ٹھنکیاں بڑی ہمت کے ساتھ برداشت کر دوں گا۔“

”یوسف صاحب میں اس بات سے بخیر نہیں ہوں کہ اللہ نے آپ کو کتنی ہمت اور کتنا حوصلہ دیا ہے۔ کاش میں آپ کی طرح ایک ادیب ہوتی اور آپ کے متعلق ایک کتاب لکھ سکتی۔“

یوسف نے ہنستے ہوئے کہا ”ماں باتیں عجیب آتی ہیں آپ کے ذہن میں۔“

”یوسف صاحب میں آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ میرے ساتھ گاڑی پر بیٹھ گئے ہیں۔“

”بھئی شکر یہ مجھے ادا کرنا چاہیے کہ آپ میری تلاش میں نکل پڑی تھیں، میں اتنا ناشکر گزار تو نہیں ہو سکتا کہ آپ گاڑی لے کر ٹرک پر کھڑی ہوں اور میں آپ کے ساتھ بیٹھنے سے انکار کر دیتا۔ ویسے مجھے یہ خیال آیا تھا کہ آپ کو نیچے بٹھا کر مجھے کار خود چلانی چاہیے۔“

امینہ نے گاڑی روکتے ہوئے کہا ”یوسف صاحب میں اب بھی نیچے بیٹھنے کے لیے تیار ہوں۔“

”اب تو ہم گھر پہنچنے والے ہیں اب چلو۔“

امینہ نے گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا، ”یوسف صاحب میں دوبارہ آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔“

یوسف کی آواز بھتر گئی۔ بلقیس نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "بیٹا! تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں میں سمجھ سکتی ہوں کہ تم اپنی ماں کی قبر پر کیوں گئے تھے۔ اگر تم میرے گھر سے ہو کر جاتے تو شاید میں بھی تمہارے ساتھ چلتی، تمہارے گھر نہ آنے کی وجہ یا امر تسرنہ جانے کی وجہ یہی تھی کہ میرے دل میں تمہاری ماں کی موت کے زخم اچانک تازہ ہو گئے تھے اور آج بھی سب کے سامنے تمہیں امینہ کے ساتھ دیکھ کر مجھے یقیناً غصہ آیا مگر اب مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میرے طرز عمل سے تمہاری دل آزاری ہوئی ہے۔ بیٹا مجھے معاف کر دو، کبھی کبھی مجھے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔"

یوسف نے کہا "چچی جان عام حالات میں میں شاید اس کے یا کسی اور لڑکی کے ساتھ کار پر بیٹھنا مناسب نہ سمجھتا لیکن کل میرا دماغ جواب دے چکا تھا۔"

"بیٹا بیٹھ جاؤ کھڑے کیوں ہو؟"

"نہیں چچی اب میں چلتا ہوں۔"

"اچھا تم مجھ سے وعدہ کر دو جب بھی تمہیں کوئی پریشانی ہوگی تم میرے پاس آیا کر دو گے۔"

"چچی جان، میں ضرور آیا کر دوں گا لیکن اپنی پریشانیوں میں آپ کو حصّے دار نہیں بناؤں گا۔"

"ماں بیٹا میں شاید اس قابل بھی نہیں ہوں کہ تمہاری پریشانیوں میں حصّہ دار بن سکوں۔"

"چچی جان، میرا مطلب یہ نہیں تھا، میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ بیٹے جو ان ہو جائیں تو وہ ماؤں کو اپنی پریشانیوں میں حصّہ دار نہیں بنایا کرتے اور میں اس رات شاید ایک بچے سے اچانک جو ان ہو گیا تھا۔ جب امی جان چلی گئیں تھیں۔ چچی جان اگر کبھی مجھے تجر بننے یا بچے کی طرح رونے کا خیال آیا تو آپ کے گھر کے علاوہ کسی اور گھر کو موزوں نہ سمجھوں گا لیکن آپ کو بھی میرے

گاڑی گھر کے قریب پہنچی تو بلقیس گلی سے نکل رہی تھی اور اس کا ڈرائیور دروازہ کھول رہا تھا۔ امینہ نے گاڑی روکی اور یوسف جلدی سے اس کے بلقیس کی طرف بڑھا اور اس نے پوچھا، "چچی جان! آپ جا رہی ہیں؟"

بلقیس نے اسے امینہ کے ساتھ دیکھ لیا تھا وہ چند ثانیے خاموش رہی اور پھر کہنے لگی، "میں نے تمہارا کافی انتظار کیا ہے۔"

"چچی جان میں صبح آپ کے پاس حاضر ہونا چاہتا تھا لیکن گھر کے کاموں میں الجھا رہا اور پھر مجھے یہ بھی امید تھی کہ آپ کسی وقت یہاں آئیں گی۔"

"بیٹا! میں آئی تھی تو تم گھر میں نہیں تھے اور یہ کوئی بھی نہیں بتا سکا کہ تم کہاں گئے ہو۔ امینہ کو میں نے نوکر کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا تھا لیکن تم اس وقت کار پر نہیں تھے۔"

"چچی جان میں سائیکل پر باہر نکلا تھا۔ یہ لوگ مل گئے تو میں نے اپنی سائیکل امینہ کے نوکر کے حوالے کر دی۔"

بلقیس نے کہا "یہ بھی اچھا ہوا کہ امینہ کو تمہارے پروگرام کا علم تھا ورنہ گھر میں بہت پریشانی تھی۔ اچھا اب تم آرام کرو میں جاتی ہوں تمہارے چچا میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

یوسف کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن بلقیس نے کار بیٹھ کر دروازہ بند کر لیا اور ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کر دی۔

اگلے دن وہ صبح ہوتے ہی بلقیس کے گھر پہنچا تو میاں عبدالعزیز دفتر جا چکے تھے۔ اس نے السلام علیکم کہنے کے بعد بلقیس سے کہا "چچی جان آپ میرے لیے ایک ابھن چھوڑ آئی تھیں، میں کافی دیر سو نہ سکا۔ میں آپ کو یہ بتانے آیا تھا کہ میں کسی پروگرام کے ساتھ گھر سے نہیں نکلا تھا اور امینہ کو یہ علم نہیں تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ بہر حال وہ میری تلاش کے لیے نکلی تو میں اپنی ماں کی قبر پر کھڑا تھا۔ شاید یہ بات آپ کی سمجھ میں نہ آ سکے کہ میں ماں کی قبر پر کیوں گیا تھا۔"

”نہیں چچی جان اب آپ مجھے اجازت دیں تو میں رات سے پہلے آ جاؤں گا۔“



اس دن وہ بہت خوش تھا۔ شام کے وقت منظور اس کے پاس آیا تو وہ دونوں چائے پی کر سائیکلوں پر راوی کی طرف چلے گئے۔ وہاں مغرب کی نماز کے بعد انہوں نے ایک کشتی لی اور یوسف کی ہفتوں کے بعد دریا کے بہاؤ کے خلاف خوشی خوشی کشتی چلا رہا تھا۔

منظور نے کہا ”خدا کا شکر ہے کہ تم بہت بشارت نظر آرہے ہو، یوسف نے کشتی دوسرے کنارے لگاتے ہوئے کہا ”دیکھو منظور اس دنیا میں زندہ رہنے کے لیے میرے جیسے آدمی کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی پر یقین رکھتا ہو یا کسی کے لیے زندہ رہنا یا مرنے چاہتا ہو، کبھی کبھی یوں ہوتا ہے کہ رات کا بادلوں کے باعث ستاروں کی ضیا پائینوں سے محروم ہوتی ہے پھر اچانک کسی جگہ سے بادل پھٹ جاتے ہیں اور کوئی ستارہ پوری تابانیوں کے ساتھ نظر آتا ہے اور تھکے مارے مسافروں کو اپنا راستہ اور منزل دکھائی دینے لگتی ہے۔ منظور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں اپنے مقدر کے ستارے کے ساتھ زندگی کا نیا سفر شروع کر چکا ہوں لیکن اس کی تفصیلات کے لیے میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔“

”یوسف! میرے لیے اصل مسئلہ اس دنیا میں تمہاری خوشی ہے اور یہ میں تمہاری آنکھوں سے دیکھ سکتا ہوں اور مجھے یہ جاننے کی ضرورت نہیں کہ تمہارے مقدر کا روشن ستارہ کون سا ہے۔ یوسف تمہیں معلوم ہے کہ جب سے تمہاری امی جان فوت ہوئی ہیں میں تمہارے لیے کتنی دعائیں کیا کرتا ہوں میں ہمیشہ تمہیں مسکراتا اور قہقہے لگاتا ہوں ساتھی دیکھنا چاہتا ہوں جس کے متعلق مجھے پہلی ملاقات کے ساتھ ہی یقین ہو گیا تھا کہ وہ دنیا میں نام پیدا کرے گا اور میں اس کا دوست کہلائے پر فخر کروں گا۔ اب نماز کا وقت ہو رہا ہے

لیے یہ دعا کرنی چاہیے کہ میں کسی کو پریشان نہ کروں۔ میں عجیب قسمت لے کر پیدا ہوا ہوں۔ جن لوگوں نے مجھ سے پیار کیا تھا وہ اچانک اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ پہلے چچا شیر علی اور میرے پردادا چلے گئے۔ پھر امی جان کی باری آئی، میں آپ کے لیے دعا کیا کرتا ہوں کہ اللہ آپ کی عمر بہت لمبی کرے اور جب تک میں بوڑھا نہیں ہو جاتا آپ پر چچا جان سلامت ہیں۔“

”بیٹا تمہیں پیار کرنے والے اور بھی تو بہت ہیں“ بلقیس نے جواب دیا۔

”جی ہاں ان کے لیے دعا کیا کرتا ہوں جب کوئی میرے دل کے قریب آتا ہے تو یہ خوف طاری ہونے لگتا ہے کہ وہ مجھ سے چھین نہ جائے۔“

”لیکن تم نے کبھی یہ سوچا ہے کہ کتنے لوگ تمہارے لیے دعا کرتے ہیں۔“

”چچا جان اس کے لیے بھی میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ اب مجھے اجازت دیں۔“

یوسف السلام علیکم کر چلنے لگا تو بلقیس نے اسے آواز دے کر کہا ”بیٹا ٹھہر میں تمہیں ایک خوشخبری سنانا چاہتی ہوں، فہیدہ بہت جلد یہاں آرہی ہیں۔ انشاء اللہ وہ چند دن یہاں گزارے گی۔ سیر بھی اُس کے ساتھ ہوگی۔ اُن کے صحیح پروگرام کا ٹیلیفون پر گفتگو سے معلوم ہو جائے گا۔ اگر تم آج رات ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ تو اُن سے گفتگو بھی کر سکو گے۔ میرا مطلب ہے اگر تمہارا وقت ضائع نہ ہو“ بلقیس مسکراتی تھی

”چچی جان میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ لیکن آپ کو یہ خیال ہے کہ میرا وقت ضائع ہوگا۔ اب تو میری یہ حالت ہے کہ وقت میرے لیے ایک سزا بن چکا ہے۔ رات مجھے نیند نہیں آتی تھی اور آج بھی اگر میں یہ اطمینان لے کر نہ جاتا کہ آپ میری حماقت پر خفا نہیں ہیں تو مجھے نیند نہ آتی۔ چچی جان نیند کا نہ آنا ایک بہت بڑی سزا ہے۔“

بلقیس نے آگے بڑھ کر پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، ”بیٹا تم نے کوئی حماقت نہیں کی تھی غلطی میری تھی دیکھو جا کر بیٹھو۔ میں سو جاؤں ہم رات کو ٹیلیفون کریں گے

”یوسف تم ذرا دیر سے آئے ہو، ہمیں جان بھر کی ٹیلی فون کال بک کراتے ہی مل گئی تھی۔ وہ سب بخیریت ہیں اور تمہارے چچا نے ان سے کافی دیر گفتگو کی تھی۔“ عبدالعزیز نے یوسف کو اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے کہا:-

”بیٹا میں کھانا کھاتے ہی ایک ضروری کام سے دفتر چلا جاؤں گا اور یہ ممکن ہے کہ میں پچھلے پرنک واپس نہ آسکوں تو تم اطمینان سے کھانا کھاؤ اور میری بات سننے رہو۔ میں ایک مدت سے ایک اہم فریضہ پورا کرنے کے متعلق سوچ رہا ہوں۔ تمہاری چچی سے بہن قدسیہ نے آخری وقت جو باتیں کی تھیں ان سے صرف میں ہی نہیں ہمارا پورا خاندان متاثر ہے۔ اگر بلقیس نے تمہیں وہ باتیں نہیں بتائیں تو کسی وقت ان سے پوچھ لینا۔ جہاں تک تمہارے مستقبل کے متعلق فہمیدہ کے والدین اور دوسرے عزیزوں کا تعلق ہے۔ ان کے لیے یہ جان لینا ہی کافی ہے کہ اللہ نے تمہیں ایک دوسرے کے لیے بنایا ہے اور بیٹی نسرین ہمیں ایک سرے سے قریب لانے کے باعث پورے خاندان میں بہت معتبر بن گئی ہے۔“

یوسف مسکرایا اور پھر اچانک اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر بیڑ ہو گئیں اور وہ رندھی ہوئی آواز میں بولا:- ”چچا جان! مجھے اظہار تشکر کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ آپ اور چچی بلقیس کے بغیر میری دنیا کتنی ویران اور اُداس ہوتی۔“

بلقیس بولی ”بیٹا تمہیں معلوم نہیں کہ تم ہماری دنیا میں کتنی خوشیاں لے کر آتے ہو۔“

عبدالعزیز نے کہا ”دیکھو یوسف! بلقیس تمہیں دیکھ کر جس قدر خوش ہوتی ہے۔ اُسی قدر تمہیں ان سے خوف زدہ رہنا چاہیے کیونکہ جب انہیں غصہ آتا ہے تو یہ بھی نہیں دیکھتیں کہ وہ غریب جو ان کے تیر و نشتر کا ہدف بن چکا ہے

اور آج یہاں ریت پر میں تمہارے پیچھے نماز پڑھوں گا۔“ اُنھوں نے وضو کیا اور دریا کے کنارے خشک ریت پر نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ نماز ختم کرنے کے بعد جب وہ دوبارہ کشتی پر سوار ہوئے تو یوسف کہہ رہا تھا ”منظور کبھی کبھی مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ اللہ میرے حال پر بہت مہربان ہے۔ ماں کی موت کے بعد میں نے اپنے دل پر جو زخم محسوس کیے تھے وہ مندرجہ ہو رہے ہیں اور بعض فرشتے مجھے کھینچ کر جنت کی طرف لا رہے ہیں اور ان فرشتوں میں سے ایک تم بھی ہو، میں تمہاری نیک عادات کے لیے شکر گزار ہوں۔ کبھی کبھی مجھے یہ بھی محسوس ہوتی ہے کہ کوئی تاریک سایہ میرا پیچھا کر رہا ہے لیکن پھر کسی سانپ کی آواز سنائی دیتی ہے اور یہ تاریک سائے روپوش ہوجاتے ہیں۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں منظور۔“

”بھائی شکر مجھے ادا کرنا چاہیے جسے تم نئے احساس دلایا ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں مجھ جیسے عاجز کی دعائیں بھی مقبول ہو سکتی ہیں۔ آج سے میں تمہارے تصور کے ستارے کے لیے بھی دعائیں کیا کروں گا۔ اور وہ دن میرے لیے انتہائی خوشی کا دن ہوگا جس میں تمہاری زبان سے یہ سنوں گا کہ تم اپنی منزل پر پہنچ چکے ہو۔“

کشتی کنارے پر لگی یوسف نے جب کشتی والے کو پیسے دینے کے لیے اپنی جیب میں اٹھ ڈالا تو منظور نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا ”نہیں یوسف صاحب، آج سے کشتی والے کو میں پیسے دیا کروں گا۔“

یوسف نے کوئی مزاحمت نہ کی اور منظور نے اپنی جیب سے ایک روپیہ نکال کر کشتی والے کو دے دیا۔



رات کے وقت یوسف عبدالعزیز کے گھر پہنچا تو وہاں کھانے کی میز پر اس کا انتظار ہو رہا تھا۔ بلقیس نے اسے دیکھتے ہی کہا

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک بیٹا ماں سے اگر روٹھے گا تو کہاں جائے گا؟ بلقیس نے قدرے توقف کے بعد کہا ”بیٹا تم نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ تمہاری ماں نے جان کنی کے وقت مجھ سے کیا باتیں کی تھیں؟“

”چچی جان! مجھے پوچھنے کی ضرورت نہ تھی میں یہ بات جانتا تھا اور جو باتیں میں نہیں سُن سکا تھا ان کے متعلق بھی میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ وہ یہی تھیں ویسے چچی جان میرے کان بہت تیز ہیں اور جن باتوں کا میری زندگی کے ساتھ اتنا گہرا تعلق تھا وہ جاننے کے لیے میری حسیات پوری طرح بیدار تھیں۔ میں ساری عمر اس بات پر آپ کا شکر گزار رہوں گا کہ جب امی جان آخری سانس لے رہی تھیں تو آپ نے ان کی سب سے بڑی اکھن اور بے چینی دُور کر دی تھی!“

بلقیس آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے بولی ”بیٹا یہ کوئی احسان نہیں تھا بلکہ جو خواہش ان کے دل میں تھی وہ میرے دل میں بھی تھی۔ انشاء اللہ آج تمہیں میری طرف سے کوئی انعام ملے گا!“

”وہ کیا ہو گا چچی جان؟“

”بیٹا وہ انعام یہ خوشخبری ہے کہ فہمدہ، نسرین اور اُن کے والدین کل صبح یہاں آ رہے ہیں۔ یہ بھاتی جان پر منحصر ہے کہ وہ کب پہنچیں گے۔ اگر ان کا موٹو بن گیا تو انشاء اللہ نماز سے فارغ ہوتے ہی چل پڑیں گے۔ فہمدہ نے کالج کی چند کتابیں خریدی ہیں لیکن اہم ترین بات یہ ہے کہ سب کا اذالین مقصد تمہیں دیکھنا ہے۔“

یوسف نے جھپکتے ہوئے کہا ”چچی جان! اگر آپ مجھے اس قابل سمجھتی ہیں تو میں بہت خوش قسمت ہوں۔“

”تم یقیناً بہت خوش قسمت ہو بیٹا! عام حالات میں شاید وہ اتنی جلدی یہاں آنے کا پروگرام نہ بناتے لیکن تمہارے چچا نے اپنے بھائی سے خلاف توقع ذرا

ان سے کتنا پیار کرتا ہے؟“

”نہیں چچا جان۔ یوسف مسکرایا ”مجھے یقین ہے کہ چچی جان کو مجھ پر کبھی غصہ نہیں آئے گا۔“

عبدالعزیز نے گلاس اٹھا کر پانی کے چند گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا میں تمہیں صرف محتاط رہنے کا مشورہ دے رہا ہوں۔ اگر مجھے دفتر میں زیادہ دیر ہوگئی تو ممکن ہے کہ گھر آنے کی بجائے وہیں آرام کروں تمہیں اٹھنے کی ضرورت نہیں۔ خدا حافظ!“

عبدالعزیز نے غسل خانے میں جا کر ہاتھ صاف کیے اور وہیں سے باہر نکل گیا۔

یوسف نے قدرے توقف کے بعد بلقیس کی طرف دیکھا اور کہا ”چچی جان! میرے لیے اسی وقت دعا کریں۔“

وہ بولی ”بیٹا! میں ہر وقت تمہارے لیے دعا کیا کرتی ہوں۔“

”وہ مجھے معلوم ہے چچی جان! لیکن آپ اس وقت میرے لیے یہ دعا کریں کہ مجھ سے کوئی ایسی حماقت نہ ہو جائے جس سے آپ کو غصہ آجائے،“ بیٹا مجھے تم پر غصہ نہیں آ سکتا اور قد سید کے پیٹے کو یہ اطمینان رکھنا چاہیے کہ مجھے اُس کی حماقتوں پر بھی پیار آئے گا۔“

”چچی جان! آپ دعا ضرور کریں کیوں کہ چچا جان نے مجھے بڑی عجیبگی سے وارننگ دی تھی۔“

”نہیں بیٹا! انہوں نے مجھے ڈرانے کی کوشش کی تھی ان کا خیال ہو گا کہ میں کسی بے خیالی میں تمہاری دل آزاری نہ کر بیٹھوں اور تم روٹھ جاؤ۔ اس لیے مجھے گفتگو میں بہت محتاط رہنا چاہیے۔“

یوسف مسکرایا ”چچی جان! اگر یہ بات ہے تو میں اسی وقت ٹیسٹ دینے کے لیے تیار ہوں۔ آپ کے جی میں جو آئے کہتی جاتیں اور میں مسکراتا رہوں گا، روٹھنے کا

کے لیے مجھے مہر و ماہ کے الفاظ پسند آگئے۔ دیکھتے مسئلہ ذاتی پسند کا ہے۔ ذوق سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اگر میں سوچ میں پڑ جاؤں تو فہمیدہ کے علاوہ اور کوئی نام مجھے پسند نہیں آئے گا۔ مجھے یہ بھی خیال آتا ہے کہ آئندہ جو چیز مجھے پسند آیا کرے گی وہ تمہارے نام کا حصہ بن جایا کرے گی۔ مجھے اس خوشی میں نیند نہیں آتے گی کہ آپ کل تشریف لارہی ہیں۔ خدا کرے کہ آج علی الصبح سفر کے موڈ میں ہوں اور آپ اچانک یہاں پہنچ جائیں۔ جب مجھے کوئی اور کام نہیں ہوتا تو میں اپنی والدہ کی قبر پر جاتا ہوں اور وہاں فاتحہ خوانی کے ساتھ یہ وعدہ بھی دہرایا کرتا ہوں کہ اب کی سب سے بڑی خواہش پوری کرنا میری زندگی کا ایک مقدس مسئلہ ہے۔ میں نسرین، تمہارے والدین اور بڑی مان جی کی بلند ترین توقعات پوری کروں گا۔

امتحان قریب آ رہا ہے مجھے کھپلی کمی پورا کرنے کے لیے سخت محنت کرنا پڑے گی لیکن سر دست میں اپنا مسودہ مکمل کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ انشاء اللہ آج یہ کام شروع کروں گا اور آپ کے یہاں آنے کی خوشی میں جو تحفہ پیش کر دوں گا وہ میری پہلی کتاب ہوگی پوری کتاب نہیں ہوگی شہزادی صاحبہ! کیونکہ آخری صفحات لکھنے کے لیے مجھے وقت کا انتظار کرنا پڑے گا اور ہمیں اللہ کی بارگاہ میں بہت سی دعائیں کرنا پڑیں گی کہ اس کی تکمیل ہماری خواہشات کے مطابق ہو۔

میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ بعض لوگوں کی تقدیس کے احترام میں مجھے نئے سترے میں ان کے نام تبدیل کرنے پڑیں گے اور بعض واقعات اور مقامات میں بھی کچھ رد و بدل کرنا پڑے گا اور یہ سب اس لیے ہوگا کہ میری کتاب میں کئی ایسے کردار آئیں گے جن کی اصل شخصیتیں میں زمانے کی نگاہوں سے اُدھل رکھنا چاہتا ہوں۔ فہمیدہ! اس وقت میرے ذہن میں ہزاروں باتیں ہیں اگر لکھنا شروع کر دوں تو ایک اور کتاب بن جائے گی۔ میں انتہائی اختصار سے کام لیتے ہوئے یہ کہنا چاہتا

کھل کر بات کی تو وہ فوراً تیار ہو گئے اور بیٹا سنبھل گیا میں فہمیدہ کی ماں سے تمہاری پریشانی کا ذکر کر رہی تھی تو مجھے ٹیلی فون پر فہمیدہ کی ہلکی ہلکی سسکیاں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ اچھا بیٹا یہ بتاؤ اس خبر سے بڑھ کر کیا انعام ہو سکتا ہے؟ یوسف مغموم لہجے میں بولا اچھی جان جب میں بہت چھوٹا تھا تو امی جان مجھے کوئی خوبصورت کھلونا دیا کرتی تھیں تو ان کے چہرے پر وہی مسکراہٹ ہوا کرتی تھی جو میں آپ کے چہرے پر دیکھ رہا ہوں۔ اس وقت میں اس کے سوا کچھ نہیں سوچتا کہ اپنے کمرے میں جاؤں ورنہ دل اور اللہ کے حضور سر بسجود ہو جاؤں!

بقیہ نے نوکر کو بلوا کر حکم دیا "تم یوسف صاحب کو بیڈ روم میں لے جاؤ ان کے لیے دھوا اور پانی رکھو دو اور یہ بھی دیکھ لو کہ غسل خانہ صاف ہے کہ نہیں ایک جائے نماز بھی وہاں رکھو دو!"

مقنن نے دیر بعد صبح نے بیٹھک میں جا کر نماز پڑھی دعائیں مانگیں اور کچھ دیر صحن میں ٹہلنے کے بعد بیٹھک کی چھت پر چڑھ گیا۔ وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ تاروں کی روشنی بیکار بڑھ گئی ہے۔ سردی کے باوجود ہوا کے جھونکے اسے خوشگوار محسوس ہو رہے تھے۔ پھر کچھ دیر ٹہلنے کے بعد اس پر لکھنے کا موڈ طاری ہو گیا اور وہ نیچے جا کر بیٹھک میں ایک کشادہ میز کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے میز کا دراز کھولا تو وہ فل سکیپ کاغذ سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے چند کاغذ نکال کر پر پر کر کے اور لکھنے میں مصروف ہو گیا۔

"مہر و ماہ سلامت رہو!"

یہ وہ خط ہے جو تمہیں بھیجنے کی جسارت کرنے کے بجائے کہ میں چھپا کر رکھ لوں گا اور کبھی کبھی تجدید عہد کے لیے خود ہی پڑھ لیا کروں گا۔ یہ ایک مشہور شہزادی کا نام ہے۔ ابھی میں چھت پر کھڑا جھلملاتے ہوئے تاروں کو دیکھ رہا تھا تو تمہیں پکارنے

وہ خواب کی حالت میں اپنے گاؤں کے کھیتوں میں گھوم رہا تھا۔ فہمیدہ اس کے ساتھ تھی۔ وہ کانگریڈ کے ایک بلند پہاڑ پر چڑھ رہا تھا اور فہمیدہ اور نسرین اس کے پیچھے آ رہی تھیں۔ وہ پھل سے لدے ہوئے ایک انجیر کے درخت پر چڑھ رہا تھا اور نسرین جھولی تلنے اپنی بہن کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ ایک آبشار کی طرف بڑھ رہا تھا اور نسرین اس کا بازو پکڑ کر چلا رہی تھی۔ بھائی جان آگے نہ جاسیتے۔ یہ جگہ بہت خطرناک ہے۔“ پھر اسے کمرے میں ٹلکی ٹلکی آہٹ اور دبے دبے قہقہے سنائی دینے لگے کچھ دیر وہ آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ نسرین کہہ رہی تھی ”آپا جی بہت دیر ہو گئی ہے مجھے تو خوف آتا ہے ایسی گہری نیند سے میرا خیال ہے کہ آپ انہیں جگا دیں۔“ فہمیدہ کی آواز سنائی دی۔ بے وقوف شور مچاؤ درنہ میں پٹائی کروں گی۔“

”آپا جان آپ کیا لکھ رہی ہیں؟“ بے وقوف چپ رہو۔“
یوسف نے آنکھیں کھولیں، نسرین بولی ”اسلام علیکم بھائی جان اگر میں اب شور مچا دوں تو آپ کی نیند تو خراب نہیں ہوگی؟“
”تمہاری آواز سے میری نیند کبھی خراب نہیں ہوتی“ یوسف نے جواب دیا۔
فہمیدہ جو ہاتھ میں قلم لیے میز کے سامنے بیٹھی تھی بولی ”اور میری آواز؟“
”اگر میں نے سوال کا صحیح جواب دیا تو آپ ناراض ہو جائیں گی۔“
”میں کیوں ناراض ہونے لگی؟“

”دیکھئے شہزادی صاحبہ اگر میں دنیا میں نہ ہوتا تو بھی آپ کی آواز سن کر اٹھ بیٹھتا۔ میرا جواب غلط نہیں ہے لیکن آپ یقیناً برا مانیں گی۔“

فہمیدہ بولی۔ ”آپ کا جواب غلط بھی ہے اور مجھے پسند بھی نہیں آیا اور یہ خط جسے آپ نے سنبھال کر رکھنا تھا مجھے مل گیا ہے اور میں نے اس کا مختصر جواب بھی

ہوں کہ جب میرے گرد و پیش تمام روشنیاں گل ہو گئی تھیں۔ میرے سامنے کوئی منزل اور راستہ نہ تھا تو تمہاری یاد میرا آخری سہارا بن گئی تھی۔ پھر ایک دن جب کہ میرے دل پر والدہ کے زخم بہت تازہ تھے۔ میں ریلوے سٹیشن پر کھڑا کانگریڈ سے آنے والی گاڑی کا انتظار کر رہا تھا اور دور سے گاڑی کا دھواں دکھائی دیا اور میں نے ایسا محسوس کیا کہ اس دھوئیں کے بادلوں سے میری زندگی کی مسکراہٹیں نمودار ہونے والی ہیں، پھر بڑی ماں جی سے ننھی نسرین سے اور آپ کے والدین سے باتیں کرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ میں نے پوری قوت سے زندگی کا دامن پکڑ لیا ہے اور میرے تصورات حقیقت بن کر میرے سامنے آ گئے ہیں۔

فہمیدہ! اس وقت شاید میں تمہیں یہ نہ سمجھا سکوں کہ تمہارے متعلق میں کیا سوچتا ہوں۔ کیونکہ جب میں تمہارا تصور کرتا ہوں تو سوچ ختم ہو جاتی ہے۔ اللہ تمہیں وہ سب کچھ دے جو مجھ جیسا تھی دست انسان نہیں دے سکتا۔

جب تم سے آزادی کے ساتھ اتنی کرنے کا وقت آئے گا تو میں تمہیں یہ سمجھا سکوں گا کہ بعض لوگ اچانک زندگی کا سہارا بن کر آتے ہیں اور زندگی سے زیادہ پیارے ہو جاتے ہیں۔ معاف کرنا اس وقت وہ بے شمار باتیں میری سمجھ میں نہیں آ سکتیں جو ایک شہزادی کے شایان شان ہوں۔

یوسف

یوسف نے بکھرے ہوئے ادراق اکٹھے کر کے بستر کے ساتھ تپائی پر رکھ دیے اور پھر اطمینان سے لیٹ کر آنکھیں پڑھنا شروع کر دیا۔ چند منٹ بعد اس نے اچانک بستر سے اٹھ کر بعض الفاظ میں رد و بدل کیا اور کچھ دیر باہر نکل کر صحن میں ٹہکتا رہا جب خنکی محسوس ہونے لگی تو وہ اندر جا کر بستر پر لیٹ گیا اور لکھے ہوئے کاغذ دوبارہ پڑھنے شروع کر دیے۔ پھر یکایک اُسے اُدھک اُگئی اور کاغذ اس کے ہاتھ سے گر کر بکھر گئے۔

لکھ دیا ہے۔“

فہمیدہ نے میز سے کاغذ اٹھا کر یوسف کو پیش کر دیا۔ اُس نے لکھا تھا۔
 ”یہ خط جو آپ نے سنبھال کر رکھا تھا۔ اپنی منزل مقصود پر پہنچ گیا ہے۔ اگر
 شاعری زیادہ نہ ہوتی تو خط بُرا نہیں تھا۔ بہر حال آپ کی فکر گزار ہوں، لیکن دیکھئے
 مجھے یہاں رہنے دیجئے۔ سورج اور چاند بنا کر لاکھوں اور کروڑوں میل دور نہ بھیج دیجئے
 آپ کی ایک بات صحیح ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض لوگ زندگی کا سہارا بن کر
 آتے ہیں اور جان سے پیار سے ہو جاتے ہیں لیکن ایک چیز ایسی بھی ہے جسے ہم
 دونوں اپنی زندگیوں سے عزیز سمجھتے ہیں اور وہ پاکستان ہے جس کی دلکش
 تصویریں میں آپ کی آنکھوں سے دیکھا کرتی ہوں۔ جب میں آپ کے سینوں کے
 پاکستان کے متعلق سوچتی ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے مستقبل کے اُنق
 پر انتہائی دل فریب رنگوں کی روشنیاں پھیل رہی ہیں لیکن کبھی بھی میں اس خیال سے
 خوف زدہ بھی ہو جاتی ہوں کہ اگر ہم پاکستان حاصل نہ کر سکے تو کیا ہوگا؟“
 یوسف نے اطمینان سے اُٹھ کر بیٹھے ہوئے جواب دیا۔ ”فہمیدہ! میں
 پاکستان پر اتنا ہی یقین رکھتا ہوں جتنا مجھے آج غروب آفتاب اور طلوع
 آفتاب پر یقین ہے۔ ہم جس دور میں پیدا ہوئے ہیں اس کا سب سے بُرا
 تقاضا یہی ہے کہ ہمارے لئے حصول پاکستان یا موت کے سوا اور کوئی راستہ
 نہیں ہے۔ پاکستان اس برصغیر پر آج نہیں، اس صدی سے نہیں، بلکہ تیرہ
 صدیوں سے قائم ہو رہا ہے۔ کوئی قوم اپنے مستقبل کو اپنے حال اور ماضی
 سے جدا نہیں کر سکتی۔ کسی نے اُن قافلوں کو رکتے نہیں دیکھا جن کے پیشرواں
 کے راستوں پر اپنے خون کی روشنائی بکھیر جاتے ہیں۔ فہمیدہ! مجھے تو
 ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے مستقبل کا ہر راستہ پاکستان کی طرف جاتا ہے

اور یہ ایک خواب نہیں ہے۔“

فہمیدہ بولی۔

آپ نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ جو اُمیدیں آپ سنجو پاکستان سے
 وابستہ کی ہیں وہ پوری نہیں ہوئیں تو کیا ہوگا؟

”دیکھئے میرے دل میں کبھی یہ خدشہ پیدا نہیں ہوا کہ میری اُمیدیں پوری نہیں
 ہوں گی۔ اگر مجھے کسی غیر متوقع صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تو بھی میں سوچوں گا کہ میں کہاں
 تک اس کا ذمہ دار ہوں اور میں نے اپنی قوم کو فکر و عمل کا صحیح راستہ دکھانے میں کس حد
 تک اپنی ذمہ داری پوری کی ہے۔ فہمیدہ! جب قافلے چلتے ہیں تو ان کے راستے میں
 نشیب و فراز بھی آتے ہیں۔ اگر رات اندھیری ہو اور ہاتھوں میں مشعلیں نہ ہوں تو
 زیادہ ٹھوکریں لگتی ہیں۔ میں اس وقت صرف یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ آپ میں سے کسی
 کو مجھ سے یہ شکایت نہیں ہوگی کہ جب پاکستان کا قافلہ کسی نازک موڑ سے گزر رہا
 تھا تو میں نے پوری قوت اور ایمان داری سے اس کو آدازیں نہیں دی تھیں اور
 جب ہمیں تاریکیوں نے گھیر لیا تھا تو میں نے دونوں ہاتھوں سے مشعلیں بلند نہیں کی
 تھیں۔ اللہ نے مجھے قلم دیا ہے اور میں اپنے وقت سے بہت دُور آگے دیکھ سکتا ہوں
 میں پورنی سنجیدگی اور دیانت سے علامہ اقبالؒ کے حسین سپنے کی تعبیریں لکھتا رہوں
 گا اور جب میری طاقت جواب دے جائے گی اور میرے ہاتھ سے قلم گر پڑے گا تو مجھے
 اس دنیا میں آخری سانس لیتے وقت بھی یہ اطمینان ہوگا کہ میں نے اپنے دل و دماغ
 اور جسم و روح کی تمام توانائیاں اپنے مقدس مشن کی تکمیل پر صرف کر دی ہیں۔ میرے اللہ!
 میں اس سے بہتر نہیں کر سکتا تھا۔“

فہمیدہ بڑی کوشش سے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

چاہتی ہوں جو صدف میرا بہادر بھائی سرسکنا ہے۔ بھائی جان! میں اللہ سے دعا کیا کرتی ہوں کہ جب تک ہم سب بہت بڑھے نہیں ہو جاتے آپ زندہ رہیں آپ بہت اچھی کتابیں لکھیں۔ بہت سی کتابیں لکھیں اور میں اور میری طرح لاکھوں افراد انہیں بار بار پڑھا کریں۔ آئیے بھائی جان وہ سب نامے پر انتظار کر رہے ہیں۔“

خاتم شد

”یوسف“ اُس نے بھڑائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ جب آپ پاکستان کے پسینے کی حسین تعبیریں لکھا کریں گے تو اللہ کا ہاتھ آپ کے سر پر ہوگا اور آپ کی زبانیں کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ پاکستان کی منزل اچانک بہت قریب آگئی ہے۔ آپ جلدی سے تیار ہو کر آئیں میں آپ کا ناشتہ رکھواتی ہوں چچی جان کو اس قدر پریشان نہ کیا کریں۔“

نہیدہ باہر نکل گئی اور نسرین یوسف کا ہاتھ پکڑ کر سہمی ہوئی آواز میں بولی:

”بھائی جان! خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کیا کریں میں بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں روک رہی تھی۔“

یوسف نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ”نسرین تم اس بات پر خوش نہیں ہو کہ پاکستان تمہارا وطن ہوگا اور میں اس وطن کے حصول کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکوں گا۔“

”بھائی جان“ نسرین نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”بھائی جان آپ کہا کرتے ہیں کہ ہمیں اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے بہت کچھ مانگنا چاہیے اور میں بہت کچھ مانگا کرتی ہوں: مجھے پاکستان کی ضرورت ہے اس سے آپ کی ضرورت کم نہیں ہو جاتی۔ میں آپ کے بغیر پاکستان کا تصور نہیں کر سکتی۔ میں آپ کی شفقت سے محروم ہو کر زندہ رہنا بھی پسند نہیں کروں گی۔“

”میری ننھی شہزادی! تم پاکستان کو اپنی آنکھوں سے بنانا دیکھو گی اور تم اس بات پر بھی فخر کیا کرو گی کہ تمہارا بھائی اس کی بنیاد رکھنے والوں میں سے ایک تھا۔“

”صرف بنیاد رکھنے والوں میں نہیں۔ بھائی جان! میں اس عمارت کی دیواریں اور چھت تعمیر کرتے ہوئے بھی آپ کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں اس دُنیا میں وہ سب کچھ دیکھنا۔“